خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2017

JULY 2017

بانیِ و مُدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مُدیرہ ——— نادرہ خاتون

مُدیر ——— آذر ریاض

نائب مُدیرہ ——— رضیہ جمیل

مُدیرہ خصوصی ——— امۃ الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

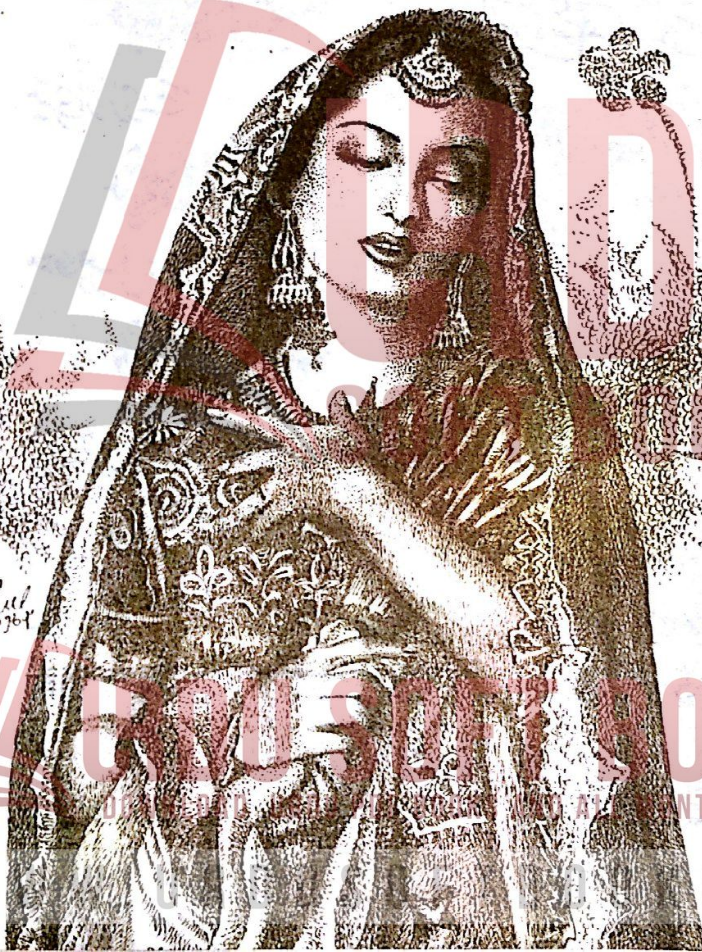
خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اُردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز





زرسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے











جولائی 2017

جلد 45 شمارہ 3

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

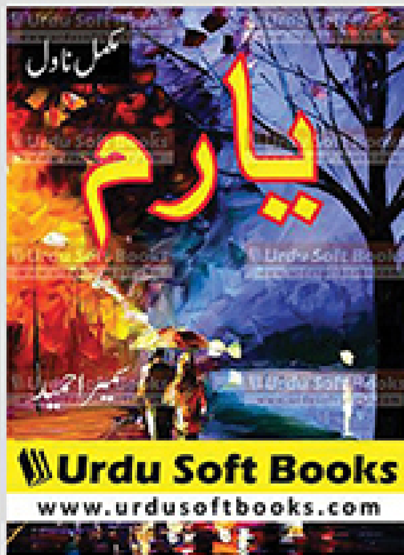
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام : بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

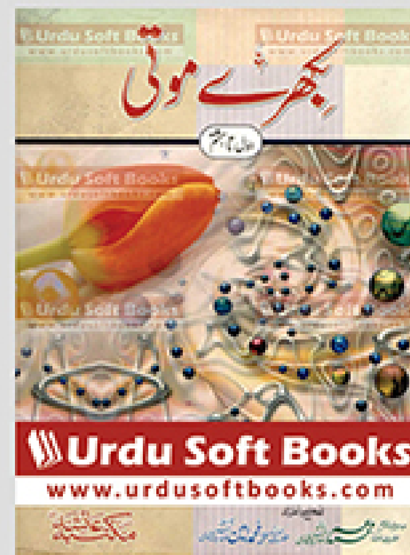
Email: Info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

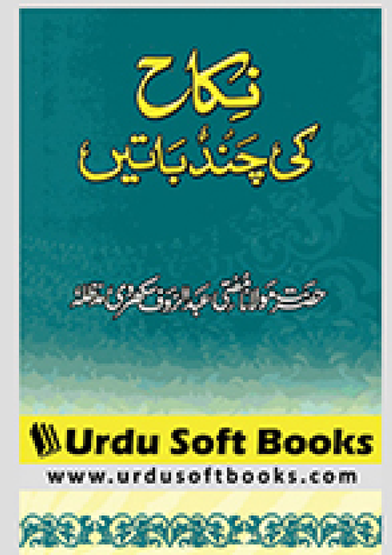
Download These Beautiful PDF Books

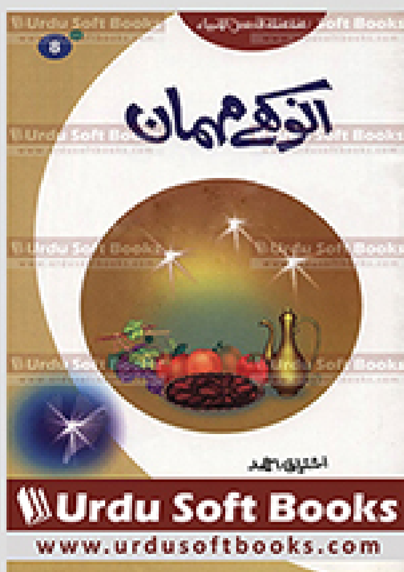
Click on Titles to Download

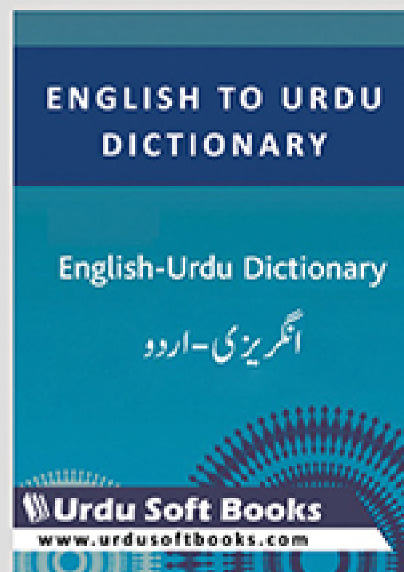




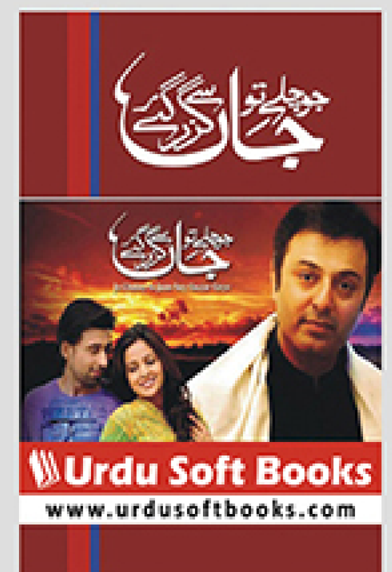


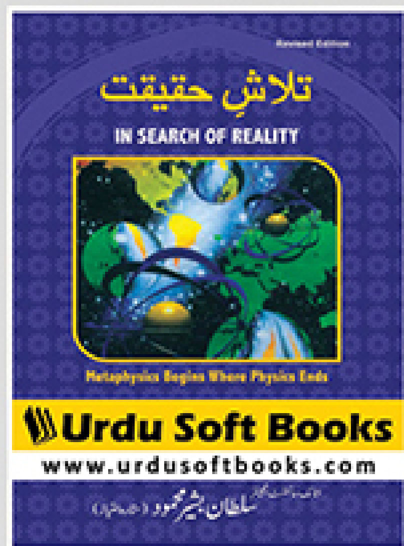


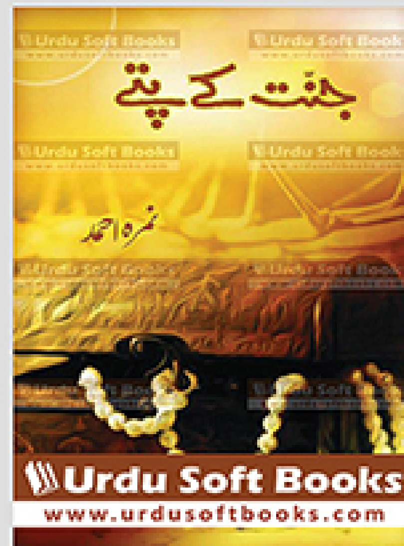


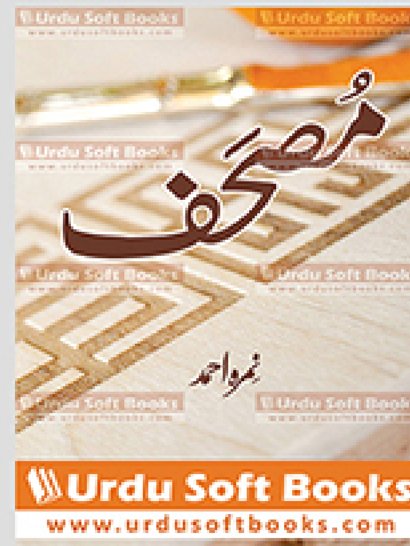


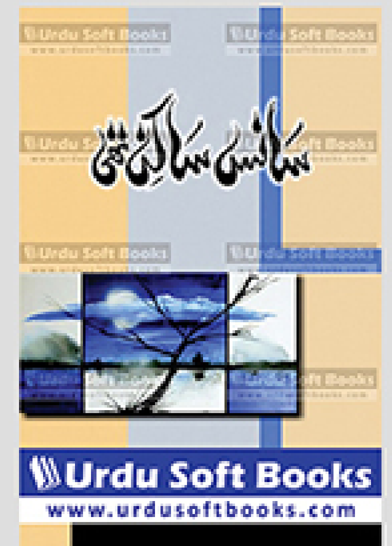


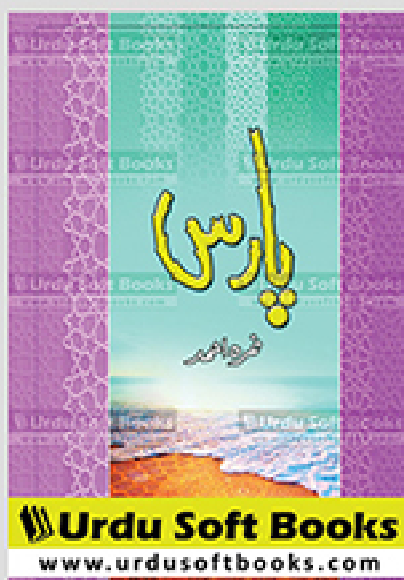


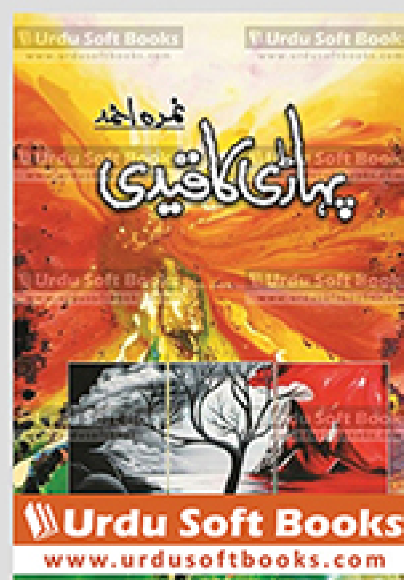


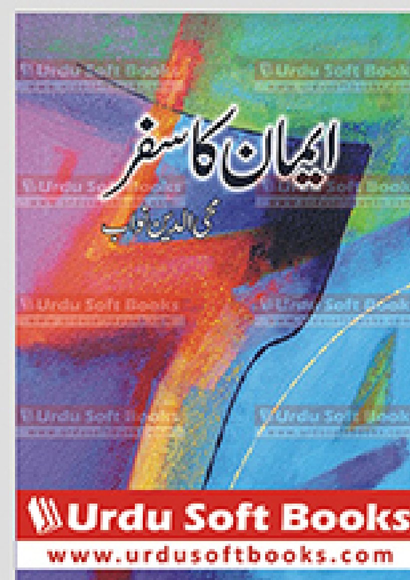




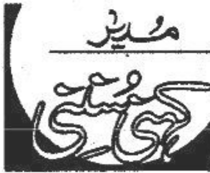












خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ عید نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
ہماری بہت سی قارئین تک پرچہ پہنچے گا تو عید رخصت ہو چکی ہو گی۔ رب کریم سے دعا ہے کہ آپ کے لیے ہر روز، روزِ عید ہو۔

عید سے پہلے پاکستانی قوم کو ایک بڑی خوش خبری ملی جس نے پوری قوم کو خوشی سے سرشار کر دیا اور عید سے پہلے ہی عید ہو گئی۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم نے بھارتی ٹیم کو خاک میں ملا دیا۔ روایتی حریف بھارت سے مقابلے پر ایک بار پھر قوم تمام اختلافات بھلا کر متحد نظر آئی۔ آخری وکٹ کے گرتے ہی پاکستان زندہ باد کے نعروں سے فضائیں گونج اٹھیں۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ گلیوں، سڑکوں پر جشن کا سا سماں نظر آیا۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ بلاشبہ اس جیت میں ماہ رمضان کی برکات اور پاکستانیوں کی دعاؤں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ 1992ء کا ورلڈ کپ بھی ہم نے رمضان المبارک میں جیتا اور چیمپئنز ٹرافی کا تحفہ بھی رمضان المبارک میں ملا ہے۔ یقیناً دل سے نکلی ہوئی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستانی ٹیم میں شامل بیشتر کھلاڑیوں کا تعلق چھوٹے شہروں، قصبوں اور بڑے شہروں کی مڈل کلاس محنت کش طبقے سے ہے۔ انہوں نے ایک بڑے ٹورنامنٹ میں کامیابی حاصل کر کے ثابت کر دیا کہ پاکستانی قوم میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں صرف پرکھنے والی نظر چاہیے اور مواقع ملنے کی بات ہے۔

صرف کرکٹ کے میدان میں ہی نہیں، ہر شعبے میں نئے خون کو ابھرنے اور سامنے آنے کا موقع دیا جائے تو حیران کن نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

ناولٹ نمبر،

پچھلے کچھ سالوں سے ہماری بیشتر مصنفین اور خصوصاً نئی لکھنے والی قارئین طویل تحریریں لکھ رہی ہیں جنہیں ایک قسط میں شائع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بہت سی اچھی تحریریں محض غیر معمولی طوالت کی بنا پر ہم شامل نہیں کر پاتے۔ اس طرح نئی لکھنے والی مصنفین کو اپنی صلاحیتیں سامنے لانے کا موقع نہیں ملتا۔

خواتین ڈائجسٹ کی روایت رہی ہے کہ اگست کا شمارہ ناولٹ نمبر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس بار بھی اگست کا شمارہ ناولٹ نمبر ہو گا۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ ہمیں ناولٹ بھجوائیں جو ہم بلا قسط مکمل شائع کر سکیں۔

اس شمارے میں،

- عنیزہ سید کا مکمل ناول "صبغت اللہ لوٹ آؤ"، سارہ رضا کا ناول "حسن المآب اور ۔۔۔"
- سمیرا حمید اور بنتِ سحر ملک کے ناولٹ، فرزانہ کھرل، افراح سکندر، فوزیہ اشرف اور مہناز نعیم کے افسانے،
- نمرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول، ٹی وی اینکر منصور علی خان سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار گوہر ممتاز سے باتیں، کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

جولائی کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں اپنے خطوط کے ذریعے اپنی رائے سے نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیادیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اللہ سے محبت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک لشکر پر (امیر بنا کر) بھیجا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھاتا اور اپنی قرات (ہر رکعت میں) (قل ھواللہ احد) پر ختم کرتا۔ جب یہ (لشکر والے) لوٹ کر آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اس سے پوچھو' یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"
چنانچہ انہوں نے پوچھا تو اس نے کہا۔
"(اس میں) رحمٰن کی صفت ہے' اس لیے میں اسے (زیادہ) پڑھنا پسند کرتا ہوں۔"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سن کر) فرمایا۔
"اسے بتلا دو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت فرماتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اللہ کی صفات پر مشتمل سورت کو پسند کرنا اور کثرت سے پڑھنا بھی اللہ کی محبت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر ہر رکعت کی قرات کے آخر یا شروع میں (قل ھواللہ احد) پڑھنے کا اہتمام کرے تو یہ جائز ہے۔ اس میں شرعاً" کوئی قباحت نہیں۔
2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں قرآنی سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا ضروری نہیں' البتہ افضل ہے۔
3۔ امام کی اگر کوئی غلطی سامنے آئے تو خود ہی اس کی اصلاح کرنے کے بجائے اس کے کسی استاد یا بڑے کی طرف رجوع کرنا چاہیے' کیونکہ ضروری نہیں کہ آپ جسے غلطی سمجھ رہے ہیں وہ واقعی غلطی ہو۔

نیک لوگوں' کمزوروں اور مسکینوں کو ایذا پہنچانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا پہنچائیں' جبکہ انہوں نے کوئی جرم اور قصور نہ کیا ہو تو یقیناً" ان لوگوں نے بہتان اور

کھلے گناہ کا بوجھ اٹھایا۔"

(الاحزاب 58)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "لہٰذا آپ یتیم پر سختی نہ کریں۔ اور سوالی کو نہ جھڑکیں۔"

(الضحیٰ 10،9)

ظاہر پر فیصلہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "پس اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔"

(التوبہ۔ 5)

فائدہ

مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کرکے اگر کوئی شخص مسلمان ہوجائے اور ظاہری طور پر وہ احکام و فرائض اسلام کی پابندی کرے تو پھر اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ نفاق کے طور پر ایسا کررہا ہے یا نمود و نمائش یا کوئی اور مقصد اس کے پیش نظر ہے تو یہ چونکہ اندرونی معاملہ ہے، اسے اللہ کے سپرد کردیا جائے گا، کیونکہ وہی دلوں کے احوال سے واقف ہے۔ کوئی دوسرا شخص کسی کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا۔

جہاد

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال (جہاد) کرتا رہوں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ (اس توحید و رسالت کے اقرار کے بعد) وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کرلیں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کرلیں گے، سوائے حق اسلام کے۔"

(یعنی مالوں میں سے صرف زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اگر کسی کو ناجائز قتل کرے گا تو قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا وغیرہ) اور ان (کے باطن) کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس حدیث میں ایک تو جہاد کے مقصد اور اس کی غرض و غایت کا بیان ہے اور وہ ہے دنیا سے کفر و شرک اور طاغوت کی عبادت و حکومت کا خاتمہ۔ جب تک یہ مقصد مکمل طور پر حاصل نہیں ہوگا، جہاد جاری رہے گا، اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ "جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔"

2۔ دنیا کے جس خطے میں بھی غیر اللہ کی بندگی اور ظلم و جہالت کا اندھیرا ہوگا، اس کے خاتمے کے لیے مسلمانوں پر جہاد کرنا ضروری ہے۔

3۔ جہاد کی ایک تیسری قسم یہ ہے کہ جہاں مسلمان کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہوں، انہیں نرغہ کفار سے نکالنے کے لیے کافروں سے جہاد کیا جائے۔ مسلمان جب تک یہ فریضہ جہاد ادا کرتے رہے، اسلام بھی دنیا میں غالب رہا اور مسلمان بھی سربلند رہے اور جب سے مسلمان اس فریضے سے غافل ہوئے ہیں، اسلام بھی محکوم ہو کر رہ گیا ہے اور مسلمان بھی ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

4۔ قبول اسلام کے بعد ہر مسلمان کی جان و مال محفوظ ہے، البتہ اسلام کے احکام ان پر لاگو ہوں گے۔ جس میں ایک حکم ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی مسلمان کو ناجائز قتل کردیں گے تو قصاص میں انہیں بھی قتل کیا جائے گا، الا یہ کہ مقتول کے ورثا معاف کردیں یا دیت قبول کرلیں۔

5۔ اگر کسی شخص نے اسلام قبول کرلیا ہے تو اس پر اس کے ظاہری حالات کے مطابق احکام اسلام کا اجرا ہوگا اس کے باطن کو نہیں کریدا جائے گا۔ اگر اس کے دل میں کھوٹ ہے یا کوئی اور مقصد اس کے پیش نظر ہے تو جب تک اس کا صحیح ثبوت مہیا نہیں ہوگا، اس

کے خلاف کارروائی نہیں ہوگی اور اس کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا' یعنی اللہ تعالیٰ ہی قیامت والے دن اس کا فیصلہ فرمائے گا۔

کلمہ

حضرت ابو عبداللہ طارق بن اشیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ
"جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا اور اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کیا تو اس کا مال اور خون محفوظ (حرام) ہوگیا اور اس (کے باطن) کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔" (مسلم)

فائدہ

اس میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں جن کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ صرف اللہ کی معبودیت کا اقرار اور غیروں کی معبودیت کا انکار۔
حضرت ابو معبد مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یہ بیان فرمایئے کہ اگر میری کافروں میں سے کسی آدمی سے مڈبھیڑ ہو جائے ہم آپس میں لڑیں' وہ میرے ایک ہاتھ کو تلوار سے کاٹ دے' پھر وہ میرے وار سے بچنے کے لیے ایک درخت کی پناہ لے لے اور کہے میں اللہ پر ایمان لے آیا تو اس کے یہ کہنے کے بعد کیا میں اسے قتل کردوں۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "تم اسے قتل مت کرو۔"
میں نے عرض کیا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا اور ہاتھ کاٹنے کے بعد اس نے یہ کہا؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم اسے قتل مت کرو' اگر تم نے اسے قتل کردیا تو (یاد رکھنا) وہ تمہارے اس مرتبے پر ہوجائے گا جس پر تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم اس کے اس مرتبے پر ہوجاؤ گے جس پر وہ اس کلمے کے کہنے سے قبل تھا جو اس نے کہا۔" (بخاری و مسلم)
"وہ تمہارے مرتبے پر ہوجائے گا۔" کا مطلب ہے۔ اس کا خون محفوظ ہوگا اور وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔ "اور تم اس کے مرتبے پر ہوجاؤ گے۔" کے معنی ہیں۔ اس کے وارثوں کے لیے بطور قصاص تمہارا خون بہانا جائز ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس کے کفرے کے مرتبے پر ہوجاؤ گے۔ (یعنی کافر ہوجاؤ گے جیسا کہ بظاہر یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے۔) واللہ اعلم

فوائد و مسائل

1۔ احکام اسلام کا نفاذ ظاہری حالات ہی پر ہوگا۔ باطن پر نہیں' کیونکہ باطن کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا' اس لیے کوئی قبول اسلام کا اظہار کرے گا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا اور اس کے جان کا تحفظ ضروری ہوگا اور جو شخص اس حرمت کے علم کے باوجود اسے قتل کردے گا تو مقتول کے ورثا کے لیے قصاص لینا جائز ہوگا۔
2۔ اگر کوئی شخص جہالت یا تاویل جہالت یا تاویل سے کام لیتے ہوئے قتل کرے گا تو صرف دیت کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ چنانچہ بعض صحابہ یہی تاویل کرتے ہوئے کہ اس نے صرف جان بچانے کے لیے اسلام کا اظہار کیا ہے' اسلام کا اظہار کرنے والے کو قتل کردیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے ورثا کو دیت ادا فرمائی۔

مسلمان کا قتل

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جہینہ قبیلے کی ایک شاخ حرقہ کی طرف (لڑائی کے لیے) بھیجا۔ چنانچہ صبح صبح ہم ان کے پانی کے چشموں پر حملہ آور ہوگئے۔ (لڑائی کے دوران) میری اور ایک اور انصاری کی مڈبھیڑ ان کے ایک آدمی کے ساتھ ہوئی۔ جب ہم نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اس نے

لاالہ الا اللہ پڑھا جس پر (میرے ساتھ) انصاری نے تو اپنا ہاتھ روک لیا۔ لیکن میں نے اسے اپنا نیزہ مارا حتی کہ اسے قتل کردیا۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"اے اسامہ! کیا تم نے اسے لاالہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کردیا؟"

میں نے عرض کیا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے تو صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) فرمایا۔ کیا تم نے اسے لاالہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کردیا؟"

آپ یہی فقرہ بار بار میرے سامنے دہراتے رہے، یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کہ میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔ (یعنی اب مسلمان ہوتا، تاکہ میرے ہاتھوں ایک نو مسلم کا قتل تو نہ ہوتا۔)

ایک اور روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے اسے قتل کردیا۔" میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے تو ہتھیار (تلوار یا نیزے) کے خوف سے یہ کلمہ کہا تھا۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔" کیا تم نے اس کا دل چیرا تھا کہ تمہیں علم ہوگیا کہ اس نے یہ کلمہ دل سے کہا ہے یا نہیں؟ چنانچہ آپ یہ فقرہ دہراتے رہے، یہاں تک کہ مجھے آرزو ہوئی کہ (میں اس سے قبل مسلمان نہ ہوا ہوتا بلکہ) آج مسلمان ہوتا۔"

فوائد و مسائل

1۔ اس سے واضح ہے کہ احکام اسلام کا نفاذ و اجرا ظاہری حالات پر ہوگا۔ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح انتقامی کارروائیوں کا سدباب کردیا گیا ہے، ورنہ ہر شخص، کسی دشمن وغیرہ کو قتل کرکے دعویٰ کر سکتا تھا کہ یہ اپنے دعویٰ اسلام میں جھوٹا تھا، اس لیے میں نے یہ کارروائی کی ہے۔ چنانچہ سدذریعہ کے طور پر باطنی کیفیت کے کھوج لگانے کو سرے ہی سے غیر ضروری قرار دے دیا گیا اور صرف ظاہر پر معاملہ کرنے کی تاکید کی گئی۔

2۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پر قصاص کا حکم اس لیے عائد نہیں کیا گیا کہ ان کا یہ فعل تاویل پر مبنی تھا، تاہم اس صورت میں دیت کی ادائیگی ضروری ہوگی، چاہے وہ بیت المال سے ادا کی جائے، تاکہ ایک مسلمان کا خون ضائع نہ جائے۔

حضرت جندب بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا ایک دستہ کچھ مشرکوں کی طرف بھیجا اور ان کا باہم مقابلہ ہوا۔

مشرکوں میں سے ایک آدمی تھا، جب وہ کسی مسلمان کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ موقع پاکر اسے قتل کردیتا۔ (یہ صورت حال دیکھ کر) مسلمانوں میں سے (بھی) ایک آدمی اس کی غفلت کی تاک میں رہنے لگا تاکہ (موقع پاکر) وہ اس مشرک کو قتل کردے۔ اور ہم آپس میں گفتگو کرتے تھے کہ یہ اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

(چنانچہ جلد ہی وہ وقت آگیا اور) حضرت اسامہ نے (موقع پاکر) جب (اسے مارنے کے لیے) اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے لاالہ الا اللہ پڑھ لیا، لیکن انہوں نے اسے اہمیت نہ دی اور) اسے قتل کردیا۔ (اس لڑائی میں مسلمان فتح یاب ہوئے) اور خوش خبری دینے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے حالات پوچھے اور اس نے بتلائے یہاں تک کہ اس نے اس آدمی (حضرت اسامہ) کا قصہ بھی بیان کیا کہ اس نے کیا کیا۔ آپ نے انہیں بلایا اور ان سے پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"تم نے اسے قتل کیوں کیا؟"
انہوں نے جواب دیا" اے اللہ کے رسول! اس نے مسلمانوں کو بڑی تکلیف دی اور (ہمارے) فلاں فلاں آدمی کو اس نے قتل کیا۔ اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئی نام بیان کیے۔ (یہ صورت دیکھ کر) میں نے اس شخص پر حملہ کیا' جب اس نے تلوار دیکھی (یعنی اس کی زد میں آگیا) تو اس نے لا الہ الا اللہ پڑھ دیا۔ (جس سے میں یہی سمجھا کہ یہ صرف جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ رہا ہے۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔"

"پھر تم نے اسے قتل کر دیا؟" انہوں نے کہا۔

"ہاں۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب یہ کلمہ لا الہ الا اللہ قیامت والے دن آئے گا تو تم کیا کرو گے؛ کیا جواب دو گے؟"

حضرت اسامہ نے کہا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فقرہ دہراتے رہے اور اس پر کوئی بات زیادہ نہ فرماتے۔ "جب یہ کلمہ لا الہ الا اللہ قیامت والے دن آئے گا تو تم کیا کرو گے؟" (مسلم)

فائدہ

کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کرنا درست نہیں۔

مواخذہ

حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو کچھ لوگوں کا مواخذہ وحی کے ذریعے سے ہو جاتا تھا' لیکن اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور باطن کے احوال پر مواخذہ ممکن نہیں رہا' اس لیے اب ہم تمہارا مواخذہ صرف تمہارے ان عملوں پر کریں گے جو ہمارے سامنے آئیں گے۔ چنانچہ جو ہمارے لیے بھلائی ظاہر کرے گا' ہم اسے امن دیں گے۔ (یا اس پر اعتبار و اعتماد کریں گے) اور اسے اپنے قریب کریں گے اور ہمیں اس کے اندرونی حالات سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا حساب اللہ تعالیٰ ہی اس سے کرے گا اور جو ہمارے لیے برائی ظاہر کرے گا' ہم اسے امن دیں گے (یا اس پر اعتبار کریں گے) نہ اس کی تصدیق کریں گے' اگرچہ وہ یہ کہے کہ اس کا اندرونی معاملہ (ارادہ) اچھا تھا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل

1۔ اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ احکام کا اجرا ظاہری اعمال پر ہو گا نہ کہ لوگوں کے ارادوں اور نیتوں پر۔ کیونکہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

2۔ دور حاضر میں اکثر لوگ اعلانیہ اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان سے اصلاح کے لیے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہماری نیت درست ہے۔ ایسے لوگ شیطان کے فریب زدہ ہیں۔ بھلا اعمال کے بغیر نیت محض کا کیا فائدہ؟ جب ظاہری اعمال ہی درست نہ ہوں تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ نیت درست ہے۔ اس کو آپ مثال کے ذریعے سے یوں سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کسی شیشے کے گلاس میں پانی ہو اور وہ اندر سے صاف ہو لیکن اس کے باہر گندگی لگی ہو اور کوئی شخص آپ کو اس میں پانی پیش کر کے کہے کہ جناب گلاس اندر سے صاف ہے تو کیا آپ اسے صاف تسلیم کر کے وہ پانی پی لیں گے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ اس کا ظاہر آلودہ ہے' اس لیے جس کا ظاہر ہی آلودہ اور احکام شرعیہ کا مخالف ہو' اس کے باطن کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔



درجہ وار اشتہارات

انشاجی

درجہ وار اشتہارات اردو صحافت میں نووارد ہیں۔ ہم حیران ہوا کرتے ہیں کہ جب یہ نہ ہوا کرتے تھے تو لوگ کیسے بنگلے بیچتے یا خریدتے تھے۔ نام کیسے بدلا جاتا تھا کہ مجھے آئندہ گھسیٹا خان کے بجائے مرزا صبغت اللہ بیگ کہا جائے۔ مشفق والدین سعادت مند اولاد کو کیسے عاق کرتے اور ان کے لین دین سے بے تعلقی کا اظہار کرتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ شادیاں کیسے ہوجاتی تھیں۔

ہماری تحقیق یہ ہے کہ ان اشتہاروں میں سے اور کوئی پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے۔ ضرورت رشتہ کا اشتہار ضرور پڑھا جاتا ہے اور اس میں زید' بکر' بچے' بوڑھے' شادی شدہ' غیر شادی شدہ کی تخصیص نہیں۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

عرضی نویسوں کی زبان کی طرح ضرورت رشتہ کے اشتہاروں کی عبارت بھی قریب قریب مقرر ہے۔ دوشیزہ، ہمیشہ قبول صورت' پابند صوم صلوٰۃ اور سلیقہ مند ہوتی ہے اور اس کا ایک معزز گھرانے سے تعلق ہوتا ہے۔ مرد ہے تو پڑھا لکھا' برسرروزگار اور شریف خاندان کا چشم و چراغ ہوتا ہے۔ بی اے پاس لڑکی کے لیے ایم اے پاس شوہر ڈھونڈا جاتا ہے۔ گزیٹڈ افسر کی مانگ بالعموم رہتی ہے۔ کچھ لوگ احتیاطاً" یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ لڑکا یوپی یا دہلی کا ہونا چاہیے۔ پنجاب والے خط و کتابت کرکے وقت ضائع نہ کریں۔ بعضے حنفی المذہب یا اثنا عشری کی قید بھی لگادیتے ہیں۔ لیکن اکثر مشتہرین فراخ دل واقع ہوتے ہیں اور ذات پات کی تمیز کے سخت خلاف ہوتے ہیں۔ فریق ثانی سے بھی ان کی یہی توقع ہوتی ہے کہ ذات پات کی تمیز نہ کریں گے۔ خط و کتابت صیغہ راز میں رہتی ہے۔

ان اشتہاروں کا تجزیہ کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں شکل' عقل کا ہونا ضروری نہیں۔ یہ آنی جانی اور فانی چیزیں ہیں۔ گچھے دار مونچھیں یا گدی پر پٹے رکھنے' بھنگ یا چرس پینے' شعر کہنے' نسوار کھانے' نہانے دھونے سے پرہیز کرنے' مصنوعی دانت' آنکھ لگانے یا لاٹھی ٹیک کر چلنے وغیرہ پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ دولہا میاں گزیٹڈ افسر یا صاحب جائیداد ہوں۔ کلرک پیشہ اور بے روزگار لوگوں کی توجہ اس جدید نظم کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت کہتا ہے۔

میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی۔۔۔

پرانے زمانے میں شادی کا مسئلہ بہت آسان تھا۔ دروپدی کے سوئمبر میں فقط اتنی سی شرط تھی کہ یہ جو اوپر چکر میں مچھلی گھوم رہی ہے۔ اس کا عکس پانی میں دیکھ کر تیر سے اس کی آنکھ پر نشانہ لگایا جائے۔ یہ کوئی نہ پوچھتا تھا کہ نشانہ لگانے والا کانا ہے یا لنجا ہے۔ کالا ہے یا گورا ہے۔ اکبر الہٰ آبادی سے روایت ہے کہ لیلیٰ کی ماں نے بھی مجنوں کا حسب و نسب' سکونت' ولدیت وغیرہ نہیں پوچھے تھے۔ بس یہی کہا تھا۔

کہ بیٹا تو جو کرلے ایم اے پاس
تو فوراً" بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ ورنہ آج کل ایک ایک یونیورسٹی سے اتنے ایم اے نکل رہے ہیں کہ لیلیٰ کی ماں کے لیے بڑی مشکل ہوجاتی۔ اسی طرح فرہاد میاں نے رشتہ مانگا تو شیریں سلمہا نے فقط یہ شرط کی کہ یہ سامنے والا پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لے آؤ تو بندی کو عذر نہیں۔

پرانے لوگ بہت احتیاط کرتے تو سوجھ بوجھ کا امتحان لینے کے لیے پہیلیاں اور معمے بھجواتے۔ جو پاس ہوجاتا۔ اس کو لڑکی کا ڈولا دے دیتے۔ کبھی نہ پوچھتے کہ کیا تنخواہ ہے۔ کرائے کے مکان میں رہتے ہو یا اپنا ہے۔ پنجاب کے ہو یا یوپی کے۔ شیعہ ہو یا سنی۔

ایسا ہی ایک شخص ایک بار کسی راجکماری سے شادی کا طلب گار ہو کر آیا۔ راجکماری کو بالعموم سخت پردے میں رکھا جاتا تھا۔ چشم فلک بھی اسے دیکھنے کو ترستی تھی لیکن اس امیدوار نے اتفاقاً" اس حسن جہاں سوز کو جھروکے میں کھڑے دیکھ لیا۔ بہت فرار کی کوشش کی لیکن پہرے کا انتظام سخت تھا۔ آخر وہ سوال و جواب کے لیے بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔

وزیر اعظم نے حسب دستور قابلیت جانچنے کے لیے سوال پوچھنے شروع کیے۔

"دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔"

امیدوار نے حساب لگا کر کہا "سات۔"

وزیر اعظم نے کہا۔

"شاباش! اب دوسرے سوال کا جواب بھی ٹھیک دو تو تم کامیاب سمجھے جاؤ گے۔" وہ کون سا جانور ہے۔ جس کی چار ٹانگیں ہوتی ہے، جو بھونکتا ہے۔"

امیدوار نے تھوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا۔ "طوطا۔"

لیکن اس کی یہ ترکیب نہ چلی۔ درباریوں نے مبارک سلامت کے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا اور دھوم دھام سے شادی کرکے راجکماری سے گلو خلاصی کرائی۔

"نقل کفر کفر نباشد۔" شادی کے متعلق حکماء کا قول ہے کہ جو کرے پچھتائے، جو نہ کرے پچھتائے۔ یہ ایک حلقہ ہے کہ باہر والے اندر جانے کے لیے بے چین ہیں اور اندر والے باہر نکلنے کے لیے مضطرب۔ لیکن چند مستثنیات کو چھوڑ کر عام لوگوں کے لیے شادی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا ایک دن مقرر ہے۔ چاہے نیند رات بھر آئے یا نہ آئے۔ آج کل ہماری

باری ہے۔ "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔" مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ لیکن اشتہاری شادی کا معاملہ اجمال کے بجائے قدرے تفصیل کا "داب" ہے۔

اشتہاری شادی میں شروع میں دونوں طرف خلوص زوروں پر ہوتا ہے۔ نہ صرف خط و کتابت بلکہ بیشتر حالات بھی صیغۂ راز میں رہ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہے کہ دلہن صاحبہ ویسے ٹھیک ہیں لیکن گنجی ہیں۔ اور دولہا صاحب جو کالی عینک لگائے رہتے ہیں۔ نقطہ نظر کے لحاظ سے موحد ہیں۔ ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ بیوی بے شک کھری سید زادی ہے، لیکن ان کے دادا کا بریلی میں ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ دولہا صاحب البتہ مغل ہیں اور اس رعایت سے ہیں کہ مغل واشنگ فیکٹری والوں سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ بیوی جن کو ان کے ظفر الملت والدین بے بی کہہ کر یاد کرتے ہیں، پہلی جنگ عظیم کے واقعات کی چشم دید گواہ ہیں اور میاں آٹھوں گانٹھ گریجویٹ ہیں۔ لیکن ان کی ڈگری تقسیم کے ہنگامے میں ہندوستان میں رہ گئی۔ انگریزی بولنے، لکھنے، پڑھنے سے احتراز ایسا اختیاری بھی نہیں جیسا کہ بتایا تھا۔ اردو کی محبت کے علاوہ اس کی اور وجہیں بھی ہیں۔ گزیٹڈ اس نے کہہ دیا تھا کہ ان کی گزیٹڈ ہونے کی باری آگئی تھی۔ لیکن ریٹائرمنٹ کی میعاد اس سے پہلے آگئی۔

اس کے ایفائے عہد تک نہ جئے
زیست نے ہم سے بے وفائی کی

یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوسکتیں، بلکہ زیادہ کامیاب یہی ہوتی ہیں۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوتی ہے۔ دونوں کے خضاب کی مدت ایک وقت ختم ہوتی ہے۔ دونوں کے صیغہ راز سے ایک ساتھ پردہ اٹھتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ داستانوں کے کرداروں کی طرح بقیہ عمر ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔



"کیا خواب دیکھا کرتے تھے کہ پڑھ لکھ کر یا بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟"

"میں لائر بننا چاہتا تھا اور ایل ایل بی کرنے یونیورسٹی آف لندن جانے والا تھا۔ آپ کو بتاؤں کہ ہماری فیملی میں زیادہ تر لوگ بزنس کرتے ہیں تو میرے والد کا بھی اپنا بزنس تھا تو ایک دن میں اپنی فیس کے سلسلے میں اپنے شو روم گیا تو میرا کمشنو بینک سے پیسے لینے چلا گیا۔ اس کی میز پہ کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کتابیں جب میں نے کھولیں۔ تو دیکھا کہ بزنس کا کچھ زیادہ اچھا حال نہیں ہے... میں نے اپنے والد کو فون کیا اور کہا کہ میں کتابوں کو دیکھ رہا ہوں تو بزنس کا حال کچھ اچھا نہیں ہے... بلکہ کچھ زیادہ ہی بُرے حالات ہیں...

والد کو چار ماہ قبل ہارٹ اٹیک ہوا تھا تو وہ بزنس پہ زیادہ توجہ نہیں دے پا رہے تھے اور ہم صرف دو ہی بھائی ہیں اور مجھ سے چھوٹا بھائی مجھ سے بارہ سال چھوٹا ہے... تو والد صاحب نے کہا کہ تم لندن پڑھنے جا رہے ہو اور میں توجہ نہیں دے سکتا تو میں اس بزنس کو ختم کر دوں گا...

میں نے کہا کہ آپ اس بزنس کو ختم کیسے کر سکتے ہیں۔ گزشتہ چالیس سال سے آپ یہ بزنس کر رہے ہیں تو انہوں نے تھوڑا طنزیہ انداز میں کہا کہ "تمہیں اتنا درد ہو رہا ہے تو تم سنبھال لو..."

تو میں نے بے ساختہ کہہ دیا کہ "ٹھیک ہے میں سنبھال لیتا ہوں... میں لندن نہیں جا رہا۔" اور میں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہا اور بزنس کو ٹیک اوور کر لیا۔ تقریباً سات آٹھ سال میں نے بزنس کو سنبھالا... مگر دل میں ہمیشہ ایک بات کھٹکتی تھی کہ یہ وہ کام نہیں ہے جو میں کرنا چاہ رہا تھا۔

اخبار پڑھنے کا مجھے شوق تھا تو ایک دن اخبار پڑھ رہا تھا تو ایک خبر تھی کہ "ڈان" انگریزی چینل لانچ کر رہا ہے... زندگی میں پہلی بار "سی وی" بنایا... ڈان کے دفتر گیا... وہاں چوکیدار کو سو روپے رشوت دی اور کہا کہ اسے اندر پہنچا دو... سی وی گئی تو کچھ دن بعد کال آ گئی کہ آپ کا آڈیشن کریں گے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی کر لیں۔

آڈیشن ہوا... کامیاب ہوا۔ کہا کہ 33 ہزار سات سو آپ کی تنخواہ ہو گی، آپ کل سے آنا شروع ہو جائیں... میرے بزنس میں، جو بندہ میرے انڈر کام کرتا تھا اس کو میں 45 ہزار روپے تنخواہ دیتا تھا۔ یعنی اپنے "سیلز مین" کو۔ والد صاحب کو بتایا تو وہ بہت ناراض ہوئے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، اچھا بھلا بزنس چل رہا ہے۔ میں نے کہا کہ... میں تو یہ جاب ضرور کروں گا۔

اتفاق سے یہ وہ ہی مہینہ تھا جس میں افتخار چودھری صاحب کو معزول کیا گیا تھا۔ اس وقت پورے ملک میں جلسے اور جلوس شروع ہو گئے اور میری ڈیوٹی ہر جگہ لگنی شروع ہو گئی اور مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا اس کام میں۔ بڑا تھرل تھا، کبھی ادھر بھاگ تو کبھی ادھر بھاگ، کبھی یہاں جلسہ، کبھی وہاں "آنسو گیس، لاٹھی چارج" تو خطرناک کام تھا، مگر میں انجوائے کر رہا تھا۔

ایک ماہ کے بعد میرے والد نے کہا کہ اگر "بھوت" اتر گیا ہو تو اپنے بزنس میں واپس آ جاؤ... میں نے کہا کہ نہیں... مجھے مزہ آ رہا ہے۔ پھر ایک مہینے کے بعد دوبارہ انہوں نے کہا کہ آنا ہے... میں نے کہا نہیں... پھر چھ مہینے کے بعد والد صاحب نے دوبارہ پوچھا... بزنس میں آنا ہے۔ تو اب میں نے صاف کہہ دیا کہ نہیں جی... مجھے اب بزنس میں واپس نہیں آنا۔ اب مشکل ہے... تو مجھے اب اس فیلڈ میں تقریباً "دس سال ہو گئے ہیں۔"

"اب تو شہرت کا نشہ بھی واپس نہیں جانے دے گا؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے... میرا رزق یہاں ہی ہے شاید اور اب تو والد صاحب بھی کہتے ہیں کہ لوگ مجھے تمہارے حوالے سے پہچانتے ہیں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔"

"بزنس کس چیز کا تھا اور آپ کے آنے سے ترقی



بن جائیں گے۔۔۔ اور اگر منصور علی خان نے یہ نہیں سوچا تھا تو پھر کیا سوچا تھا اپنے بارے میں۔۔۔ ذرا معلوم کریں۔

"السلام علیکم' کیا حال ہے آپ کا؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"انٹرویو شروع کرنے سے پہلے لوگوں کی فرمائش پر بھی اور خود بھی یہ سوال کرنا چاہوں گی کہ آپ کی خوب صورت' چارمنگ اور اسمارٹ شخصیت کا کیا راز ہے؟"

ہنستے ہوئے۔ "مجھے تو نہیں لگتا کہ میں خوب صورت اور اسمارٹ اور ہینڈسم ہوں۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس فیلڈ میں آنے سے پہلے میں ماڈلنگ بھی کر چکا ہوں۔ میرے والد اپنی نوجوانی اور پھر جوانی کے دور

رپورٹر سے اینکر بننے تک کا سفر

منصور علی خان سے ملاقات

شاہین رشید

اکثر سیانے کہتے ہیں کہ زندگی کو پلاننگ کے ساتھ گزاریں تو کامیابیاں قدم چومتی ہیں اور اکثر بے وقوف کہتے ہیں کہ پلاننگ کے بغیر چلیں تو کامیابیاں قدم چومتی ہیں اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ سیانوں اور بے وقوفوں کی اس بحث میں بے وقوف جیت جاتے ہیں۔۔۔ اس لیے کہ ہمارا پلانر تو اوپر بیٹھا ہے' وہ ہی ہمارے لیے سوچتا ہے کہ ہمیں زندگی میں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔۔۔ اور جو پلان کامیاب ہو جاتے ہیں' اس کا کریڈٹ بھی "اوپر" والے کو ہی جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہی پلان کرواتا ہے کامیاب کرنے کے لیے۔

معروف اینکر منصور علی خان نے کب سوچا تھا کہ وہ ایک دن معروف اینکر بن جائیں گے۔۔۔ لوگ انہیں پہچانیں گے' ان کے پروگرام میں شرکت کرنا پسند کریں گے۔۔۔ اور وہ میڈیا کی جانی پہچانی شخصیت

میں بہت خوب صورت ہوا کرتے تھے۔ یعنی بڑے گھبرو جوان تھے اور ابھی بھی ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہیں۔۔۔ ایف سی کالج میں پڑھتے تھے اور تین کھیلوں کے کپتان بھی تھے۔"

"اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟"

"جی۔۔۔ میرے والد کا تعلق "لدھیانہ" سے تھا اور قیام پاکستان کے وقت جب وہ دو سال کے تھے تو ان کی فیملی پاکستان شفٹ ہو گئی۔ میری امی کا تعلق ہزارہ فیملی سے تھا۔۔۔ اور میری امی کوئٹہ میں رہائش پذیر تھیں اور سابق گورنر بلوچستان "جنرل موسیٰ" میرے نانا تھے۔۔۔ میں لاہور میں 22 اپریل 1979ء پیدا ہوا۔ 27 سال لاہور میں گزارے۔ تقریباً 8 سال کراچی میں گزارے کیونکہ وہاں میری جاب بھی اور اب اسلام آباد آئے تقریباً نو دس ماہ ہو گئے ہیں۔"

ہوئی یا وہیں رہا جہاں سے آپ نے لیا تھا؟"

"ہمارا الیکٹرونک کا بزنس تھا اور جب میں نے بزنس سنبھالا تو دو سال میں "سونی" اور سام سنگ کے (ہم ڈیلر تھے) چیمپئن ڈکلیئرڈ ہوئے تو ماشاء اللہ ایل سی ڈی اور ایل ای ڈی کا بزنس کافی ترقی کر گیا اور میرے والد اسی لیے مجھے میڈیا میں جانے نہیں دے رہے تھے کہ بزنس ترقی کر رہا تھا۔ مگر پھر انہوں نے تین چار سال میرا انتظار کیا اور جب وہ میری واپسی سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے وائنڈ اپ کر دیا بزنس کو اور چھوٹے بھائی نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں نے بزنس میں نہیں آنا اور اب وہ ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے۔ آغا خان سے اپنا ایم بی بی ایس کر کے اب وہ امریکہ جا رہا ہے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے اور میں گریجویٹ ہوں۔"

"آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ بھی ملک سے باہر چلے جائیں؟"

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا تعلق ہزارہ فیملی سے ہے تو تقریباً" اسی نوے فیصد لوگ اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہو چکے ہیں ملک سے باہر اور "اسائلم" لے چکے ہیں اور میری بھی بہ 90 فی صد فیملی ملک سے باہر ہے تو مجھے سب یہی کہتے ہیں کہ تم صحافی بھی ہو' ہزارہ فیملی سے بھی ہو تو تمہارے لیے اسائلم (سیاسی پناہ) لینا مشکل نہیں ہے۔۔۔ اور میں تو ویسے بھی تقریباً" 22 ممالک گھوم پھر چکا ہوں۔۔۔ مگر آپ یقین کریں کہ ملک سے باہر جا کر دس پندرہ دن سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ میرا سانس جیسے بند ہونا شروع ہو جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ جلدی سے واپس پاکستان چلا جاؤں۔ مجھے بس اپنے ملک سے پیار ہے۔ اپنی والدہ کے بارے میں بتاؤں کہ وہ گائناکالوجسٹ ڈاکٹر ہیں اور انہوں نے اس وقت تک پریکٹس کی جب تک میں پیدا نہیں ہو گیا۔۔۔ میری پیدائش کے بعد انہوں نے کہا کہ بچے پالنے سے زیادہ مشکل کوئی کام نہیں ہے لہٰذا انہوں نے اپنی پریکٹس ختم کر دی۔"

"آپ جب کسی معروف شخصیت کا انٹرویو کر رہے ہوتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ میں اس کی جگہ ہوتا اور یہ میرا انٹرویو کر رہا ہوتا؟"

"جہاں تک سیاست کی بات ہے تو کبھی دل کرتا ہے کہ ہم بھی سیاست میں جائیں لیکن میں ان اینکرز یا جرنلسٹ کی طرح نہیں بننا چاہتا جو دن کے وقت تو سیاست کر رہے ہوں اور رات کے وقت اپنا شو کر رہے ہوں۔۔۔ اگر میں سیاست میں جانے کا فیصلہ کروں گا تو پھر صحافت کا دروازہ بند کر کے جاؤں گا۔"

"یہ تو خیر باتیں ہوتی ہی رہیں گی اس فیلڈ کی' یہ بتایئے کہ شادی کو کتنے سال ہو گئے آپ کی اور بچے آپ کے؟"

"2003ء میں میری شادی ہوئی۔ تقریباً" 14 سال ہو گئے ہیں۔ اور لو میرج تھی۔ 18 سال کی عمر میں عشق ہوا اور جب 19 سال کا ہوا تو منگنی ہو گئی میری۔۔۔ اصل میں میرے لیے گھر پر لڑکیوں کے فون بہت آیا کرتے تھے تو ایک دن والد صاحب نے مجھے پاس بٹھایا اور کہا کہ ہم تمہارے لیے آنے والی فون کالز سے بہت تنگ ہیں ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری کہیں منگنی کر دیتے ہیں۔۔۔ یا تو تم اپنی پسند بتا دو یا پھر ہمیں کچھ کرنے دو۔۔۔ تو پھر میں نے اپنی پسند کی لڑکی بتائی کہ آپ اسے دیکھ لیں اگر آپ کو پسند آ جائے تو رشتہ ڈال دیں ورنہ پھر جہاں آپ کا دل چاہے میری منگنی شادی کر دیں۔۔۔ انہوں نے جا کر اس لڑکی سے ملاقات کی اور گھر آ کر کہا کہ ہمیں اس سے اچھی لڑکی مل ہی نہیں سکتی۔"

"آپ کو اپنی ہونے والی بیگم اور والدین کو اس لڑکی میں کیا بات پسند آئی؟"

"ہم دونوں کو ایک ہی بات پسند آئی تھی اور وہ یہ کہ وہ ہر جگہ بہت جلدی اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیتی تھی۔ وہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی تھی اور دوسروں کو آسانی سے شیشے میں اتار لیتی تھی اور دلچسپ بات یہ کہ میرے والدین نے جب بیگم کے والدین سے ملاقات کی تو پتا چلا کہ دونوں ایک ہی محلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور بہت اچھی طرح ایک

دوسرے کو جانتے تھے۔ پھر تو انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔"

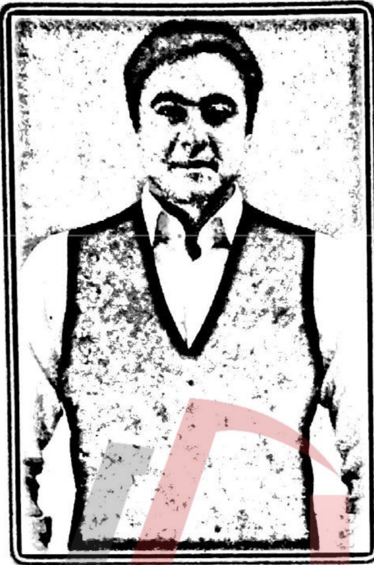
"آج آپ جن کامیابیوں پہ فخر کرتے ہیں اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

"کہتے ہیں نا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو میری کامیابی کے پیچھے دو عورتوں کا ہاتھ ہے' ایک میری بیگم کا اور دوسری میری ماں کا.... یہ دونوں خواتین اگر آج میری زندگی میں نہ ہوتیں تو شاید میں اتنا کامیاب بھی نہ ہوتا۔"

"آپ مختلف چینلز کا سفر کرتے ہوئے اب ایکسپریس نیوز سے وابستہ ہیں.... سیاست دان ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جائے تو کہتے ہیں کہ "وفاداری" بدلی ہے.... مگر جب ایک اینکر چینل بدلے تو کہتے ہیں کہ ترقی ہوئی ہے تو....؟"

"جی بالکل میں مختلف چینلز کا سفر کرتے ہوئے ایکسپریس نیوز میں آیا۔ سب سے پہلے میں "ڈان نیوز" گیا پھر "سی این بی سی" اس کے بعد جیو.... پھر چھ ماہ کے لیے بول میں گیا۔ وہاں سے پھر "اے آروائی" گیا اور "اے آروائی" سے اب "ایکسپریس" میں ہوں اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں جہاں بھی گیا میں نے ایک نیا رول ادا کیا.... ایسا نہیں تھا کہ ایک ہی جیسی جاب کے لیے میں نے جگہ بدل دی ہو اور جب آپ کو کوئی نیا کام مل رہا ہو تو یہ آپ کا حق ہے کہ آپ پرانا کام چھوڑ کر نیا کام شروع کر دیں....ڈان میں، میں بہ حیثیت رپورٹر کے گیا۔ پھر سی این بی سی میں بہ حیثیت پروڈیوسر کے کام کیا۔ جب جیو میں آیا تو پہلے اسپورٹس اینکر کے کام کیا پھر نیوز کاسٹر بنا۔ جب "بول" گیا تو وہاں میں نے پروگرام کرنے تھے' مگر پروگرام کبھی آن ایئر ہی نہیں ہوتے تھے۔ تو "اے آروائی" آیا' یہاں مجھے کام کرنے کا موقع ملا.... اور جب ایکسپریس میں آیا تو مجھے اسلام آباد سے پروگرام کرنے کا موقع ملا.... تو سب چینلز کے تجربے اپنے رنگ اپنے روپ تھے۔"

"کہاں زیادہ سیکھنے کا موقع ملا.... کہاں انجوائے کیا؟"



"میں نے جہاں جہاں بھی وقت گزارا ہے وہاں مجھے سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جیو کو میں نے چھ سال دیے اور 5 سال کے بعد مجھے لگنا شروع ہوا کہ سیکھنے کا پروسس ختم ہو گیا ہے.... اور ایک وقت میں تو مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ جیسے میں آنکھیں بند کر کے خبریں پڑھ سکتا ہوں اور جب مجھے یہ احساس ہو جائے کہ میرا لرننگ پروسس ختم ہو گیا ہے تو پھر میں اس جاب کو انجوائے کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ میں خطروں سے کھیلنے والا آدمی ہوں۔ میں کبھی اپنی زندگی سے بور نہیں ہو سکتا.... میں ہر طرح کی ڈائیونگ کر چکا ہوں۔ میں جمپنگ کر چکا ہوں۔ میں پہاڑوں پہ چڑھ چکا ہوں اور ان شاء اللہ عنقریب میں ایک اور چوٹی سر کرنے جا رہا ہوں.... تو بس مجھے بوریت پسند نہیں ہے' کچھ نہ کچھ کرتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"اس سے آگے اگر اچھی آفر آئی تو؟"

"جی آگے کچھ اچھا کرنے کو ملا تو.... ابھی کچھ ہی دن پہلے ایک چینل سے آفر آئی کہ ہم آپ کو اچھی پے

منٹ بھی دیں گے اور پرائم ٹائم یعنی 8 بجے کا ٹائم بھی دیں گے' آپ ہماری طرف آجائیں... تو میں نے انہیں کہا کہ مجھے پیسوں کے لیے کام نہیں کرنا... آپ نے اگر مجھے بلانا ہے تو نئے کام کے لیے بلائیں۔ یہ تو وہی کام ہے جو میں کر رہا ہوں۔ تو کیوں بلاوجہ چند اضافی پیسوں کی خاطر اس چینل کو چھوڑ دوں۔"

"ہمارے اکثر اینکر پروگرام کے دوران کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے مہمان بھڑک اٹھتے ہیں اور اینکر انجوائے کر رہا ہوتا ہے۔ تو آپ بھی...؟"

"میں اس اینکر کو اچھا اینکر نہیں سمجھتا کہ جس کے سامنے دو لوگ مختلف پارٹیوں کے لڑ رہے ہوں اور آپ چپ کر کے بیٹھے ہوں۔ اینکر کا مطلب ہے پورے پروگرام کو چلانے والا... اگر اس کی اپنے پروگرام پہ گرفت نہیں ہے اور پروگرام اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے تو میری نظر میں وہ ایک اچھا اینکر نہیں ہے۔ میرے پروگرام میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مہمان نے دوسرے مہمان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ میں نے منع کیا' انہوں نے دوبارہ کی اور جب تیسری بار کی تو میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب اگر آپ نے بدتمیزی کی تو میں آپ کو اٹھا کے باہر پھینک دوں گا... تو وہ "سکتے" میں چلے گئے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے... تو میں کہتا ہوں کہ آپ میرے پروگرام میں بحث کریں۔ اپنا نقطۂ نظر واضح کریں... مگر بدتمیزی کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ میرے پروگرام میں کوئی کسی کو "چور" نہیں کہہ سکتا' "لٹیرا" نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی "ڈاکو" کہہ سکتا ہے... اینکر کو اپنے اعصاب پر قابو ہونا چاہیے... مجھے یاد ہے کہ جب زلزلہ آ رہا تھا تو میں اسکرین پہ زلزلے کی لائیو کوریج کر رہا تھا اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ زلزلے میں انسان کی جان کو کتنا خطرہ ہوتا ہے۔ جیو کا سارا اسٹاف جو میرے ساتھ کام کر رہا تھا' بلڈنگ خالی کر کے جا چکا تھا اور مجھے بھی باہر آنے کو کہا گیا مگر میں نے کہا کہ میں تو پروگرام کروں گا۔ کیونکہ میں اس وقت ڈیوٹی کر رہا ہوں۔"

"آپ رہنماؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ لوگ صرف سیاست کر رہے ہیں یا اپنے ملک کے ساتھ مخلص بھی ہیں؟"

"ہمارے عوام میں اور ہمارے سیاست دانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جتنی زیادہ دوغلی ہماری عوام ہے' جتنے زیادہ دوغلے ہمارے اینکر ہیں' اتنے ہی زیادہ دوغلے ہماری سیاست دان ہیں۔ (بالکل درست' پھر احتساب تو ان سب کا ہونا چاہیے' صرف سیاست دانوں کا کیوں؟)"

"عمران خان کی سیاست کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اور نواز شریف کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"عمران خان کی سیاست کے بارے میں یہی کہوں گا کہ وہ دل کے بُرے نہیں ہیں... دل کے وہ نرم ہوں گے شاید... وہ کھلاڑی رہ چکے ہیں... کھلاڑی کا کھیل مختلف ہوتا ہے اور سیاست دان کی سیاست مختلف ہوتی ہے۔ لیکن عمران خان کبھی کبھار دونوں چیزوں کو مکس اپ کر کے آگے بڑھاتے ہیں۔ جبکہ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سیاست کے وقت سیاست کریں اور کھیل کے وقت کھیل... اس میں کامیابی ہے... میاں صاحب کا جو اسٹرانگ پوائنٹ ہے' وہ ان کا دھیما مزاج ہے۔ ان کے ٹھہراؤ کے اندر ہی ان کا طوفان چھپا ہے۔ ان پر الزامات لگتے ہیں اور جب عوام میں جا کر ان کے بارے میں پوچھو تو کہتے ہیں کہ ہاں' ہمیں ان کے بارے میں پتا ہے۔ ان میں ایک اچھی بات ہے کہ انہوں نے پاکستان کے لیے کام بھی کیا ہے اور یہاں آ کے بات ختم ہو جاتی ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ سڑکیں' پل اور میٹرو ترقی کا زینہ نہیں ہے؟"

"یہ فیصلہ تو عوام کو کرنا چاہیے... یہ چیزیں اگر ترقی کا زینہ نہیں ہیں تو ان کو ووٹ نہ دیں۔"

"ہمارے حکمران ملک کے اندر تو پروٹوکول لیتے ہیں۔ لیکن ملک سے باہر بھی لیتے ہیں... جیسے نواز

شریف صاحب نے ''مسجد نبوی'' میں جانے کے لیے بھی پروٹوکول لیا۔۔۔ کیوں؟''

''دیکھیں جی' پاکستان وہ ملک ہے جہاں 70 ہزار جانیں دہشت گردی کی نذر ہوگئی ہیں۔ پاکستان وہ ملک ہے جس کا صدر (ضیاء الحق) اور اور سابق وزیر اعظم (بے نظیر بھٹو) دہشت گردی کا نشانہ بنے اور جن کے قاتلوں کا آج تک پتا نہیں چلا۔۔۔ تو اگر انہیں اس صورت حال کے پیش نظر پروٹوکول مل گیا تو کوئی حرج نہیں ہے۔۔۔ ویسے ابھی کچھ ہی عرصہ قبل وزیر اعظم ترکی کے دورے پر گئے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا تو میں نے تو کوئی خاص پروٹوکول نہیں دیکھا تھا۔ جہاں سے انہیں گزرنا ہوتا تھا وہاں کے روڈ کو شاید دو منٹ پہلے بند کردیا جاتا تھا۔۔۔ اور جیسے ہی ان کی گاڑی گزر جاتی تھی' روڈ کو کھول دیا جاتا تھا۔۔۔ ہمارے یہاں یہ عادت ہے کہ اگر ساس بہو کی لڑائی بھی ہورہی ہوگی تو درمیان میں کہیں نہ کہیں نواز شریف کو ضرور لے آئیں گے۔''

''سیاست دانوں سے اور دیگر رہنماؤں سے قریبی تعلقات رکھتے ہیں یا دور دور رہتے ہیں؟''

''یہاں ہماری صورت حال کبھی کچھ یوں ہوتی ہے کہ جیسے سرکس دکھانے والا رسی پہ ایک ٹانگ پہ کھڑا ہوتا ہے۔ تعلقات بنا کر بھی رکھنے پڑتے ہیں اور یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ اتنے بھی تعلقات نہ بڑھیں کہ وہ یہ سوچیں کہ یہ تو میرا دوست ہے اگر میرے خلاف کوئی خبر آئے گی تو یہ نہیں چلائے گا۔ تو اس چیز کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔ اس کے لیے یہ مثال بہتر ہے کہ ''گھوڑا اگر گھاس کے ساتھ دوستی کرے گا تو پھر کھائے گا کیا''۔۔۔ میں جب ترکی کے دورے پر وزیر اعظم کے ساتھ گیا تو میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے صحافی سے کہا کہ آپ یہ بات نوٹ کرلیں کہ میرا وزیر اعظم کے ساتھ یہ پہلا اور آخری دورہ ہے تو انہوں نے کہا کہ ابھی تو جہاز نے ٹیک آف بھی نہیں کیا تو میں نے کہا کہ صحافیوں کو اس لیے ساتھ لے جایا جاتا ہے تاکہ وہ اچھا اچھا لکھیں اور یہ میری فطرت نہیں ہے۔۔۔



تو جس دن وزیر اعظم کے ساتھ ترکی میں ہمارا آخری دن تھا اسی دن خبر آئی کہ ''پاناما کیس'' کا فیصلہ محفوظ کرلیا گیا ہے۔ تو صحافیوں کے ساتھ ایک نشست تھی وزیر اعظم صاحب کی۔ سب صحافی مجھ سے سینئر تھے تو کہا گیا کہ پہلے سینئرز بات کرلیں پھر جونیئرز کریں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی ''پاناما کیس'' کے بارے میں آج کی خبر کے حوالے سے کوئی سوال کرے گا۔ مگر کسی نے نہیں کیا تو میں نے ہاتھ کھڑا کرکے سوال پوچھ ہی لیا کہ

''پاناما کا فیصلہ محفوظ ہوچکا ہے' آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں۔''

وہ میرا سوال سن کر حیران ہوئے اور کہا کہ میں جس کام کے لیے آیا ہوا ہوں' پہلے مجھے وہ کام کرنے دیں۔۔۔ اس پوری پریس کانفرنس میں میں نے ہی سوال کیا تھا تو سارے چینلز نے سوال اور پھر جواب سارا دن دہرایا۔۔۔ اور اب میرا نہیں خیال کہ وزیر اعظم صاحب اپنے کسی دورے میں مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ مگر مجھے خوشی ہے کہ میں نے جرأت کا مظاہرہ تو کیا۔''

"کوئی ایسی خبر جو میڈیا نے ملک کے مفاد کی خاطر نہ چلائی ہو؟"

"آج سے دو سال پہلے دس محرم الحرام کو راولپنڈی میں ایک جلوس جا رہا تھا... اور ایک مسجد سے اس جلوس پہ فائرنگ کی گئی' پھر وہ جلوس مسجد میں داخل ہوا اور مسجد کے امام اور دیگر لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا ... یہ خبر میڈیا نے جان بوجھ کے روک لی اور نہیں چلائی ... اس لیے کہ اگر خبر چلا دیتے تو اس وقت پورے پاکستان میں جلوس نکل رہے تھے۔ لوگوں نے اس خبر سے بے قابو ہو جانا تھا اور پھر "خون کی ہولی" شروع ہو جاتی... ہم تو عوام کے مفاد کی خاطر کئی خبریں چلاتے ہی نہیں ہیں... مگر پھر بھی قصور وار ہم ہی ٹھہرائے جاتے ہیں۔"

"باتیں بہت ہیں کرنے کو مگر وقت کی کمی ہے... کچھ لوگوں کے میں نام لوں گی' آپ کے ذہن میں ان کے بارے میں جو سوچ ہے وہ بتائیں؟"

"زرداری۔" "زرداری صاحب پیپلز پارٹی کی سب سے بڑی طاقت بھی ہیں اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔"

"بلاول بھٹو۔" "بلاول بھٹو زرداری ابھی سیاست میں زرداری کے قریب قریب بھی نہیں ہیں۔"

"نواز شریف۔" "نواز شریف کی سب سے بڑی طاقت گفتگو میں ٹھہراؤ ہے لیکن اس ٹھہراؤ میں ان کی ایک کمزوری بھی ہے کہ وہ ری ایکٹ کرنے میں کبھی کبھی بہت سلو ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے معاملہ زیادہ خراب ہو جاتا ہے... اور اب انہیں چاہیے کہ اپنی نئی پیڑھی (نئی جنریشن) کی طرف اپنی سیاست کو منتقل کریں اور ریٹائرمنٹ کے بارے میں سوچ لینا چاہیے۔"

"مریم نواز۔" "جیسا کہ آپ نے کہا کہ وہ اگلی وزیراعظم ہوں گی تو میرا نہیں خیال کہ ایسا ہو گا۔ ہاں البتہ وہ سیاست میں ضرور آئیں گی۔ ذہنی طور پر مریم نواز بہت برائیٹ ہیں۔ ن لیگ کو اگر ایک نیا چہرہ دیا سوشل میڈیا کے حوالے سے تو وہ مریم نواز نے دیا ہے ... سیاسی حوالے سے انہیں ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا ہے اور جس طرح بے نظیر بھٹو کو ان کے زمانے کے انکلز " (Uncles) نے تنگ کیا تھا' اس طرح مریم نواز کو بھی اس زمانے کے انکل تنگ کریں گے۔"

"عمران خان۔" "عمران کو جذبات پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے۔ اچھے سیاست دان کی سب سے بڑی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ جذباتی نہیں ہوتا... وہ لیڈر ہوتا ہے اور لوگوں کی نظریں اس کی طرف ہوتی ہیں کہ وہ ہمیں کیا دے رہا ہے... کرکٹ کا کپتان کبھی کبھار جذباتی ہو جائے تو کوئی بات نہیں لیکن سیاست کے کپتان کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔"

"شیخ رشید۔" "شیخ رشید سے بڑا کوئی عوامی سیاست دان پورے ملک میں نہیں ہے جو عوام سے ٹچ رہتے ہیں اور جو باتیں وہ کرتے ہیں' جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں وہ عوام کی زبان ہوتی ہے ان کے جذبات کی عکاس ہوتی ہے۔ اور یہ اپنے حلقے میں بہت مقبول ہیں۔"

"سب سے آسان پروگرام کون سا ہوتا ہے۔ آؤٹ ڈور کا' پینل ڈسکشن کا یا پھر سنگل انٹرویو کا؟"

"میرے خیال میں سب سے آسان پروگرام پینل ڈسکشن کا ہوتا ہے۔ آپ نے ایک سوال کرنا ہے اور ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے اپنے حساب سے جواب دینا ہوتا ہے۔ جو ون ٹو ون انٹرویو ہوتے ہیں وہ سب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ کو پوری معلومات کے ساتھ اس بندے کے سامنے بیٹھنا ہوتا ہے جس کا آپ انٹرویو کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بہت کم اینکر ایسے ہیں جو ون ٹو ون انٹرویو بہت اچھے انداز میں کرتے ہیں۔ ان میں ایک شاہ زیب خان زادہ ہیں اور دوسرے وسیم بادامی ہیں انہیں ہنر آتا ہے انٹرویو کرنے کا۔"

"انٹرویو کے شروع میں آپ نے کہا کہ آپ

ماڈلنگ بھی کر چکے ہیں تو اس کا کیا بیک گراؤنڈ ہے؟"

"میں ایک دن اپنے شوروم میں بیٹھا تھا کہ ایک صاحب آئے کچھ خریدنے کے لیے... پھر دو دن کے بعد ان کا فون آیا کہ آپ میرے لیے ماڈلنگ کریں۔ میں نے کہا کہ آپ کون ہیں میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں تو انہوں نے کہا کہ میں ایک فوٹوگرافر ہوں اور ہمارے پاس "کرتا شلوار" کی ایک شوٹ آئی ہوئی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ اس شوٹ کو کریں۔ میں نے انکار کیا مگر انہوں نے زبردستی شوٹ کروائی... اور جب وہ اخبار میں چھپا اور والد صاحب نے دیکھا تو کہا کہ یہ آپ کس کام میں شروع ہو گئے اس کے بعد سب نے کہا کہ آپ فلموں کی طرف جائیں مگر میں نے منع کر دیا کہ مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ویسے ڈرامے وغیرہ دیکھتے ہیں؟"

"نہیں جی... میں نے انٹرٹینمنٹ کے چینل کبھی نہیں دیکھے نہ کبھی رمضان ٹرانسمیشن دیکھی نہ کبھی مارننگ شو دیکھے۔ ٹاک شو، خبریں شوق سے دیکھتا ہوں۔ اخبارات اور میگزین پڑھنے کا شوق ہے۔"

"گھومنے پھرنے اور ہوٹلنگ کا شوق ہے؟ فیملی کو کتنا ٹائم دیتے ہیں؟"

"جی ہاں گھومنے پھرنے کا شوق ہے... عموماً" پیر کے دن میرا آف ہوتا ہے تو سارا وقت فیملی کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ وقت اپنی فیملی کو دوں۔ میرے ماشاء اللہ تین بیٹے ہیں... جب انہیں چھٹیاں ہوتی ہیں تو ہم ضرور شہر سے باہر یا ملک سے باہر جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے منصور علی خان صاحب سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا...



نمرہ احمد



تالیہ مراد ایک کرمنل، جھوٹی، چور اور دغاباز ہے جو اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ اسے صرف یہ یاد ہے کہ اسے ایک کشمیری خاندان نے ایک یتیم خانے سے لے کر اپنی لے پالک اولاد بنا لیا تھا مگر اس کی حیثیت ملازمہ کی سی تھی۔ انہوں نے اس کی شادی اسکائپ پر ایک ملائشین آدمی سے کر دی۔ مگر وہ آدمی فراڈ نکلتا ہے۔ اور تالیہ کو منی لانڈرنگ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

تالیہ صاحب کشف ہے اور اسے سچے خواب نظر آتے ہیں اسے اس فراڈ کا پتا چل جاتا ہے ایئرپورٹ پر تالیانہ جو خود بے سہارا ہے اس کی مدد کرتی ہے۔ دونوں اس فراڈی آدمی سے پیچھا چھڑا لیتی ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بن جاتی ہیں۔ تالیہ چیزیں چرا کر پہلے لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرتی ہے پھر ان کر پسند فون پر، مردانہ آواز میں حالم بن کر ان مسائل کو حل کرتی ہے۔ یہی اس کا روزگار ہے۔ سب حالم کو ایک اسکام انویسٹی گیٹر کے طور پر جانتے ہیں، مگر پہچانتے نہیں۔ تالیہ عارضی طور پر تنکو کامل کی ملازمہ ہے وہ بھولی بن کر اس کا اعتماد حاصل کر لیتی ہے۔ مولیا، حالم کا کلائنٹ اور تنکو کامل کے حریف کا ملازم ہے۔

تالیہ کو بار بار خواب میں ایک سکہ نظر آتا ہے جو مظفر شاہ کے زمانے کا ہے۔ تالیہ کو کئی بار اسے چرانے کا موقع ملتا ہے، مگر وہ اسے نہیں چراتی۔ داتن (لیانہ) چیزوں کی نقل بنانے کی ماہر ہے۔ سکے کی تاریخ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی ایک شخص کے پاس نہیں ٹھہرتا کسی نہ کسی وجہ سے گردش میں رہتا ہے اور جس کے پاس بھی ہوتا ہے وہ کسی موذی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تالیہ ایک جھوٹی کہانی سنا کر یتیم خانے کی آیا سے اگلوا لیتی ہے کہ وہ پراسرار چمک دار سکہ جو چابی کا ایک حصہ ہے





تالیہ کا ہی تھا۔ تالیہ کے قبضے سے نکلتے ہی وہ بجھ جاتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے اور تالیہ کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ اب وہ سکہ تنگو کامل کے پاس ہے۔

تالیہ اب اکثر پریشان کن خواب دیکھتی ہے۔ ایڈم' عبداللہ کی جگہ گیارہ دن کے لیے فاتح رامزل کا باڈی مین بنتا ہے۔ اشعر' عصرہ رامزل کا بھائی خود وزیراعظم بننا چاہتا ہے اور اس لیے فاتح اور عصرہ کے خلاف سازشیں بھی کرتا ہے اور ان کا دم بھی بھرتا ہے۔ فاتح اس کی ہر سازش سے باخبر ہے۔ ایڈم اپنے خدشات کا اظہار کرتا ہے تو فاتح کی ذہانت اسے اس کا گرویدہ کردیتی ہے۔ ایڈم فاتح کا بے لوث اور وفادار ملازم ہے۔
بریسلیٹ چرانے کا تالیہ اور داتن کا ہر منصوبہ ناکام ہوجاتا ہے۔ تالیہ سکہ چرانے کے لیے ایک امیر لڑکی کا روپ دھار کر عصرہ کی آرٹ گیلری میں پہنچتی ہے۔ جہاں اشعر کو وہ پسند آجاتی ہے۔

تیسری قسط

عصرہ نے ایک نظر اشعر کو دیکھا' اور دوسری نظر نیچے کھڑی لڑکی پہ ڈالی جو اب گردن ترچھی کرکے پینٹنگ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ پھر گہری سانس لی اور تحکم سے بولی۔ "اسے اوپر بلاؤ۔"
سیکرٹری نے جب تالیہ کے قریب آکر یہ پیغام دیا تو وہ چونکی' پھر گھوم کے اوپر دیکھا۔ دونوں بہن بھائی وہاں کھڑے تھے مگر بظاہر آپس میں بات چیت کررہے تھے۔ تالیہ اسی سنجیدگی سے سیکریٹری کے پیچھے چل دی۔ کان میں داتن کی محظوظ آواز گونجی۔
"تیر نشانے پہ لگ چکا ہے۔ عصرہ سے ہاتھ ملانا اور اس کے ہاتھ سے بریسلیٹ اتار لینا۔ ہائے مجھے وہ وقت یاد آگیا جب ہم غریب تھے اور کے ایل کے بازاروں میں عورتوں سے ٹکرا کے معذرت کرتے اور ان کے زیور اتار لیتے تھے۔ یہ بھی ویسے ایک آرٹ ہے تالیہ! اتنی احتیاط اور نزاکت سے کسی کے ہاتھ سے زیور اتارنا کہ اسے محسوس ہی نہ ہو۔ چوروں کی کوئی ایوارڈز کی تقاریب کیوں نہیں ہوتیں؟ میں آدھ درجن تو جیت ہی جاتی۔"
"تمہارے جیتنے سے پہلے چور آدھے ایوارڈز چرا کے ہی لے جاتے۔" کہہ کے بدقت اس نے ہنسی دبائی اور سنجیدہ چہرہ بنائے سیکریٹری کے پیچھے چلتی گئی۔
"یہ مس تالیہ مراد ہیں' میم۔" سیکرٹری نے اس کے قریب آنے پہ تعارف کروایا تو وہ دونوں بہن بھائی اس کی طرف گھومے۔ سامنے کھڑی سفید لمبا اسکرٹ اور سرخ منی کوٹ والی لڑکی کی خوب صورت آنکھوں میں خوشگوار حیرت در آئی تھی۔
"مسز عصرہ فاتح! آف کورس! یہ تو آپ کی گیلری ہے۔ مجھے خیال کیوں نہیں آیا کہ آپ سے بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔" وہ متاثر اور خوش سی آگے بڑھی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عصرہ مسکرائی۔ (اس نے تنگو کامل کی نوکرانی کو نہیں پہچانا تھا) اور اس کا ہاتھ تھاما۔
"میں نے فاتح رامزل کو ووٹ دیا تھا۔ باریسن نیشنل کو۔" وہ گرم جوشی مگر وقار سے عصرہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھامے بولی اور انگلیاں طلائی بریسلیٹ کی طرف بڑھائیں۔ جیسے ہی اس کے پوروں نے بریسلیٹ کی زنجیر کو چھوا' اسے کرنٹ سا لگا۔ زنجیر دہکنے لگی تھی۔ گرم' جیسے سونا ابل رہا ہو۔ ایک دم اس نے ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ عصرہ چونکی' مگر وہ فوراً" سے سنبھل گئی اور جبراً" مسکرائی۔
"فین مومنٹ۔ یو نو۔" رنگت ذرا پھیکی پڑی۔ ایک چور نظر اس کی کلائی پہ ڈالی۔ بریسلیٹ چمک رہا تھا۔ تیز روشن۔ مگر عصرہ اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔ نہ اسے تپش محسوس ہوئی تھی۔ اس کی نظر تالیہ کے کانوں سے لٹکتے

سرخ یاقوتوں پہ جم گئی تھیں۔ آنکھیں چمکیں۔
"مصباح کہہ رہی تھی آپ اس پینٹنگ میں انٹرسٹڈ ہیں۔" اشعر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
"جی بالکل۔" وہ انگلی سے سنہری بال پیچھے ہٹاتے ہوئے مسکرائی۔ "مجھے قدیم چینی پینٹرز کا کام بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔ میرے بیڈ روم میں صرف چینی آرٹ ورک ہے۔ پروسلین اور چینی پینٹنگز۔"
"مگر یہ پینٹنگ برائے فروخت نہیں ہے۔" عصرہ اسی اطمینان سے مسکرا کے بولی تو اشعر نے بے اختیار اسے دیکھا۔ نظروں میں تنبیہہ تھی مگر وہ تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔
"میں اس کو نیلامی میں رکھ رہی ہوں۔ آپ نیلامی میں آئیں اور دوسرے لوگوں کی طرح بولی لگائیں۔ اگر آپ کی قیمت اچھی ہوئی تو آپ اس کو جیت لیں گی۔" اشعر نے ضبط سے گہری سانس لی۔ اور دانت اس کے کان میں بولی۔
"چالاک بزنس وومن ہے یہ خاتون۔ معلوم ہو گیا کہ تمہیں پینٹنگ پسند آگئی ہے تو اب قیمت بڑھا رہی ہے۔ نیلامی والے دن یہ اپنا بندہ بٹھا دے گی جو بولی لگا لگا کے قیمت کو لاکھوں میں لے جائے گا اور تم دس گنا قیمت پہ خریدنے پہ مجبور ہو گی۔ خیر، بہسلیٹ چرالیا ہے تو نکل آؤ' کیونکہ باہر فاتح کی گاڑیوں کا قافلہ آرہا ہے۔"
"شیور.... میں آکشن میں خرید لوں گی اور مجھے معلوم ہے کہ میں اسے خرید لوں گی۔" وہ جبراً" مسکرا کے بولی تو عصرہ کھلے دل سے مسکرائی۔

"آپ سے مل کر اچھا لگا تالیہ! مصباح پلیز' ان کو انویٹیشن کارڈ لا کر دو' اور گیسٹ لسٹ میں ان کا نام ڈالو۔" پھر اشعر کو دیکھا اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تالیہ' یہ میرا بھائی ہے اشعر محمود۔ آپ یقیناً" ان کو جانتی ہوں گی۔" سوٹ' ٹائی' ہیئر موز سے ماتھے کے اوپر کھڑے بال' اور وجیہہ چہرے کی مسکراہٹ۔ تالیہ نے پہلے دفعہ چہرہ پھیر کے اشعر کو دیکھا۔ جبراً" مسکرائی اور سر کو خم دیا۔
"ان کو کون نہیں جانتا۔" اشعر جو پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا' اس بات پہ ہلکا سا ہنس دیا۔
"میں اس کو تعریف سمجھوں گا۔" پھر اسی محظوظ انداز میں اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "تو آپ کیا کرتی ہیں' تالیہ؟"
"میں مختلف کلبز کی ممبر ہوں' چند کارپوریٹ شیئرز کی مالک ہوں' پارٹیز' چیریٹیز۔ مصروف زندگی گزر رہی ہے۔" وہ کن اکھیوں سے دیکھ سکتی تھی کہ گیلری کا مرکزی دروازہ کھلا تھا اور چند افراد اندر داخل ہوئے تھے۔ سوٹ میں ملبوس باڈی گارڈز۔ اور ان کے درمیان مسکرا کے قدم اٹھاتا فاتح رامزل۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔
"ماشاء اللہ۔ امپریسیو۔" اشعر نے ستائشی انداز میں ابرو اٹھائے۔
"اور آپ کو آرٹ کلیکشن کا شوق بھی ہے۔" عصرہ نے ایک نظر نیچے ڈالی اور اسی بے نیازی سے واپس تالیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"بہت زیادہ۔"
"ویلس گڈ۔ پھر تو آپ کو آرٹ کی قدر ہو گی بہت۔ ان فیکٹ...." اس کی آواز میں دبا دبا سا جوش بھرا۔
"ہمارے پاس سیائم کی ایک پینٹنگ بطور عطیہ آئی ہے' اور میں اسے بھی نیلامی میں رکھ رہی ہوں۔"
"اچھا!" وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔ "کون سی پینٹنگ؟"
"گھائل غزال۔" تالیہ کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوئی۔ آنکھوں میں بے یقینی در آئی۔ "گھائل غزال؟"
"ہوں۔ تم دیکھنا چاہو گی؟" کہنے کے ساتھ اس نے سیکرٹری کو ایک اشارہ کیا' پھر اشعر کو دیکھا۔ "تم اپنے بہنوئی

کو اٹینڈ کرو اور ان کو بتاؤ کہ عرب مہمان جا چکے ہیں۔" وانت یہ وانت جما کے بولی اور سینے پہ بازو لپیٹے مڑ گئی۔ تالیہ فوراً "اس کے پیچھے لپکی۔ اشعر بدمزہ ہوا مگر گہری سانس لے کر مڑ گیا۔

"ایک منٹ... کیا اس نے کہا گھائل ہرن؟" کافی شاپ میں بیٹھی داتن کان میں لگا آلہ دباتے ہوئے چونک کے بولی۔ "مگر گھائل ہرن تو ہم نے اس عرب شہزادے کے جزیرے والے گھر سے چرائی تھی اور اس کی جگہ تمہاری بنائی گئی نقلی پینٹنگ رکھ دی تھی۔"

"ہوں۔" وہ دبی آواز میں بے چینی سے بولی اور عصرہ کے پیچھے چلتی گئی۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔

"تالیہ اصلی گھائل غزال تو ہمارے پاس ہے، پھر مسز عصرہ کو عرب مہمان نے نقلی پینٹنگ کیوں عطیہ کی؟" داتن حق دق تھی۔ "ڈیڑھ سال سے اس عرب شہزادے نے پینٹنگ کی چوری کی رپورٹ نہیں کی تھی کیونکہ وہ اس کے باپ کی تھی اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اصلی پینٹنگ چوری ہو چکی ہے، باپ کی وجہ سے چپ رہا۔ تو اب کیوں؟"

تالیہ خاموشی سے عصرہ کے ہمراہ آفس میں داخل ہوئی۔ دو سیکیورٹی افسران وہاں کھڑے تھے اور پینٹنگ کو پیک کر رہے تھے۔ عصرہ نے ان کو اشارہ کیا تو وہ اسے دوبارہ سے واپس نکال کے سامنے رکھنے لگے۔

"واؤ۔" تالیہ مصنوعی ستائش سے کہتی قریب آئی اور جھک کے غور سے اسے دیکھا۔ "یہ آپ کو عطیہ کی گئی ہے۔"

"ہاں۔ آپ کو سپائم کا کام پسند ہے؟"

"ریورس گلاس پینٹنگ میری پسندیدہ ہے مسز عصرہ۔" وہ اسی طرح جھکی کھڑی آنکھیں چھوٹی کر کے باریک بینی سے پینٹنگ کا جائزہ لے رہی تھی۔ کان میں داتن بولی۔ "یہ تمہاری والی ہے؟"

"ہوں!" تالیہ نے مثبت سا ہنکارا بھرا پھر سیدھی ہوئی۔ "آپ نے اس کو کسی ایکسپرٹ سے (تصدیق) کروایا؟"

"ہاں... ابھی کچھ دیر پہلے کروایا ہے۔ یہ اصلی ہے۔" عصرہ مسکرا کے زور دے کر بولی۔ تو تالیہ بھی مسکرا دی اور پھر سے اس پینٹنگ کو دیکھا۔

"تالیہ... کوئی مسز عصرہ کو اسکام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خیر یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔" داتن نے اپنی فکر کو خود ہی رد کر دیا۔ "تم بریسلٹ لے کر نکل آؤ بس۔"

"او کے۔ میں چلتی ہوں اب۔" وہ مسکرا کے مصافحہ کرنے آگے بڑھی تو دیکھا، اس کے ہاتھ کے قریب آتے ہی بریسلٹ کا سونا چمکنے لگا ہے۔ تالیہ کا دل بیٹھنے لگا۔ بس واجبی سا اس سے ہاتھ ملا کر واپس کھینچ لیا۔ چمک ماند پڑ گئی جیسے بریسلٹ ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔

"اچھا لگا آپ سے مل کر تالیہ۔ آکشن میں ملاقات ہو گی۔" عصرہ خوش نظر آتی تھی۔ وقار سے ایک ہاتھ بڑھا کے تالیہ کے کندھے کو دبایا تو وہ پھیکا سا مسکرا دی۔ تب ہی دروازہ کھلا تو تالیہ کا دل دھڑکا البتہ وہ مڑی نہیں۔

"میں لیٹ ہو گیا؟ چلے گئے وہ صاحب؟" وہ بے نیازی اور خوشگوار موڈ میں کہتا اندر داخل ہوا۔ گارڈز باہر ہی رک گئے تھے اور اس کے ساتھ صرف اشعر اندر آیا تھا۔ آتے ساتھ ہی اس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ "تو یہ ہے ان کا عطیہ۔" میز کے کنارے وہ رکا اور ایک بے نیاز سی نظر اس پینٹنگ پہ ڈالی۔ "کیا قصور تھا اس بے چارے جانور کا جو اس کو زخمی حالت میں پینٹ کرنا ضروری تھا؟" وہ افسوس سے چچ کر کے بولا تھا۔ عصرہ نے اسے

مغرور امگر جب بولی تو آواز کافی شائستہ تھی۔
"یہ ہماری نیلامی کی سب سے قیمتی پینٹنگ ہوگی۔"
"ایک تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لوگ ایک کینوس کے ٹکڑے پہ اتنا پیسہ کیوں لٹاتے ہیں؟ جبکہ کروڑوں انسان بھوک کا شکار ہیں' پڑھ نہیں سکتے' اچھے کپڑے نہیں پہن سکتے اور..." وہ بے رحمی سے پینٹنگ کو دیکھ کے تبصرہ کر رہا تھا۔ وہ ہنوز رخ موڑے کھڑی تھی۔
"اسی لیے بھائی' کاکا کی آکشن کا ایک بڑا حصہ چیریٹی میں جائے گا۔" اشعر نے نرمی سے اسے ٹوکا۔ فاتح نے ہنوز گردن جھکائے پینٹنگ کو دیکھتے شانے جھٹکے۔ "واقعی؟ دیٹس گڈ' عصو۔"
"فاتح! ان سے ملو۔ یہ تالیہ مراد ہیں۔" عصو نے تالیہ کو یوں گم سا کھڑا دیکھا تو کھنکھار کے فاتح کو متوجہ کیا۔ اس کے کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی اور پھر دائیں طرف دیکھا۔ وہاں سنہرے بالوں والی دراز قد لڑکی کھڑی تھی۔ سرخ منی کوٹ پہنے' سفید پاؤں تک آتے لباس والی تالیہ نے نظریں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہ ملی۔
اشعر فوراً" بولا۔ "تالیہ ایک معروف سوشلائیٹ ہیں۔ ایک وسیع وراثت کی مالک۔ مختلف چیریٹیز اور آرٹ آکشن میں حصہ لیتی ہیں۔ ہماری چیریٹی کی مستقبل کی ایک بڑی ڈونر بننے والی ہیں۔"
"اچھا۔" وہ تالیہ کو دیکھ کے سادگی سے مسکرایا۔ "سو آپ کیا کرتی ہیں تاشہ؟"
"تالیہ۔" عصو نے ہولے سے تصحیح کی مگر وہ متوجہ نہیں تھا۔ تالیہ نے بدقت لب کھولے۔
"میں ایک کمپنی میں شیئر ہولڈر ہوں' سلیپنگ پارٹنر' اور مختلف چیریٹیز میں ڈونیٹ کرتی رہتی ہوں۔"
"مگر یہ تو آپ کے ماں باپ کا پیسہ ہے نا۔ وراثتی دولت۔ اس کو خرچ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ خود کیا کرتی ہیں؟ آپ کے کیا ٹیلنٹ ہیں' کیا کامیابیاں ہیں؟" وہ اسی سنجیدگی سے بولا تھا۔ تالیہ کے سارے الفاظ ختم ہو گئے۔ گلا سوکھنے لگا۔

"میں... سوشلائزنگ اور..."
"مطلب تم کچھ نہیں کرتیں تاشہ؟ کچھ بھی نہیں؟" وہ متعجب ہوا تھا۔ وہ اتنا تیز بولتا تھا کہ سامنے والے کو جواب کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ "زندگی میں بڑے گولز' بڑے خواب' کچھ نہیں ہیں تمہارے؟ Too Bad انسان کو ایسے اپنی زندگی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔" عصو نے بے اختیار ماتھا چھوا مگر وہ اب اشعر کی طرف متوجہ تھا۔
"تم ایک کام کرو' میرے ساتھ آفس آؤ' میں..."
"میں چلتی ہوں۔" وہ کہہ کر جلدی سے مڑ گئی اور باہر نکل آئی۔
گیلری میں آ کر چند گہرے سانس لیے۔ رنگت بے رنگ پڑ رہی تھی۔ دل عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ بار بار کنپٹی کو چھوتی۔ کبھی گردن پہ ہاتھ رکھتی۔ فاتح کے ملازم گیلری میں گروہ کی صورت کھڑے تھے۔ وہ گیلری میں چلتی گئی۔ آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ کن انکھیوں سے اس نے دیکھا کہ ملازموں کے گروہ میں سے ایک شخص نے مڑ کے اسے دیکھا اور پھر اس کے پیچھے آیا۔ وہ پروا کیے بنا چلتی رہی۔
"بات سنیں۔" الجھی ہوئی آواز میں وہ اس کے پیچھے آ کر بولا تو وہ بادل نخواستہ رکی اور پلٹی۔ وہ کوٹ اور شرٹ میں ملبوس عام شکل و صورت کا ملے نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کے وہ چونکی۔ (یہ وہی ہے خواب والا۔ میں' فاتح اور یہ۔ ہم تینوں کے سر پہ ہما تھا۔) مگر ظاہر نہیں کیا اور رکھائی سے بولی۔
"آپ کون؟"

"میں... فاتح صاحب کا باڈی مین ہوں۔ اس دن ہم تنکو کامل کے گھر آئے تھے۔ اصل میں وہ میری جاب کا پہلا دن تھا، پہلا دن کوئی نہیں بھولتا۔ میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ ہے نا۔" وہ الجھن اور ذرا جوش سے کہہ رہا تھا۔ "آپ تنکو کامل کی ملازمہ ہیں نا؟"

تالیہ مراد اپنی جگہ بالکل سُن رہ گئی۔

"آپ کے بال دوسرے تھے اور حلیہ بھی، مگر آپ وہی ہیں، ہے نا؟ اس دن آپ نوکرانی کیوں بنی ہوئی تھیں؟"

اس کے انداز میں سادگی اور تعجب تھا۔

تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔



کوالالمپور سے چند گھنٹے کی مسافت پہ... ملاکہ شہر میں ایک قدیم چرچ واقع تھا۔ چرچ کے اندر دیواروں کے طاقچوں میں مختلف قبریں بنی تھیں۔ جن میں درازوں کی طرح تابوت داخل کیے جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک قبر کے اوپر پرانی بوسیدہ پلیٹ لگی تھی جس پہ ایک طویل نظم کھدی تھی۔ رسم الخط قدیم جوزی تھا اور اوپری اوپری چند الفاظ گھستے تھے۔

"تاشہ۔

جو شاہزادیوں جیسی تھی

اس نے ایک غلام سے شادی کی تھی

اور اس کو آزاد کر دیا..."

اگلے الفاظ گرد میں دب گئے تھے...

اس نے دیکھا۔

گھنا جنگل ہے، اونچے درخت جھاڑیاں، کہیں بلندی کہیں نشیب اور وہ دونوں بھاگتے چلے جا رہے تھے۔

تیز سانس لینے کی آوازیں، ہانپتے ہوئے بار بار گردن موڑ کے پیچھے دیکھنا اور اندھادھند دوڑنا۔

وہ خود کو واضح دیکھ سکتی تھی۔ الجھے بکھرے آدھے بندھے سنہرے بال، چہرے پہ مٹی اور زخموں کے نشان ڈھیلا ڈھالا سا لباس پہنے، وہ بھاگتی جا رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں تعاقب کر رہی تھیں۔

کوئی اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ وہ بھی بار بار گردن گھما کے تعاقب کرنے والوں کو دیکھتا تھا۔

پھر ایک دم وہ رک گئی۔ جھک کے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ وہ جو چند قدم آگے نکل گیا تھا، واپس مڑا۔

"چے تالیہ، رکیں گی تو ان کا شکار بن جائیں گی۔ دوڑیے۔" وہ اس کے کندھے کے پیچھے گھبراہٹ سے کچھ دیکھتا تھا۔

"نہیں۔" اس نے پھولتی سانسوں کے درمیان دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "اس کے پاس شکاری کتے ہیں۔ تالیہ نہیں بھاگے گی۔" وہ کہتے ہوئے دائیں طرف بڑھی۔ چند قدم اٹھائے۔ آوازیں قریب آ رہی تھیں۔

"چے تالیہ! آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"تالیہ اور ایڈم میں یہی فرق ہے۔ تم ایڈم شکار بن کے سوچتے ہو۔ میں شکار باز بن کے سوچتی ہوں۔" وہ ادھر ادھر جھاڑیوں میں ہاتھ مار رہی تھی۔ "اگر میں شکاری ہوتی تو تالیہ اور ایڈم کو کیسے ڈھونڈتی؟"

"کیسے؟"

"دو چیزیں... دو چیزیں ہوتی ہیں شکاری کتوں کے پاس جن سے وہ شکار کو پکڑتے ہیں۔" اس نے جھاڑیوں میں

کچھ تلاش کرتے انگلیوں کی وی بنا کے پیچھے دکھائی۔ ”ان کی رفتار اور سونگھنے کی حس۔“ وہ دھونکنی کی طرح چلتے تنفس کے درمیان رک رک کے کہہ رہی تھی۔ ”رفتار اتنی تیز ہوگی جتنا تیز مالک چل سکتا ہے“ اس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی ہوئی ہے۔ شکاری کتوں کو زنجیر کے بغیر کوئی نہیں جنگل میں لاتا اور اس کا مالک اتنا تیز نہیں ہے۔ کتوں کو ہم تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ ہمیں کتے سے زیادہ نہیں اس کے مالک سے زیادہ تیز بھاگنا ہے۔“

بھونکنے کی آوازیں ہر پل قریب ہو رہی ہیں۔

”اور دوسری چیز۔“

”اس کی حس شامہ۔“ اس نے دمے کے مریض کی طرح سینے پہ ہاتھ رکھ کر سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سونگھنے کی خوشبو۔“ پھر چند پتے توڑ کھینچے۔ ”کالی مرچ کا پودا اور وہ دیکھو۔“ بازو لمبا کر کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ شہتوت کا درخت‘ منککدو انڈین شہتوت ان کی خوشبو کتوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہ اس بو کا تعاقب نہیں کرتے۔ ان کو خود پہ مل لو ایڈم ہم شکاریوں سے اور کسی طرح سے نہیں بھاگ سکتے۔“

”یہ سب آپ کو کس نے بتایا‘ چے تالیہ؟“ وہ مبہوت کھڑا تھا۔ تالیہ نے زرد چہرہ اٹھا کے نقاہت سے اسے دیکھا۔

”کسی نے نہیں میں خود شکار باز ہوں‘ بے وقوف!“ وہ کہہ کے درخت کی طرف بڑھی تھی۔ کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں بلند ہو چکی تھیں۔ وہ قریب تھے بہت قریب۔



”آپ تنکو کامل کی ملازمہ ہیں نا؟“

تالیہ مراد اپنی جگہ بالکل سن کھڑی رہ گئی۔

”آپ کے بال فرق تھے اور حلیہ بھی‘ مگر آپ وہی ہیں‘ ہے نا؟ اس دن آپ نوکرانی کیوں بنی ہوئی تھیں؟“ اس کے انداز میں سادگی اور تعجب تھا۔ تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔ لمحے بھر کو وہ اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ شل‘ ساکت‘ پھر داتن کی آواز کان کے آگے سے چنگھاڑی۔

”یا اللہ۔ یہ کون ہے؟ اس نے کیسے پہچانا؟ تالیہ! بھاگو یہاں سے۔ میں کار گیلری کے دروازے تک لاتی ہوں۔“ مگر وہ لمحہ گزر گیا‘ ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی نے لب بھینچ لیے۔ بھنویں اکٹھی کیں‘ اور چار پانچ قدم قریب آئی‘ یہاں تک کہ وہ ایڈم کے عین مقابل آکھڑی ہوئی۔

”سوری‘ مجھے سنائی نہیں دیا۔ کیا کہا آپ نے؟“ ہر عادی جھوٹے کی طرح اس نے جواب سوچنے کے لیے وقت حاصل کیا۔

”میں... سوری۔ میں کہہ رہا تھا کہ اس دن فاتح صاحب کے ساتھ میں آپ کی طرف آیا تھا۔ آپ تنکو کامل کی ملازمہ ہیں نا۔“ وہ بلا کسی ڈر جھجک کے سادگی سے پوچھ گیا۔ عام سا چینی نقوش کا نوجوان اور اس کی سادگی‘ تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”کون ہو تم؟ دان فاتح کے ملازم؟“

”جی میں۔“

”ادھر آؤ تم!“ اس نے ایک دم چہرہ غصے سے لال بھبھوکا کر کے چٹکی بجا کے باڈی گارڈز کو اشارہ کیا جو عصر کے آفس کے سامنے کھڑے تھے۔ پولیٹیکل سیکریٹری نے اس طرف دیکھا تو چونک گیا۔ ایڈم کے سامنے کھڑی طرح دار امیر سی لڑکی غصے سے اسے بلا رہی تھی۔ وہ پریشانی سے اس طرف دوڑا۔

"کیا مسز فاتح اس طرح گیلری آئے مہمانوں کو بے عزت کرتی ہیں؟"
"سوری میم کیا ہوا؟"
"میں ابھی ابھی مسز عصو کی چیرٹی کے لیے ایک بڑی ڈونیشن کی کمٹمنٹ کرکے آئی ہوں اور باہر کھڑا یہ باڈی مین مجھے روک کر کہتا ہے کہ تمہاری شکل ایک بدصورت' غریب ملازمہ جیسی ہے۔یا اللہ۔یا اللہ۔" اس نے ہونٹ گول کرکے سانس باہر نکالی' اپنے ہاتھ سے چہرے پہ پنکھا جھلا جیسے ایک دم اس کا شوگر لو ہو رہا ہو۔
ایڈم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ششدر سا ہو کر اس نے سیکریٹری کو دیکھا۔ "نہیں' میں نے یہ نہیں کہا' میں تو کہہ رہا تھا کہ تنگو کامل..."
"یہ کیا چیز پال رکھی ہے مسز عصو نے؟ ہاں؟" وہ نزاکت بھرے غصے سے چلائی۔ "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تھی جو اس طرح میری توہین کی جارہی ہے؟" یہ رکھو کارڈ اور مسز عصو سے کہہ دینا کہ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔یا اللہ۔یا اللہ!" اس نے کلچ سے کارڈ نکال کے سیکریٹری کے منہ پہ پھینکا اور مڑ گئی۔باریک ہیل سے چلتی وہ راہداری میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ سیکریٹری گھبرا کے اس کے پیچھے دوڑا۔
"میم۔رکیں پلیز! آپ مت جائیں۔میں معذرت کرتا ہوں بلکہ ایڈم آپ سے خود معذرت کرے گا۔ میم سنیں تو۔"
مگر وہ ہاتھ جھلا کے' اس کو دفعان ہونے کا اشارہ کرکے تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگی۔ ابھی تک خود کو ہاتھ سے پنکھا جھل رہی تھی جیسے نازک اندام طبیعت پہ یہ سب بہت گراں گزرا ہو۔ سیکریٹری نے بے چارگی سے اسے جاتے دیکھا' پھر پلٹا اور کسی بھوکے شیر کی طرح ایڈم کی طرف آیا۔وہ اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔
"تم۔ تمہیں سمجھایا تھا میں نے کہ اپنی حد میں رہو۔"
"نہیں سر! میں نے اس کی شکل کا تو نہیں کہا۔یا اللہ' میں تو کہہ رہا تھا کہ اس دن وہ ان کی ملازمہ تھی' اور اب..."
"بکواس بند کرو!" سیکریٹری نے زور سے اس کو کندھے سے پکڑ کے پیچھے دھکا دیا تو ایڈم کا چہرہ سرخ ہوا' مگر اس نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔
"سر آپ زیادتی کررہے ہیں۔"
"تمہیں تو اب میں بتاؤں گا کہ زیادتی کے معنی کیا ہوتے ہیں۔" وہ آندھی طوفان کی طرح اندر لپکا۔
آفس میں وہ تینوں اسی طرح کھڑے تھے۔ عصو برہمی سے کچھ کہہ رہی تھی' اس کے یوں مخل ہونے پہ اس طرف متوجہ ہوئی۔
"میم۔وہ جو مس یہاں سے ابھی ابھی گئی ہیں' کارڈ واپس کرگئی ہیں۔بہت غصے میں تھیں۔"
"کیا؟" جہاں عصو کا دماغ بھک سے اڑ گیا' وہیں ایلش تیزی سے سیدھا ہوا۔
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
فاتح مرکزی کرسی پہ بیٹھا تھا' بنا کسی تاثر کے سیکریٹری کو دیکھے گیا۔
"ایڈم نے ان سے بدتمیزی کی۔ان کو روک کے ان پہ جملے کسے۔وہ اس توہین پہ برا مان کے چلی گئیں۔"
"ایڈم کون ہے؟" اشعر نے ناگواری سے ٹوکا۔
"عبداللہ کی جگہ جو نیا لڑکا آیا ہے۔جب سے آیا ہے باس کے ہر ملنے جلنے والے سے فرینک ہونے کی کوشش کررہا ہے۔اس کو مستقل نوکری چاہیے۔اس لیے شاید کانٹیکٹس بنانا چاہ رہا ہے' یقیناً" ان خاتون کو بھی یہی کہا

ہو گا پھر ان کے انکار پہ ان سے بدتمیزی کر بیٹھا۔"
"اف۔بلاؤ اس ایڈم کو۔" عصو غصے سے چنگھاڑی۔ "میں اس کے ساتھ اتنی مہمان رہی اور یہ میرے کلائنٹس کو بھگا رہا ہے؟"
"تم حوصلہ رکھو کاکا! میں دیکھتا ہوں۔ ارے تم بیٹھو میں ہوں نا۔" اشعر نے چہرے کو جلد ہموار کرلیا اور اسے تسلی دیتا باہر نکلا۔ سیکرٹری اس کے پیچھے لپکا۔ عصو نے بے بسی سے فاتح کو دیکھا تو اس نے ہلکے سے شانے اچکا دیے جیسے کہہ رہا ہو میں معاملے سے واقف ہی نہیں تو کیا کروں؟
باہر تمام گارڈز موجود تھے۔ ایڈم پریشان سا ان سے الگ کھڑا نظر آتا تھا۔ اشعر سپاٹ چہرے کے ساتھ چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
"تم نے مسز عصو کی مہمان سے بدتمیزی کی؟"
"نہیں سر! میں نے بدتمیزی نہیں کی۔ صرف یہ کہا تھا کہ میں نے ان کو تنگو کال کے کیے۔"
"ارے واہ! تم میں تو بہت ہمت ہے کیا اسی لہجے میں تم نے ہماری مہمان سے گفتگو کی تھی؟"
وہ اتنی تیزی سے پھنکارا کہ ایڈم کا سانس رک گیا۔ وہ پلک تک نہ جھپک سکا۔ سامنے کھڑا قیمتی سوٹ میں ملبوس ایک طاقت ور آدمی اس کو سلگتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایڈم کو پہلی دفعہ خوف محسوس ہوا۔
"کتنے دن رہ گئے ہیں تمہارے کام کو ختم ہونے میں؟"
"چھ دن سر!" سیکرٹری گردن آگے کر کے تیزی سے بولا۔
"کیا میں نے تم سے پوچھا ہے؟" اشعر نے ایک تیز نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ گڑبڑا کے پیچھے ہو گیا۔ پھر وہ واپس ایڈم کی طرف متوجہ ہوا۔
"تم ان خاتون سے اپنے رویے کی معافی مانگو گے' سنا تم نے۔ رملی!" اس نے تحکم سے اپنے چیف آف اسٹاف کو آواز دی۔
ادھیڑ عمر عینک والا رملی پیچھے ہی کھڑا تھا فوراً آگے آیا۔ "یس باس!"
"ان خاتون کا پتا معلوم کرو' پھر دعوت نامے اور اس بے وقوف کو لے کر ان کے گھر جاؤ۔ اور اگر یہ لڑکا معافی مانگنے سے انکار کرے تو اس کو گھر بھیج دو بغیر تنخواہ کے اور عبداللہ کو واپس بلا لو۔" مرمریں راہداری کی ساری یاسیت ایڈم محمد کی آنکھوں میں اتر آئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اشعر آگے بڑھ چکا تھا اور رملی اس کے ساتھ تھا۔ پیچھے اب اسے پولیٹیکل سیکرٹری کی کھری کھری سننی تھیں۔
"اس لڑکی کے بارے میں تمام معلومات لے کر آنا۔ بینک بیلنس کتنا ہے' شیئرز کن کمپنیز میں ہیں' اور سب سے بڑھ کے کوئی شوہر' منگیتر' دوست وغیرہ ہے یا سنگل ہے۔" اشعر راہداری میں سبک قدموں سے چلتا دبی آواز میں رملی کو ہدایات دے رہا تھا۔
"میں بخوبی سمجھ گیا باس!" وہ تیز تیز اس کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔



داتن گاڑی کا دروازہ کھولے گیلری کے باہر کھڑی تھی جب تالیہ باہر نکلی۔ ہوا سے اس کے سنہرے بال اڑنے لگے تو اس نے سفید ہیٹ سر پہ رکھ لیا۔ ماتھے پہ بل ویسے ہی تھے اور آنکھوں کی خفگی بڑھ چکی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پہ آبیٹھی تو داتن اسٹیئرنگ وہیل تھامے' دوسرے ہاتھ سے موبائل پہ بٹن دبا رہی تھی۔

"کیا کررہی ہو؟" اس نے کوفت سے اسے مخاطب کیا۔

"معلوم کرنے کی کوشش کررہی ہوں کہ ہم کس تھانے کی حدود میں موجود ہیں تاکہ جب یہ ہمیں گرفتار کروا کے وہاں بھیجیں تو مجھے پہلے سے پتا ہو کہ یہاں میرا کون کون جاننے والا ہے۔"

"کار چلاؤ' داتن۔ ہم نہیں پکڑے جارہے۔" تلخی سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا تو داتن نے سرہلا کے کار آگے بڑھادی۔

"تھانہ یہاں سے دس منٹ کے فاصلے پہ ہے' جب تک وہ پولیس کو بلائیں گے ہم روڈ کراس کرکے آگے نکل چکے ہوں گے۔"

"داتن! مطمئن رہو۔ ہم محفوظ ہیں۔"

"اور جب وہ ہمیں تھانے لے جائیں گے مین روڈ سے گرفتار کرکے تو تمہیں سب سے پہلے میرا پہلا اصول یاد آئے گا جب ہماری اداکاری کھل جائے تو تالیہ۔" (چیخ کر بولی) "وہاں سے فوراً بھاگتے ہیں!"

"تالیہ کے پاس ہمیشہ اگلا پلان ہوتا ہے' اور میرے کان میں مت چیخو' موٹی!" وہ دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ کے جواباً چلائی۔ داتن نے لب بھینچ کے اسے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ وہ ڈسٹرب نظر آتی تھی۔ داتن دھیمی پڑی۔ "یہ کون تھا اور اس نے تمہیں کیسے پہچانا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ کوالالمپور اتنا بڑا شہر ہے' یہاں ہزاروں بہروپیے روز بھیس بدل کے لوگوں سے ملتے ہیں' کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ میرا تو حلیے میں بھی فرق تھا۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا' پھر چونک کے چہرہ اٹھایا۔ "ضرور یہ کوئی خطرناک آدمی ہے۔ جو وان فاتح کے ساتھ جڑا ہے۔ کسی ایجنسی کا بندہ یا انٹرپول کا انڈر کور ایجنٹ۔۔۔"

"یہ وان فاتح کے باڈی مین کی جگہ گیارہ دن کے لیے آیا ہے۔ ڈیٹنگی اسکام کے وقت معلومات اکٹھے کرتے مجھے پتا چلا تھا مگر مجھے اتنا اہم نہیں لگا تو میں نے اس کی زیادہ جانچ پڑتال نہیں کی۔" داتن افسوس سے کہہ رہی تھی۔

"متبادل ملازم! اوہ۔" تالیہ چونکی۔ "سارے بہروپیے اور کرائے کے قاتل متبادل ملازم بن کے ہی آتے ہیں۔ اس کی پوری چھان بین کرو۔" پھر آنکھیں بند کرکے کنپٹیوں کو سہلایا۔ "مجھے کبھی کسی نے نہیں پہچانا۔ یا اللہ یہ مجھے کیسے پہچان گیا۔ مجھے اس کی اگلی پچھلی سات پشتوں کا حساب چاہیے۔" داتن نے برا منہ بنا کے بیک ویو مرر میں اسے دیکھا۔

"پچھلی سات نسلوں کا مل جائے گا۔ اگلی کے لیے خواب میں مستقبل نظر آنا ضروری ہے اور معذرت کے ساتھ' یہ کام مجھے نہیں آتے۔"

مگر وہ اب کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پریشانی سے بڑبڑا رہی تھی۔ "کوئی اتنی طرح دار امیر لڑکی کو یوں سرراہ مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ اس نے کیسے کرلی؟ کیا چیز تھا وہ؟"

"ویسے تمہارے چوری شدہ زیورات بھی کسی کام نہ آئے۔ اس نے پھر بھی تمہیں ملازمہ بنا ڈالا۔"

"تم تو چپ ہی کرجاؤ۔" وہ اسے دیکھ کر جل کے بولی۔ داتن آگے سے چمک کے کچھ کہہ رہی تھی مگر یکدم تالیہ کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے زور کا چکر آیا تھا۔

جنگل' وہ دونوں بھاگ رہے تھے۔ تعاقب کرتے کتے' شہتوت کا درخت۔۔۔

"تالیہ' تالیہ۔" داتن نے کار آہستہ کی اور زور سے اسے پکارا تو وہ چونکی۔ وہ گردن موڑ کے فکرمندی سے اسے

دیکھ رہی تھی۔ "کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں سر میں درد ہے۔" وہ رخ موڑ گئی مگر دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ کتوں کی آوازیں "کالی مرچ کی خوشبو۔

"میں اور ایڈم جنگل میں کیوں بھاگ رہے تھے؟ وہ مجھے جے تالیہ (مس تالیہ) بلا رہا تھا۔ یا اللہ اس سب کا کیا مطلب ہے؟" کہنی دروازے کے ہتھے پہ رکھے اس نے پیشانی ہتھیلی پہ گرا کے آنکھیں بند کر لیں۔

ایسا دھچکا پہلی بار لگا تھا۔ آخر کون تھا یہ ایڈم؟



پولیٹیکل سیکریٹری کی اچھی خاصی جھاڑ سن کے اب ایڈم گیلری کے باہر فاتح کی کار کے ساتھ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ڈرائیور اور دوسرے گارڈز بھی مستعد سے کھڑے تھے۔ (تمسخرانہ نگاہوں سے بار بار ایڈم کو دیکھتے بھی تھے) اسی اثنا میں فاتح باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ سیکریٹری سے کچھ کہتے ہوئے پارکنگ تک آیا تھا۔ عادتاً "مسکرا رہا تھا۔ بال ہوا کے باعث اُڑ کے ماتھے پہ بکھرنے لگے تو اس نے ہاتھ سے ان کو دائیں جانب پیچھے کیا اور کار کی طرف بڑھا۔ ایڈم کو کھڑے دیکھ کر حسب معمول اشارہ کیا کہ وہ آگے بیٹھے۔ سیکریٹری نے فوراً "مداخلت کی۔

"سر! اس کو میں گھر بھیج رہا ہوں۔ اس نے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے۔" وہ جو اندر بیٹھنے کے لیے جھکنے لگا تھا، چونک کے واپس سیدھا ہوا اور پہلے سیکریٹری پھر ایڈم کو دیکھا۔

"کیوں؟ کیا کیا ہے اس نے؟" ایڈم کی نظریں جھک گئیں۔ رنگت گلابی پڑی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا۔

"سر، جو خاتون مسز عصو کی مہمان تھیں نا، وہ heiress سوشلائیٹ "اس نے ان کو روک کے بدصورت کہا ہے۔ وہ کافی خفا ہو کے گئی ہیں۔"

دروازے پہ ہاتھ رکھے فاتح نے آنکھیں پُرسوچ انداز میں چھوٹی کر کے ایڈم کو دیکھا۔ "کیا وہ واقعی بدصورت تھی؟ مجھے تو نہیں لگی مگر خیر۔" اس نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔ "اس شہر میں اس جیسی بورنگ پریٹی ویمن بھری پڑی ہیں۔ بیٹھو۔" ابرو سے اشارہ کیا تو ایڈم کی آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی۔

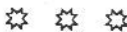
"میں بیٹھوں سر؟"

ادھر سیکریٹری کی رنگت خفت سے اُڑ سی گئی۔ جلدی سے بولا۔ "مسز عصو کافی خفا ہیں، سر! مجھے اس لڑکے کو ابھی گھر بھیجنا ہے تاکہ یہ اپنے رویّے کو..."

"مجھے فلو ہے، عثمان اور ایڈم کے پاس ٹشو ہیں۔ بیٹھو۔ میرے پاس تم لوگوں کی آفس پالیٹکس میں ضائع کرنے کے لیے مزید وقت نہیں۔" ٹھنڈی سی تپش سے کہا اور اندر بیٹھ گیا۔

ایڈم جو شل سا کھڑا تھا جھٹ سر ہلا کے بولا۔

"جی سر۔" اور فوراً "دروازہ بند کیا، پھر سیکریٹری سے نظر ملائے بغیر جلدی سے فرنٹ سیٹ پہ آبیٹھا۔ دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ کار زن سے آگے بڑھ گئی اور سیکریٹری تندو تیز نظروں سے اسے گھورتا رہ گیا۔ یہ لڑکا ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔



حالم کے بنگلے کی بالائی منزل پہ ایک ہال نما کمرہ تھا جس کی سڑک کو جو کرتی دیوار شیشے کی تھی۔ اس سے اندر

چھن کے آتی کرنوں نے سارا کمرہ روشن کر رکھا تھا۔ وہاں قطار سے چند ایکسر سائز مشینیں رکھی تھیں۔ ورزش کرتے ہوئے سامنے پھیلے بنگلوں کی قطار اور ان کے پار دور اوپر نیلا آسمان نظر آتا تھا۔
مگر وہ آسمان کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ بس ٹریڈ مل کے ہینڈ ریل پہ دونوں ہاتھ جمائے بیلٹ پہ کھڑے کھڑے بھاگ رہی تھی۔ ورزش کے رف کپڑوں میں ملبوس سنہری بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھے (جس سے گردن تلے گول جلنے کا سا نشان نظر آتا تھا) وہ پسینہ پسینہ کھڑی تھی۔ آنکھیں کھڑکی پہ جمی تھیں لیکن شاید دماغ کے اندر تک الجھی تھیں۔ ان میں بے بسی بھرا غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔
دفعتاً"اسے شیشے کی دیوار پہ عکس دکھائی دیا۔ داتن عقب میں کمرے کے اندر داخل ہوئی تھی۔ تالیہ نہ رکی نہ پلٹی اسی طرح ٹریڈ مل پہ بھاگتے ہوئے بولی۔ "معلوم کیا تم نے؟ کون ہے وہ ایڈم؟ کرایے کا قاتل؟ کوئی جاسوس بہروپیا؟"
"تالیہ۔" بھاری بھر کم داتن ہچکچاتے ہوئے قریب آئی۔ تالیہ نے بٹن دبایا اور ٹریڈ مل کی رفتار بڑھائی۔ قدموں تلے بھاگتی بیلٹ مزید روانی سے بھاگنے لگا۔ "وہ لڑکا ایڈم۔"
"میں کبھی گر فتنگ نہیں کرتی۔" وہ پھولے تنفس کے دوران خود سے بولے جا رہی تھی۔ (گر فتر وہ ٹھگ ہوتا ہے جو بھیس بدل بدل کے لوگوں سے مختلف اسکیموں کے نام پہ پیسے بٹورتا ہے۔) "میں کیٹ برگلر ہوں۔ رات کو دبے پاؤں پھلانگ کے آنے والا چور۔ ایسے کردار کرتی ہوں جو پس منظر میں رہتے ہیں۔ ویٹر تو کرانی بچوں کی آیا۔ مجھے کبھی کسی نے نہیں پہچانا۔ اس نے پہچانا تو کیسے؟" وہ غصے میں تھی۔
"سنو۔"
"وہ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔" وہ کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے دانت پہ دانت جمائے کہہ رہی تھی۔ "بہت ذہین بہت گہری نظر کا مالک تھا۔ اور اس کا وہ اعتماد جس سے اس نے مجھے پکارا۔ عام آدمی ایسا نہیں کرتا۔"
داتن آگے آئی اور ٹریڈ مل کا بٹن دبایا۔ مشین بند ہو گئی۔ بیلٹ رک گئی۔ وہ ذرا سا لڑکھڑائی، پھر غصے سے داتن کو دیکھا۔ "کیا؟"
داتن نے پہلے جوس کی بوتل اس کے سامنے رکھی پھر بولی۔ "تحمل سے سنو۔ وہ ایک معمولی گھرانے کا معمولی لڑکا ہے۔ بے روزگار ہے۔ فوج میں نوکری ملی تھی مگر جلد ہی دمے کی شکایت کی وجہ سے واپس بھیج دیا گیا۔ تب سے اب تک ڈھنگ کی نوکری نہیں کر سکا۔ باپ ایک کپڑوں کے اسٹور پہ سیلز مین ہے۔ منگنی ہو چکی ہے اور جلد شادی ہونے والی ہے۔"
"ہاہ ہاہ بالکل۔ پرفیکٹ کور اسٹوری۔" اس نے بوتل منہ سے لگائی، چند گھونٹ غٹاغٹ بھرے پھر بوتل نیچے کی اور سرخ تمتماتے چہرے کے ساتھ داتن کو دیکھا۔ "مگر اصل میں کون ہے وہ، یہ بتاؤ؟"
"وہ یہی ہے تالیہ۔ ایک سادہ سچا ایماندار لڑکا۔"
"جیسے تنکو کامل کی ملازمہ تالیہ تھی؟ ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا اور ٹریڈ مل سے اتر آئی۔ "کوئی سچا ایماندار نہیں ہوتا یہاں داتن! سب کی سیاہ داستانیں ہوتی ہیں۔ یہ جو تم بتا رہی ہو یہ تو اس ایڈم نے اپنی فائل میں لکھا ہوگا نا۔ مگر وہ اصل میں کون ہے؟"
"وہ یہی ہے تالیہ! اس کے محلے میں میرا ایک کانٹیکٹ رہتا ہے۔ وہ چھبیس برس سے اس کو جانتا ہے۔ سارا محلہ اس کے خاندان کو جانتا ہے۔ وہ نیک شریف لوگ ہیں۔ وہ کوئی جاسوس، کوئی کرایے کا قاتل نہیں ہے۔ وہ سادہ اور سچا مشہور ہے۔"

تالیہ ٹھہر گئی۔ چہرے پہ شل ہو جانے کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بے یقینی تھی۔ "سچے لوگ نہیں ہوتے دنیا میں۔ جو ہوتے ہیں وہ زیادہ دیر تک ٹھہرتے نہیں۔"

"دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک سانچے سے کوئی دو لوگ نہیں بنائے اللہ نے۔"

وہ تولیے سے گردن تھپتھپانے لگی۔ الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ باہر شام کی کرنیں اب ڈوبنے لگی تھیں۔

"مگر وہ اتنا ہی ذہین تھا تو ابھی تک زندگی میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکا؟"

"کیونکہ ہر شخص کو اپنی ذہانت کا علم نہیں ہوتا تالیہ! ذہانت الگ چیز ہوتی ہے ذہانت کا اعتماد الگ۔" داتن سبھاؤ سے اس کو سمجھا رہی تھی۔

"یا شاید وہ شکار کی طرح سوچتا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

داتن ٹھیک سے سن نہ پائی اور پوچھنے لگی۔

"تم نے بریسلیٹ کیوں نہیں چرایا؟"

تالیہ پلٹ گئی اور دیوار گیر روشن کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگی۔ دور اوپر جامنی پڑتا نظر آ رہا تھا۔ اپنی آغوش میں بہت سے انسانوں کے راز دبا کے بھی وہ شام کے اس پہر پر سکون لگتا تھا۔

"جس کی مجھے تلاش ہے داتن! شاید اس کو بھی میری تلاش ہے۔ مگر وہ چوری نہیں کیا جا سکتا۔ اس سکے یا اس بریسلیٹ کو بھی کسی نے چوری نہیں کیا۔ ہمیشہ بیچا یا تحفے میں دیا۔ میں نے اسے چھونا چاہا تو وہ دہکنے لگا۔ میں اس کو ایسے نہیں چرا سکتی۔"

داتن کی نظریں بے اختیار اس کی گردن کے نشان پہ ٹھہر گئیں۔ (کیا مجھے تالیہ کو بتا دینا چاہیے؟ اونہوں) اس نے سر جھٹکا۔

"فکر نہ کرو۔ میرے پاس پلان ہے۔ میں اپنی چابی واپس لے کر ہی رہوں گی۔" وہ عزم سے سلگتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تالیہ۔ شاید ہمیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ شاید یہ واقعی کوئی ملعون شے ہو اور..."

وہ تیزی سے گھومی اور غصے سے داتن کو دیکھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے داتن؟ میرے پاس کیا ہے زندگی میں؟" وہ ایک دم ایسے پھٹ پڑی تھی کہ لیانہ صابری ہکا بکا رہ گئی۔ "تمہیں لگتا ہے جو میں ہنستی ہوں، مذاق کرتی ہوں، یہ سب سچ ہے؟ یہ جو میں کہتی ہوں کہ مجھے کبھی فلاں سلیبریٹی پہ کرش ہے تو کبھی وان فاتح پسند ہے، یہ سب میرے دل کی باتیں ہیں؟ نہیں داتن۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں جھوٹ بولتی ہوں۔ خود کو خوش رکھنے کے لیے بہانا کرتی ہوں۔ ورنہ میری زندگی خالی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کے دکھائے جن میں ہوا کے سوا کچھ نہ تھا۔

"میرے پاس کوئی رشتے نہیں ہیں۔ کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اور وان فاتح کہتا ہے کہ تمہاری کامیابیاں کیا ہیں؟ تمہارا ٹیلنٹ کیا ہے؟ کہاں تھے اس وقت یہ تمام ممبر پارلیمنٹ جب میرے شوہر نے میرے ذریعے منی لانڈرنگ کروانی چاہی تھی۔ کہاں تھے یہ قانون کے ادارے جب میں اور تم ملائیشیا کی سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے تھے اور ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم نے اذیت کاٹی ہے، بھوک اور مفلسی کاٹی ہے۔ اور اب میری زندگی میں ایک ہی خواب بچا ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "چھوٹا سا جزیرہ ہو اور وہ میرا ہو۔ اس کے اوپر ایک پہاڑ کی چوٹی پہ ایک قلعہ ہو، اور میں وہاں حکومت کروں۔ جزیرے کے لوگ مجھے چور نہ سمجھیں، وہ میری عزت کریں۔ ہاں وہاں میں سچی ایماندار بن کے رہ سکتی ہوں۔ مگر اس شہر میں شاید کبھی

نہیں۔ مجھے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں، ساری دولت ان امیر لوگوں سے حاصل کرنی ہے داتن۔ میں غریبوں کا مال کبھی نہیں چراتی، صرف ان امیر لوگوں سے لیتی ہوں جو پیسے کو مس نہیں کرتے۔ میں لوگوں کے دل نہیں دکھاتی' اور وہ کہتا ہے، تمہاری کامیابیاں کیا ہیں؟"

آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور بولتے بولتے اس کی ہچکی بندھ گئی تو وہ وہیں کھڑکی کے ساتھ فرش پہ بیٹھتی چلی گئی۔ ایسے ہی اکڑوں حالت میں' اور ٹھوڑی گھٹنوں پہ رکھ دی۔ آنسو ہنوز گر رہے تھے۔

"تم اتنی دکھی ہو تالیہ؟" داتن دھیرے سے اس کے سامنے ہوم جم مشین کی سیٹ پہ بیٹھی اور ملال سے اس کا چہرہ تکا۔

"میں اندر سے خالی ہوں لیانہ! میری زندگی کا کوئی مقصد' کوئی عزم کچھ نہیں ہے۔ شاید وہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں کچھ نہیں کرتی۔ میری کوئی کامیابیاں نہیں ہیں۔"

اس نے ہتھیلیوں سے آنسو رگڑے اور رندھی آواز میں بولی۔ پھر گردن موڑی تو دیکھا' کالونی کی سڑک پہ ایک عورت واکر کو دھکیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ واکر میں کوئی بچہ تھا جس کے اوپر وہ چھاتا تانے ہوئے تھی۔

"مجھے نہیں جاننا میرے ماں باپ کون تھے۔ مجھے صرف یہ بات دکھ دیتی ہے کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑا؟ کیا کوئی ایسے اپنے بچے کو چھوڑ کے بھول جاتا ہے۔" اس کی آزردہ آنکھیں سڑک پہ چلتی عورت پہ جمی تھیں۔ "یہ لوگ خوش قسمت ہیں۔ ان کے پاس کوئی گھر ہے جہاں پہ کوئی ان کا انتظار کرتا ہے۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ داتن اگر میں اس اونچے محل میں مر بھی جاؤں تو کتنے دن ہمسائیوں کو بھی خبر نہیں ہو گی۔"

داتن کی آنکھیں نم ہوئیں۔ "اور میں تالیہ؟"

تالیہ نے گردن موڑ کے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "ایک تم ہی ہو مگر لوگ کہتے ہیں خون کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں۔ دوستی کا رشتہ کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے خوف آتا ہے کہ تم بھی مجھے چھوڑ کے چلی جاؤ گی۔ اگر میرے ماں باپ مجھے چھوڑ سکتے ہیں تو مجھے کوئی بھی چھوڑ سکتا ہے۔ اس لیے میں ڈھیر ساری دولت حاصل کرنا چاہتی ہوں داتن۔ وہ کم از کم میرے ساتھ تو رہے گی۔ سونا اور ہیرے دھوکا نہیں دیتے۔ بس ایک آخری واردات۔" اس نے سختی سے سیاہ آنکھیں رگڑیں جو اندر سے گلابی پڑ گئی تھیں۔ داتن نے ٹوٹے دل کے ساتھ گہری سانس لی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھی۔

"میرے تمہارے جیسے کبھی نہیں نیک ہو سکتے تالیہ! ہم کبھی سچے اور ایمان دار نہیں ہو سکتے۔" اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ پلٹی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ تالیہ نے چہرہ گھٹنوں میں دے دیا۔ آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔

داتن باہر سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے سیاہ چہرے پہ پھسل رہے تھے۔ شام دھیرے دھیرے تاریک ہوتی گئی۔



کیپونگ کا علاقہ رات کو اتنا روشن نہیں تھا جتنے امراء کے علاقے ہوتے تھے۔ یہاں لوگ وقت پہ سو جاتے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف قطار میں چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ گھر بنے تھے جن کی مخروطی چھتیں تھیں۔ ایڈم جس وقت چھوٹا لکڑی کا گیٹ کھول کے' کوٹ کندھے پہ لادے اندر داخل ہوا' گھر کا برآمدہ روشن تھا۔ مگر اس کے چہرے کی جوت بجھی ہوئی تھی۔ وہ وہیں برآمدے کے زینے پہ بیٹھ گیا۔ قریب میں مرغیوں کا ڈربا تھا جس کے

اندر پروں تلے چوزے دبائے بیٹھی مرغی نے ہلکی سی کٹاک کی ہیجیسے چونکی ہو۔
جالی دار دروازے کے کھلنے کی آواز آئی تو ایڈم نے گردن موڑی۔ اس کی ماں وہاں کھڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسکارف سر پہ لپیٹے لمبی قمیص اور کرتنگ (اسکرٹ کی طرح) پہنے وہ جیسے اس کو دیکھ کے فکر مند ہو گئی تھی۔
"تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر آجاؤ۔"
"میں اتنا بے وقوف کیوں ہوں' ایبو (ماں)۔" وہ تھوڑی گھٹنوں پہ گرائے سامنے دیکھتے ہوئے اداسی سے بولا تھا۔ ماں نے گہری سانس لی اور چند قدم چل کے قریب آئی۔ ایڈم نے چہرہ موڑ کے اس کے جوتوں کو دیکھا جو اس کے ساتھ آر کے تھے۔ ان سے نکلتے پیروں پہ ادھیڑ عمری کتنی لکیریں پڑی تھیں۔
"کیا ہوا ہے؟" وہ ڈھارس بندھانے والے انداز میں پوچھتی اس کے ساتھ نیچے بیٹھی۔
"میں نے آج کتنی بڑی بے وقوفی کی' سوچ بھی نہیں سکتیں ایبو۔"
"سوچ سکتی ہوں۔ تم بتاؤ۔" وہ گردن موڑ کے سکون سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"مجھے شرم آئے گی۔" وہ خفت زدہ لگتا تھا۔
"سچ بولنے والوں کو اگر سچ پہ شرم آنے لگے تو جھوٹ بولنے والے جھوٹ کہتے وقت گردن اکڑا لیا کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے' میرا بیٹا جھوٹ نہیں بولے گا۔" ایڈم نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ "تم میرا یقین کرو گی۔"
"کیا پہلے کبھی نہیں کیا؟"
"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی یا شاید غلط سمجھی تھی۔" وہ روہانسا ہو گیا تھا۔
"کون؟"
"وہ لڑکی۔ وہ گیلری میں آئی تھی۔" وہ ڈھکن کھول کے انڈیلی جانے والی بوتل کی طرح روانی سے بتاتا گیا۔ "پہلی نظر میں مجھے لگا میں نے اسے دیکھا ہے۔ پھر یاد آیا' جاب کے پہلے دن جس گھر میں ہم گئے تھے وہ ادھر کام کر رہی تھی۔ تب اس نے ملازمہ والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آج وہ بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ یہ اتنے سارے زیور پہنے' بال چمکیلے کیے۔ مگر مجھے وہ وہی لگی تھی۔ میں نے صرف اسے روک کے پوچھا کہ اس دن ملازمہ کیوں بنی ہوئی تھی' اور اس نے سب کو اکٹھا کر لیا کہ یہ مجھے بدصورت کہہ رہا ہے۔ کسی نے میرا یقین نہیں کیا۔ باس نے کہا ہے کہ اب مجھے اس سے معافی مانگنی ہو گی۔"
"ہو سکتا ہے' یہ غلط فہمی ہو۔"
"ہاں واقعی' یہ میری غلط فہمی ہو گی' اتنی بھی اس کی اس ملازمہ سے شکل نہیں ملتی تھی' ہو سکتا ہے وہ واقعی کوئی اور ہو اور۔"
"تمہاری نہیں' اس کی غلط فہمی ہو کہ تم اس سے کچھ اور پوچھ رہے ہو۔" ماں نے زور دے کر بولی تو وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔
"کیا ایڈم کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی؟"
"ہو سکتی ہے' لیکن ہوئی نہیں ہے۔ ایڈم! اگر تمہیں لگتا ہے کہ وہ وہی لڑکی تھی تو وہ وہی ہو گی۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ جانتی ہوں کہ تم ذرا سادہ ہو' چالاک نہیں ہو' سچے اور ذہین ہو۔ لیکن ایک چیز' تمہاری نظریں' وہ ہمیشہ سے بہت گہری تھیں۔ گھر میں کوئی چیز کھوتی تو میں تم سے کہتی' تم منٹ میں ڈھونڈ لیتے۔ بازار سے سودا لانا ہوتا تو

تمہیں بھیجتی۔ تم ایک نظر میں ساری دکان دیکھ لیتے کہ کچھ اور بھی تو کم نہیں ہے گھر میں!"
"واقعی؟ میری نظر اچھی ہے نا۔" وہ خود بھی حیران رہ گیا۔
"ہاں ایڈم! تمہاری نظر جھوٹ نہیں بولتی' کیونکہ تمہارا دل جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر تم کبھی جھوٹ بول بھی لیتے تھے تو چند گھنٹوں میں ہی سارا سچ میرے سامنے کھول دیتے تھے۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں ایڈم۔ ایک وہ جو سچے ہوتے ہیں' اور ایک وہ جو جھوٹے ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم خود بھی سچے تھے اور وہ ہم سے یہ چاہتے تھے کہ ہم بھی سچے بنیں۔ کیونکہ بیٹے' جب انسان دوسروں سے سچ بولتا ہے تو اس کے اعضاء اس سے سچ بولنے لگتے ہیں۔ اس کا دل اس کو غلطی کا احساس دلاتا ہے اور نظریں اس کو کسی جھوٹ کا شکار نہیں بننے دیتیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ لڑکی کون ہے اور اس کا کیا معاملہ ہے' لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہاری نظر تمہیں دھوکا نہیں دے گی۔"
وہ ماں کی باتوں پہ بالکل گم صم سا ہو گیا۔ ذہن کے جالے صاف ہوئے تو دل الجھنوں میں گھر گیا۔ وہ جو خود کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں ایک لڑکی کو ملازمہ سے ملایا' اب پھر سے چونک گیا تھا۔
"تم نے اسے اس لیے روکا کیونکہ تمہارے دل نے کچھ غلط ہوتے دیکھا۔ ایک انسان کو دوسرے روپ میں دیکھا تو دل کو لگا یہ غلط ہے اور تم نے سادگی سے اپنی الجھن بیان کردی۔ یہی ہوا ہوگا' ہے نا؟ تم اس سے معافی مانگ لینا اور بات ختم کردینا' کیونکہ تمہیں کیا معلوم کس کی کیا مجبوریاں ہیں۔ تم بس اپنے کام پہ دھیان دو۔ خوب محنت کرو۔ بیٹا ہے۔" وہ ایک دم مسکرائی اور یاد کرکے بولی۔ "جب تم چھ سال کے تھے تو تمہارے پاپا کے بڑے تایا ہمارے گھر آئے تھے۔ وہ بڑے نیک اور اچھے انسان تھے۔ میں نے کہا' ایڈم کے لیے دعا کریں تو انہوں نے دعا مانگی کہ..."
"کھانا' کھانا دو ماں۔" وہ خجالت سے اس کی بات کاٹتا اٹھ کھڑا ہوا۔
"ایڈم!" ماں نے سر اٹھا کے افسوس بھری گہری سانس لی۔ "تمہیں تایا جان کی دعا پہ شرمندگی کیوں ہوتی ہے؟ اللہ سے جتنا زیادہ مانگو گے' وہ اتنا زیادہ ہی دے گا۔"
"ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ اب کھانا دو نا۔" وہ اسے اٹھاتے ہوئے پھر سے بات گول کر گیا۔ مبادا ماں وہ دعا دہرا ہی نہ دے۔ (اگر جو کسی نے سن لیا تو اف۔ اور اگر جو باس کے پولیٹیکل سیکریٹری نے سن لیا تو وہ کتنا ہنسے گا ایڈم پہ۔) اس نے جھرجھری لی۔ ڈربے میں بیٹھی مرغی نے پھر سے کٹاک کی تو دیوار سے جھانکتی بلی پیچھے ہو گئی۔ رات پھر سے پرسکون ہو گئی۔
ماں اب کچھ خفا سی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کے اندر کی طرف جا رہی تھی۔ "دعا پہ کیسی ندامت' ہاں؟"



رات کوالالمپور پہ اتری تو دیسا پارک کے اس اونچے محل کے لان میں لگے پھول مہک مہک اٹھے۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ اندر تک آنے لگی۔ وان فاتح گھر کے اندر داخل ہوا تو ہر سو سناٹا چھایا تھا۔ ملازموں کی چہل پہل تھم چکی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کوٹ اتارتے ہوئے دوسرے کی انگلیوں سے ماتھے پہ آئے بال پیچھے کیے اور کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ پھر کھلا دروازہ دیکھ کے وہ ٹھٹکا' بھنویں سکوڑیں۔ دروازہ پورا دھکیلا تو لبوں سے گہری سانس نکلی۔ عصرہ اس کے کمرے میں سامنے کرسی پہ بیٹھی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"تم سوئیں نہیں ابھی تک؟ یا آج تمہیں دیر تک کوئی کام نہیں کرنا؟" اس نے کوٹ دوسری کرسی پہ ڈالا۔ پھر بیڈ کے کنارے آبیٹھا اور شرٹ کے کف کھولنے لگا۔

"تم نے آج اس لڑکی کے ساتھ بہت برا کیا' فاتح! وہ ہماری کلائنٹ تھی۔ ڈونر تھی۔" وہ خفگی سے ایک دم بولی' تو وہ جو کف کا بٹن کھول رہا تھا' رک کے حیرت سے اسے دیکھا۔ آنکھوں میں الجھن بھر گئی۔

"کون سی لڑکی؟"

"جس کو تم نے میرے آفس میں یہ کہہ کر بے عزت کیا کہ وہ کچھ نہیں کرتی۔ اور اس کے آرٹ کے شوق کی توہین الگ کی۔"

فاتح چند لمحے اچھنبے سے اسے دیکھتا رہا' پھر یاد آیا۔ سنہرے بالوں اور بڑی آنکھوں والی لڑکی۔ "اچھا وہ... اس کو میں نے برا بھلا کہا تھا یا ایڈم نے؟" وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس کی غلطی کیا تھی۔ پھر یاد کیا۔

"ویسے میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا اس کو۔" اب وہ کندھے اچکائے جھک کے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔ "میں اگر یہ دیکھوں کہ میرے سامنے ایک ایسا انسان کھڑا ہے' جس کی زندگی میں کوئی بڑا مقصد نہیں ہے' وہ اپنی زندگی ضائع کر رہا ہے اور میں ظاہر کروں کہ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں' یہ تو غلط بات ہے۔"

"مگر وہ دنیا کو ایسے نہیں دیکھتی ہو گی جیسے تم دیکھتے ہو۔"

"نہ دیکھے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے بے نیازی سے کندھے دوبارہ اچکاتے جھکے جھکے دوسرا تسمہ کھولا۔

"فاتح! تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے کیریئر میں تمہیں سپورٹ کرتی رہوں لیکن تمہیں میرے فائدے نقصان سے فرق نہیں پڑتا۔" اس نے دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات آنکھوں میں بھرے اسے دیکھا۔ وہ بوٹ اتارتے ہوئے اسی سادگی سے بولا۔

"دیکھو عصرہ۔ میرے الفاظ ٹوئسٹ کر کے اگر تم آرگومنٹ جیتنا چاہتی ہو تو جیت لو۔ میں برا نہیں مانوں گا۔ لیکن ہم دونوں کو معلوم ہے کہ کوئی ایسا ایشو نہیں ہے' جس پہ تم اتنی توانائی ضائع کرو۔"

"میری مہمان اور ڈونر کو خفا کرنا کوئی ایشو نہیں ہے؟ واف کیا میں تمہارے مہمانوں کے ساتھ ایسے کرتی ہوں؟ کیا میں اچھی بیوی کی طرح پوز کر کے ان کی خاطر مدارت نہیں کرتی؟ ہاں؟"

"اب تمہارا آرگومنٹ کمزور پڑ رہا ہے۔" فاتح نے جرابیں اتارتے ہوئے افسوس سے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ "اگر تم اس بات پہ برا مناتیں کہ میں کسی لڑکی سے اچھے سے بات کر رہا ہوں تو میں اسے ایک جائز دلیل سمجھتا' لیکن برے سے بات کرنے پہ اتنا جھگڑا؟ چچ۔" آخر میں گویا ملال کر کے وہ اٹھا اور ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ بے اختیار اٹھی اور غصے بھری بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔

"تم کبھی نہیں سمجھتے کہ جو کنکر تم دریا میں پھینک دیتے ہو' ان کے دائرے کتنی دور تک پھیل کے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ چاہے وہ میں ہوں۔ میرا کاروبار ہو' تمہارا کیریئر ہو۔ یا۔" اس کی آنکھیں گیلی ہوئیں۔ "یا۔ آریانہ ہو۔"

وہ جو الماری کھولے کھڑا ہینگرز الٹ پلٹ کر رہا تھا' اس بات پہ ایک دم ٹھہر گیا۔ پھر آہستہ سے واپس پلٹا تو اس کے چہرے میں کچھ بدلا ہوا سا نظر آتا تھا۔ جیسے کوئی زخمی پن سا ہو آنکھوں میں۔ کسی بجھی راکھ کی پرچھائیں ہو۔

"تم آریانہ کو درمیان میں لائے بغیر بھی بحث جیت سکتی ہو عصرہ۔" جیسے کوئی اداس ماتم سا ہو آواز میں۔

"میں تم سے جیتنا نہیں چاہتی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں فاتح کہ تم اپنی ایروگنس (خود پسندی) کے خول سے باہر نکل کے دیکھو کہ تمہاری وجہ سے ہم سب کیا کچھ نہیں سہہ چکے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ مٹھیاں بھینچ کر درد سے چلا رہی تھی۔ "تم نے اپنے جنون کے ہاتھوں ہم سب کو تباہ کر دیا ہے۔ آریانہ کو کھونا تمہاری غلطی تھی۔ میری بیٹی تمہاری وجہ سے مجھ سے دور ہوئی ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ اپنے بچے کو کھونا ایک ماں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

وہ خاموش کھڑا رہا۔ بیٹلریہ للی شرٹ بازوؤں میں تہہ کیے زخمی آنکھوں سے اسے دیکھے گیا۔

"مگر تم نہیں سمجھتے۔ تم کبھی نہیں بدلتے۔ میں ایک بھڑکتے جہنم میں رہ رہی ہوں، مجھے باہر نکلنا ہے اس سے۔ وہ نیلامی میں اپنے بچوں کو تمہارے جنون کی آگ سے نکالنے کے لیے کر رہی ہوں اور تم اس کو نقصان پہنچانے سے بھی باز نہیں آتے۔ میں تمہاری بیوی ہونے کی قیمت آخر کب تک ادا کرتی رہوں گی؟"

"مجھے بھی آریانہ کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہے۔" وہ زخمی سا بولا تھا۔

"تمہیں دکھ ہے اس کا؟ تمہیں تو شاید وہ یاد بھی نہیں آتی، وان فاتح۔" وہ تنفر اور اذیت سے اسے دیکھ کے مڑی اور تیز تیز چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ فاتح نے آنکھیں بند کیں اور گہری سانس اندر کو کھینچی۔ پھر آنکھیں کھولیں اور ہینگر پرے رکھ دیا۔ جیب سے والٹ نکالا اور آگے آیا۔ والٹ لیے وہ اسی کرسی پہ بیٹھا جہاں عصو پہلے بیٹھی تھی۔ جگہ ابھی تک گرم تھی۔ شاید وہ بہت دیر سے اس کے انتظار کی آگ میں جل رہی تھی۔

اس نے والٹ کی ایک تہہ پلٹی تو سامنے فوٹو کے خانے میں ان دونوں کی تصویر لگی تھی۔ فاتح اور آریانہ۔ وہ دونوں اس میں ہنس رہے تھے۔ ننھی سی بچی جس نے ہیئر بینڈ لگا رکھا تھا اور جس کی آنکھیں ہیروں جیسی چمکتی ہوئی تھیں۔

"عصو یہ نہیں سمجھتی کہ اپنی بیٹی کو کھونا ایک باپ کے ساتھ کیا کرتا ہے۔" وہ تصویر پہ انگوٹھا پھیر کے ہلکا سا بڑبڑایا تھا۔ اذیت سی اذیت تھی جو دل میں اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔

باہر مہکتے گلابوں کی اداس خوشبو اب بھی سارے گھر سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔



حالم کے گھر میں اس رات کسی نے کوئی بتی نہیں جلائی۔ ایک سوگ سا تھا جس نے سارے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ داتن اندھیرے زینوں پہ بیٹھی سامنے خلا میں گھور رہی تھی۔ جب پیچھے آہٹ ہوئی۔ دروازہ چرچرایا۔ پھر ننگے قدم اٹھانے کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ یا شاید آواز اس نے تصور کی تھی کیونکہ کیٹ برگر بنا چاپ کے چلنے میں ماہر تھی۔ وہ اس کے پیچھے آرکی۔ داتن نہیں مڑی۔ یا سیت سے سامنے دیکھتی رہی۔

"تلیانہ!" تالیہ نے دھیرے سے پکارا۔ آواز سنبھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

"تم ہر چیز سیکھنا چاہتی تھیں۔" وہ اسی طرح سامنے دیکھتے ہوئے ٹوٹے دل سے بولی۔ "کیا تمہیں یاد ہے تالیہ؟"

تالیہ کچھ نہیں بولی۔ اس سے پیچھے ایک زینہ اوپر بیٹھ گئی اور اسے بولنے دیا۔

"جب ہم نے تمہارے شوہر کے پیسے واپس کر کے اس سے تمہارے لیے طلاق لی تھی تو تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اس شخص نے تمہیں دھوکا دینا سکھا دیا ہے اور اب تم اسی طرح پیسے بنانے کے نت نئے طریقے سیکھنا چاہتی ہو۔ اسکام اور چوری کے طریقے۔ ہم نے چھوٹے چھوٹے اسکام سے شروع کیا تھا۔ تم نے انٹرنیٹ پہ ایڈ ڈالا کہ اپنے سابقہ بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ یا میاں بیوی کا اکاؤنٹ ہیک کروانے کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔"

تالیہ جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی اس بات پہ بے اختیار ہنس دی۔ داتن نہیں ہنسی، بولتی گئی۔

"عشق اور جلن سے بڑے بڑے لوگ ہم سے رابطہ کرتے، ہم پیسے ایڈوانس مانگتے اور جب وہ پیسے دے دیتے تو ہم ان کی ای میلز کا جواب نہ دیتے۔ اب وہ پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتے تھے کہ کیا کہتے؟ کسی کا اکاؤنٹ ہیک کروانے جیسے غلط کام میں ملوث رہے ہیں؟ خود پکڑے جاتے سو دھوکے چپ ہو جاتے۔ تم کہتی تھیں کہ اگر لوگ پیسے کی حفاظت نہیں کر سکتے تو وہ اس پیسے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر جلد تم بور ہو گئیں۔"

اندھیری سیڑھیوں پہ وہ دونوں ہیولوں کی صورت بیٹھی نظر آتی تھیں۔ داتن کی آواز جیسے کسی پس منظر میں بیٹھے پیانو ساز کی مدھر لے جیسی سنائی دے رہی تھی۔

"ہم نے کرایے کا گھر لے لیا تھا' سر چھپانے کا ٹھکانا تھا' دو وقت کا کھانا مل جاتا تھا مگر تم ناخوش تھیں۔ تم کہتی تھیں' واتن۔۔۔ دھوکا دہی ایک آرٹ ہے اور آرٹ میں دھوکے کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح سے ہم لوٹ رہے ہیں اس میں لٹ جانے کے بعد لوگوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ یہ احساس میری ذہانت کی توہین ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے con games (فریب) کبھی پکڑے نہیں جاتے۔ پھر ہم نے چھوٹی چھوٹی چوریاں شروع کیں۔ سالز' بازاروں میں عورتوں سے ٹکرا کے ان کے زیور اتار لیتے۔ تمہاری انگلیاں اس کام میں ماہر تھیں' مگر تم تب بھی خوش نہیں تھیں۔ تم کہتی تھیں کہ میں جزیرے پہ وہ اونچا قلعہ توبنالوں گی کسی نہ کسی طرح' مگر اہانت کے ساتھ نہیں۔ تمہیں مزید صفائی سے کام کرنا تھا۔ تب تم نے فیصلہ کیا کہ تم آرٹ تھیف بنوگی۔ کیٹ برگلر (جو بلی کی طرح کہیں بھی گھس کے بنا آہٹ کے کچھ چرا لاتا ہے) تمہیں پینٹنگ کا شوق تھا مگر تم اسے کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر تم آرٹ اسکول گئیں۔ تم نے پینٹ کرنا سیکھا۔ تم نے مختلف فن سیکھے۔ تم نے گن چلانا سیکھا۔ لڑنا سیکھا۔ تم نے خود کو کسی ہتھیار کی طرح تراشا۔"

تالیہ تھوڑی گھٹنوں پہ رکھے محو سی سنے گئی جیسے شہریار کو شہزاد کسی خوب صورت رات میں الف لیلوی داستان سنا رہی ہو۔ جیسے وہ کسی اور کی کہانی ہو۔

"جب تم نے پہلی نقال تیار کی جس کو تم نے اصلی پینٹنگ کی جگہ رکھ کے اصل کو چرانا تھا' تو میں وہ دیکھ کے مبہوت رہ گئی۔ وہ اتنی مکمل تھی کہ حد نہیں۔ میں نے تب تم سے پوچھا' تالیہ! تم اتنا اچھا پینٹ کرنے لگ گئی ہو تو تم اسی شعبے کو کیوں نہیں اپنا لیتیں۔ تم نے کہا' واتن اگر میں بہت اچھی پینٹنگ بھی بناؤں تو وہ دو تین ہزار سے زیادہ کی نہیں بکے گی۔ لیکن اگر میں کسی قدیم پینٹنگ کی نقل تیار کروں' اور بھرپور پلاننگ کے ساتھ اس کو اصل کی جگہ رکھ کے اصلی چرا لوں تو اس اصلی پینٹنگ کو میں بلیک مارکیٹ میں پچاس ساٹھ لاکھ کا بیچ سکتی ہوں۔ کوالالپور بھرا پڑا ہے کار پینٹرز سے اور کوالالپور بھرا پڑا ہے چوروں سے' مگر آرٹ تھیف ہوتا ہے جو یا تو کسی ماہر نقال کو اپنے ساتھ رکھے یا خود نقال پینٹ کرنا جانتا ہو فورجر کے بغیر آرٹ تھیف نہیں بن سکتی میں اور کسی فورجر پہ اعتبار نہیں کر سکتی۔ مجھے خود فورجری سیکھنی ہوگی۔ پھر تم نے پینٹنگز کے علاوہ وہ دوسری چیزوں کی نقال بھی تیار کرنا شروع کیں۔ انعامی اسکیم' بلیک ٹکٹ' پرائز بونڈ اور ہم امیر ہوتے گئے۔ تم نے ہر چیز سیکھی سوائے ایک چیز کے۔" کہتے کہتے اس نے مڑ کے تالیہ کو دیکھا جواب اس کے ایک دم بات کو ادھورے موڑ پہ لانے پہ گردن اٹھا کے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"اور وہ ہے چوری کا فن۔ ہاتھ کی صفائی۔ یہ تمہیں ہمیشہ سے آتا تھا۔ مجھے نہیں آتا تھا۔ میں نے کچھ نہیں سیکھا۔ ساری عمر ایک جیولری اسٹور اور ایک لائبریری میں کام کیا تھا۔ جب تمہیں جیولری چرانی ہوتی تو اس کی نقل تم نہیں تیار کر سکتی تھیں۔ وہ میں تیار کرتی۔ پھر ہم نے حالم کے نام سے کام شروع کر دیا' لوگوں کے لیے مسئلے کھڑے کرتے اور ان کو خود حل بھی کر دیتے۔ کبھی کسی کی پینٹنگ چرا کے خود ڈھونڈ لاتے۔ اصل رکھ کے نقل اس کو واپس کر دیتے۔ کبھی کسی سے انعامی اسکیم کے لیے پیسے بٹورتے۔ تم نے بس چوری کا فن نہیں سیکھا اور میں نے تو کچھ نہیں سیکھا سوائے ہاتھ کی صفائی اور چوری کے فن کے۔ یہ مجھے نہیں آتا تھا' تم نے مجھے سکھایا۔ تم گمنام رہنا چاہتی تھیں۔ اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ تمہیں امید تھی ایک دن تم اچھی بن جاؤ گی۔ میں نے یہ ذمہ اپنے سر لے لیا۔ سوائے چند لوگوں کے تمہیں شہر میں کوئی بطور ایک چور کے نہیں جانتا۔ مگر میں نے اسٹریٹ کانٹیکٹس بنائے۔ میں نے بلیک مارکیٹ میں تعلقات استوار کیے۔ اور یوں ہم دونوں آرٹ اور جیولری چرانے کے ساتھ بطور حالم ان کے مالکان سے کنسلٹنسی فیس بھی لیتے تھے ہم اسکیمرز بن گئے اور ہم نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو' داتن؟" اس بات پہ داتن نے سوگوار چہرہ موڑا اور ملال سے اسے دیکھا۔
"تمہیں لگتا ہے کہ تم یہ راستہ چھوڑ سکتی ہو مگر ایسا ممکن نہیں ہے تالیہ۔ جانتی ہو میں نے ہمیشہ اپنا چہرہ کیوں مخفی نہیں رکھا؟ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک دفعہ ہم اس دریا میں اتر جائیں تو واپسی کی کوئی کشتی نہیں بچے گی۔ تم کبھی پینٹر بن کے خوش نہیں رہ سکتیں نہ میں لائبریرین بن کے۔ جب مجھے میرے بچوں نے چھوڑا یا جب میں نے ان کو چھوڑا کیونکہ جیولری اسٹور کو جوان کاریگر مل گئے تھے اور میں ایک بوجھ تھی' تو میں نے لائبریری کے ساتھ ایئرپورٹ پہ نوکری کرلی اور اولڈ ہوم آگئی۔ لیکن جب بعد میں میرے پاس تمہاری وجہ سے دولت آنے لگی تو میں ہر ویک اینڈ پہ اپنے بچوں کے پاس جانے لگی۔ اب بھی جاتی ہوں۔ ان کے لیے قیمتی تحفے لے کر اور وہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک لائبریرین ہوں مجھ سے میرا ذریعہ معاش نہیں پوچھتے۔ وہ اب میری قدر کرتے ہیں' بھلے جہاں سے بھی پیسا آئے' وہ خوش ہیں۔ میں بھی خوش ہوں کیونکہ میں ان پہ انحصار نہیں کرتی' ان کے سامنے ایک مضبوط عورت ہوں میں' لیکن اگر میں یہ کام چھوڑ دوں تو میری قدر و قیمت وہاں ختم ہو جائے گی اس لیے میں کبھی بھی "نیک" نہیں ہونا چاہتی کیونکہ تالیہ۔ خون کے رشتے ہر ایک کے لیے کامل نہیں ہوتے ہم جیسے لوگوں کی کہانیوں میں دوستی کا رشتہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔"
"آئی ایم سوری داتن۔" اس نے پیچھے سے داتن کی گردن میں بازو لپیٹے اور اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پہ رکھ دی۔ "میں اتنی ڈسٹرب تھی کہ میں بھولتی جارہی تھی کہ میں کون ہوں اور کیا کرنے کی اہل ہوں۔ میں اپنی گیم سے باہر ہو رہی تھی مگر اب نہیں۔" اس نے داتن کا سیاہ گال چوما اور پھر سیدھے ہو کر ایک عزم سے کھڑی ہوئی۔ دیوار پہ ہاتھ مارا اور لمحے بھر میں سارا گھر روشن ہو گیا۔ تیز روشنی سے داتن کی آنکھیں چندھیا گئیں' اس نے فوراً ان پہ ہاتھ رکھا۔ پھر ذرا ٹھہر کے تالیہ کو دیکھا جو سینے پہ بازو لپیٹے ایک سنبھلی ہوئی سی سامنے کھڑی تھی۔
"اب؟" داتن نے ہمیشہ کی طرح اس سے پوچھا جو کہتی تھی کہ اس کے پاس ہمیشہ اگلا پلان ہوتا ہے۔
"اب ہم نے انتظار کرنا ہے یا تو ایڈم کی بات پہ یقین کر کے عصرہ محمود تنکو کال سے رابطہ کرے گی اور وہ سب میری تصدیق کر کے مجھے گرفتار کرنے یہاں آئیں گے یا پھر عصرہ محمود اپنے اسٹاف کے ہاتھوں مجھے دعوت نامہ بھجوائیں گی۔ پہلی صورت میں ہمارا سامان بندھا ہوا پڑا ہوا اور ہم سگنل دیکھتے ہی شہر سے فرار ہو جائیں۔ اور دوسری صورت میں ہم کھیل جاری رکھیں۔" داتن نے گہری سانس لی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھی۔
"مگر کھیل ہے کیا تالیہ؟ تم نے بریسلیٹ اتار کے واپس آجانا تھا' نیلامی وغیرہ پہ تھوڑی جانا تھا۔"
"میں کھیل بدل رہی ہوں۔ پلان بی۔" اس نے مسکرا کے موبائل ٹراؤزر کی جیب سے نکالا اور نمبر ملانے لگی۔
داتن نے اچنبھے سے اس کے سیاہ فون کو دیکھا جو حالم کا تھا۔
"یہ تم کس کو۔۔۔"
"السلام علیکم زین العابدین مولیا۔" وہ بشاشت سے بولی اور داتن کو دیکھ کے آنکھ دبائی۔ "کیسے ہو مولیا؟ ابھی تک درختوں پہ بوجھ بنے ہوئے ہو؟ اوہ اکچوئلی۔ اس بات پہ غور نہ کرنا' میرے حس مزاح کا لیول تمہارے ذہن سے کافی بلند ہے۔ خیر میں نے اس لیے فون کیا کہ۔۔۔" وہ اعتماد سے بولتی ہوئی مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور داتن نے تکان بھری سانس اندر کھینچی۔
بالآخر وہ کھیل میں واپس آچکی تھی۔ اس کی یہی بات تو سب سے اچھی تھی۔ گو کہ سب کی طرح گرتی تھی مگر گرنے کے بعد ہنس کے کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔
"پلان بی۔" داتن گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ (مجھے یقین ہے کہ یہ پلان اس کے پاس پہلے نہیں تھا اور اس نے ابھی ابھی سوچا ہے مگر کبھی نہیں مانے گی۔ ہونہہ) وہ بھی واپس گیم میں آرہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جزیروں سے بنے ملک پہ اگلی صبح بھیگی بھیگی سی اتری۔ سیاہ بادل سورج کو جھانکنے تک نہیں دے رہے تھے۔ بس گرجتے اور چمکتے جا رہے تھے۔ ایسے میں قطار سے کھڑے اونچے محل اپنے سامنے سڑک پر بھاگتے اس شخص کو دیکھ رہے تھے' جو ٹراؤزر کے اوپر آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں ملبوس' دوڑتا جا رہا تھا۔ کنپٹی سے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بال گیلے ہو کے ماتھے پہ چپکے تھے۔ وہ دور سے جاگنگ کرتا آ رہا تھا۔ اپنے گیٹ کے قریب آ کر رفتار سست ہوئی' ایک ہاتھ گیلے بالوں میں چلا کے ان کو پیچھے کیا اور ہینڈز فری کانوں سے کھینچ نکالے۔ گارڈز نے اسے دیکھتے ہی راستہ کھول دیا۔

"فاتح صاحب!" کسی نے تولیہ اچھالا جو اس نے ایک ہاتھ بلند کر کے تھاما اور اس سے چہرہ پونچھتا پورچ میں آگے چلا گیا۔ لمبی جاگنگ سے چہرہ گلابی شفاف سا ہو رہا تھا اور تنفس تیز تھا۔

لاؤنج میں آ کر وہ میز تک رکا' جھک کے اخبار اٹھایا' الٹ پلٹ کر کے دیکھا' پھر سیدھا ہوا ہی تھا کہ سامنے ایڈم نظر آیا۔ وہ اس کی عینک بڑھائے ہوئے تھا۔

"تھینکس!" فاتح نے اخبار رول کیا' عینک تھامی اور آگے بڑھ گیا۔

"سر!" اس نے جلدی سے پکارا' مگر وہ رکا نہیں۔ سیڑھیوں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

"سر! اشعر صاحب نے کہا ہے کہ آج میں ان خاتون سے معافی مانگنے جاؤں!" ہمت کر کے بلند آواز میں بولا۔

"کون سی خاتون ایڈم؟" وہ زینے چڑھتے ہوئے اخباروں کو الٹ پلٹ کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"وہ گیلری والی۔" وہ رکا اور جلدی سے اضافہ کیا۔ "سر! کیا مجھے ان سے معافی مانگنی چاہیے؟"

فاتح نے مطلوبہ میگزین نکال کے اوپر رکھا اور گردن موڑ کے ایک سادہ نظر اس پہ ڈالی۔ "ایڈم! ہر لفظ کے نتائج ہوتے ہیں۔ خاموشی کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے کہے گئے الفاظ کے نتائج مرد بن کے بھگتا کرو۔" اور اوپر چڑھتا گیا۔ ایڈم کا چہرہ مزید بجھ گیا۔ (مگر میں نے ایسا کیا کہا تھا؟)

ٹیرس پہ اس کی کرسی ہے۔ رکھی تھی۔ ساتھ میز پہ جوس کا گلاس' اور پھل۔ سب ترتیب سے تھا۔ مگر وہ ذرا چونکا۔ وہاں عصرہ بھی بیٹھی تھی۔ اسے آتے دیکھ کے عصرہ نے نظریں اٹھائیں تو ان میں اداسی تھی۔

"تم ادھر؟" وہ نارمل انداز میں کہتا اپنی کرسی پہ آ کے ڈھیر ہوا' اور پیر لمبے کر کے میز پہ قینچی کی صورت رکھ لیے۔

"آئی ایم سوری۔ میں کل رات کچھ زیادہ بول گئی۔"

"ہاں تم کل رات کچھ زیادہ ہی بول گئیں۔" اس نے تائیدی انداز میں کہتے ہوئے سر کو خم دیا اور اخبار سینے پہ رکھ کے بازوؤں کا تکیہ بنا کے سر ان پہ ٹکا لیا۔ اب اس کی آنکھیں توجہ سے عصرہ پہ جمی تھیں۔ بھورے بالوں کی پونی بنائے' اسکرٹ بلاؤز کے اوپر سفید رنگ کا دوپٹہ کندھوں کے گرد لپیٹے' ایک ہتھیلی پہ چہرہ ٹکائے وہ اداس نظر آ رہی تھی۔

"میں اندر سے دکھی ہوں فاتح۔ میرے زخم نہیں بھرتے۔ اور میں تمہارا بھی دل دکھا دیتی ہوں۔"

"اور تم سمجھتی ہو کہ میرے زخم بھر چکے ہیں؟" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"کیا نہیں بھرے؟"

"میں اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار نہیں کرتا عصرہ!" وہ نیم دراز بازوؤں کے تکیے پہ سر رکھے' اسے سامنے بیٹھے دیکھ کے رسان سے بولتا گیا۔ "ان کو سی کے آگے بڑھ جاتا ہوں مگر جس کھڑکی سے میں دنیا کو دیکھتا ہوں تم نے وہ کھڑکی بند کر رکھی ہے۔"

"فاتح۔۔۔ تم۔۔۔"

"عصرہ! یہ دنیا ماضی میں جینے والوں کے لیے نہیں ہے۔ وہ میری بھی بیٹی تھی' مجھے بھی دکھ ہے اس کا مگر اللہ کی چیز تھی' اللہ نے لے لی۔ میں پچھتاووں پہ یقین نہیں رکھتا۔ میں ماضی میں نہیں رہتا۔ میں آگے کا سوچتا ہوں۔ جبکہ تم۔۔۔" اس نے گہری سانس خارج کی۔ "تم ہمیشہ ماضی میں جیتی ہو۔ اب نکل آؤ ماضی سے عصرہ! یہ دنیا بہادر اور Daring لوگوں کے لیے ہے' جو آگے بڑھیں اور اس کو اپنی مثبت سوچ سے فتح کریں۔ یہ دنیا امید رکھنے اور خواب دیکھنے والوں کی ہے۔ بہت سی عورتیں گرتی ہیں عصرہ اور بہت سی گر کے اٹھتی ہیں' مگر جیتتی صرف وہ ہیں جو ہنس کے اٹھنے والی ہوں۔ مگر میں تم سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم تھوڑی سی کوشش کرو تو ایک دن تم بھی حال میں جینے والی بن جاؤ گی۔" وہ بات کے اختتام پر مسکرایا تھا۔ سیاہ بادلوں کی جھروکے سے چند آوارہ کرنیں' ٹیرس پہ پڑ رہی تھیں' اور اس کے چہرے کو روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہاں امید' نرمی' سکون سب کچھ تھا۔

عصرہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ اور پھر اس کے ہاتھ پہ دونوں ہاتھ رکھے۔

"مجھے مستقبل ڈراتا ہے فاتح۔" وہ بولی تو آواز کانپ رہی تھی۔ "تمہیں کھونے کا ڈر۔ اپنے بچوں کے رُل جانے کا خوف۔ میرے دل کو سمجھو فاتح۔ ملائیشیا کا ہمارے بغیر کچھ نہیں بگڑے گا ہم ٹوٹ جائیں گے۔ میں تمہارے لیے ڈرتی ہوں۔ تم یہ الیکشن نہیں جیت پاؤ گے اور جب ہارو گے تو تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔ جانتی ہوں کہ تم مضبوط ہو' بہادر ہو' اپنے دکھ بتاتے نہیں ہو مگر میں تمہیں ضائع ہوتے نہیں دیکھ پاؤں گی۔"

"یہی فرق ہے ہم میں عصرہ۔" اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے گال پہ رکھ کے اس کا چہرہ تھپکا۔ "تم یہ سوچتی ہو کہ کہیں میں ہار نہ جاؤں۔ اور میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھے جیتنا کیسے ہے۔" پھر اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے' اخبار کھول کے چہرے کے سامنے کیا اور عینک آنکھوں پہ جمائی۔ عصرہ نے گہری سانس لی اور سر جھٹکا۔ وہ اس شخص کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

"جوس پی لو۔ گرم ہو جائے گا۔" اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا اور اٹھ گئی۔ فاتح نے اخبار پہ نظریں جمائے "تھینکس" کہا۔ عصرہ نے چند قدم اٹھائے' پھر ٹھہری۔

"بس ایک بات مجھے پر سکون کرتی ہے کہ آریانہ زندہ ہے۔ وہ مری نہیں ہے۔ کسی کو مل گئی ہو گی وہ۔ کسی اچھے گھرانے میں تربیت پا رہی ہو گی۔ میں مر جاتی فاتح اگر مجھے یہ امید نہ ہوتی کہ وہ کبھی نہ کبھی ہمیں واپس مل سکے گی۔ تمہارے خواب بہتر ملائیشیا کے ہیں' میرے آریانہ کے ہیں۔ اور اس خواب نے میری ہر کھڑکی کے آگے پردے ڈال دیے ہیں۔ تم اس کو "آریانہ تھی" کہہ کے بلاتے ہو' اور میں اس کو "آریانہ ہے" کہہ کے سوچتی ہوں۔ یہی فرق ہے ہم میں' ڈان فاتح!" کھڑے کھڑے' اس کو دیکھے بنا وہ کہتی گئی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

وہ اخبار پڑھتا رہا۔ بادلوں نے پھر سے سورج کو چھپا لیا تو اس کا روشن چہرہ چھایا میں چلا گیا۔ ٹھنڈی سرمئی چھایا۔



حالم کا اونچا بنگلہ بھی سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بالائی منزل کے ہال کے شیشے کی دیوار سے وہ نیچے دیکھ رہی تھی جہاں ایک کار کھڑی تھی اور ایک آدمی نکل کے گھنٹی بجا رہا تھا۔

"کیا خیال ہے؟" داتن اس کے عقب میں آ کھڑی ہوئی۔ "ہم آج رات کا کھانا کون سے تھانے میں کھائیں گے؟"

"وہ اس باڈی مین کو ساتھ لائے ہیں۔" وہ سنجیدہ سی نیچے نظریں جمائے بولنے لگی۔ "ڈرائیور نہ گھڑی کو دیکھ رہا ہے' نہ آگے پیچھے۔ نہ اسے جلدی ہے نہ وہ کسی کو چھپا کے ساتھ لایا ہے۔ بار بار گیٹ کے دھات میں اپنا عکس

دیکھتا ہے۔ یعنی اسے بہت ہدایت کے ساتھ خود کو بہترین پوز کرنے کا کہا گیا ہے۔ اپنے کوٹ کی جیب کو بھی تھپتھپاتا ہے' یعنی اندر کچھ ہے۔ یقیناً "دعوت نامہ۔" پھر اطمینان سے داتن کی طرف گھومی۔ "ہم نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ ہمارا شکار ——— Hook بھی ہو چکا ہے۔"

چند منٹ بعد تالیہ کی ایک جزوقتی ملازمہ ان دو افراد کو اندر لا رہی تھی۔ رملی طائرانہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا قدم اٹھا رہا تھا گویا آنکھوں سے ہر شے کی مالیت کا اندازہ کرنا چاہ رہا ہو۔ جبکہ ایڈم بجھا بجھا مگر سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ دونوں ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ ذرا دیر بعد دروازے پہ آہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ لمبے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس' پیشانی پہ بل لیے' سینے پہ بازو لپیٹے۔ وہ ان کے سامنے آٹھہری۔ ناقدانہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

"جی؟" ماتھے پہ مصروفیت اور اکتاہٹ سے بھری شکن تھی۔ ایڈم نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ اتنی خوب صورت' طرح دار اور بااثر لڑکی جس کے کانوں کے چمکتے ہیرے نگاہیں خیرہ کر رہے تھے... وہ تھی یا نہیں؟ اس کا دل شک میں پڑنے لگا۔ پیچھے دیوار پہ اس کی فوٹو فریم میں تصویر بھی لگی تھی۔

"میڈم۔ کل آپ گیلری سے خفا ہو کر آئی تھیں' ہمیں باس نے بھیجا ہے تاکہ آپ کی غلط فہمی دور کی جاسکے۔"

"یہ!" تالیہ نے چونک کے ایڈم کی طرف انگلی اٹھائی' اور جیسے ذہن پہ زور دیا۔ "یہ مسز عصرہ کا وہی ملازم ہے نا جس نے کل مجھ پہ فقرے کسے تھے۔ یا اللہ... اور آپ اس کو میرے گھر لے آئے۔" خوب صورت آنکھیں برہمی سے سرخ پڑنے لگیں تو رملی جلدی سے بولا۔

"یہ معذرت کرنے آیا ہے' مادام۔ اس سے غلطی سے ہوا جو بھی ہوا۔" ساتھ ہی ایڈم کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (معافی مانگو) ایڈم نے پہلے اسے دیکھا' پھر تالیہ کو۔ ایک قدم آگے آیا۔ اس کے عین سامنے۔

"انسان کے ہر لفظ کے نتائج ہوتے ہیں چے تالیہ۔ خاموشی کے بھی۔ مجھے قطعاً" یہ حق حاصل نہ تھا کہ میں سر راہ کسی خاتون کو روک کر ان کو کسی سے تشبیہہ دوں۔ آپ وہ تھیں یا نہیں' مجھے بغیر کسی تعارف کے یوں بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔" اپنی پوری دیانت داری اور دل کی سچائی سے وہ بولا اور جیسے اس کا دل شانت ہو گیا۔

وہ اسی طرح اس کو دیکھتی رہی۔ تند و تیز نگاہوں سے۔ جیسے اس کے الفاظ کو تول رہی ہو۔ پھر رملی کو دیکھا اور گہری سانس لی۔ "ہوں... ٹھیک ہے۔ میں نے معذرت قبول کی۔ اور کچھ۔"

"میم' اگر آپ نے دعوت نامہ نہ قبول کیا اور نیلامی پہ نہیں آئیں تو اس بچے کی نوکری چلی جائے گی۔ اس کو اس نوکری کی اشد ضرورت ہے اور مسز عصرہ اس کو معاف نہیں کریں گی۔" دعوت نامہ کوٹ سے نکال کے رملی نے سامنے رکھا اور لجاجت سے بولا تو ایڈم کی آنکھوں میں جہاں حیرت ابھری وہاں اہانت کا احساس بھی ہلکورے لینے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' تالیہ نے تحکم سے کہا۔

"باس کو کال ملاؤ۔" رملی نے فوراً" فون لگایا اور بولا۔ "سر... چے تالیہ بات کرنا چاہتی ہیں۔" اور فون تالیہ کو پیش کیا۔

"تالیہ مراد بات کر رہی ہوں۔ اوہ آپ؟ میں مسز عصرہ کو توقع کر رہی تھی۔" وہ فون کان سے لگائے حیران ہوئی۔

"ایک ہی بات ہے چے تالیہ" وہ شائستگی سے کہہ رہا تھا۔ "آپ عصرہ اور میری کلائنٹ نہیں' مہمان تھیں اور

ہماری مہمان کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ہماری مہمان نوازی ٹھکرا دے' یہ ہمارے خاندان کے لیے تکلیف کی بات ہے۔"

"میں خود بھی معذرت خواہ ہوں اشعر صاحب۔" اس کو نرم پڑتا دیکھ کے رملی کی سانس بحال ہوئی۔ "یہ تو بچہ ہے' بھول چوک میں کچھ بول گیا تو مجھے ہی بڑے پن کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ مگر آپ کے اس قدم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔"

"گڈ۔ میں عصمو کو آگاہ کردوں گا کہ ان کی مہمان نے مہمان نوازی قبول کرلی۔"

"میں شکر گزار ہوں' سر!" اور فون واپس کر دیا۔ پھر فرصت سے ان دونوں کو دیکھا۔ بالخصوص ایڈم کو۔

"بے فکر رہو۔ تمہاری نوکری نہیں جائے گی۔" ادائے بے نیازی سے ہاتھ جھلا کے گویا تخلیہ کا اشارہ کیا' تو ایڈم کے ابرو بھینچ گئے۔

"تھینک یو' مگر مجھے یہ نوکری مستقل کرنی ہی نہیں ہے۔ میں صرف گیارہ دن کے لیے متبادل کے طور پہ آیا ہوں' چے تالیہ۔" رملی نے گڑبڑا کے اسے گھورا' مگر وہ اسی طرح تالیہ کی آنکھوں میں دیکھتا رہا (یہ وہی ہے۔ یہ آنکھیں۔۔۔ ان کے تاثرات۔۔۔ وہی ہیں۔۔۔)

اور وہ۔۔۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ٹھہر سی گئی۔ دم بخود۔ ساکن۔۔۔ نگاہوں کے سامنے منظر بدلا۔۔۔ ایک جھلی پہ گویا فلم سی چلنے لگی۔

رات کا سیاہ آسمان تھا۔ چاند چمک رہا تھا۔۔۔ پہاڑی کا راستہ دشوار گزار اور پتھریلا تھا۔۔۔ اونچا نیچا۔۔۔ اور وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ تالیہ آگے تھی۔۔۔ ایڈم پیچھے تھا۔۔۔ لباس اندھیرے کے باعث ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔ بس تاریکی میں گویا دو ہیولے تھے' جو اوپر چڑھتے جاتے تھے۔

"چے تالیہ۔۔۔" وہ پیچھے سے ہانپتا ہوا بولا تو تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"کیا ایڈم!"

"آپ کیا کرنے جارہی ہیں؟"

"میں ہم دونوں کو بہت امیر کرنے جارہی ہوں ایڈم!" وہ چلتے چلتے رک گیا۔

"کیسے؟" وہ پلٹی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تاشہ کے خزانے سے جسے ہم دونوں کھود کے نکالیں گے۔"

"کیا؟" وہ حیران رہ گیا۔

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھے ایڈم کہ تاشہ نے اس دیوار پہ وہ نظم کیوں لکھی تھی؟" وہ مسکرائی۔

"کیوں؟"

"تاکہ ایڈم اور تالیہ اس دیوار تک جائیں اور وہاں مدفن خزانے کے راز کھود نکالیں۔ ہم دنیا کے سب سے طاقتور لوگ بن جائیں گے ایڈم۔"

"اور وان فاتح؟" وہ پوچھ رہا تھا مگر تصویر دھندلی پڑتی گئی۔

"ہمیں اجازت!" رملی کی آواز نے اسے حال میں واپس کھینچا تو وہ چونکی۔ بس لمحے بھر کا اثر تھا اور وہ سنبھل گئی۔ پھر دوبارہ ایڈم کو دیکھا۔ اب کی دفعہ نگاہ مختلف تھی۔ حیران۔ متحیر۔ وہ البتہ مرعوب ہو کر نظر جھکا چکا تھا' مبادا مزید کوئی مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔

"ہوں!" اس نے ہاتھ سے برخاست ہونے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں پلٹ گئے۔

ان کے باہر نکلتے ہی داتن کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا' وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھی ہے۔ داتن نے

بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ "کیا وہ پولیس کو لینے گئے ہیں؟" تالیہ نے ماتھے سے ہاتھ ہٹائے اور سر اٹھا کے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ "داتن۔۔۔ ایک خزانہ ہے کہیں۔"

"میری پیاری بچی۔۔۔ میں جانتی ہوں' تم مجھے کسی خزانے سے کم نہیں سمجھتیں' مگر۔۔۔"

"تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔۔۔" وہ جھنجلا کے کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی شاہزادیوں والی شان اب ندارد تھی۔

"میری بات سنو۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "جاتے وقت ایڈم نے لابی میں لگی تمہاری تصاویر میں سے ایک کو چپکے سے موبائل پہ اتارا ہے' تالیہ۔"

"ظاہر ہے اس نے یہ کرنا تھا۔ اس کا حل ہے میرے پاس۔ تم فی الحال میرے ساتھ پلان بی کی تیاری کراؤ۔۔۔" وہ اس موٹی مرغی کو کندھوں سے پکڑ کے دھکیل کے باہر لے جانے لگی۔

رملی کار چلا رہا تھا اور ایڈم موبائل اسکرین پہ اس کی نظروں سے بچا کے وہ تصویر غور سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں الجھن بھری گہری سوچ پنہاں تھی۔ (یہ وہی تھی۔ یا شاید نہیں تھی؟)



کوالالمپور کی وہ تکون شیشوں سے ڈھکی عمارت بادلوں کو سر اٹھا کے دیکھ رہی تھی جو دھیرے دھیرے اس پہ قطرے ٹپکا رہے تھے۔ بوندا باندی کافی دیر سے جاری تھی۔ عمارت کے اندر پارٹی کے آفس فلور پہ معمول کی چہل پہل جاری تھی۔ راہداریوں میں پالسی ورکر آجا رہے تھے۔ کام چل رہا تھا۔ ایسے میں ایڈم فاتح کے آفس کے باہر بے کار سا بیٹھا تھا۔ سر جھکا اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ دفعتاً" دروازہ کھلا تو وہ تیر کی طرح سیدھا ہوا۔

فاتح کوٹ پہنتے ہوئے باہر نکل رہا تھا' ساتھ میں چلتے شخص سے بات بھی کر رہا تھا۔ گرے سوٹ' سفید شرٹ' ٹائی' اور ہلکے گیلے بال جو وہ دائیں جانب کو سنوار کے پیچھے کرتا تھا۔۔۔ اور اس پہ مسکراتا چہرہ۔۔۔ کسی بات پہ ہلکا سا ہنس کے وہ ساتھ موجود شخص کو جواب دے رہا تھا۔۔۔ وہ ایڈم کی طرف متوجہ نہیں تھا اور ایڈم صرف اس کی طرف متوجہ تھا۔ گزشتہ روز اس امیرزادی کے ہاں ماتھا ٹیکنے کی ساری کلفت دور ہونے لگی۔

وہ شخص آگے بڑھ گیا اور فاتح کوٹ کا کالر سامنے سے برابر کرتا مڑا تو ایڈم پہ نظر پڑی۔ "ہاں ایڈم۔۔۔ کیا حال ہے تمہارا؟" آنکھوں میں مسکراہٹ لیے نرمی سے پوچھا اور بٹن کو ہول میں ڈال کے بند کیا۔

"فٹ' سر!" وہ تازہ دم سا ہو کے مسکرایا۔

"گڈ۔ مجھے پارلیمنٹ جانا ہے' اور مجھے کافی چاہیے۔ میرے کار میں پہنچنے تک لے آؤ۔ ورنہ میں تمہارے بغیر جا رہا ہوں۔" نرم لہجے سے بات شروع کر کے آخر میں تنبیہہ کی اور مڑ گیا۔ ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ بے ساختہ اس نے دوسری جانب دوڑ لگائی تھی۔

بارش ٹپ ٹپ برس رہی تھی جب فاتح سڑک پہ کھڑی کار میں بیٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈرائیور نے اوپر چھتری تان رکھی تھی۔ فاتح نے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ اسی پل بھاگتا' اور جھکتا ایڈم کھڑکی تک آیا اور ایک کافی گلاس جس میں اسٹرا لگا تھا فاتح کی طرف بڑھایا۔

اس نے گلاس پکڑا اور اپنی چمک دار آنکھیں اٹھا کے ایڈم کو دیکھا۔

"وان فاتح پارلیمنٹ سیشن میں ہمیشہ دو کپ کافی پیتا ہے۔"

"اسی لیے میں دو کپ لایا ہوں سر۔" اس نے دوسرا ہاتھ اٹھا کے ایک اور گلاس دکھایا تو فاتح کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیلی۔ شیشہ اوپر کر دیا اور کپ لبوں سے لگائے اپنی کوئی فائل کھول کے دیکھنے لگا۔ ایڈم دوسرا گلاس

پکڑے اگلی سیٹ پہ آبیٹھا۔
بارش تیز ہو رہی تھی۔ کار سڑک پہ رواں دواں تھی اور عینک ناک پہ جمائے فاتح اپنی فائل پڑھ رہا تھا۔
"میں کچھ...." ایڈم نے پوچھتے پوچھتے شیشے دیکھا مگر اسے محو دیکھ کے چپ ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایک ناگوار نظر ایڈم پہ ڈالی۔
"پوچھو ایڈم!" فاتح نے آخری صفحہ پلٹا اور فائل بند کر دی۔ پھر عینک اتار کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔
"کیا پھر عبدالمطلب کو اللہ نے دس بیٹے دیے؟" وہ اس دن کے ادھورے قصے کے بارے میں پوچھنے لگا۔
وہ عینک کے ہینڈل کا کونا دانتوں میں دبائے اس کی بات سن کے مسکرایا۔ نظریں کھڑکی کے باہر جمی تھیں۔
"ایڈم! انسان شدید تکلیف کی حالت میں اللہ سے جب کسی سودے کا وعدہ کر لیتا ہے تو آزمایا بھی جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی قسمت بدل جاتی ہے۔ وہ چیز اس کو پہلے بھی ملنی تھی مگر وعدے کے باعث وہ اس کی قوت ارادی کی آزمائش بن جاتی ہے۔"
"عبدالمطلب کی قوت ارادی کیسی تھی؟"
"میرے اور تمہارے سے بہتر تھی۔ اس وقت ان کا ایک ہی بیٹا تھا' پھر اللہ نے ان کو کئی بیٹے دیے۔ دس یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ جب وہ جوان ہوئے اور اپنا بہترین ورثہ بن گئے تو عبدالمطلب نے وعدہ نبھانے کا سوچا۔ وہ ہماری طرح اللہ کے لیے کم ترین نہیں دیتے تھے۔ بہترین دیتے تھے۔ سو انہوں نے قرعہ ڈالا اور وہ عبداللہ کے نام نکلا۔" ایڈم نے چونک کے گردن موڑی۔ "ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا؟"
"ہاں...." اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گردن اثبات میں ہلائی۔ نظریں دور بھیگتے شہر پہ جمی تھیں۔ "مگر عبداللہ کے ماموں وغیرہ آڑے آگئے اور کہا کہ اس کی قربانی نہیں ہونے دیں گے' مگر عبدالمطلب وعدے کے سچے تھے۔ ایک آدمی جو اتنے برس ایک وعدے کے ساتھ جیا ہو' وہ خائن نہیں ہوتا۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ انگلی سے ٹھوڑی کو ذرا کھجایا۔ نظریں باہر ثبت تھیں۔
"تو کیا انہوں نے عبداللہ کو قربان کر دیا؟"
"نہیں۔ وہ ایک کاہنہ عورت کے پاس معاملہ لے گئے تو اس نے کہا کہ ایک پرچی پہ عبداللہ کا نام لکھو اور دوسری پہ دس اونٹ' پھر قرعہ نکالو۔ ایسا ہی کیا تو پھر سے عبداللہ کا نام نکلا۔ وہ بولی 'اونٹ بڑھاتے جاؤ' یہاں تک کہ اللہ راضی ہو جائے۔ سو وہ لوگ اونٹوں کی تعداد بڑھاتے گئے۔ ہر دفعہ عبداللہ کا نام نکلتا' یہاں تک کہ سو اونٹ کی پرچی ڈالی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ سو عبدالمطلب نے گمان کیا کہ اللہ راضی ہے اور سو اونٹ قربان کیے۔ عبداللہ کو بچا لیا گیا اور تب سے آج تک مسلمانوں میں ایک انسان کی دیت سو اونٹ مقرر ہے۔ تب ہی ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود کو دو ذبیحوں کی اولاد کہتے تھے۔"
"اسماعیل علیہ السلام اور عبداللہ جن کو ذبح ہونے سے بچا لیا گیا صحیح۔" وہ سر ہلا کے سمجھتے ہوئے بولا تھا۔ پھر ٹھہرا۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھا جہاں بارش کے قطرے مسلسل گر رہے تھے اور وائپر روانی سے چل رہے تھے۔
"مگر وعدہ تو پورا نہیں کیا عبدالمطلب نے۔ آخر میں کفارہ ہی دیا۔ پھر اتنے برس کے وعدے کا کیا فائدہ ہوا۔"
"اللہ تعالیٰ سے انسان فائدے نقصان کے لیے کمٹمنٹ نہیں کرتا۔ اپنے اور اللہ کے اعتبار کے تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے کرتا ہے۔ ہم اللہ سے وعدے کر کے چند دن میں ہی انہیں توڑ دیتے ہیں' مگر تمہیں ایڈم' عبدالمطلب کو یاد رکھنا چاہیے جنہوں نے کئی برس اپنے وعدے کو پال پوس کے جوان کیا۔ اگر تم اللہ سے کوئی وعدہ کر لیتے ہو اور مقررہ گھڑی کے قریب آنے پر تمہارا دل کمزور پڑنے لگ جائے' تب بھی اس وعدے کو نبھانے کی

کوشش کیا کرو۔ اللہ کو تم سے کوئی چیز چھین لینا مقصود نہیں ہے' وہ صرف تمہیں کھودینے کے خوف اور پالینے کے لالچ سے آزاد کرکے ایک مضبوط انسان بنانا چاہتا ہے۔ ہم اپنے وعدوں کو جتنا زیادہ نبھائیں گے اتنے ہی مضبوط بنیں گے اور آخر میں اللہ خود ہی کوئی راہ نکال کے ہمیں ہماری محبوب شے لوٹا دے گا۔ عبدالمطلب کو مضبوط بننے کے لیے دس بیٹے چاہیے تھے۔ لیکن کیا تمہیں نہیں لگا ایڈم کہ ان کو دس بیٹوں سے زیادہ ان کے وعدوں نے مضبوط کیا تھا؟" اس نے کپ تھاما' ہونٹوں تک لے کر گیا' پھر ذرا اوپر کیا۔ خوشبو اندر اتاری اور چونک کے فرنٹ سیٹ کی طرف دیکھا۔

"یہ میری کافی نہیں ہے۔ شاید یہ تم اپنے لیے لائے تھے۔" اور بغیر پیے گلاس آگے بنے اسٹینڈ میں اٹکا دیا۔

ایڈم نے سخت شرمندگی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اب اس گلاس کو اٹھاتا۔

فاتح اسی طرح کھڑکی سے باہر دور تک پھیلی عمارتوں کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیگے چلی جارہی تھیں۔



پارلیمنٹ ہاؤس وسیع و عریض اور روشنیوں سے منوّر تھا۔ دور' دور تک ممبران کے ڈیسک اور کرسیاں بچھی تھیں جن پہ ان کی فائلز' مائیک وغیرہ سجے تھے۔ مرکزی چبوترے پہ اونچی کرسی پہ اسمبلی کا اسپیکر بیٹھا تھا اور عینک ناک پہ جمائے' نیچے کھڑے تقریر کرتے ممبر کو دیکھ رہا تھا۔

ہال کے اوپر' کافی اوپر بالکونی بنی تھی۔ وہاں سینما گھروں کی طرح کرسیاں اوپر تک لگی تھیں جہاں لوگ بیٹھ کے پارلیمنٹ کی کارروائی دیکھتے تھے۔ عموماً" لوگ کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے' مگر وہ گیلری میں ریلنگ کے ساتھ کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی۔ سنہری بال فرنچ چوٹی میں گوندھے' وہ سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز کے اوپر سیاہ منی کوٹ پہنے ہوئے تھی' اور سر پہ ترچھا کرکے سفید ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ سفید گلابی چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

نیچے ممبران معمول کے انداز میں بیٹھے تھے۔ کچھ آپس میں بات کررہے تھے' کچھ اپنے لیپ ٹاپ پہ ٹائپ کررہے تھے اور زیادہ تر تقریر کرتے فاتح کو سن رہے تھے۔ تالیہ یہاں سے اس کی پشت دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ پہ کھڑا اسپیکر کی طرف رخ کیے بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

"مجھے آج افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ملے پارلیمنٹ نے میرا ایجوکیشن بل نامنظور کردیا ہے۔ توان اسپیکر (جناب اسپیکر) ہم اس بل کے ذریعے تعلیمی شعبے میں وہ اصلاحات متعارف کروانا چاہتے تھے جو......"

تالیہ بور سی ہوکے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ قانون سازی کی خشک باتوں سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ دوسرے مقصد کے لیے آئی تھی۔ گردن آگے پیچھے گھمائی تو ٹھہری۔ فاصلے پہ ایڈم کھڑا تھا۔ توجہ سے تقریر کرتے وان فاتح کا ایک لفظ سنتا ہوا۔ وہ بور نہیں ہو رہا تھا۔

وہ نامحسوس طریقے سے اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ جانے کس احساس کے تحت ایڈم نے یوں ہی گردن موڑی تو اسے دیکھ کے چونکا۔

"آپ یہاں؟" تالیہ چونکی۔ پھر اسے دیکھ کے مشکوک نظر آنے لگی۔

"تم میرا پیچھا تو نہیں کررہے؟ اور بعد میں اس پہ معافی مانگ لوگے؟"

"نہیں' نہیں۔" وہ شرمندگی سے وضاحت کرنے لگا۔ "میں تو وان فاتح کے ساتھ آیا ہوں۔"

"ہوں۔" وہ کروفر سے ہنکارا بھر کے گردن واپس موڑ گئی اور سنجیدگی سے نیچے دیکھنے لگی۔ البتہ ایڈم کا دھیان بٹ چکا تھا۔

"آپ یہاں کیسے؟"
"اشعر صاحب کہاں ہیں؟" وہ نیچے دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں بولی۔
"وہ نیچے بیٹھے ہیں۔ وان فاتح کے پیچھے۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔"
"نہوں۔" اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔
"ابھی لنچ بریک ہوگا تو میں آپ کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ اسی راستے سے باہر نکلیں گے۔" وہ اشارہ کر کے سمجھانے لگا، پھر ایک غیر آرام دہ نظر اس پہ ڈالی۔ "آپ نیلامی پہ آئیں گی نا۔" اسے دیکھ کے اندیشہ سا ہوا کہ پھر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔
"ظاہر ہے بچے... میں نے کل کہا تھا نا میں نے تمہیں معاف کیا۔"
"مگر میں نے آپ کو بدصورت نہیں کہا تھا۔ پلیز مجھے وضاحت کرنے دیں۔ میں نے آپ کی شکل کی ایک لڑکی دیکھی تھی کسی کے گھر میں سمجھا وہ آپ ہیں۔"
تالیہ پوری اس کی طرف گھومی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "تو کیا وہ میں ہوں؟"
ایڈم اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ بس ایک نظر اسے دیکھا اور شک و شبہ رفع ہونے لگا۔ یہ وہ نہیں تھی۔ اس نوکرانی کی تو شکل بھی اب اسے بھولتی جا رہی تھی۔
"نہیں... مجھے غلط فہمی ہوئی تھی سوری۔" سچائی سے اس نے نظریں جھکا کے اعتراف کیا۔
"دلچسپ بات یہ ہے جناب اسپیکر کہ اس وقت اسمبلی میں آدھے سے زیادہ لوگ میری بات کو غیر اہم جان کے صرف لنچ بریک کا انتظار کر رہے ہیں۔ باقی آدھے سو رہے ہیں۔" اس نے ایک دم تقریر کا کاغذ ڈیسک پہ پٹخا اور اونچی آواز میں بولا تو وہ دونوں چونک کے متوجہ ہوئے۔ ہال میں چلتی سرگوشیوں میں کمی آئی۔ سناٹا چھانے لگا۔
وان فاتح اپنی جگہ پہ کھڑا اسپیکر کو دیکھ کے دبے دبے غصے سے بول رہا تھا۔ گرے سوٹ اور دائیں طرف کو پیچھے کر کے جمائے بالوں کے برعکس اس کی آواز آج قابو میں نہیں لگ رہی تھی۔
"کیونکہ ان کو تعلیم کی باتیں بورنگ لگتی ہیں۔ کیونکہ ان باتوں کا رزلٹ اگلے الیکشن تک نہیں ملتا۔ مگر اونچی عمارتوں اور لمبی سڑکوں کا مل جاتا ہے۔ شہر میں نئے پھول لگانے اور نئے پارک بنانے کا بھی مل جاتا ہے۔ سیاست دان ہمیشہ اگلے الیکشن کا سوچتا ہے، مگر لیڈر اگلی نسل کا سوچا کرتا ہے، سر! وان فاتح یہ بل اس لیے پاس کروانا چاہتا تھا، کیونکہ وان فاتح اس وقت کا بھی سوچ رہا ہے جب وہ خود مر چکا ہوگا، مگر ملائیشیا کے بچے آج سے زیادہ مشکل حالات میں ہوں گے۔" اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے جھک کے ڈیسک دو دفعہ بجایا تو سارے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ اشعر خاموشی سے پیچھے بیٹھا سن رہا تھا۔
"ٹھیک ہے میں وزیر اعظم صاحبہ کی پارٹی میں سے نہیں ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے کافی فاصلے پر اگلی قطار میں بیٹھی خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ تالیہ نے گردن اونچی کی۔ سفید اسکارف اوڑھے وزیر اعظم فرنٹ پہ بیٹھی تھی اور یہاں سے اس کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ "مگر میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بچے میرے اور ان کے ہم سب کے نہیں تھے؟ کیا ہم مل کے سیاسی اختلافات کو بھلا کے اپنے بچوں کے لیے ایک پلیٹ فارم پہ اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر نہیں... صرف اس لیے کہ وان فاتح نے تعلیم کے نام پہ ووٹ لیا ہے، میڈم وزیر اعظم نے میرے وعدے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے اس بل کو نامنظور کروایا۔ مگر مجھے آپ ان کے وعدوں کے متعلق ایک بات بتانے دیجیے۔" وہ برہمی سے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ نظریں وزیر اعظم کی کرسی پہ تھیں، جس نے مڑ کے اسے دیکھا تک نہیں۔ بنا اثر لیے سامنے دیکھتی رہی۔
"چونکہ وزیر اعظم صاحبہ کو وعدے پورے کرنے کی عادت نہیں ہے اور وہ ہمیشہ لینے پہ یقین رکھتی ہیں، دینے پہ

نہیں۔ اس لیے وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ کچھ لوگ اپنے وعدوں کی پاسداری کے لیے اپنی قیمتی متاع کو بھی ذبح کر دیتے ہیں اور آپ کے لیے بُری خبر یہ ہے کہ وان فاتح ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ مجھے کہا جاتا ہے کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں' میری پارٹی تک میرے ساتھ نہیں کھڑی۔ جیسے وان فاتح کو اس بات کی بہت فکر ہے کہ وہ اکیلا رہ گیا تو کیا ہو گا۔ اگر میرے اوپر ایسا وقت آیا کہ ملے قوم میں سے صرف ایک شخص بھی میرے ساتھ کھڑا ہوا ئیں تب بھی اپنا وعدہ پورا کروں گا' میں اس ایک شخص کا بھی لیڈر ہوں اور یاد رکھیے گا میڈم' میں پھر سے اس بل کا ڈرافٹ تیار کروں گا اور اب کی بار... میں... اس بل کو... آپ کے... حلق سے... نیچے اتاروں گا اور آپ مجھے بے بسی سے ایسا کرتے دیکھیں گی۔" کہہ کے اس نے زور سے ڈیسک پہ ہاتھ مارا۔ چہرہ جذبات کی حدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔ پھر ٹائی کو ڈھیلے کرتے وہ واپس کرسی پہ بیٹھا تو اوپر گیلری سے جہاں تالیاں گونجنے لگیں' وہیں ہال میں بیٹھے اس پارٹی کے چند ارکان ڈیسک بجانے لگے۔ (اسمبلی میں بیٹھ کے ڈیسک بجانے کا مطلب تعریف اور کھڑے ہو کے بجانے کا مطلب احتجاج ہوتا ہے۔) حکومتی ارکان البتہ خاموش بیٹھے رہے۔

اور وہ دونوں بھی اوپر بالکل خاموشی سے کھڑے تھے۔ ایڈم گم صم سا تھا اور وہ یک ٹک اس آدمی کو دیکھ رہی تھی' جواب ٹیک لگا کے' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ قریب بیٹھے افراد نے آگے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ کسی نے پانی کی بوتل آگے بڑھائی جو اس نے تھام کے لبوں سے لگالی۔

چند منٹ بعد وہ نیچے راہ داری میں ایڈم کے ساتھ کھڑی تھی۔ گارڈز بھی ساتھ ہی کھڑے تھے۔ دفعتاً "لفٹ کے دروازے کھلے اور... چند افراد باہر نکلے۔ آگے وہ دونوں تھے۔ اشعر اور... تالیہ کے دل کی دھڑکن مس ہوئی... وان فاتح۔

وہ اب قطعاً "غصے میں نہیں لگ رہا تھا' مسکرا کے اشعر کی بات سن رہا تھا جو خوش گوار انداز میں اس کے قریب جھکے کچھ کہہ رہا تھا کہ اس کی نظر تالیہ پہ پڑی۔ آنکھوں میں حیرت اتری۔ اس نے ملکے سے فاتح کی کہنی کو چھو کے کچھ کہا تو فاتح نے نظر اٹھا کے اس طرف دیکھا۔ پھر وہ دونوں چند قدم آگے آئے۔ تالیہ کو لمحے بھر کے لیے اپنا سارا اعتماد ہوا ہوتا محسوس ہوا' بے اختیار نظریں فاتح پہ جمی تھیں۔

"تالیہ! آپ یہاں؟" اشعر نے کہتے ہوئے ایڈم کو دیکھا تو ذرا سا چونکا۔ "کیا وہ بات ختم نہیں ہوئی۔"

"مجھے شرمندہ مت کریں' اشعر صاحب۔" پھر فاتح کو دیکھ کر ادب سے سر کو خم دیا۔ "وان فاتح!" اس نے جواباً دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اسے جانا تھا۔ اس کے عجلت بھرے انداز نے تالیہ کو بے چین کیا۔ جلدی سے بولی۔

"میں اشعر صاحب سے بات کرنے آئی تھی' مگر آپ کی تقریر... بہت اچھی تھی... میں ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتی ہوں... لیکن..." وہ ٹھہری تو فاتح جو غالباً" آگے بڑھنا چاہتا تھا' رک کے اسے دیکھنے لگا۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ "لیکن؟"

"میں نہیں مان سکتی کہ کبھی آپ پہ ایسا وقت آسکتا ہے کہ آپ کے ساتھ ملے قوم میں سے سوائے ایک کے کوئی نہ کھڑا ہو' لیکن اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میں اپنی پوری سچائی سے کہتی ہوں کہ میں وہ ایک شخص ضرور ہوں گی۔"

"میں بھی!" ایڈم نے زیر لب کہا تھا۔

"تھینک یو تاشہ!" وہ تکلفاً" مسکرایا' جیسے اسے اس بات سے فرق نہ پڑا ہو۔ وہ ان باتوں کا عادی تھا۔

"تالیہ... ان کا نام تالیہ ہے۔" اشعر نے کھنکھار کے تصحیح کی۔ پھر ایک گہری نظر تالیہ پہ ڈالی۔ وہ گرد و پیش سے بے نیاز فاتح کو دیکھے جا رہی تھی۔ اشعر کی پیشانی پہ ہلکی سی شکن ابھری۔

"صحیح۔۔ صحیح۔۔۔ تالیہ۔۔۔" اس نے پیشانی چھوئی۔ "میری بیوی شکر ہے یہاں نہیں ہے ورنہ اس کو خفا ہونے کے لیے ایک اور وجہ مل جاتی۔" وہ جھرجھری لے کر ہلکا سا ہنسا۔ پھر گھڑی دیکھی اور اشعر کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں کار میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"مجھے۔۔۔ ایک بات کرنی تھی۔" وہ جلدی سے بولی، مگر وہ نہیں رکا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے گارڈز اور ایڈم اس کے ساتھ ہو لیے۔ تالیہ کی رنگت بجھی۔ تو اشعر مسکرا کے آگے ہوا اور حوصلہ افزا انداز میں کہا۔ "آبنگ کو دل رکھنے کی عادت نہیں۔ وہ ہماری دنیا کے انسان نہیں ہیں۔ مگر آپ کہیے ۔میں سن رہا ہوں۔" مگر تالیہ کا چہرہ بجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"میں کھائل غزال میں انٹرسٹڈ ہوں۔"

"اور۔۔۔؟"

"میں صرف یہ چاہتی تھی کہ مسز عصرہ سے ذاتی طور پہ مل لوں۔ گیلری سے ہٹ کے مگر۔۔۔" ایک اداس نظر اس طرف ڈالی جہاں وہ اپنے گارڈز کے ساتھ جاتا دکھائی دیا تھا۔ "شاید مسز فاتح یوں ہر ایک سے نہیں مل لیتیں۔" وہ جیسے ہرٹ ہوئی تھی۔

"وہ ہر ایک سے واقعی نہیں مل لیتیں، لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ آپ کو ہر ایک کی کیٹگری میں رکھتی ہیں۔" وہ چونک کے اشعر کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں امید جاگی۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

"جی یہ ممکن ہے۔ آج رات آپ میرے اور عصرہ کے ساتھ ان کے گھر ڈنر کیجیے گا۔ وہیں آپ پینٹنگ کی بات کر لیجیے گا۔ آپ یقیناً یہ چاہتی ہیں کہ کاکا اس کو نیلامی پہ نہ رکھیں۔" ابرو اٹھا کے سوال کیا گویا اس کا چہرہ پڑھ رہا ہو۔ دونوں ابھی تک راہداری میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"جی۔۔۔ نیلامی پہ مجھے ڈر ہے کہ وہ میرے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ میں زیادہ قیمت دے کر بھی اس کو اپنے لیے پہلے سے بک کرنا چاہتی ہوں۔ مسز عصرہ واقعی میری بات رک کے سنیں گی نا؟" وہ آس سے بولی، جیسے ابھی بھی خوف زدہ ہو کہ اشعر اپنا ذہن بدل نہ لے۔

"کاکا آبنگ جیسی نہیں ہیں۔ جے تالیہ۔ وہ آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گی۔ ہاں لیکن میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ وہ پینٹنگ نیلامی سے نکالنے پہ راضی ہو جائیں گی۔" اس بات پہ وہ مسکرائی۔

"اور اگر میں کوئی ایسی سفارش لے آؤں جس کو وہ رد نہ کر سکیں تو؟"

اشعر ہلکا سا چونک کے اسے دیکھنے لگا، پھر مسکرایا۔ "آپ سفارش لائیں، ہم دیکھ لیں گے، مجھے اجازت۔" تالیہ نے مسکرا کے سر ہلایا اور ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ آگے بڑھا تو اس کے منتظر گارڈ بھی ساتھ چلتے گئے۔

"تو اس نے تمہیں گھر بلایا ڈنر پہ؟" کار میں بیٹھتے ہی وانن نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ تالیہ اطمینان سے بیٹھی اور دروازہ بند کر کے سیٹ بیلٹ پہننے لگی۔

"کیسے نہ بلاتا۔ مجھے پتا تھا وان فاتح نے مجھے گھاس نہیں ڈالنی اور اشعر ٹھہرا خوش اخلاق۔ مجھے "ہرٹ" دیکھ کے مداوا کرتے ہوئے ڈنر پہ بلا لے گا۔ سب پلاننگ کے مطابق ہو رہا ہے۔" ہیٹ اتار کے اس نے پچھلی سیٹ پہ ڈالا۔

"کل دعوت نامہ بھی اشعر نے بھیجا تھا۔ اب یہ دعوت بھی اشعر نے کر ڈالی۔ یہ تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔" وانن کار اسٹارٹ کرتے ہوئے تھوڑی کھٹکی تھی۔

"کیونکہ میں اس کی بہن کے کاروبار کے لیے منافع بخش ثابت ہو سکتی ہوں۔"

"اشعر جیسے سیاست دانوں کو گلیمرس بیوی کی تلاش ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ مزید پاپولر ہو جائیں۔"

"اسے لڑکیوں کی کیا کمی ہے داتن؟ وہ صرف اپنی بہن کے لیے کر رہا ہے یہ۔" وہ شانے اچکائے بے نیازی سے بولی تو داتن خاموش ہو گئی۔
"فاتح مجھے تاشہ کہتا ہے۔ یہ تاشہ کون ہے؟" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے سوچ میں ڈوبی بولی تھی۔
"تمہارے پاس ایک شناختی کارڈ ساشا کے نام کا ہے نا۔"
"اوہو کتنی دفعہ بتاؤں موٹی مرغی' اس نے ساشا نہیں کہا' تاشہ کہا ہے۔ میں نے اس دن ایک وژن دیکھا تھا کہ ایڈم اور میں کسی تاشہ کے خزانے کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی خزانہ ہے داتن اور کوئی تاشہ کی نظم جس سے مجھے وہ خزانہ ڈھونڈنا ہے۔"
"تو پھر انتظار کرو' تمہارے خواب تمہیں راستہ دکھا ہی دیں گے۔ فی الحال ڈنر کا سوچو۔"
"رائٹ!" وہ سر جھٹک کے سیدھی ہوئی اور گہری سانس اندر اتاری۔ "ہمارے پاس آج رات کا وقت ہے۔ ڈنر پہ مجھے عصرہ کے سامنے نقلی پینٹنگ کی اصلیت کھولنی ہے اور اس شخص کا پردہ بھی چاک کرنا ہے جو عصرہ کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ کون ہے' اس کو ہم نے شام سے پہلے ڈھونڈنا ہے۔ یہاں سے رائٹ لے لو۔ ہمیں ابھی گیلری کی طرف جانا ہے۔ وقت نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور ساتھ میں چھوٹا آئینہ نکال کے چہرے کے سامنے کیے لپ اسٹک گہری کرنے لگی۔



واپس پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر آؤ تو پارکنگ میں کار کھڑی تھی اور دروازہ کھلا تھا۔ اندر بیٹھا فاتح موبائل پہ میلز چیک کر رہا تھا اور غالباً "اشعر کا انتظار بھی۔ اشعر پارکنگ کے سرے پہ کھڑا رملی کی بات توجہ سے سن رہا تھا۔
"تمام معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ واقعی اتنی ہی امیر ہے جتنی نظر آتی ہے۔" وہ دبے دبے جوش سے بتا رہا تھا۔
"چند معروف کمپنیز میں اس کے شیئرز ہیں۔ باپ عرصہ ہوا مر کھپ گیا تھا' تب سے ساری دولت کی بلا شرکت غیرے مالک رہی ہے۔ کئی سال امریکہ میں رہی' وہیں پلی بڑھی' تین سال ہوئے کے ایل آئی ہے۔ پارٹیز اور آرٹ کی خدمت بس یہی کام کرتی ہے۔ ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ ایک چالان تک نہیں ہوا آج تک۔" پھر وہ ٹھہرا۔ اشعر جو مسکرا کے سن رہا تھا' اس کے وقفے پہ قدرے بد مزا ہوا۔
"تمہاری ٹون سے لگتا ہے تم "مگر" کہنے والے ہو۔"
"نہیں سوری سر' مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ جس کا بھی بیک گراؤنڈ ڈیٹا اکٹھا کروں اس کے دامن کا کوئی نہ کوئی دھبا ضرور مل جاتا ہے۔ ایک پارکنگ ٹکٹ ہی سہی۔ ڈرنک ڈرائیونگ کا ایک ایکسیڈنٹ ہی سہی مگر یہ لڑکی بالکل صاف ہے۔ کچھ زیادہ ہی صاف ہے۔"
"بہت سے لوگ صاف ہوتے ہیں رملی۔ بے کار کی باتیں نہ سوچا کرو۔" وہ اکتا کے بولا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ اندر بیٹھتے ہی وہ قدرے درشتی سے فاتح سے مخاطب ہوا تھا۔
"وہ کاکا کے لیے بہت منافع بخش ڈونر ثابت ہو سکتی ہے۔ بھائی آپ کو اس کو تھوڑا سا وقت دینا چاہیے تھا۔"
وہ جو عینک ناک پہ جمائے موبائل دیکھ رہا تھا' اسی طرح سر جھکائے بولا۔ "کاکا کا بہانہ نہ کرو اشی۔ تمہیں وہ لڑکی پسند آ گئی ہے۔ اس لیے تم اس پہ جتنا چاہے وقت ضائع کرو' میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"
اشعر نے فوراً "سامنے بیٹھے ڈرائیور اور ایڈم کو دیکھا اور پھر برہم سی خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔



کوالالمپور کی وہ چوڑی سڑک درختوں سے گھری تھی۔ دونوں اطراف میں دو تین منزلہ اونچی لکڑی کی عمارتیں بنی

تھیں۔ کسی زمانے میں یہ گھر تھے مگر اب ان کو تراش خراش کے بعد آرٹ گیلریز' ریسٹورانٹس اور ڈیزائنر شاپس میں ڈھال دیا گیا تھا۔ سرسبز درختوں کے پس منظر میں بھوری لکڑی کی اونچی شاپس بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ عصرہ کی آرٹ گیلری بھی ان کے وسط میں کھڑی تھی۔

گیلری کے بالکل سامنے سڑک پہ ایک پولیس کار آرکی' دروازے کھلے اور اندر سے وہ دونوں باہر نکلیں۔ تالیہ نے فرانسیسی جوڑا بنا کے سن گلاسز پہن رکھی تھیں۔ ہونٹوں پہ بھوری لپ اسٹک لگائے سیاہ کوٹ پہنے وہ سخت گیر سی آفیسر معلوم ہوتی تھی۔ جبکہ داتن پولیس کے یونیفارم میں ملبوس تھی۔

تالیہ اعتماد سے آگے چلتی' ماتھے پہ بل ڈالے گیلری کے مقابل شاپ میں داخل ہوئی جو ایک کپڑوں کا بوتھک تھا۔

"ساشا کمال۔ اے ایس پی رائل ملیشیا پولیس۔" وہ بیج کارڈ لہراتی ریسپشن پہ آئی اور ایک کہنی کاؤنٹر پہ رکھی۔ "اور یہ انسپکٹر صوفیہ ہیں۔" سنجیدہ خشک انداز میں داتن کا تعارف کروایا۔

کاؤنٹر والا لڑکا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "جی آفیسر۔ کیا ہوا؟"

"دی رو میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ہائی پروفائل۔ مجھے تمہارا سی سی ٹی وی ریکارڈ دیکھنا ہے۔" کروفر سے کہہ کر اس نے ہاتھ جھلایا اور جھک کے کاؤنٹر کی مانیٹر اسکرین اپنی جانب موڑی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" مینیجر سامنے سے چلتا آیا تو دونوں پولیس آفیسرز نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ مینیجر ناخوش لگتا تھا۔ کبھی ان کو دیکھتا کبھی گاہکوں کو جو مڑ مڑ کے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ تالیہ اسے نظرانداز کر کے واپس لڑکے کی طرف مڑی۔

"صوفیہ تمام عملے سے پوچھ گچھ کریں گی' تم مجھے کل کی فوٹیجز نکال کے دو۔" تحکم سے وہ بولی مگر اس سے پہلے کہ لڑکا کمپیوٹر پہ جھکتا منیجر سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس کے چہرے پہ ناگواری تھی۔

"وارنٹ ہے آپ کے پاس؟"

"آپ کے خیال میں میں وارنٹ کے لیے کورٹ کے چکر لگاتی رہوں اور قاتلوں کو بھاگ جانے دوں؟"

"کون سا قتل ہوا ہے یہاں؟ کمال ہے ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی۔"

"پھر دعا کرو کہ تمہارے عملے کا تعلق نہ نکل آئے جرم سے' ورنہ سارے زمانے کو خبر ہو جائے گی۔ فوٹیجز نکالو یار' کیا کر رہے ہو۔" لڑکے کو جھڑکا تو وہ فوراً" کی بورڈ پہ بٹن دبانے لگا۔ منیجر نے چبھتی ہوئی آنکھوں سے باری باری دونوں کا جائزہ لیا۔

"کون سے تھانے سے ہیں آپ؟"

"تن ایچ ایس لی پولیس اسٹیشن۔" پیچھے کھڑی داتن روکھے انداز میں بولی تھی۔

"اچھا۔ میرا کزن بھی وہاں کام کرتا ہے۔ کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا اس نے ساشا کمال صاحبہ۔"

"کیا نام ہے آپ کے کزن کا؟" وہ پرسکون رہی۔ بے نیاز اور اکتائی ہوئی۔

"منصر اللہ بیترا۔ سب انسپکٹر ہے۔"

تالیہ نے بے زاری سے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے کہ داتن تالیہ کے برابر آئی۔ "منصر اللہ بیترا تو دو سال پہلے کار ایکسیڈنٹ میں فوت نہیں ہو چکا؟ اس کی روح نے آ کر اگر تمہیں میڈم کے بارے میں خبر نہیں دی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔" سیاہ موٹی عورت اسے گھور کر چبا چبا کر کہتی دو تین قدم مزید قریب آئی تو منیجر کے تاثرات بدلے۔ وہ پیچھے ہٹا۔

"اگر تم جیسے mysognist مرد عورتوں کو وردی میں برداشت نہیں کر سکتے اور چاہتے ہو کہ ہمارے تھانے

فون کرو تو ملاؤ فون۔ اچھا ہے آج سارا دن پولیس کی گاڑیاں تمہارے اسٹور کے باہر کھڑی رہیں تاکہ گاہک ادھر آنے کی زحمت نہ کریں۔" موٹی ایک ایک حرف تپش سے ادا کرتی گھورتے ہوئے آگے آرہی تھی اور مینیجر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی کلفت اور شک سب زائل ہو چکا تھا۔

"اب ہم تھانے سے کسی مرد آفیسر کو بلا کے لائیں گے یا تم لوگوں نے تعاون کرنا ہے؟" تالیہ برہمی سے بولی۔

"لگاؤ... ان کو کیا دیکھنا ہے... شاباش دکھاؤ۔" وہ لڑکے کی طرف گھوما تو وہ لیس باس کہتا جلدی جلدی مطلوبہ فوٹیج لگانے لگا۔ تالیہ نے بدقت مسکراہٹ دبائے فلیش ڈرائیو اس کی طرف بڑھائی۔

باہر پولیس کار میں بیٹھتے ساتھ ہی وہ داتن کی طرف گھومی تھی۔ "تمہیں کیسے پتا کہ اس کا کزن مر چکا ہے۔"

داتن نے جواب میں شاہانہ بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ "میں کردار میں خود کو اچھے سے ڈھالتی ہوں تالیہ۔ جس تھانے کی آفیسر کا رول کر رہی ہوں۔ اس کے بیس سال کا ریکارڈ میرے زرخیز ذہن میں محفوظ ہوتا ہے۔ ایک ایک شخص کا نام' ایک ایک کیس کا نمبر۔"

"واؤ داتن!" وہ بے حد متاثر ہو کے بولی۔ "میں کتنی امپریسڈ ہوں تم سوچ نہیں سکتیں۔ اتنی ذہین اور باکمال گرفتر کا ساتھ میرے لیے کتنے فخر کی بات ہے۔ کاش میں بھی تم جتنی ذہین ہوتی۔" آخر میں افسوس سے بولی تو داتن کے سیاہ گالوں میں سرخی گھلی۔ وہ شرمانے کے ساتھ حیران بھی ہوئی۔

"سچ؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ چیخ کے بولی۔ "کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم جب بھی پولیس والی کا رول کرتی ہو تو کان میں لگے اس آلے سے... (اس کے کان سے ٹکڑا کھینچ نکالا) ہر وقت اپنی پولیس والی دوست سے آن لائن رابطے میں رہتی ہو' تاکہ ادھر کوئی کسی کا نام لے' ادھر تمہاری دوست تمہیں کان میں خبر کر دے۔ ہونہہ۔" آلہ اس کی مٹھی میں پٹخا۔ لیکن داتن ذرا بھی شرمندہ نہ ہوئی۔

"یہ بھی آرٹ کی ہی ایک قسم ہے۔"

"اور اسے شارٹ کٹ کہتے ہیں۔"

داتن نے افسوس سے اسے دیکھا اور کار اسٹارٹ کی۔ "دل دکھانے والوں کا قیامت کے دن الگ سے حساب ہوگا' تالیہ۔"

"اس سے پہلے دنیا کی آدھی آبادی کا کھانا کھا جانے والوں کا ہوگا۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور فلیش اس میں لگائی۔ اسکرین ذرا سیدھی کی اور گردن جھکا کے غور سے دیکھا۔ "مسز عصرو نے کہا تھا کہ میرے آنے سے پہلے عرب شیخ نے آکر پینٹنگ ان کو دی۔ یہ دیکھو' یہ میں جا رہی ہوں شاپ میں۔" وہ ویڈیو کو پیچھے کر رہی تھی جو اسٹور کے بیرونی کیمرے سے لی گئی تھی اور اس میں گیلری میں جاتے لوگ صاف دکھائی دے رہے تھے کیونکہ اسٹور اور گیلری آمنے سامنے تھے۔

"اوہ۔ یہ ہے وہ عرب شیخ جس نے مسز عصرو کو پینٹنگ دی۔ اس کے گارڈز پینٹنگ کا باکس اٹھا کے اندر لے جا رہے ہیں۔ اسے پہچانتی ہو۔" اس نے اسکرین کا رخ داتن کی طرف موڑا۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک نظر ڈالی۔

"نہیں... کون ہے یہ؟"

"یہ نوفل ہے۔ شیخ جاسم کا ملازم جس سے ہم نے پینٹنگ چرائی تھی مگر یہاں تو یہ بڑے اچھے کپڑے جوتے پہن کے آیا ہے۔ ڈیزائنر گلاسز۔ واہ۔ شیخ بننے کی اداکاری کر رہا ہے۔"

"تمہیں اس کی ابھی تک شکل یاد ہے؟" جواب میں تالیہ نے ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ "بدقسمتی سے میرا

زرخیز دماغ بیس سال پہلے تھانے کا ریکارڈ تو اپنے اندر محفوظ نہیں رکھتا' مگر ڈیڑھ سال پہلے چوری کی گئی پینٹنگ سے متعلقہ کھرکی تمام معلومات یاد ہیں مجھے۔ یہ تو نقل ہی ہے' اس کی پوری چھان بین کی تھی ہم نے۔"
"یعنی اس نے شیخ بن کے پینٹنگ مفت میں دی ہے۔ عطیے کے طور پہ۔ اگر پیسے کمانا مقصد نہیں ہے تو پھر کیا؟"

"دشمنی۔ کیونکہ جب نیلامی پہ عصرہ یہ پینٹنگ بیچیں گی اور وہاں خریدار نے ماہرین کو بلا کے اسے چیک کروایا اور میڈیا کے سامنے یہ بات کھلی کہ پینٹنگ نقلی ہے تو عصرہ مشکل میں پڑ جائیں گی۔ پچھلے دس سال سے بیچی ایک ایک پینٹنگ کا آڈٹ ہو گا۔ مقدمے.... اسکینڈل۔"
"تو ہم ان کی مدد کیوں کر رہے ہیں؟ یہ ان کا معاملہ ہے۔ ہمارا اس سے کیا لینا دینا۔"
"میں وان فاتح کو اس طرح ہرٹ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ بس میں نہیں دیکھ سکتی۔" اس نے اسکرین آہستہ سے فولڈ کی۔ "یہ جو کوئی بھی ہے' اس کا مقصد وان فاتح سے دشمنی نکالنا ہے' ناکہ عصرہ سے۔"
واتن نے ڈرائیو کرتے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ "وہ سیاست دان ہے اور وہ بھی شادی شدہ' دو بچوں کا باپ۔ تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے تالیہ۔ سیاست دان بہت رلاتے ہیں اچھے دل کی لڑکیوں کو۔"
"تین۔ اس کے تین بچے تھے۔" وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگی تھیں۔ (کیا واقعی مجھے اس سے محبت ہونے لگی ہے؟)
"خیر آج رات تم کیا کرو گی؟"
"میں!" اس نے آنکھیں رگڑیں اور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے مسکرائی جہاں بارش کے بعد اب سورج جھانکنے لگا تھا۔ "میں آج ڈنر ٹیبل پہ وان فاتح کو بتاؤں گی کہ میرا ٹیلنٹ کیا ہے۔" ایک عزم ان چمکدار آنکھوں میں جھلملانے لگا تھا۔ آنسو خاموش ہو گئے تھے۔



شہر کے دوسرے حصے میں وان فاتح کی کار ایک عمارت کے سامنے رکی تو اشعر جو اس گفتگو کے بعد سے اب تک خاموش ہی تھا' نکلنے سے پہلے اچنتے انداز میں اسے دیکھ کے بولا۔ "آپ اندر نہیں چلیں گے؟"
"ارادہ بدل دیا ہے۔ آفس جاؤں گا۔" وہ سر جھکائے ابھی تک موبائل دیکھ رہا تھا۔
"شاید آپ اس گیدرنگ کو اس لیے avoid (نظرانداز) کر رہے ہیں کیونکہ یہاں سب آپ سے استعفیٰ کی بابت سوال کریں گے۔ میرا خیال ہے' آہنگ اب وہ وقت آ ہی گیا ہے' جب آپ اپنے استعفے کا اعلان بہادری کے ساتھ کر ہی ڈالیں۔" اس کے لہجے میں برہمی اور خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔ فاتح نے نظر تک نہیں اٹھائی اور وہ کار سے نکل گیا۔
"عثمان!" اس نے بالآخر سر اٹھا کے ڈرائیو کرتے پولیٹیکل سیکریٹری کو دیکھا۔ "دی سن کی ہدی کے ساتھ شام کے انٹرویو کا وقت رکھو۔ وہ کافی دن سے کہہ رہی تھی۔"
"اوکے سر! مگر.... دی سن تو ہمارا مخالف اخبار ہے۔" وہ تذبذب سے بولا۔ (ملائیشیا میں آدھے اخبارات حکومت اور آدھے اپوزیشن کی سیاسی جماعتوں کے ہوتے تھے۔ ایک کا سچ جانب دار ہوتا تھا تو ایک کا جھوٹ۔)
"مجھے سیاست نہ سکھاؤ۔ جو کہا ہے' وہ کرو۔" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا تو عثمان خاموش ہو گیا۔ ایڈ ہلکا سا کھنکھارا۔
"سر! میں آج کا دن آف لے سکتا ہوں' دو تین گھنٹے کا۔ میرا ایک دوست۔"

"شیور۔ کار سے نکل جاؤ۔" موبائل پہ لگے فاتح نے ہاتھ جھلا کر کہا گویا مزید اپنے مطالعے میں خلل برداشت نہ کرپا رہا ہو۔ ایڈم اگلے ہی پل باہر تھا۔

اندر اشعر عمارت کی لفٹ کی طرف بڑھتا فون کان سے لگائے مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "آپ کو برا تو نہیں لگا' کاکا؟ ایک ڈنر کا بوجھ ڈال دیا میں نے آپ پہ؟"

"برا کیوں لگے گا' ایش؟ میں ہر رات کسی ڈنر کی میزبان یا مہمان بننے کی عادی ہوں۔ اور اگر وہ پینٹنگز بھی خرید لے اور اپنے جیسے دو تین آرٹ کلیکٹرز کو لے آئے تو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔" وہ حساب کتاب کر کے کہہ رہی تھی۔ "اور میں جانتی ہوں کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو' اس لیے مجھے بھی اب اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے۔"

"اچھا' اتنا شور کیوں ہے آپ کے پیچھے؟" وہ مسکراہٹ دبا کے بولا تھا۔

"چیریٹی ایونٹ پہ آئی ہوئی ہوں ایک یتیم خانے میں۔ شام کو وقت سے پہنچ جانا۔ اچھا فاتح سے تو مجھے کوئی امید نہیں ہے مگر اسے بھی آنے پہ مجبور کرنا۔" عصرہ نے فون رکھا اور مسکرا کے پیچھے کھڑے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئی جو اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ملے طرز کی لمبی قمیص اور اسکرٹ کے اوپر دوپٹہ سر پہ لیے ہوئے تھی۔ وہ ایک اونچی عمارت کے دالان میں کھڑی تھی۔ سامنے سیڑھیاں تھیں جہاں سے ان کو اوپر جانا تھا۔

"اس طرف۔" ساتھ چلتے افراد آگے بڑھے تو وہ مسکرا کے ان کی بات سنتی ننگے پیر زینے چڑھنے لگی۔ دائیں بائیں منتظمین تھے۔ چند مرد اور خواتین جو اسے وقفے وقفے سے ایونٹ کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے۔ فوٹو گرافرز بھی ساتھ ہی اوپر چڑھ رہے تھے۔

وہ اوپر زینے پہ آئی ہی تھی کہ جانے کس طرف سے ایک بچہ بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس کی رنگت سیاہ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ عصرہ نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ مسکرا کے منتظم کی بات سن رہی تھی کہ اس بچے نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑا۔ وہ چونکی' مگر پھر مسکرا کے ذرا سا جھکی تاکہ آہستہ سے اپنا ہاتھ نکال لے۔

"دھیان رکھنا۔ خبردار رہنا۔" وہ اس کے قریب ہو کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے غرایا تھا۔ عصرہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ دیگر افراد فوراً" اس طرف بڑھے تاکہ اس کو عصرہ سے علیحدہ کر سکیں مگر وہ اس کا ہاتھ جکڑے' اس کی آنکھوں میں بنا پلک جھپکے آنکھیں ڈالے غراہٹ کے ساتھ کہتا گیا۔

"ایک چور ہے۔ اور وہ **بھبو رو** (شکاربازوں) میں سے ہے۔

اس کو اپنی زندگی میں مت داخل ہونے دینا۔

وہ آئے گی اور تمہارے شوہر کو تمہاری دنیا سے دور لے جائے گی۔

وہ..." مگر ایک شخص نے اسے زور سے کھینچ لیا تو اس کا ہاتھ عصرہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اسے جھڑکتے ہوئے اپنی گرفت میں لیے دور لے جا رہا تھا اور عصرہ یک ٹک ادھر دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ شل ہو گئی تھی مگر پھر جبراً" مسکرائی اور زینے چڑھنے لگی۔ رنگت ابھی تک قدرے اڑی ہوئی تھی۔ منتظم گھبرا کے معذرت کرنے لگا۔

"یہ احمق ہے۔ کچھ عرصے سے ذہنی توازن بگڑتا جا رہا ہے اس کا۔ کہتا ہے اس کو مستقبل کے خواب آتے ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے گردن موڑ کے اس طرف دیکھا جہاں وہ بچے کو لے کر گئے تھے۔ "یہ **بھبو رو** کیا ہوتے ہیں۔"

"ہمبو رو لیجنڈ ہے ایک۔ قدیم داستانوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ ایک جادوگروں یا عاملوں کا گروہ سا تھا شاید جو اپنے آپ کو ہمبو رو (شکاری) کہتے تھے۔ مگر آپ ان باتوں میں نہ پڑیں۔ احمد کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔"
وہ اسے تسلی دینے لگا تو وہ گہری سانس لے کر زینے چڑھنے لگی۔ اُسے ان حقیقت سے ماورا باتوں پہ ویسے بھی یقین نہیں تھا۔



کوالالمپور کا وہ ایک مصروف بازار تھا۔ درمیان میں اینٹوں کی روش بنی تھی اور دونوں اطراف میں دکانوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے برآمدوں میں چھتری والے اسٹال لگے تھے جہاں لوگ رک رک کے خریداری کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں ایک ریسٹورانٹ کے اندر درمیانی میز پہ ایڈم بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے ایک کریو کٹ والا نوجوان تھا جس سے وہ ممنونیت سے کہہ رہا تھا۔
"شکریہ۔ تم نے میرے لیے وقت نکالا۔"
"کوئی بات نہیں۔ میں تو فوج سے چھٹی پہ آیا ہوا تھا۔ پچھلے ہی ہفتے رینک بڑھا ہے۔ تم سناؤ تم کیا کرتے ہو۔"
اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ وہ شاہانہ انداز میں بائیں بازو کرسی کے پیچھے کیے بیٹھا تھا۔
"میں..." وہ رکا۔ "میں ایک آدمی کا باڈی مین ہوں۔ چند دن کے لیے۔"
"واٹ؟ باڈی مین؟ چچ چچ۔" اُسے افسوس ہوا۔ "اگر تمہیں دمہ نہ ہوتا تو تم فوج میں ترقی کرتے۔ بہت۔ میرے برابر پہنچ چکے ہوتے۔" پھر نوجوان چپ ہو گیا تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔
"نصر! میں تم سے کبھی جیلس نہیں ہوں گا' بے فکر رہو۔ اگر اللہ نے میرے دوست کو وہ کامیابیاں دے دی ہیں جو میں حاصل کرنا چاہتا تھا تو مجھے حسد نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ سب کا برابر کا ہوتا ہے۔ میرا بھی ہے۔ میں محنت کروں گا تو مجھے بھی کامیابیاں ملیں گی۔"
"ہاں' یہ تو ہے۔" نصر نے کان کھجاتے ہوئے سر کو خم دیا۔ پھر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کری پف آگئے تو وہ ان سے انصاف کرنے لگے۔
"ایک بات بتاؤ... مجھے ایک الجھن ہے۔" بالآخر ایڈم مدعے پہ آیا۔ نوجوان پف کھاتے ہوئے غور سے اس کو دیکھنے لگا۔
"اگر کسی لڑ..." وہ لڑکی کہتے کہتے آدمی بول گیا۔ "کسی آدمی کو تم دو مختلف جگہوں پہ دو مختلف حلیوں میں دیکھو تو اس کا کیا مطلب ہو گا؟"
"یہ تو ان دو جگہوں پہ منحصر ہے ایڈم۔"
"کیا؟" وہ سمجھ نہیں پایا۔
"اگر کوئی شخص دو مختلف حلیے بنا کے دو مختلف جگہوں پہ موجود ہے تو یہ دیکھنا ہو گا کہ ان دو جگہوں میں کیا مشترک ہے۔ وہ کس کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے؟"
ایڈم شل رہ گیا۔ بالکل شل۔ وہ تو حلیوں میں ہی الجھا رہا۔ یہ خیال ہی نہیں آیا۔
"ایک... ایک بہت ہائی پروفائل شخص کے گرد..." ایڈم کی حیرت میں ڈوبی زبان لڑکھڑائی۔ "دو دفعہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ نوکر کے روپ میں' ایک دفعہ امیر انسان کے روپ میں۔"
"تو صاف ظاہر ہے' وہ اس ہائی پروفائل شخص کو ٹارگٹ کر رہا ہے۔"

بقیہ صفحہ نمبر 260

"آپ کا نام ضرور شاہان ہے مگر آپ کی تنخواہ اس قدر شاہانہ نہیں کہ اپنے نام کا مطلب ہر وقت یاد رکھا جائے۔" وہ کچن ٹیبل پر دھرے اشیائے خورد و نوش سے بھرے شاپرز دیکھ کر ضبط کرنے کے باوجود بھی لہجے کی تپش چھپا نہیں سکی اور کڑی نظروں سے شوہر کو گھورا۔

"بھئی، ہم اپنے نام کے معنی و مطلب کا بھرم رکھنے والوں میں سے ہیں۔" وہ شریر لہجے میں گویا ہوا۔ "آپ کی طرح نہیں کہ ہم جیسے ہینڈسم بندے کا پروپوزل کیا گیا' اپنے نام سے جھٹا جھٹ بے وفائی کا جھنڈا لہرا کر ہاتھ پیلے کر لیے۔ معاف کرنا بیگم صاحبہ! اس جھلکڑپن میں ہم آپ کے شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔" اس کا مسکراتا لہجہ اور گنگناتی آنکھیں آنسہ کو جی بھر کے زچ کر رہی تھیں۔ (اف اماں نے پتا نہیں کیا سوچ کر یہ نام رکھا تھا) "جی نہیں' میرے نام کا پہلا حرف عین سے شروع ہوتا ہے۔" وہ انتہائی خوب صورتی سے منہ کے زاویے بگاڑ کر تنک کر بولی۔

"ارے باپ رے" ہاہا۔ شاہان کا قہقہہ بلند تر تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ شاپرز میں سے تمام اشیاء نکال کر میز پر رکھتی جا رہی تھی۔

"لگتا ہے' شریف فیملی کو عید کے کھانے پر انوائیٹ کرنے کا ارادہ ہے۔" وہی سابقہ جلا کٹا لہجہ۔

"بچوں کی فرمائش پہ سب سامان لایا ہوں۔ سب کی پسند کی دو' دو ڈشیں۔" وہ لب دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

"ہاں آپ کے معصوم بچے ان ڈشوں کو بس چکھ کر سیر ہو جائیں گے۔ باقی سارا کھانا ریفریجریٹر میں بند۔" غصے سے بولتی وہ تمام باکس تابی (ملازمہ) کو پکڑاتی جا رہی تھی جنہیں وہ کیبنٹ میں تیزی سے سیٹ کر رہی تھی۔

"تو کس نے کہا ہے کہ فریج بھر اکرو۔" وہ پھل سنک میں رکھ کر دھونے لگا۔ ساتھ ہی لقمہ دیا۔

"میں اکیلی چھ' چھ ڈشنز نہیں کھا سکتی۔" وہ پتا نہیں کیوں جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

فرزانہ کھرل

الف سے عید

"اب یہ کس نے کہا ہے کہ خود کھاؤ۔" پرسکون لہجے میں پھر کہا گیا۔ "تو؟" وہ ایک دم ہی اس کی طرف مڑی اور اس کی چوڑی پشت کو گھورنے لگی۔

"تو یہ کہ جو کھانا بچ جائے' وہ تابی کو دے دینا۔ وہ اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دے گی۔" وہ بھی سنک کے سامنے سے ہٹا اور شیلف سے فروٹ باسکٹ اٹھاتے ہوئے کن انکھیوں سے بیوی کو دیکھا۔

"میں تابی کو کھانا نہیں دیتی کیا؟" آنسہ نے نظروں کے تیر سے دو شکار کیے۔

"باجی! میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔" تابی نے گڑبڑا کر صاحب کو دیکھا۔

"تمہارے صاحب کی نظر میں تو میں اول نمبر کی کنجوس ہوں۔" شاہان ٹوکری میں پھل ترتیب سے رکھتے ہوئے مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"اب یہ بھی بتادو کہ اول عین سے شروع ہوتا ہے کہ الف سے۔" بات کے اختتام پر اس کا قہقہہ نکل گیا۔ آنسہ نے میکرونی کا فل سائز پیکٹ اس کی طرف توپ کے گولے کی صورت اچھالا جسے اس نے سہولت سے کیچ کرلیا۔

"خود سے مطلب اخذ مت کیا کرو۔ بس تمہیں چیزوں کو بلکہ زائد اشیاء کو ٹھونس ٹھونس کر رکھنے کی عادت ضرور ہے۔" اس نے لہجہ حتی الامکان بشاش ہی رکھا۔

"مان لیا شاہان صاحب آپ سخی ٹھہرے۔ ہم تو خوف خدا سے مبرا ہیں۔" وہ اچھا خاصا جل ککڑی بنی جارہی تھی۔

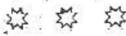
توبہ ہے آنسہ..... ہم تو نچلے درجے پہ "س" سے سخی ہیں مگر آپ ہم سے اوپر فائز ہیں یعنی "ص" سے سخی" شاہان نے شرارتی نظریں اس کے غصیلے چہرے پر گاڑیں۔

پہلے تو بات آنسہ کے سر سے گزر گئی اور جب دھیان کی ڈوریاں ملائیں تو کارن فلور کا ڈبہ وہ تاک کر مارا کہ شوہر صاحب سینہ مسلتے رہ گئے۔

"اب آپ نے میدان جنگ تیار کر ہی لیا ہے تو معذرت کے ساتھ اگلی عید پہ بس ایک ۔ چکن کڑاہی کا آئے گا پھر آپ نے شاپر سے وہ واحد پیکٹ نکال کر کہنا ہے کیا صرف شیخ رشید صاحب کو عید کے کھانے پہ بلایا ہے؟" اس نے کچھ اس طرح سے بیوی کی نقل اتاری کہ آنسہ کے ساتھ نانی کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اچھا میرے فراخدل میاں جی اب آپ تشریف لے جائیے۔" وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی۔ وہ ڈیپ فریزر میں پھل رکھ کر پلٹا۔

"تم بے چاری ک کے زیر اثر ہے یعنی کے نیچے۔ ف سے فراخدل۔ ک سے کنجوس۔ س۔ پھر بھلا کس کا رتبہ بڑا ہوا۔" اتنا کہہ کر وہ ٹھہرا نہیں تھا کیونکہ بیوی نے اب چھری اٹھالی تھی۔



شاہان اپنی شاپنگ خود کرتا تھا۔ وہ اپنی اور بچوں کی شاپنگ رمضان سے قبل ہی مکمل کرلیتی تھی۔ اس بار سات سالہ سب سے چھوٹے احد کا سوٹ خریدنا رہ گیا تھا۔ آنسہ کو کپڑوں کے رنگ پھیکے پھیکے سے لگے تھے سو کافی خواری کے بعد وہ گھر آگئی کہ بعد میں ذرا موسم ٹھنڈا ہو تو بازار کا چکر لگاؤں گی مگر ٹھنڈا موسم تو دیوانے کا خواب بن کر رہ گیا۔ اب عید میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ رات یوں ہی باتوں باتوں میں اس نے احد کے سوٹ کا سرسری ساذکر کیا۔

"اس وقت تو قیمتیں آسمانوں کو چھو رہی ہوں گی۔" شوہر نے جواب میں خاموشی اختیار رکھی مگر ایک بولتی نظر بیوی پہ ضرور ڈالی کہ میرا بیٹا عید پہ نیا جوڑا ضرور پہنے گا۔

دوسرے دن سہ پہر کو اس کی بھانجی زارا کا فون آگیا کہ امی کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک شوٹ کرگیا ہے۔ آپ جلدی سے آجائیں تاکہ انہیں اسپتال لے جاسکیں۔ وہ بھاگم بھاگ بمعہ بچوں کے بڑی آپا کے گھر پہنچی۔ آج شاہان کی اپنے دوستوں کے ساتھ افطار پارٹی تھی۔ رات کو واپسی پہ اسے احد کا سوٹ یاد آیا۔

اس کے کہنے پر زارا نے گاڑی کا رخ شاپنگ مال کی طرف کیا۔ کافی خواری کے بعد اسے خدا خدا کرکے ایک سوٹ پسند آہی گیا مگر قیمت پڑھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"تین ہزار۔۔۔ نہ بابا۔۔۔ نا۔۔۔"

"کیا ہے خالہ! اتنی مشکل سے آپ کو سوٹ پسند آیا ہے۔ آپ جتنی رقم میں سوٹ چاہتی ہیں وہ مجھے دیں۔ عید میں ایک دن تو رہ گیا ہے۔" زارا جھنجلا کر بولی۔ رقم ہاتھ میں آنے کے بعد اس نے ہزار اپنی طرف سے ڈال کر وہ سوٹ خرید لیا۔ وہ ارے ارے

کرتی رہ گئی۔

"ہمارے رزق میں رشتے داروں کا بھی حصہ ہوتا ہے خالہ۔" بھانجی کی فراخدلی پہ وہ جزبز ضرور ہوئی مگر مزید کچھ نہیں کہا۔ واپسی کا سفر زارا اور بچوں نے ہنس بول کر آئس کریم کھاتے ہوئے طے کیا، لیکن وہ خاموش ہی رہی۔

اس کا شوہر انکم ٹیکس میں انسپکٹر تھا۔ تقریباً" اس کی تنخواہ پچاس ہزار تھی، مگر وہ ہر وقت بچت کے چکروں میں پڑی مہنگائی کا رونا روتی رہتی۔ اس شہر میں صرف اس کی ایک بہن رہائش پذیر تھی۔ اپنی اکلوتی بھانجی کو بھی آنسہ نے کبھی عید بقر عید پہ تحفتاً" کچھ نہیں دیا تھا۔ حالانکہ اس کا بہنوئی ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھا۔ رات سوتے میں بھی اس کے کانوں میں زارا کا جملہ گونجتا رہا کہ ہمارے رزق میں رشتہ داروں کا بھی حصہ ہوتا ہے جبکہ خود آنسہ غریب غربا اور مساکین کو بھی ناپ تول کر دیتی تھی۔ زارا نے کیسے جھٹ سے ہزار کا نوٹ نکالا تھا اور تین چار سو کی آئس کریم بھی بچوں کو کھلائی۔ اس کا بہنوئی بھی افطاری میں کیا کچھ نہیں اٹھالایا تھا۔



اپنے سامنے ایک ہی جیسے دو سوٹ دیکھ کر وہ صدمے کے مارے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

"تت 'تت تم مجھ سے فون پر پوچھ تو سکتے تھے؟؟"

شدید غصے میں وہ یوں ہی ہکلاہٹ کا شکار ہو جاتی تھی۔

"او... ہو... یار! ڈیزائن ایک ہے تو کیا ہوا۔ رنگ تو مختلف ہیں۔" اتفاقاً" ان دونوں میاں بیوی نے ایک جیسے سوٹ خرید لیے تھے۔ شاہان نے ہاتھ بڑھا کر قریب کھڑے بیٹے کو قریب تر کیا اور اس کے پھولے رخساروں کو فرط محبت سے چوما۔

"میں ابھی آیا بابا۔" وہ ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف بھاگا۔

"اب کومے سے باہر آجاؤ..." وہ بیوی کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔

ہوئی بات میں یار... جبکہ اس بات کو... کہ ہماری چوائس ہنڈرڈ پرسینٹ ملتی ہے۔" آنسہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ احد دوبارہ اندر آیا۔ اس کے ساتھ تائی کا بیٹا شعبان بھی تھا جو احد کا ہی ہم عمر تھا اور اسے عید کا جوڑا دکھانے لگا۔

"اور یہ...؟" شعبان نے دوسرے سوٹ پہ ہاتھ رکھا۔

"یہ بھی میرا ہے۔" احد کی بات سن کر اس کا چہرہ پھیکا سا پڑا۔ دوسرے پل احد اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کے اس گوشے کی طرف لایا جہاں اس کے کھلونوں کا ڈھیر موجود تھا۔ شاہان نے جن نظروں سے بچے کی طرف مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھوں میں اس خواہش کی تحریر آنسہ نے بخوبی پڑھ لی تھی۔ وہ قارئین کی اس صنف میں سے تھی جن پر پڑھی جانے والی تحریروں کا اثر کم ہی ہوتا ہے۔ وہ بس ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ وہ جس قدر کھلے ہاتھ کا مالک تھا، آنسہ اس کے برعکس تھی ——— وہ دوسروں پہ پیسہ خرچ کرنے کو ضائع کرنے کے مترادف سمجھتی تھی۔ شاہان ہلکے پھلکے انداز میں اسے ٹوکتا بھی رہتا تھا جسے سن کر وہ کچھ یوں جواب دیتی کہ اگر تمہارے مشوروں پہ چلوں تو چند دنوں تک گھر میں صرف فرنیچر ہی رہ جائے گا۔ "سادہ غذا کھاؤ۔ عمر زیادہ پاؤ" آنسہ کے زیر کنٹرول کچن کا حال بھی ایسا ہی رہتا تھا، مگر عید... بقر عید پر وہ اس کی ایک نہیں چلنے دیتا تھا۔

شاہان بڑے بیٹے کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے گیا ہوا تھا۔ افاویہ اور احد کو ناشتہ دینے کے بعد وہ تائی کے ساتھ دوپہر کے کھانے کی تیاریوں میں جت گئی۔ "باجی آپ کی بہن کا کیا حال ہے؟" تائی کے استفسار پر وہ چونکی۔

"ہاں اب بالکل ٹھیک ہے۔"

"باجی! ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں مانیں گی؟" تائی کے لہجے میں جھجک در آئی۔

"برا مانوں گی تو ڈانٹ دوں گی۔ تم پوچھو..." وہ ہنس کر بولی۔

"باجی! آپ اپنی آپا کو بھی عیدوں پر بھی گھر نہیں بلاتیں اور آپ بھی ان کے گھر کم جاتی ہیں حالانکہ اس شہر میں آپ کا اور کوئی رشتے دار نہیں تو اس لحاظ سے آپ دونوں کا ایک شہر میں ہونا کسی نعمت سے کم نہیں۔" وہ کام چھوڑ کر ہونقوں کی طرح تابی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ابا نے آپا کو دس مرلے کا گھر بھی خرید کر دیا اور ایک گاڑی بھی دی کہ اسے سسرالی وراثت سے کچھ زیادہ نہیں ملا تھا اور آنسہ کو صاف کہہ دیا۔

"تمہارا گھر اپنا ہے۔ تمہارے سسر نے بیٹے کو اچھی گاڑی بھی دلا دی ہے۔ بہن سے مقابلہ مت کرنا۔"

اس نے مقابلہ تو نہیں کیا، مگر شاید وہ حسد تھا کہ اسے بے انصافی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی کیفیت کبھی سمجھ نہیں پائی۔ تابی نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا جو ہنوز بت بنی کھڑی تھی۔ کچھ زارا کی بات بھی اس کے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ تب ہی شعبان بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس نے ہزار بار کا پہنا ہوا سوٹ عید کے روز بھی پہن رکھا تھا۔

"تابی! تم نے بچے کے لیے نئے کپڑے نہیں خریدے۔ میں نے تمہیں اس بار تنخواہ زیادہ دی تھی۔" آنسہ کے دل میں گرد سی اڑی۔

"باجی خریدے تھے، مگر صبح آتے ہوئے پہلے بھائی کے گھر گئی تھی اس کے بیٹے نے صرف نیکر پہنی ہوئی تھی۔ میں نے وہ سوٹ اس کو دے دیا۔ عید صرف خوشی کا نام نہیں، دوسروں کا احساس کرنا اور وہ کیا کہتے ہیں ایثار۔۔۔"

"ایثار۔۔۔" آنسہ جیسے زیر لب بولی۔

"ہاں وہی۔۔۔ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا عید ہے۔" آنسہ کی سماعت میں تابی کے لہجے نے بم پھوڑا تھا۔ وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں وہاں سے چل کر اپنے کمرے میں آئی اور احد کا تین ہزار کا جوڑا اٹھا کر واپس کچن میں پہنچی۔

"تو شعبان کو پہنا دو۔" تابی نے جھجکتا کر وہ سوٹ پکڑ لیا۔" کچھ دیر بعد شعبان کا مرجھایا ہوا چہرہ گلاب کا پھول بنا ہوا تھا جس کی خوشبو ایک خوشی کی صورت تمام گھر میں پھوٹ رہی تھی۔

"میں نے آپا کو فون کر دیا ہے۔ وہ لوگ دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔" کچن میں داخل ہوتے شاہان نے حیرت سے سنا۔ وہ شاید تابی کو بتا رہی تھی۔ اس نے لان میں احد کے ساتھ شعبان کو کھڑے دیکھا تھا۔ اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔

"ہنہ ہنہ۔" وہ **کھنکھارا**۔ آنسہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فالسئی اور شربتی رنگ کے امتزاج کے لباس میں انتہائی دلکش لگ رہی تھی۔ کسی اپنے یا ضرورت مند پر خرچ کیے جانے والا پیسہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ ایک تعجب سے سکون کا باعث بنتا ہے۔ یہ کیفیت اس نے آج دل سے محسوس کی تھی۔

"بھئی تابی! مجھے آج تمہاری ذہانت کا امتحان لینا ہے؟" وہ دلچسپی سے بیوی کو دیکھ کر تابی کی جانب متوجہ ہوا۔

"جی پوچھیں۔۔۔" اس نے بھی چھری سلیب پر رکھی۔

"عید کا پہلا حرف کون سا ہے۔"

"لو جی یہ کون سا مشکل سوال ہے۔" تابی نے دانت نکالے۔ "عین سے عید۔"

"اور اب بتاؤ آنسہ کا پہلا حرف کون سا ہے۔" اس نے شوہر کو تیکھے چتون سے دیکھا۔

"الف سے جی۔" تابی نے جھٹ جواب دیا۔

"ہوں۔" وہ بہت محظوظ ہو کر مسکرایا۔

"اب اگر عین سے آنسہ پکاریں تو عید کا پہلا حرف کیا ہوگا؟" صاحب کی بات پہ تابی نے کچھ دیر سوچا۔ پھر جھٹ بولی۔

"الف سے عید۔۔۔" چند لمحوں کے توقف سے تابی کے جواب پہ دونوں میاں بیوی کا مشترکہ قہقہہ بلند ترین تھا اور تابی ہراساں سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ آنسہ نے منہ پہ ہاتھ جما کر بمشکل ہنسی کو کنٹرول کیا پھر آگے بڑھ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"الف سے احساس۔ الف سے ایثار تو پھر الف سے ہی عید بنتا ہے۔" تابی نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔



افراح سکندر خان

منہاری

وہ مینا تھی' درختوں پہ چہچہاتی' پروں کو پھیلاتی' بل کھا کر اڑ اڑ جاتی۔ اپنی آواز سے فضا کو مہکاتی' چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ راگ الاپتی... وہ مینا تھی۔ سحر میں حمد و ثنا کرتی... شام میں کلمہ شکر پڑھتی... آنگن میں پھدکتی... دانہ دنکا چگتی... کھیلتی...

دن بڑے روشن تھے کہ یک دم سمت غیب سے اک آندھی چلی اور سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ وہ جس کی چہکار آنگن کی فضاؤں میں گونجتی تھی۔ آہ و فغاں میں بدلنے لگی۔ کیونکہ چہکاریں باپ کی چھتر چھایا میں ہی گونجتی ہیں۔ جب چھت گر جاتی ہے تو گھر فسندہ غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ گونجتی چہکاریں صیاد اور درندوں کے لیے دعوت عام ہو جاتی ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ چہکاریں بند ہو گئیں۔ انہیں بند ہونا ہی پڑا۔ کیونکہ مینا نڈھال ہو گئی تھی۔ بانسری بھی تب ہی سر اٹھاتی ہے جب اس میں پھونک گزرتی ہے۔ بھوک سے نڈھال مینا میں اتنی توانائی نہیں تھی کہ پھونک بھی بھر سکے۔

☼ ☼ ☼

ایک صبح جب آنگن کی فضائیں نوحہ کناں تھیں۔ گھر کی تمام لڑکیاں کمروں میں دبکی کل کے انجانے خوف میں گھل رہی تھیں۔ باورچی خانہ اور خالی مرتبان اور ان مرتبانوں کے پیندے تک صاف ہو چکے جیسے آخری بھور ڈھونڈنے کی بھی تگ و دو کی گئی ہو تو ایسے ٹھہرے ہوئے موت کے سکوت جیسے گھر میں اماں نے شور برپا کر دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے وہ چوڑیاں باہر نکالیں جن کی جوڑائی کرنا باقی تھا۔ دو دن سے لڑکا پوچھنے آ رہا تھا۔ پچھلے ہفتے تو میت کا گھر تصور کر کے ٹھیکیدار نے لڑکا نہیں بھیجا تھا' لیکن کب تک...

"چلو لڑکیو! جلاؤ چمنیاں' بیٹھو اپنی اپنی جگہ اور ان کی جوڑائی کرو۔"

لڑکیوں نے انہیں تعجب سے دیکھا۔ کل شام تک جو اماں سر پہ دوپٹا باندھے سسکیوں کے درمیان کھانس کھانس کے ادھ موئی ہوئی جاتی تھیں' ان کی آواز میں یہ گونج کہاں سے آ گئی۔ وہ منہار کی بیوی تھیں۔ کتنی تپش پہ شیشہ پگھلتا ہے اور پھر اس پگھلے شیشے کو کیسے پٹخنا ہے وہ خوب جانتی تھیں۔ جب لڑکیاں ٹس سے مس نہ ہوئیں بلکہ منجھلی کی ہچکی بندھ گئی تو اماں نے سب سے پہلے اسے ہی پٹخا۔

"رو اور رو... بس روتی جا پھر ان ہی آنسوؤں سے ان چھوٹوں کا پیٹ بھرنا۔ اے چھوٹے ادھر آ' یہ اس کے گال سے آنسو اٹھا اور پی۔" اب وہ چھوٹے کو کندھے سے پکڑے جھنجھوڑ رہی تھی۔ "تجھے بھوک لگی تھی نا' رات کو بھی روتا رہا ہے۔ تو لے یہ اب اسی جوگی رہ گئی ہے کہ ان سے ہی پیٹ بھرے تیرا۔" آٹھوں کے آٹھوں بچے سہم گئے۔ انہیں لگا باپ چلا گیا دنیا سے اور اماں ہو گئی ہے پاگل... بڑی آپا ہی آگے آئیں۔ اور چھوٹے کو اماں کی گرفت سے چھڑایا۔

"اسے چھوڑ اور جا... جا کر پنکھا چالو کر' چمنیاں جلا۔ تیل بھی تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ ان کی جوڑائی کرو۔ جو پیسے ملیں گے' سب سے پہلے تیل ہی لاویں گی۔" اونچا بولتے بولتے ان کی آواز خود کلامی میں ڈھل گئی۔

"اور مینا تو... تو ادھر آ! ویسے تو تیرے پیروں میں

ہیے فٹ تھے کہیں ٹکتی نہیں تھی۔ اب کیا زنگ لگ گیا ہے...؟" اس نے سوچا کہیں اماں کی عقل کو تو زنگ نہیں لگ گیا... ابا کی میت کے اگلے روز ہی تو اماں نے اسے مار پیٹ کے کہا تھا کہ "تو یتیم ہے اب۔ اس طرح آوارہ پھرنا بند کر' گھر میں رہا کر نہیں تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

اب وہ سہمی کھڑی اماں کو دیکھ رہی تھی۔

"اے کاکی' جا اپنا دوپٹہ لا۔" کاکی بھاگ کر اپنا ڈوپٹہ لے آئی۔

مینا نے اس وقت کاکی کے ہی نیلے رنگ کے بد رنگ کپڑے پہن رکھے تھے جو کاکی کے بعد تاجی اور پھر اس کے حصے میں آئے تھے۔ لال رنگ کا بدرنگی پٹی نما دوپٹہ اس نے سر پہ لیا ہوا تھا جو اس کے سر کا پچھلا حصہ ڈھانپنے میں ناکام تھا۔ اماں نے اسے کھینچ کے اتارا اور کاکی کا بڑا دوپٹہ اسے دے مارا۔

"لے یہ پہن۔" کاکی نے آگے بڑھ کر اس دوپٹے کو بکل کے طرز پہ اسے اڑھایا۔ "جا کر بلا کر لا سب عورتوں کو۔ کہہ دے اماں نے پنکھا (کمپریسر) اور چمنیاں چالو کر دی ہیں۔ آ جائیں دیہاڑی پر اور خبردار جو دوپٹہ سر سے اتارا۔"

مینا بھاگ کر دروازہ پار کر گئی۔

محلے ہی کی سات عورتیں آتی تھیں دیہاڑی پہ۔ مینا ان سب کے گھر گئی' لیکن واپسی پہ جو خبر اس کے پاس تھی اس کے ڈر سے وہ دروازے پہ ہی جم گئی۔ پھر جس کمرے میں پنکھا (کمپریسر جس کے آگے چمنیاں لگی ہوتی ہیں) چل رہا تھا (اس کا دروازہ گلی میں کھلتا



تھا) اس دروازے سے اندر جھانکا اور بڑی آپا کو اشارے سے بلایا۔

"آپا وہ کہتے ہیں کوئی رشیدہ خالہ کے گھر ہے تو کوئی نیاز بھائی کے پاس گئی ہے کام کرنے۔" آپا نے سنا تو ان کی سانس رک گئی۔

سانس تو اماں کی بھی رک گئی تھی وہ بھی اسی کمرے میں ایک چمنی پہ بیٹھی تھیں۔ سب ان کے غم میں شریک تھے' ان کے ہمدرد تھے' لیکن ایک ہی عذاب تھا جو سب کے ساتھ چمٹا تھا۔ سارا فساد ہی اسی کا ڈالا ہوا تھا..... پاپی پیٹ کا عذاب۔



ابا جس چوڑی کی فیکٹری میں کام کرتا تھا وہاں سے پوچھنے پہلے تو کوئی نہ آیا پھر کچھ دن بعد ایک آدمی آیا اور دو لفظ ہمدردی کے بول کر چلا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ دو تین بار آیا۔ چوڑیوں کی سجاوٹ کا کام بھی اس نے اماں کو لا کر دیا' لیکن وہ کام اماں کو نہیں آتا تھا۔ پھر اسی کے مشورے پہ اماں نے بڑی اور چھوٹی آپا کو ایک گھر میں چوڑی کی سجاوٹ کا کام کرنے بھی دیا۔ دن کا زیادہ حصہ دونوں بہنیں وہاں گزار کر آتی تھیں گو کہ وہ رات کو جوڑائی اور سدھائی کا کام بھی کرتی تھیں' لیکن پھر بھی دن کو مینا کا کام بڑھ گیا تھا۔ اماں فجر کے وقت انہیں جگا دیتیں (وہ تو پہلے بھی جگاتی تھیں' لیکن اب مارنا پیٹنا بھی پڑتا تو چوکتی نہیں تھیں)۔ ابا ہی تھا جس کی آمدن سے زیادہ خرچے نکلتے تھے' یہ گھر میں تو اماں زائد آمدن کے لیے کام کرتی تھی۔ ان کا گھر گلی کے کشادہ اور پکے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ اسی لیے زائد جگہ پہ اماں نے چمنیاں لگائی تھیں۔ گھر کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹی بھٹی بھی تھی جو ابا نے خود بنائی تھی۔ کچھ عورتوں نے دوبارہ دیہاڑی پہ آنا شروع کر دیا تھا' لیکن پھر بھی بڑی مشکل تھی۔ ان کی پہلے بھی ساری تگ و دو روٹی کے لیے ہوتی تھی' لیکن یہ تگ و دو اب بقا کی جنگ میں بدل چکی تھی۔

دیہاڑیاں دینے' تیل کے خرچ کو نکالنے کے بعد اتنے پیسے ہی بچتے تھے کہ وہ دال روٹی کر لیتے بمشکل دو وقت کی۔ بڑی اور چھوٹی آپا دوپہر کا کھانا چھوڑ دیتیں کہ وہ کھا کر آئی ہیں۔

سجاوٹ (ویلوٹ اور سلک کے کپڑے کی سجاوٹ) کرنے کے پیسے جوڑائی اور سدھائی سے زیادہ تھے۔ اماں کو بھی اطمینان تھا کہ دونوں خود اپنی کمائی سے اور کچھ نہیں تو بیاہ کے چاولوں کا ہی خرچ اٹھا لیں گی۔

پہلے تیرہ چمنیاں جلتی تھیں تو سب مل کر پچاس سے ساٹھ توڑے (فی توڑا 365 چوڑیاں ہوتی ہیں فی توڑے کی قیمت دس روپے ہے) چوڑیوں کے تیار کرتے تھے۔ اب اماں کا بس نہیں چلتا تھا کہ یہ لوگ نوے سے سو توڑے تیار کریں۔ عورتوں کی تعداد اماں بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔

سارا سارا دن چمنیوں کے آگے گزر جاتا۔ گرمی کے دن اور چمنی کی تپش کبھی کبھی مینا کو لگتا کہ اس کے ہاتھ اب تپش کے عادی ہو گئے ہیں۔ انگلیوں کی کھال تو ویسے ہی جلی جلی محسوس ہوتی (چوڑی کے جوڑائی سے پہلے دو سرے ہوتے ہیں چمنی کی آگ سے دونوں سروں کو ہاتھ سے پکڑ کر جوڑا جاتا ہے)

ابا کے جانے کے بعد اماں کی تو جیسے ساری بیماریاں کہیں گم ہو گئی تھیں اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کیونکہ اماں کے پاس دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ سب بچوں سمیت مٹی کا تیل پی لیتیں یا پھر بیماریوں کو بھول کر چوڑیوں کے سروں کے ساتھ گھر کی جوڑائی بھی کر لیتیں۔

ایک تیسرا راستہ بھی تھا جو اماں کو تو "پتا" تھا' لیکن اس کا "پتا" انہوں نے ابھی اپنی اولاد کو نہیں بتایا تھا نہ ہی کبھی خود اس راستے پہ گئی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ کھانا کم پڑنا شروع ہو گیا کیونکہ دونوں آپاؤں نے سجاوٹ کے کام کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا۔ کالی نے تو باقاعدہ جھگڑا کیا تھا کہ وہ نہیں جاتیں تو وہ اور ناجی چلی جاتی ہیں' لیکن اماں نے اس کی وہ دھلائی کی کہ الامان.....

چھوٹا..... گھر بھر کا لاڈلا اور اکلوتا لڑکا تھا۔ بھوک کا کچا

بھی، جب اسے دوپہر کے کھانے میں روٹی کم ملی تو اس نے واویلا کیا۔ کسی نے توجہ نہ دی تو کھانا چھوڑ دیا کہ آدھی روٹی کھا کر بھی تو بھوکا ہی رہنا ہے نا تو اچھا ہے وہ یہ آدھی بھی نہ کھائے۔ اس سے پہلے کہ اماں اسے مارتیں، چھوٹی آپا نے اپنی روٹی آگے کھسکا دی۔ اس نے آپا کو دیکھا اور پھر کھا گیا۔

اس رات جب سب سو رہے تھے تو پیروں کے درد سے نڈھال مینا نے سنا کہ رات ساکت نہیں ہے بلکہ کرلا رہی ہے... رو رہی ہے۔ تھکاوٹ سے مندی آنکھیں کھلنے میں ناکام تھیں، لیکن تجسس تھا... کہ کیا ماجرا ہے؟ وہ نیند کے خمار میں ہی اٹھ بیٹھی۔ بڑے کمرے میں جہاں سب اکٹھے سوتے تھے وہاں اماں نہیں تھیں۔ بچے کی فطرت ہے وہ کہیں سے آئے، کہیں جائے یا سو کر اٹھے اسے سب سے پہلا خیال ماں کا ہی آتا ہے۔ ماں کو غائب دیکھ کر مینا بھی بھرے کمرے میں سہم گئی پھر چوکس ہو گئی۔

دبے دبے قدم اٹھاتی۔ دبی دبی سسکیوں اور بھنبھناہٹوں کا سراغ پاتی وہ چمنیوں والے کمرے کے باہر جا کھڑی ہوئی۔

''ہم چوڑی بیچتے ہیں... چوڑی۔ یہ چوڑی ایسے ہی بن اور بک نہیں جاتی۔ جان جلانی پڑتی ہے۔ کانچ کے چیرے اور ان سے نکلے خون سے ہم رنگتے ہیں ان چوڑیوں کو۔ کم بخت، کمینہ۔ کیڑے پڑیں اس رذیل میں اور تم دونوں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہم صرف ''چوڑی'' بیچتے ہیں۔

''اب جاؤ سو جاؤ... کرتی ہوں کچھ... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

اور وہ ''کچھ نہ کچھ'' مینا کے پہیوں کو مزید تیز کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مینا کے پر ایک دم سے پھر کھول دیے گئے تھے۔ اسے اڑنا تھا کیونکہ وہ اسی لیے پیدا کی گئی تھی۔ چھوٹا مدرسے کے لباس میں سر پہ ٹوپی جمائے (صرف وہی مدرسے جاتا تھا) مینا کی پرواز کا ساتھ دینے میں ناکام تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے بس بھاگا چلا جا رہا تھا۔ کچا قلا سے جو بھاگنا شروع ہوئے تو اب پھولی سانسوں، دوپٹے کی بکل جو پیروں سے ذرا اوپر تھی۔ گیارہ سالہ مینا اور نو سالہ چھوٹا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ''ریشم گلی'' میں کھڑے تھے۔

مینا کے کانوں میں اس کی ماں کی کرخت آواز گونج رہی تھی۔ ''یہ چھوٹے کا ہاتھ پکڑ اور بھائی نواب کے پاس جا اور یاد رکھنا چھوٹے...! بہن کا ہاتھ نہیں چھوڑنا اور تو یاد رکھنا کہ تیرا ہاتھ صرف چھوٹا ہی پکڑ سکتا ہے۔''

چاچا نواب (ابا کے دوست) کو ریشم گلی میں ڈھونڈتی یہ سوچ رہی تھی کہ اماں نے اسے بڑا بنا کر بھیجا ہے، لیکن دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ کچا قلا سے ریشم گلی کی پندرہ منٹ کی دوڑ نے چھوٹے کو ''چھوٹے'' سے ''بڑا'' بنا دیا تھا۔ اسے مینا کا سربراہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ چھوٹے کا مدرسہ جانا بند ہو گیا تھا۔ اب وہ چاچا نواب کے ٹھیلے کے ساتھ والی پلاسٹک کے برتنوں کی دکان پہ ملازم ہو گیا تھا۔ بڑی آپا کا رشتہ نواب چاچا کے چھوٹے بھائی سے طے کر دیا گیا تھا۔

دن کی روشنی میں سب بہنیں چوڑیوں کی جڑائی کرتی تھیں۔ شام ڈھلے مینا کو آپا نے قرض پہ لیے گئے سامان سے چوڑی کی سجاوٹ کا کام لینا شروع کر دیا۔ دن بھر مینا شیشے کی چوڑی کے ساتھ ہاتھ جلاتی اور شام کو دھات کی چوڑی کے لیے گوٹے، ویلوٹ اور سلک سے پھول بوٹے بنا کر گوندے سے جوڑتی، لیکن پھول بوٹے بنانے میں زیادہ مزا تھا۔ مینا اور اس سے چھوٹی سات سالہ بالی یہ کام جلد ہی سیکھ گئی تھیں، لیکن ایک مسئلہ تھا... بجلی... رات کو کام کرنے کے لیے بجلی درکار تھی، لیکن اماں نے اس کا حل بھی ڈھونڈ لیا۔

ایک شام اماں مینا اور بالی کو بھی بازار لے گئی۔ ان کے گھر ایک بلب جلنا محال تھا، لیکن بازار میں تو روشنیوں کا سیلاب تھا۔ چاچا نواب کے ٹھیلے پہ

کھڑے جب مینا بازار میں سے گزرتے لوگوں کو دور کھڑی ریڑھی سے چپس خریدتے دیکھ رہی تھی تب اماں ان کی بنائی چوڑیاں چاچا نواب کو فروخت کر رہی تھی۔ چاچا نواب نے ہی انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ سیدھا دکانداروں کو مال سپلائی کریں کیونکہ ٹھیکیدار اور بچولیے محنت زیادہ وصولتے ہیں اور اجرت کم دیتے ہیں، انہوں نے یہ بھی امید دلائی تھی کہ وہ دوسرے ٹھیلے والوں کو بھی ان کا مال دکھائیں گے۔

اس رات بازار سے واپسی پہ اماں کو چوڑیوں کے جتنے بھی پیسے ملے تھے، اماں نے اس کی دو لالٹینیں خریدلی تھیں۔ ان کی روشنی میں وہ رات کا بیشتر حصہ چوڑیوں کی سجاوٹ کرتیں۔ دن کو باقی سب کی نسبت زیادہ سوتیں پھر اٹھ کر چمنی پہ آ بیٹھتیں۔ پھر ایک ایک کر کے سب بہنیں رات کو ان کے ساتھ بیٹھ کر چوڑیاں اور کڑے سجانے لگیں۔ دو سے تین ٹھیلے والوں نے بھی ان سے مال خریدنا شروع کر دیا۔

پہلے پہل اماں ان کے ساتھ مال دینے جاتی تھی، لیکن پھر جوڑوں کی تکلیف کے باعث صرف مینا اور بالی ہی مال سپلائی کرنے جانے لگیں۔ پھر کچھ دکانیں چھوڑ کر ایک بڑی چوڑی والی دکان والے نے بھی ان کو آرڈر دیا۔ سامان بھی وہی دیتا تھا۔ بس کرنا یہ ہوتا کہ گاہک اپنی مرضی کا ڈیزائن اور رنگ بتائے گا اور انہیں ویسی ہی چوڑی بنا کر دینا ہوتی۔ چوڑی پہ نام لکھنے والی تکنیک بھی ان دونوں نے سیکھ لی۔

شروع شروع میں جب وہ بازار جانے لگیں تو ایک دو مرتبہ ان کو ایک ٹھیلے والے نے سموسے لے دیے۔ ان کے تو مزے ہو گئے۔ پھر جتنی بار وہ جاتیں وہ بھی سوڈے کی بوتل تو کبھی چپس منگوانے لگا۔ ان سے باتیں کرتا لطیفے سناتا۔ ایک دن چھوٹے نے دیکھ لیا۔ اس نے بھی ان سے بوتل مانگی، لیکن دونوں نے انکار کر دیا۔ بدلے کے طور پہ اس نے اماں کو ان کی شکایت لگادی۔

اماں نے سنا تو دونوں کو دھنک کر رکھ دیا۔ پھر بھی چین نہ پڑا تو مینا کو چمنی کے سامنے لے گئیں اور لگی آگ لگانے، لیکن سب بہنوں نے مینا کو اماں سے جھپٹ لیا۔ کاکی اس کو چھت پہ لے گئی۔

پھر شامت آئی چھوٹے کی اس رات چھوٹے نے غیرت کے وہ سب سبق پڑھ لیے جو پڑھتے پڑھتے عمر لگ جائے یا بہت سو کی تو عمر بھی کم پڑ جائے۔

اس رات مینا اور بالی کو بھی بہت سے سبق پڑھائے گئے۔ چھوٹی آپا اور کاکی جو مناسب الفاظ استعمال کر سکتی تھیں۔ وہ سب کیے۔ اماں نے سب بڑیوں کو چھوڑ کر مینا اور بالی کو ہی کیوں منتخب کیا۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا نے کیوں گھر سے باہر جا کر کام کرنا بند کیا۔ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ..... عورت کیسے اپنی جگہ بناتی ہے کہ مردوں کے ہجوم سے بھی گزرے اور ان کو۔

زندگی کی کتاب کا وہ باب جسے "عزت اور غیرت" کہتے ہیں اس کے سب ہی ورق پلٹے گئے۔

سات، نو اور گیارہ سال کے "کچے" "محنت کشوں کے "کچے" ذہنوں کے لیے وہ رات بہت بھاری تھی۔



پھر یوں ہوا کہ مینا اور بالی کو پرواز کے نئے طریقے آ گئے۔ کوئی انہیں بلاتا یا روکتا تو وہ چونک کر پلٹتی نہ تھیں۔ بلکہ ان کی رفتار میں تیزی آجاتی تھی۔

باہر نکلنا مجبوری تھی۔ کسی نہ کسی کو تو نکلنا ہی تھا۔ کیونکہ گھر پہ بیٹھ کے کام کرنے اور اپنا استحصال کروانے میں اور مال سیدھا دکانداروں کو فروخت کرنے میں بہت فرق تھا۔ گھر میں وہ اور ان کا ہنر اوجھل تھا۔ اب وہ مارکیٹ میں آگئی تھیں، ان کے کام کی تعریف گاہک ان کے سامنے ہی کرتا تھا۔ اب انہیں پیسے بھی زیادہ ملتے تھے۔

جیسے مینا بھی پرواز بھرا کرتی تھی ویسے ہی وقت نے بھی پرواز بھرلی۔ اماں کا دمہ بگڑتا گیا۔ چھوٹی آپا، تاجی اور کاکی کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ اماں کا ایک ہی کلیہ تھا اس سے پہلے کہ لڑکیاں اندھی ہوں انہیں دمہ لگے یا جوڑوں کی تکلیف ہو انہیں بیاہ دو۔ اور انہیں کون سا جہیز جوڑنے تھے۔ سارے ہی ایک جیسے تھے سب کو

سب کے حالات ازبر تھے۔ لوگوں کو ہنر مند بہوئیں چاہیے تھیں جو شوہر کا بازو بنیں اور ہنر ان کے گھر میں بہت تھا۔

چاچا نواب اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب تو اس نے ایک چھوٹی سے دکان بھی بنالی تھی۔ مانو کے لیے اماں آج کل رشتے کی امید میں بیٹھی تھیں اس کے بعد مینا کا نمبر تھا۔ چھوٹا اب ایک بڑے اسٹور پہ جانے لگا تھا۔

زندگی یوں ہی کبھی روشن، کبھی لو اس اور کبھی اندھیر میں سے گزر رہی تھی کہ اچانک اس کا جگنو وہاں آبھٹکا۔



وہ بچپن سے ہی ابا کی دکان پہ آتا جاتا تھا۔ پھر ابا نے نسبتاً" بڑی دکان خرید لی۔ لیس اور چوڑی کی مستطیل دکان کا ایک حصہ بڑی گلی میں جبکہ بڑا حصہ چھوٹی گلی میں تھا۔ چھوٹی گلی جو واقعی چھوٹی تھی یہی کوئی ڈھائی تین فٹ چوڑی۔ پھر جب سے اس نے مستقلاً" دکان پہ بیٹھنا شروع کیا تب ہی سے اس کی عورت ذات سے آشنائی شروع ہوئی۔ عورتیں اس کو چھوٹا بھائی کہتے ہوئے اپنی بات سمجھاتی جاتیں۔ وہ ان کی مطلوبہ چیزیں پھرتی سے ان کے سامنے رکھتا جاتا۔ اب تو وہ اس ذات کا اتنا مزاج آشنا ہو چکا تھا کہ گاہک دیکھ کر بتادیتا کہ اسے کیسا مال پسند آئے گا۔ فطرتاً" شریف تھا اس لیے کبھی کسی گاہک کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھا۔ اسی لیے عورتیں بھی اس سے بات کرنے میں سہولت محسوس کرتی تھیں۔

ہزار لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن اتنی کشش اتنا تجسس کسی کے لیے محسوس نہ ہوا جتنا سامنے زمین پہ چادر بچھا کر بیٹھی لڑکی میں ہوا تھا۔ سانولی سی بے ضرر سی لڑکی۔ ساتھ بیٹھی بہن کے ساتھ بات کرتے دبی دبی ہنسی ہنستے، چاچا شفیق کے ڈر سے دبکتی مہارت سے ہاتھ چلاتی۔ گاہکوں کی فرمائشیں سنتی۔ تیزی سے چوڑی کے گرد کپڑا لپیٹتی، بہن کے کان میں کچھ کہتی پھر کھنک کھنک کے جیسے ہنستی۔ گاہک کے محبوب کا نام چوڑی پہ لکھتے خود شرم سے دہری ہوئی جاتی۔

آج کل گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہریں لمبی اور لوڈ شیڈنگ عروج پہ تھی۔ عورتیں بھی شام میں بازار نکلنا پسند کرتی تھیں۔ اسی لیے گاہکوں کا زور ٹوٹا ہوا تھا۔ پیاس کے مارے برا حال تھا۔ جگنو ٹھنڈی سوڈے کی بوتل پینے نکلا تو نہ جانے کیوں اس نے تین بوتلیں خرید لیں۔ چاچا شفیق ذرا دکان سے ادھر ادھر ہوا تو اس نے دو بوتلیں فوراً" سے سامنے والی دکان کے کاؤنٹر پر رکھ دیں۔ دونوں دکانوں کے درمیان بمشکل تین فٹ کی گلی تھی۔ سیکنڈوں میں ان کے سامنے بوتلیں رکھ کر وہ فوراً" واپس اپنی دکان کے کاؤنٹر پر جا بیٹھا۔ کھٹکے کی آواز سے دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "آنا" "فانا" دو سوڈے کی بوتلیں ان کے سر کے برابر سطح والے کاؤنٹر پر پڑی تھیں۔ سامنے کی دکان والے جگنو بھائی پلٹ کے اپنے کاؤنٹر کی طرف جا رہے تھے۔

دونوں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔

چاچا شفیق کے پاس کراچی سے بڑا اور ہنگامی آرڈر آیا تھا۔ جو کل تک انہیں بھجوانا تھا۔ کوئی بہت بڑی شادی تھی جس میں عین وقت پر میزبانوں کو یاد آیا تھا کہ مہمان عورتوں کو روایتی کڑے اور گوٹے کی چوڑیاں مہندی میں تحفتاً" دی جائیں۔ وہ دو دن سے اس پہ کام کر رہی تھیں لیکن کام پورا نہیں ہو رہا تھا۔ آج چاچا شفیق انہیں گھر سے لایا تھا کہ میرے سامنے بیٹھ کر کام کرو۔ بجلی گئی ہوئی تھی اور یو پی ایس پہ صرف بلب جل رہے تھے پنکھا بند تھا۔ چاچا شفیق خود سڑک پار والی دکان پہ جا بیٹھا تھا۔ انہیں فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ انہیں پنکھے کی سہولت کبھی کم ہی میسر آتی تھی۔ ان کے لیے بلب اہم تھے اور دکان میں دن میں بھی دو سے تین بلب جل رہے تھے۔ لیکن یہ نئی مصیبت آگئی تھی۔ جگنو بھائی تو بڑا شریف بندہ تھا۔ ان سالوں میں کتنی ہی بار اس کی دکان کے لیے بھی مال بنایا تھا۔ کیا صرف ہمدردی میں وہ ان کے لیے بوتلیں رکھ گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر

سامنے جگنو بھائی کو تاکہ جانچ سکیں کہ یہ ہمدردی کیوں۔۔۔؟ لیکن وہ تو جیسے ہی اپنے کاؤنٹر پر جاکر بیٹھا تھا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا ہی نہیں اور موبائل میں گم ہو گیا۔

چاچا شفیق آتا تو یقیناً "ان سے بوتلوں کے بارے میں پوچھتا۔ وہ بتادیتیں تو ابھی جگنو بھائی کی دھلائی ہو جاتی بھرے بازار میں۔ وہ خود اس سے جاکر دو دو ہاتھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان میں ان کی بھی بے عزتی ہوتی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بوتلیں پکڑ لیں۔

جگنو کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ اس کے کان دہک رہے تھے۔ وہ پہلی بار تھا جب جگنو نے پیش رفت کی تھی۔

اگلی مرتبہ جب وہ جگنو بھائی کا مال دینے اس کی دکان پہ گئیں تو اس نے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ کام کے علاوہ کوئی بات کرتا بھی نہیں تھا۔ سامان دیکھ لینے کے بعد اس نے انہیں اجرت تھمادی۔ مینا نے پیسوں کو گنا اور دو بوتلوں کے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ بالی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ مینا بڑی تھی وہ ہی سب سے سارے معاملات طے کرتی آئی تھی۔

جگنو نے ان کی طرف دیکھا اور پھر پیسوں کی طرف۔۔۔۔

"بوتلوں کے پیسے ہیں جگنو بھائی۔ اس دن ہی دے دیتی لیکن اس دن پیسے نہیں تھے میرے پاس۔" بے تاثر لہجہ اور ویسی ہی بے تاثر آنکھیں۔ اس دن جگنو نے اس کی آنکھوں کی چمکتی لو بھی دیکھی تھی۔ اس نے اس سانولی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے مینا نے اپنے سر پر جمے دوپٹے کو مزید کھینچ کر آگے کیا اور اس کی کلائی کی ادھ درجن چوڑیاں بج اٹھیں۔۔۔ اور جگنو کو پہلی بار سمجھ میں آیا کہ سانولی سلونی محبوبہ کیسی ہوتی ہو گی۔

"میرا نام جگنو ہے۔ مجھے جگنو ہی بلایا کر۔" مینا ہوشیار ہو گئی کہ بس صیاد اب دام لگائے بیٹھا ہے۔

"بڑوں کو نام سے بلانا تو بدتمیزی ہوتی ہے جگنو بھائی۔" یہ کہہ کر وہ مڑنے ہی والی تھی کہ اس کے پیر زنجیر ہو گئے۔ نہ صرف دام بچھ چکا تھا بلکہ وہ شکار بھی ہو گئی۔

امی بھی ابو کو صاحب کہہ کر ہی بلاتی ہے۔

یہ وہ پہلا وعدہ تھا جو اس کے قدموں سے آلپٹا تھا۔ یہ وہ پہلا خواب تھا جو اس کے پلو میں باندھا گیا تھا۔ پھر اس خواب نے آنے والی کئی راتوں میں اس کی آنکھوں کے دیپ جلائے تھے۔

اس رات کو سونے سے پہلے مینا نے سوچا تھا کئی بار سوچا تھا۔ پچھلے آٹھ سالوں میں اس نے بھانت بھانت کے مرد اور ان کی نظروں کو دیکھا تھا۔ مردوں کے لہجوں سے ٹپکتی ہوس کو دیکھا تھا۔ لیکن ایسا کوئی نہیں دیکھا تھا۔ وہ لہجہ اور وہ نظریں اس کے لیے نئی تھیں۔

لمبے قد کا درمیانے جسم کا حامل جگنو بھائی۔ اس رات کا "صاحب" بن گیا تھا۔ پھر اگلی مرتبہ جگنو نے کوئی بات نہیں کی۔ بس ایک الوداعی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ وہ بھی جواب میں مسکرادی۔

بالی کو اماں کا بڑا ڈر تھا۔ ڈرتی تو وہ بھی تھی۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کی اندھیری رات میں اسے راستہ دکھانے جگنو آچکا ہے۔ پھر جب جب وہ بازار جاتی جگنو کی دکان پہ بھی جانے لگی۔ اس نے بھی زیادہ کام دینا شروع کر دیا۔ گاہکوں کو بھگتا کر وہ اس کی طرف آتا۔ ڈیزائنوں والی تصویریں دکھاتا۔ پھر ایسے ہی جاتے جاتے اس سے پوچھ لیتا کہ اسے کونسا رنگ پسند ہے۔ وہ بتادیتی اسے لال رنگ پسند ہے۔۔۔۔

"تجھے کھانے میں کیا اچھا لگتا ہے۔" ایک دن مال تھیلے سے نکالتے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہمیں کھانا پورا مل جائے تو ہم شکر مناتے ہیں صاحب۔ پسند ناپسند ہمارے اختیار میں نہیں۔"

جگنو کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے پہلی بار اسے "صاحب" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مینا بھی بالی کا ہاتھ پکڑ کر اجرت لیے بنا ہی تیزی سے دکان سے نکل گئی۔

پھر سارا دن جگنو بات بے بات مسکراتا رہا۔

اعتبار کا رشتہ بندھ چکا تو جگنو نے اپنی حکایت دل کا لفظ لفظ اس کے کانوں میں انڈیلنا شروع کیا۔ وہ تو بہت عام سی تھی، شاید اس سے بھی کچھ درجے کم تھی۔ لیکن اسے بتایا جاتا تھا کہ وہ تو خاص ہے۔ بہت ہی خاص۔ اسے بڑا اجنبی لگنے لگا۔ رات کو سب جب سو جاتے تو اندھیرے کمرے میں پورے خاندان کے درمیان لیٹی ہوئی وہ جیسے سب سے کٹ جاتی۔ وہ جملے وہ باتیں جو اس کے لیے جگنو کہتا ان کو دہراتی رہتی پھر چونک جاتی۔۔۔ جیسے ہی تصور میں وہ خود کو اپنے "صاحب" کے ساتھ دیکھتی۔۔۔ اپنی ہتھیلیوں کو اٹھا کر اپنے چہرے کے سامنے کرتی، اندھیرے میں بھی وہ جانتی تھی کہ اس کی ہتھیلیوں پہ "لکیروں" سے زیادہ "چیرے" ہیں۔ اس کی انگلیاں اور ان کی جلی ہوئی پوریں۔۔۔ اسے خود پہ رونا آتا۔

چمنیوں کی آگ نے اس کے نشان انگشت تک تو جلا کر مٹا دیے تھے۔ کچھ عرصے تک تو انہیں پتا بھی نہیں تھا، وہ تو جب کاکی نے نکاح نامے پہ انگوٹھا لگایا تو پتا چلا کہ اس سمیت وہ سب اپنی بنیادی شناخت کی علامت بھی کھو چکے ہیں۔

وہ اپنی نظروں میں کچھ درجے اور گر جاتی اور "صاحب" کے درجے اور بڑھ جاتے۔

اسے لگنے لگا کہ اب شکار اور شکاری کا کھیل ختم ہوا۔ زندگی کی اندھیری رات میں جگنو اسے راستہ دکھانے آگیا ہے۔ وہ بھی اس جگنو کے پیچھے پیچھے اڑنے لگی۔۔۔ راستہ کیا بتاتا۔۔۔ اس نے تو اسے نئی فضاؤں اور نئی منزلوں کی سیر کروانے کی ٹھانی تھی۔ اعتبار کے دھاگے سے بندھی وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

کبھی وہ اسے لال چوڑیاں دیتا۔۔۔ وہ اماں کے ڈر سے انکار کر دیتی۔

وہ اس کے لیے چنری لایا۔۔۔ وہ حسرت سے اسے دیکھتی ہی رہ گئی لیکن ہاتھ بڑھا کر لے نہ سکی۔

اب ملاقاتیں باغوں میں ہوتی تھیں۔ بلی اس کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے جگنو بھی آرام محسوس کرتا تھا۔ پھر وہ اس کے لیے مہنگی بیکری کے بسکٹ لایا۔

"کل رات دوستوں کے ساتھ بیکری گیا تو تیرا خیال آیا۔ اب ان کو منع مت کرنا یہ کون سا گھر لے جانے ہیں۔"

بسکٹ بہت لذیذ تھے لیکن ان سے زیادہ لذیذ چاکلیٹ کیک تھا۔ ان ذائقوں کی تو بات ہی رہنے دیتے ہیں۔۔۔ سب سے زیادہ لذیذ وہ احساس، وہ خیال تھا جب وہ کہتا کہ "میں کھانے لگا تو مجھے تیرا خیال آیا تو پھر سنبھال لیا کہ اکٹھے کھائیں گے۔"

دن پھر بڑے بڑے اور روشن ہو گئے۔ چوڑیاں پھر کھنکنے لگیں اور مینا پھر چہچہانے لگی۔ بہار چار سو پھیل رہی تھی۔ اعتبار اور محبت کے پھول کھل رہے تھے۔ وہ بھی اپنی زندگی کی طرح ہی روکھی پھیکی ہو چکی تھی۔ لیکن اب بہار کے دن آچکے تھے۔ دل کی بہار۔ ملن کی بہار۔ تمنا کی بہار۔ حسرت کے پتے جھڑ چکے تھے اور وہ گل و گلزار ہو رہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں صندل گھلنے لگے تھے۔ گال جو کبھی گلابی نہیں رہے تھے اب ان پہ لالیوں کا گمان ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ بھول گئی تھی کہ سب سے زیادہ گھات بہار میں ہی لگتی ہیں۔ پھولوں کے جھنڈ صرف جھنڈ نہیں ہوتے بلکہ کمین گاہ بھی بن سکتے ہیں۔

ایک شام جب وہ عالم سرمستی میں گنگنا رہی تھی

اور اس کا "صاحب" یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اسے دیکھا جائے یا سنا جائے۔ وہ آج تک قاصر ہی رہا تھا یہ طے کرنے میں، آخر کیوں وہ اس کے آگے اتنا بے بس ہے اس کی نگاہوں کے سامنے حسین سے حسین چہرے بھی آئے لیکن اس نے توجہ نہ دی جیسے قدرت نے اس کی توجہ کو سنبھال کر رکھنا تھا۔ جیسے مینا چونکی پھر شرمگیں مسکراہٹ سجائے گانا جاری رکھا۔ آواز بار حیا سے لڑکھڑانے لگی۔

اتنا حسین منظر جگنو نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لب بھی مسکرانے لگے۔ پھر اس نے مینا کے ہاتھ کو دیکھا۔۔۔ وہ ایک محنت کش عورت کے ہاتھ

تھے، ہر طرح کی نرمی سے عاری لیلن جگنو کو بے حد حسین لگے، مینا کی آواز کا سحر ماحول پہ چھانے لگا..... اتنا چھا گیا کہ جگنو کو سرمست کر گیا اور اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس نے مینا کے ہاتھ پہ لب دھر دیے۔

مینا کی آواز گھٹ گئی۔ اس نے چونک کر جگنو کو دیکھا۔ مینا کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے چوم رہا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا لیکن گرفت مضبوط تھی۔ اسی وقت جگنو کو بھی اپنے فعل کا احساس ہوا..... اس نے خود ہی مینا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ لیکن مینا سکتے میں آ گئی جگنو اب بھی نادم نہیں تھا بلکہ اسے نرم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سالوں پہلے کا اماں کا جملہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ "تیرا ہاتھ صرف جھوٹا ہی پکڑ سکتا ہے۔"

اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر جگنو کو بھی احساس ہو گیا کہ اسے برا لگا ہے۔

"مینا! کیا ہوا ہے تجھے..... رک کیوں گئی کتنا اچھا گا رہی تھی۔" اس نے بہلانے کے انداز میں اس کے گال تھپتھپانا چاہا لیکن مینا کو تو کرنٹ لگ گیا تھا جیسے۔ اس نے تیزی سے جگنو کے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس کی آس کا محل زمین بوس ہو گیا تھا اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

"میں "منہاری" ہوں صاحب" طوائف نہیں۔" یہ کہہ کر وہ جگنو کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔

باغ کا وہ تنہا گوشہ جہاں پہلے بہاریں جوبن پہ تھیں، اس وقت تاریک ہو گیا تھا اور کسی صیاد کی کمین گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں جگنو گم صم بیٹھا شاید اپنی شناخت کرنے میں قاصر تھا۔

☆ ☆ ☆

اس شام مینا کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل تھا۔ گھر کا راستہ دھندلا رہا تھا۔ وہ گھر پہنچی تو سیدھی چھت پہ چلی گئی۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں وہ اماں کی نظروں سے بچ سکتی تھی۔ اپنی ہچکیوں کا گلا گھونٹتی اپنی ذات کی کرچیاں سمیٹتی وہ وہ سبق یاد کر رہی تھی جو اسے بھول گیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی آگاہ تھی پھر جانتے بوجھتے وہ کیوں دام میں آ گئی۔

کیا ضروری تھا کہ وہ خود چل کر شکار ہوتی.... بالی حواس کے انتظار میں تھی اس کے پیچھے آئی تو وہ اس کے گلے لگ کر رو پڑی۔ بالی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔

رات کا آنا عذاب تھا وہ کمرے سے اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی اور رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تو ویسے بھی کمرے میں پانچ افراد ہی ہوتے تھے۔ سب اماں کی عقابی نظروں کے حصار میں ہوتے تھے۔

دن کو چمنی کے آگے بیٹھ کر وہ رونے کا شوق پورا کرنے لگی۔ اماں کے پوچھنے پہ ایک ہی بات آنکھیں دکھنے لگی ہیں۔ اماں بھی شاید انجان بننے لگیں ورنہ ایسی تو نہ تھیں کہ ایسے بہانے پہ بہل جاتیں۔ اب جو پہلے ہی زخمی تھی اسے کیا زخمی کرتیں۔ اماں نے اسے سامان دیا کہ دکانوں پہ دے آئے۔ اس نے انکار کر دیا۔ جگنو کی دوکان کا مال بھی تھا اس میں۔

"اماں میں بھی تو بڑی ہو گئی ہوں اب۔ تجھے میری فکر نہیں ہے کیا.....؟" شکوہ اس کی زبان پہ آ گیا حالانکہ وہ خفا خود سے تھی۔

"تیرے سے جو بڑی تھیں ناں ان کو کبھی تیرے ابا نے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ لیکن تیرے اور بالی کے سامنے تو میں نے دنیا کھول کر رکھ دی تھی۔ تم لوگوں کو تو سارے راستے بتا دیے تھے۔ اپنی نگہبان تم خود ہو۔" اپنے گھٹنوں پہ زور دے کر اٹھتے ہوئے اماں پھر بیٹھ گئی۔

"تجھے بھی پتا ہے کہ تو ساری عمر گھر میں نہیں بیٹھ سکتی، یہاں کون ہے جو تجھے بٹھا کر کھلائے گا۔" مینا کی ہچکی بندھ گئی (وہ جو کہتا تھا کہ بٹھا کر کھلائے گا اس نے تو چند چیزوں کی ہی اجرت طلب کر لی تھی۔ اب تو واقعی کوئی نہیں تھا جو اس کو بٹھا کر کھلاتا)

"دنیا ہے یہ۔۔۔ اس کے کام دھندے چلتے ہی رہتے ہیں رکتے نہیں۔ تو بھی مت رک۔۔۔ جو سبق زمانہ پڑھاتا ہے وہ پختہ ہوتے ہیں۔ پکی سڑک کا کام دیتے ہیں زندگی میں۔ ان کو رکاوٹ سمجھ کے بیٹھ گئی تو تیرا سفر تو پہلے پڑاؤ پہ ہی ختم ہو جائے گا۔ منزل تک کیسے جائے گی۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں سوال تھا کونسی منزل اماں۔۔۔۔ کیا ہماری بھی کوئی منزل ہے۔۔۔؟ پر یہی سوال زبان پہ بھی آگیا۔

"میں تو سمجھی تھی کہ ہم وقت کی چکی میں ہی گول گول گھوم رہے ہیں۔"

اماں نے اس کی آنکھوں کی یاسیت کو دیکھا۔

"ہاں تو پھر گول گول گھومنا اپنا چکر پورا کر، رک کیوں گئی ہے۔" یہ کہہ کر اماں اپنے گھٹنوں پہ دباؤ ڈالتے ہوئی اٹھی۔ "مال لے جا اور نیا کام لے کر آ۔"

اس نے اماں کو دیکھا کاش اماں نے اسے اس کا نگہبان نہ بنایا ہوتا۔ ساری ہمت جمع کر کے وہ بالی کے ساتھ آگئی۔ جگنو کا مال بالی نے اسے دیا، پیسے تھامے اور نیا آرڈر لیے بغیر ہی آگئی۔ وہ چاچا شفیق اور دوسری دکانوں پہ مال دینے گئی تھی لیکن جگنو کی طرف اس نے دیکھا بھی نہیں کیونکہ وہ بھرے بازار میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ جس چہرے میں اسے فرشتے نظر آتے تھے وہ اس پہ شیطانی سایہ کیسے دیکھ سکتی تھی۔ دیکھ لیتی تو پھوٹ پھوٹ کے رو پڑتی۔

جگنو نے بالی کو بھی روکا اور اسے بھی دیکھا بلکہ اس کی ایک ایک حرکت کو جانچا کہ وہ کس حد تک ناراض ہے لیکن جب بالی آرڈر لیے بغیر ہی چلی گئی اور مینا نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ بہت کچھ غلط ہو گیا ہے۔

اس کا خیال تھا کہ وہ ناراض ہو گی تو وہ سے منا لے گا۔ لیکن مینا نے منا لینا تو دور اسے بات تک کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے تو اسے اجنبی کر دیا تھا، بازار کا ہر آدمی اجنبی تھا۔ اب جگنو بھی پہلے کی طرح اسی بھیڑ کا حصہ بن گیا تھا۔

وہ غلط تھا، بہت غلط۔۔۔ جسے وہ ساحرہ سمجھا تھا وہ تو سحر کی طرح اجلی تھی۔۔۔ وہ اس کا سحر نہیں بلکہ نور تھا جس پہ وہ دل ہار اتھا۔

بھانت بھانت کی عورتیں دیکھی تھیں، عورت کی ہر ہر ادا سے واقف تھا۔ لیکن مینا۔۔۔ اس میں تو کوئی ادا تھی ہی نہیں۔ بازار سے گزر بھی جائے اور کسی کو پتا نہ چلے۔ کبھی کوئی توجہ بھی نہ دے کہ یہاں سے ابھی کوئی گزرا ہے۔ وہ رات جگنو پہ بہت بھاری تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا کڑھتا رہا۔ پھر اس نے ایک مشکل فیصلہ لیا۔۔۔ بہت مشکل۔۔۔ اگلے دن کا سورج اس کے لیے بہت سے نئے اور کٹھن امتحان لانے والا تھا لیکن اس نے بھی ڈٹ جانے کی ٹھانی تھی۔



مینا پہ تو ہر رات ہی بھاری گزرتی تھی۔ پہلے زبان محبت کی مٹھاس سے ناآشنا تھی تو محرومیوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ جب سے اس کمبخت زبان نے اس "مٹھاس" کو چکھا تھا پیٹ کی بھوک کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

دن اب بھی ویسے ہی روکھے پھیکے، صبح سے شام چوڑیاں بناتے ان کو سجاتے گزرتے تھے۔ چوڑیوں کو رنگوں سے سجاتے یہ خیال کہ ان رنگوں پہ اس کا کوئی حق نہیں، اب اسے وحشت زدہ کرنے لگا تھا۔

وحشت بڑھ جاتی تو ایک جنگ اس کے اندر چھڑ جاتی تھی۔ دل تو جیسے بٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک حصہ جگنو کے حق میں دلائل دیتا تو دوسرا ان کی نفی کرتا۔

وہ جتنا اس خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتی کہ۔۔۔ اسے بھی مال تصور کیا گیا۔۔۔ ہر وقت اس پہ سوار رہ کر اسے اس کی نگاہوں سے گرا دیتا۔ دل چاہتا کہ ایک موقع تو بنتا ہے، ہو سکتا ہے کہ جگنو معذرت کر لے۔ پھر وہی تکرار شروع اور پھر وہ دن بھی باقی دنوں کے جیسا وحشت زدہ سا گزرتا۔ پھر اس نے اپنی اس ذہنی اور دلی کیفیت سے سمجھوتا کر لیا۔

بہت سے دن گزرے جب ایک خاتون سر کو دوپٹے سے ڈھانپے کڑھائی اور شیشوں کے کام سے مزین قیمتی

چادر کندھوں پہ لپیٹے ان کے گھر آئیں جنہیں دیکھ کر اماں کو لگا کہ شاید راستہ بھٹک گئی ہے۔

روز روز ایک ہی لڑائی ایک ہی جھک سے وہ تو کیا سب ہی تنگ آگئے تھے۔ لیکن جگنو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ بڑے بھائی بھاوج، بہن، بہنوئی، سب نے سمجھا بجھا کر دیکھ لیا لیکن وہ چکنا گھڑا بنا رہا۔ پھر سارے جذباتی ہتھکنڈے آزمالینے کے بعد اماں نے اس سے گڑ گڑانے کے انداز میں پوچھ ہی لیا۔ "آخر کیوں تو اتنا باؤلا ہو رہا ہے۔ کیوں تڑپ رہا ہے اتنا۔ اپنی حیثیت دیکھ اور اس کی حیثیت دیکھ۔"

وہ چارپائی پہ بیٹھی تھیں، جگنو نے ان کی گود میں سر رکھا۔ "اماں اس کی حیثیت دیکھوں تو میں کچھ نہیں اس کے آگے۔ (اب تو اماں کو لگا کہ معاملہ تعویذ گنڈے کا ہے)

انہوں نے ملامتی نظروں سے جگنو کو دیکھا۔

"اماں وہ بالکل آپ کے جیسی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کیں جیسے اماں کی گود میں ساری تھکن اتارنے آیا ہو۔

اب وہ آگے کیا کہتیں۔ اسی لیے آج وہ اس تنگ کچی پکی گلی کے کچے پکے مکان میں بیٹھی تھیں۔

وہ پہلے ہی سمجھ سکتی تھیں کہ گھر بار کیسا ہوگا لیکن پھر بھی انہیں مایوسی ہوئی اب وہ اس چشم مار روشن دل باشاد کی منتظر تھیں جس نے ان کے بیٹے کو پھانس رکھا تھا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی تو اس کی ماں کی طرف دیکھا اب کچھ نہ کچھ تو بات کرنی ہی تھی۔

"جانتی تو ہوگی تم کہ ایک دکان ہماری شاہی بازار میں ہے اور ایک ریشم گلی میں۔ جگنو ریشم گلی والی دکان پہ بیٹھتا ہے۔"

"نہیں میں نہیں جانتی کس کی کتنی دکانیں ہیں اور جگنو کون ہے۔"

اماں نے بہت کچھ سمجھ کر نپا تلا جواب دیا۔ اسی وقت مینا باہر سے گھر میں داخل ہوئی اور اس نے ایک اجنبی آواز سنی۔ "اپنی بیٹی سے پوچھنا وہ بتادے گی سب۔" طنز نے اماں تو اماں مینا کو بھی چھلنی کر دیا۔

"بہن وہ دیکھ وہ کھڑی ہے مینا۔ اس سے پوچھ لے۔ وہ کیا جانتی ہے کیا نہیں۔"

انہوں نے پلٹ کر مینا کو دیکھا۔ وہ جو کسی حسین و جمیل لڑکی کی توقع کر رہی تھیں تو وہاں ایک عام سی لڑکی کھڑی تھی۔

"آپ جو کہنے آئی ہو وہ کہو۔" اماں نے بے زاری سے کہا۔

"اب میرے کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔" نخوت سے کہا گیا۔

"تو بس پھر جب کچھ ہے ہی نہیں جی، تو اچھا لگا آپ سے مل کر۔ ابھی دس توڑے بنانے رہ گئے ہیں۔ چل مینا تو بھی۔" اماں نے ہاتھ جھاڑے اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

احساس توہین سے جگنو کی ماں کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ تو بے عزت کر کے احسان جتا کر رشتہ لینے آئی تھی اور یہاں ان کی بے عزتی ہو گئی تھی۔

"اپنی لڑکی سے تو پوچھ لو پہلے؟" اٹھتے ہوئے بھی وہ طنز کرنا نہ بھولیں۔

مینا دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی چل کر ان تک آئی۔ "خالہ جی، میرے سر پہ صرف عزت کی چادر ہی تو ہے۔ اگر آپ اس کی حرمت کی پاسداری کرتیں تو میں آپ کے قدموں میں گر جاتی لیکن اب میں اپنی اور اپنی ماں کی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی۔" آنسوؤں سے بھری آنکھوں اور کانپتے لہجے کا عزم ان کے جمے قدموں کے ڈگمگانے کے لیے کافی تھا۔

ساری عمر اپنے شوہر کی عزت کی امین رہی تھیں اسی لیے تو جگنو نے کہا تھا کہ "وہ آپ کے جیسی ہے۔" بس لمحے بھر کی بات تھی انہیں لگا کہ ان کی باتوں نے مینا کا دل چیر دیا ہے۔ اب رفو بھی انہیں ہی کرنا تھا۔ انہوں نے اپنے کندھوں سے چادر اتاری اور مینا کے سر پر ڈال دی۔

"بہن جی! آج سے آپ کی بیٹی میری ہوئی۔" یہ کہہ کر انہوں نے حیران ہوتی مینا کو گلے سے لگا لیا اور مینا کی اماں جو چینی والے کمرے میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے اپنی نم آنکھوں کو سجدۂ شکر میں جھکا دیا۔

☆

عنیزہ سید

صبغت اللہ لوٹ آؤ

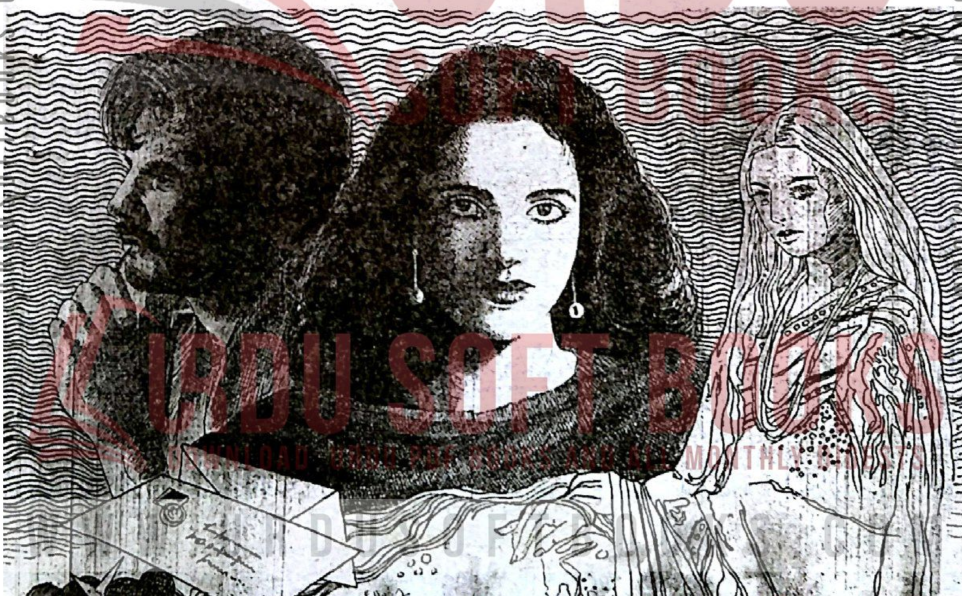
اس علاقے کی ہر گلی کے بچوں کے لیے وہ دن خوشی کے کسی سالانہ تہوار سے کم نہیں تھا' جب ہی تو گلی گلی میں' کوچے میں' بازار اور بازار کی ہر دکان کے اگلے تھڑے پر ہر طرف بچے ہی بچے نظر آرہے تھے۔ پُرشوق نظروں اور خوشی سے جھلملاتے چہروں والے بچے' جیسے ہی بے تار کا مائیک ہاتھ میں پکڑے' چھوٹے بڑے کیمروں کے جلو میں چلتی وہ لڑکی کسی نئی گلی' کسی نئے موڑ کے اندر مڑتی' ادھر ادھر' یہاں وہاں کھڑے بچے بھرّا مار کر اسی طرف دوڑ پڑتے۔

دبلی پتلی نازک سی یہ لڑکی تنگ موری کی جینز پر سفید کرتی پہنے اپنے گھونگھریالے بالوں کو کیچر میں پھنسائے' پیروں میں بند جوتے پہنے' اس علاقے میں بچوں کے انٹرویوز کرنے پہنچی تھی۔

وہ سب بچے اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ وہ وہی تھی' بالکل وہی جو ہفتے میں کئی بار ایک بڑے نیوز چینل پر اپنی رپورٹ کے ساتھ خبروں کے دوران یا پھر کسی ٹاک شو میں نظر آتی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے والا جتنا بھی عملہ تھا' وہ چینل کا نمائندہ نظر آتا تھا۔

''جینوئین رپورٹ بنا رہے ہیں' جینوئین!'' سلیم جنرل اسٹور کے مالک سلیم مغل نے چینل کے عملے اور مائیک والی لڑکی کو بچوں کے جلوس کے درمیان چلتے دیکھ کر کسی گاہک سے کہا تھا۔

مکمل ناول



”وہ کام نہیں لگ رہا‘ جو آئے دن چھوٹے چھوٹے چینلوں والے یہاں آکر کرتے ہیں۔ جھوٹے انٹرویو‘ جعلی پروگرام۔“ وہ مارے شوق کے اسٹور کے شوکیس کے اوپر سے ہی کود کر دکان کے تھڑے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

”میری گھر والی تو ہے ہی پھوہڑ۔ (بد سلیقہ)۔“ پاس کی دکان سے زلفی ‘زلف تراش بھی دکان سے باہر نکل کر کھڑا تھا۔ ”ان ہی میلے ‘پھٹے کپڑوں میں بچوں کو بھیج دیا ہے اس نے۔ لو دسو بھلا ‘اب جو میرے بچوں کا انٹرویو چل گیا ٹیلی ویژن پر تو سارے رشتہ داروں نے کہنا ہے کہ زلفی کے کے بچوں کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں ہیں۔“ وہ سر جھٹک کر مایوسی سے کہہ



رہا تھا۔
"میری گھر والی کو تو اتنی عقل بھی نہیں ہے۔" سلیم مغل نے اپنے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں سیدھا کرتے ہوئے سوچا۔ "سوئی پڑی ہوگی اندر کمرے میں فل اسپیڈ پر پنکھا چلا کر۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ محلے میں کون کس لیے آیا ہے۔ بچوں کو بھی نانی کے گھر چھوڑ آئی ہوگی' وہ ادھر کدکڑے لگاتے رہیں تاکہ مہارانی سکون کی نیند پوری کر لے۔" اس کے دل میں ملال گھر کرنے لگا تھا۔ بچوں کے اس جلوس میں اسے اپنے بچے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"ہوئے' وہ دیکھو وہ۔" اکرم سینارا باچھیں کھلاتے ہوئے انگلی کے اشارے سے کسی کو بتا رہا "۔ میرے پپو سے بات کر رہی ہے میڈم' لے وئی لے 'میرا پپو تو ٹیلی ویژن اسکرین پر نظر آیا ہی آیا۔" اکرم سینارے کا سینہ یوں پھولتا نظر آ رہا تھا جیسے اس نے میدان مار لیا ہو۔

اور ان باتوں سے بے خبر' بچوں کے ہجوم میں چلتی' ہنستی مسکراتی' مسلسل بات کرتی وہ لڑکی اچانک ایک تنگ گلی کی طرف مڑ گئی تھی۔

"یہ گلی بڑی تنگ ہے جی۔ آگے جا کر بند بھی ہو جاتی ہے۔" محلے کے کسی لڑکے نے بلند آواز میں اسے بتانے کی کوشش کی تھی۔

"اس گلی میں مت جاؤ' بہت تنگ ہے' کیمروں کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔" اس کے ساتھ چلتے ڈی او پی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"سلمز (Slum) سلمز۔" جواب میں لڑکی نے بھی اسی سرگوشی کے انداز میں جواب دیا تھا۔ "سلمز کے اندر جاؤ گے تو ریٹنگ کے چانسز بھی بڑھیں گے نا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اس تنگ گلی کے بچے بھی ٹی وی اسکرین پر نظر آنے کے ارمان دل میں لیے اپنے اپنے گھروں کی دہلیز پر ہی کھڑے نظر آ رہے تھے۔

"ہاں بھئی تمہارا نام کیا ہے۔" ان ہی میں سے ایک خوش نصیب بچے کے سامنے مائیک آ کر رکا۔ جواب میں وہ بچہ لحہ بھر کے لیے تو اپنی خوش قسمتی پر یقین کرنے کی کوشش میں ہی پورے دانتوں سے مسکراتا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بمشکل اپنا نام بتایا۔

"ہاں اب یہ بتاؤ کہ ہر سال عید الفطر کیسے مناتے ہو اور اس سال کیسے منانے کا ارادہ ہے؟" اپنا ایک نکاتی سوال بچے کے سامنے رکھتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

اس کے سوال کو ادھورا پورا سمجھتے ہوئے بچے نے اٹک اٹک کر جواب دینا شروع کیا اور ابھی اس کا جواب مکمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ مائیک والی پری سیدھی ہوتی ہوئی کیمرے کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"جی تو ناظرین! آپ نے دیکھا کہ بچے چاہے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں' روایتی تہواروں سے متعلق ان کے خواب' ان کی خواہشات اور ان کی آرزوئیں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ نئے کپڑے' نئے جوتے' عیدی' پکوان' موج مستی اور مزا' عید الفطر سے جڑے سب رنگ ہر بچے کی آنکھوں میں رقص کرتے نظر آ رہے ہیں۔"

وہ کیمرے کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے بولتی' اس گلی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ چلتا اس کے عملے اور گلی کے بچوں کا ہجوم اسے سن رہا تھا۔ جب ہی ایک پُرشکن' نرم ہاتھ اس کے ہاتھ پر ٹک گیا تھا۔ وہ اس قسم کی کوریج کے دوران لوگوں کی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کے طریقوں سے بخوبی واقف تھی۔ کوئی اس کا شانہ جھنجوڑتا' کوئی بازو' کوئی کپڑے کھینچتا اور یہ ہی وہ مواقع ہوتے تھے جب اس قسم کی رپورٹس کور کرنا اسے دنیا کا سب سے برا کام محسوس ہوتا تھا اور وہ اپنے دل میں عہد کر لیتی تھی کہ آئندہ ایسی چیزیں کور کرنے سے انکار کرنے پر اسے یہ نوکری چھوڑ کر کسی اور جگہ نوکری کرنی پڑی تو بھی وہ دوبارہ اس کام کے لیے نہیں آئے گی' لیکن پھر پُرکشش تنخواہ اور اس تنخواہ سے جُڑی آسائشات اس کی نظروں کے سامنے رقص کرتیں اور اسے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر

مجبور کر دیتیں۔

اس نے بے زار نظر اس جھریوں زدہ' سفید نرم ہاتھ پر ڈالی اور نجانے کیوں اس کی اگلی نظر بے اختیار ہی اس چہرے کی طرف اٹھ گئی۔

"آنا' آنا' میں کب سے دروازے پر کھڑی تیرا انتظار کر رہی تھی۔" ہاتھوں کے مقابلے میں وہ چہرہ جوان نظر آتا تھا۔

جواب میں وہ لڑکی پیشہ ورانہ مجبوری کے تحت ایک خاص انداز سے مسکرائی۔

"ماں جی' ہم یہاں بچوں کے انٹرویوز کے لیے آئے ہیں۔ عیدالفطر کے خصوصی پروگرام کے سلسلے میں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ عید تو دراصل بچوں کی ہوتی ہے' ہے نا۔"

"ہوں!" ماں جی کا منہ بن گیا' لیکن اگلے ہی لمحے وہ مسکرا کر بولیں۔ "میں بھی تو بچی ہوں' تم نے سنا نہیں بچے اور بوڑھے ایک برابر ہوتے ہیں۔" ماں جی کی بات سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر ایک سوچ اس کے ذہن سے ٹکرائی۔

"خیال برا نہیں۔" وہ ڈی او پی کے کان کی طرف جھکی۔ "بوڑھا بچہ' ریٹنگ لے سکتا ہے پروگرام کا یہ حصہ۔"

"ہوں.... مگر صرف ان ماں جی سے.... مزید بڈھے بڈھیاں تلاشنے مت بیٹھ جانا۔" جواب میں وہ داڑھی کھجا کے بولا تھا۔

"اچھا تو ماں جی آپ بتائیے آپ عید کیسے مناتی ہیں' اس سال عید کے لیے کیا اہتمام کرنے کا ارادہ ہے۔" اگلے لمحے لڑکی پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ایسے تھوڑی بتاؤں گی' اندر آؤ' میرے گھر کے اندر' دو گھڑی بیٹھ کر بات کرو۔ میں تو کب سے اپنے دروازے پر کھڑی تیرا انتظار کر رہی تھی۔" ماں جی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اس ہجوم میں جلدی سے باہر بھی نہیں نکل سکتے لہٰذا دو گھڑی کی یہ فرمائش پوری کرنی پڑے گی تمہیں۔" ڈی پی او کیمرہ مین کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ!" لڑکی نے منہ کا بگڑا زاویہ لمحوں میں درست کیا اور کیمرے کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"آئیے ناظرین! ان بچوں کے ساتھ ساتھ ایک اماں جی سے بھی پوچھتے ہیں کہ وہ اپنی عید کس طرح مناتی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں ناظرین کہ بوڑھے اور بچے ایک برابر ہوتے ہیں تو جہاں ہم نے اس محلے کے بچوں سے یہ سوال کیا کہ وہ اپنی عید کس طرح مناتے ہیں وہیں ان ماں جی سے بھی پوچھ لیتے ہیں کہ ان کا عید منانے کا طریقہ کیا ہے؟"

وہ مائیک میں بولتی ماں جی کے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"مجھے انٹرویو' شنٹرویو کوئی نہیں دینا' میں تو تم سے ملنے کے لیے' تمہیں دیکھنے' تم سے دو گھڑی بات کرنے کے لیے کھڑی تھی باہر دہلیز پر....." ماں جی ان تینوں کو اپنے ساتھ اندر لاتے ہوئے بولی تھیں۔

"اوہ خدا!" لڑکی نے دانت پیسے۔

"آؤ' آؤ' آجاؤ۔" ماں جی اپنے چھوٹے سے صحن میں اہتمام سے رکھی کرسیوں کے قریب پہنچ کر رک گئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی کا ایک انوکھا سا احساس جھلک رہا تھا۔

"بریک سمجھ لو۔" ڈی او پی نے سرگوشی کی۔

"تم دونوں یہاں بیٹھو۔" وہ کیمرہ مین اور ڈی او پی سے مخاطب ہوئیں۔ "اور تم" انہوں نے لڑکی سے کہا۔ "میرے ساتھ اندر چلو۔"

لڑکی نے جز بز ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور پیر پٹختے ہوئے ماں جی کے ساتھ اندر چلی گئی۔

"میں تمہیں اکثر دیکھتی ہوں' ٹیلی ویژن پر۔" ماں جی نے مسکراتی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "نام کیا ہے تمہارا بھلا سا؟" انہوں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "حرمت۔ ہے نا۔ یہ ہی نام ہے نا تمہارا۔" وہ مسکرائیں۔

"حرمت العین۔" لڑکی ماں جی کی وارفتگی پر الجھ سی گئی تھی۔

"ہاں حرمت العین۔ کیسا پیارا نام ہے۔

"چلو، اب ایسا کرو۔" وہ رک کر بولیں۔ "جہان بھر کے بچوں سے تو تم نے پوچھ لیا کہ وہ عید کیسے مناتے ہیں۔ مجھے تم بتاؤ تم عید کیسے مناتی ہو؟"

"میں!" وہی لڑکی جو کچھ دیر پہلے پٹر پٹر بولے چلی جا رہی تھی اس وقت یوں محسوس کر رہی تھی جیسے زبان کو تالا لگ گیا ہو۔

"ہاں ہاں تم...." ماں جی مسکرا کر بولیں۔

وہ ہلکا سا ہنسی اور بولی۔ "جی بھر کر سوتی ہوں عید کے دن اور اس کے آگے پیچھے جتنی بھی چھٹیاں مل جائیں ان میں بھی۔ غنیمت لگتی ہیں عید کی یہ دو تین چھٹیاں۔ کوئی کام نہیں، کام کی ٹینشن نہیں۔ اف! اتنی پر سکون نیند آتی ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"اچھا۔" ماں جی مسکرائیں۔ "تو پھر تمہارا انٹرویو میں نے کر لیا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "اب ذرا سوچ کر یہ بتاؤ کہ کیا اپنے بچپن میں، لڑکپن اور نئی نئی آئی جوانی میں بھی کوئی اپنی عیدیں ایسے ہی منایا کرتا ہے۔"

لڑکی کا ذہن کچھ دیر کے لیے سوچ کی گہرائی میں اترا، لیکن اگلے لمحے ہی اسے یاد آ گیا وہ اس گلی محلے میں کیا کرنے آئی تھی۔

"چلتی ہوں ماں جی!" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بہت دیر ہو گئی، پروڈیوسر میری جان کو رو تا ہو گا۔"

"ہاں پھر تو تم جاؤ۔ کوئی کاہے کو تمہاری جان کو روئے۔" وہ بھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں۔ "ویسے یہ جو بالوں کا کھونچا بنا رکھا ہے نا تم نے۔ یہ اچھا نہیں لگ رہا مجھے۔" انہوں نے اس کے سیاہ گھونگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "کیسے کھردرے اور بے جان ہیں۔" وہ بولیں اور پھر ہنس دیں۔ "ٹیلی ویژن پر تمہارے یہ بال کیسے اچھے نظر آتے ہیں اور تیری یہ مرجھائی ہوئی زرد رنگت بھی کیسی اجلی اور چمکتی نظر آتی ہے۔ ہے نا....." وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر ہنس دیں۔

"میں بڑھیا تو صاف دھوکا کھا جاؤں۔"

لڑکی کے چہرے پر خفگی ابھرتے دیکھ کر شاید انہیں احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ اور شاید بے موقع بول گئی تھیں۔ "اچھا رکو ذرا ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے کوئی تحفہ تو لے آؤں۔" وہ کمرے کی دیوار میں جڑی لکڑی کی الماری کی طرف لپکیں۔

"نہیں ماں جی... رہنے دیں، تھینک یو پلیز۔" لڑکی کے منہ سے الفاظ نکلتے رہے اور وہ ان کی پروا کیے بغیر الماری سے ایک شاپر نکال لائیں۔

"اپنے گھر جا کر دیکھنا، اس میں تمہارے لیے کیا ہے۔" انہوں نے شاپر رول کر کے لڑکی کے ہاتھ میں زبردستی تھما دیا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے ماں جی... میں اس طرح تحفے تحائف لینے کی عادی نہیں ہوں۔" لڑکی ناراض لہجے میں بولی۔

"فکر نہ کرو... یہ ذرا سا شاپر قبول کر لینے پر تمہیں وہ نہیں کروں گی... کیا کہتے ہیں اسے۔" وہ رکیں۔ "ہاں۔ ایکسپلائٹ" انہیں یاد آ گیا۔ "میں تمہیں ایکسپلائٹ نہیں کروں گی ان شاء اللہ... اسی بات کا ڈر رہتا ہے نا تم لوگوں کو... دیکھ لو میرے گھر میں تو کوئی خفیہ کیمرے بھی نہیں لگے ہوئے۔"

ماں جی کی معصومانہ جون کو یک دم تیکنیکی باریکیوں سے واقفیت میں بدلتے دیکھ کر لڑکی بری طرح گھبرا گئی تھی۔

ماں جی کو خدا حافظ کہے بغیر وہ کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آئی اور اپنے ساتھیوں کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس گھر سے باہر نکل آئی۔ باقی کا دن اس کا دل اسی ایک خیال کے تحت دھڑکتا رہا۔

وہ عورت کوئی بھی ہو سکتی تھی، کوئی غیر ملکی ایجنٹ، دہشت گردوں کی سہولت کار، کوئی عام سی چور، ٹھگ، فراڈی۔ وہ کیوں اس کی بات مان کر اس کے گھر میں جا گھسی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ تربیت کے دوران جس نقطے پر سب سے زیادہ بات کی جاتی تھی اس نے اسی کو فراموش کر دیا تھا۔ اس کا دل ایک انجانے سے ملال کی زد میں رہا تھا۔

اکاؤنٹس کی اسٹیٹ لیتی۔" حرمت بڑبڑائی۔

"میرے ممی اور ڈیڈی دونوں بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ان سے دور رہ کر ان کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں اور خود اپنے ساتھ بھی۔" سحری کے دوران وہ حرمت کے ابو کو بتا رہا تھا۔

"یہ تو ہے۔" ابو نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو خود حیران ہوں تم لوگوں نے ان سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"غلط کیا نا۔" شہریار نے اعتراف کیا۔ "اسی لیے عید کے بعد ہم واپس ممی کی طرف شفٹ ہو جائیں گے۔ اس اپارٹمنٹ کو کرائے پر دے دیں گے۔ کرائے کی رقم اس کی اور گاڑیوں کی قسطیں بھرنے کے لیے کافی ہوگی۔"

"گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔" حرمت نے دل میں دہرایا "ممی کا وہ پرانی وضع کا بنا وسیع اور کشادہ گھر جس میں کتنے ہی بڑے بڑے کمرے ہیں اور آگے پیچھے لان بھی ہے۔ لان میں پیڑ پودے اور درخت بھی ہیں۔ جہاں تھوڑی سی محنت کر کے روٹھے ہوئے پرندوں کو واپس بلایا جا سکتا ہے۔ خوشبودار پھولوں کی مہک کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔" حرمت کا دل کھل سا گیا۔

"ممی اور ڈیڈی کے ساتھ رہنے کا مطلب پچھتاوے سے بچ جانا بھی ہو گا جوان کو توجہ نہ دے سکنے پر دل پر بوجھ کی مانند رہتا ہے۔"

وہ خوش تھی، خوش ہو رہی تھی زندگی کی تمام جہتیں جیسے ایک دم سے بدل گئی تھیں۔



"میں جو سن رہی ہوں عینی کیا وہ سچ ہے۔" اگلے روز کام کے دوران آدھے گھنٹے کے وقفے میں وہ پریشے سے واٹس ایپ پر بات کر رہی تھی۔

"تم نے کیا سنا ہے پریشے" وہ اپنی سیٹ پر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ ہی کہ تم ماضی اور مستقبل پرستی کے درمیان

"میرا گھر دیکھا ہے۔" شہریار نے کافی کا مگ برقی کیتلی کے قریب رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "میرے گھر کے درودیوار فنونِ لطیفہ سے متعلق ہر قسم کے نوادرات سے سجے ہوئے ہیں۔" اس نے ترچھی نظروں سے پریشے کی طرف دیکھا۔ "ہر طرف گم شدہ تہذیبوں اور عصرِ حاضر کی ثقافت بکھری پڑی ہے۔"

"ارے جاؤ۔" پریشے نے سر جھٹکا۔ "یہ سب تو عینی کا کمال ہے، جس نے شومئی قسمت تمہیں اپنے شوہر ہونے کا اعزاز عطا کر رکھا ہے۔" شہریار ہنس دیا تھا۔

"ویسے وہ ہے کہاں، آج تمہارے لاؤنج میں سب کچھ بکھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔ گھر پر نہیں ہے کیا۔"

"گھر ہی پر ہے۔" شہریار نے جواب دیا۔ "بہت تھکی ہوئی ہے۔ آج اس کا آؤٹ ڈور تھا۔"

"اوہ تب ہی تمہاری بکھری ہوئی چیزیں نظر آ رہی ہیں نہ ہی اس کی بڑبڑاہٹ سننے کو مل رہی ہے۔" پریشے ہنسی۔ "ویسے ایک بات کہوں؟" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"ہاں کہو۔"

"عینی تم سے کہیں زیادہ محنت کرتی ہے اور پھر بھی اس نے کبھی تھکن کا رونا رویا ہے نہ ہی یہ شکایت کی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں تم اس سے کم رفتار پر بھاگتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔" شہریار نے برقی کیتلی اٹھائی اور ابلتے ہوئے پانی سے کافی کے دو مگ بھرے۔ "مگر تم جانتی ہو، میری نسبت آدرش بھی تو اس کے بڑے ہیں، اس کے سنہری خواب، اس کے خوابوں کی تعبیریں بلندیوں پر سجی ہیں۔"

"اف!" پریشے نے سر جھٹکتے ہوئے چھت کی طرف دیکھا۔ "ہم عورتوں کا المیہ... کبھی جو ہمارے مرد ٹوکن آف گریٹی ٹیوڈ (احسان مندی، تشکر کے احساس) کے اظہار کے طور پر ایک آدھ جملہ ہی ہمارے لیے بول جائیں۔"

شہریار ایک مرتبہ پھر دل کھول کر ہنسا۔ "ایک ناکام توقع کی داستان... اگلی ہائیکو اس ٹائٹل پر لکھ سکتی ہو تم۔" کافی کے مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا... پھر ٹھیک ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔" وہ ٹرے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم بھی... اللہ حافظ۔" پریشے اسکرین سے غائب ہو گئی تھی۔



گرم کافی کے کپ ٹرے میں رکھے شہریار بیڈ روم میں داخل ہوا۔ بیڈ روم میں ہر چیز بے ترتیب نظر آ رہی تھی۔ وارڈ روب کے پٹ کھلے تھے۔ کپڑے اور دوسری چیزیں بھی گھمسان کے معرکے کے بعد کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

"کیا تلاش کر رہی ہو؟"

"ابھی تو رکھا تھا۔" جھلّائے ہوئے انداز میں بولی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے یہیں کہیں۔ نہیں مل رہا۔" اس کے لہجے میں بے بسی اور بے چینی تھی۔

"مجھے بتاؤ وہ کیا تھا۔" شہریار اٹھتے ہوئے بولا۔

"کوئی نشانی، کوئی ہنٹ (hint)۔" اس نے درازوں سے باہر نکلی چیزیں سمیٹ کر واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاپر تھا عام سا... وہ نہیں ہوتا نیلے رنگ کا۔" وہ پہلو بدل کر شہریار کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا!" وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ "اس شاپر میں کیا تھا ویسے۔"

"یہ ہی تو دیکھنا تھا۔" وہ مایوسی سے بولی۔

شہریار نے لمحہ بھر کے لیے اپنی بیوی کو یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا ہو لیکن پھر اگلے ہی لمحے وہ نیلے شاپر کی تلاش میں گھٹنوں کے بل جھکا بیڈ کے نیچے جھانک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ حرمت العین کے دماغ کی سوئی جب کسی نقطے پر اٹک جاتی تھی تو اس وقت تک آگے چلنے سے انکاری رہتی تھی جب تک نقطہ پکڑا نہ جائے، لیکن اگلے پندرہ منٹ میں اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ اس نیلے رنگ کے شاپر کو

تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا جس کی گمشدگی "حرمت العین" کو ملول کر رہی تھی۔

"کافی!" اپنی ناکامی کے بعد اس نے محنت سے بنائی کافی کا کپ عینی کی طرف بڑھایا جواب بھی منہ بسورے بیٹھی تھی۔

"ٹھنڈی ہو گئی۔ ہے نا۔" عینی نے بے دھیانی ہی میں کافی کا گھونٹ بھرا تھا۔ شہریار کو لگا ٹھنڈی کافی اس موڈ میں اسے بہت بری لگی تھی۔

"نہیں' اتنی بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو ویسے بھی چلتے پھرتے' بھاگتے دوڑتے آدھی گرم' آدھی ٹھنڈی چیزیں کھانے پینے کی عادت ہے۔ اس لیے چلے گی۔"

"دل رکھنے کا شکریہ۔" وہ ہنسا۔ اور گھٹنا موڑ کر حرمت کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "اچھا اب یہ بتاؤ۔ اس نیلے شاپر میں ایسی کیا اہم چیز تھی جو تمہیں بے چین کر رکھا ہے اس نے؟"

"کہا نا مجھے نہیں پتا کہ اس میں کیا تھا۔" وہ دوبارہ سے آزردہ ہوئی۔ "یہ ہی تو دیکھنا تھا۔" وہ شہریار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ جو ایک تجسس ہوتا ہے نا' بے چینی والا۔ وہ ہو رہا ہے کہ بھلا دیکھوں تو اس کے اندر کیا تھا۔"

"آیا کہاں سے تھا وہ تمہارے پاس۔" شہریار نے آدھی کافی مگ میں ہی چھوڑ دی۔ وہ آدھی ٹھنڈی' آدھی گرم چیزیں کھانے پینے کا عادی نہیں تھا۔

"یوں ہی آج کام کے دوران کسی نے پکڑایا تھا۔" وہ مایوسی سے سرہلاتے ہوئے بولی۔

"کیا خبر تم اسے گھر لائی ہی نہ ہو' وہیں کہیں چھوڑ آئی ہو۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" عینی نے سختی سے سر ہلایا۔ "میں جب گھر میں داخل ہوئی وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ تمہیں ہیلو کہتے کہتے میں سیدھی یہاں نہیں آگئی تھی اپنے کمرے میں۔ میں تو لمحہ بھر کے لیے بھی لاؤنج میں یا ادھر ادھر نہیں رکی اور پھر۔ پھر میں نے خود یہیں کہیں رکھا تھا اسے' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ ایک بار پھر جھلا کر بولی۔ "بس ایک شاور لینے کے لیے باتھ روم گئی۔ شاور لے کر نکلی ہوں اور شاپر غائب۔"

شہریار کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"تم۔ تم کیوں ہنس رہے ہو؟" وہ سیدھی ہوئی۔

جواب میں شہریار اور بھی کھل کر ہنس دیا۔

"میں پریشان ہوں اور تم کو ہنسی آرہی ہے۔" عینی خفا ہونے لگی۔

"تم شاور لینے کے بعد اپنے بالوں کو برش کر لیا کرو پلیز۔ یوں خشک ہو کر تمہارے بالوں کے کلرز اور بھی پھول جاتے ہیں یوں جیسے ان میں بم پھٹا ہو۔" شہریار ایک بار پھر ہنسنے لگا تھا۔

وہ محجوب سی ہو گئی۔ لاشعوری طور پر اپنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹنے لگی۔ "بس اس بار ری بونڈنگ کرواہی رہی ہوں میں۔ ایک سے ایک کوالٹی برانڈ شیمپو اور کنڈیشنز استعمال کر کے دیکھ لیا' مجال ہے جو یہ قابو میں آجائیں۔"

"ارے نہیں نہیں۔" شہریار نے ہاتھ بڑھا کر اس کا جوڑا کھول دیا۔

"جانتی ہو تمہاری ان ہی گھونگریالی زلفوں کا تو اسیر ہوں میں۔"

"جانتے ہو۔" اس نے شہریار کی طرف دیکھا "میرے بالوں کی لو کوالٹی کا حساب تو ان اماں جی نے بھی لگا لیا تھا۔ بولیں۔ کتنے روکھے اور بے جان ہیں تیرے بال۔" اس نے سر جھٹکا۔

"اماں جی کون؟" شہریار نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کوئی۔" وہ منہ بنا کر بولی' اسے ایک بار پھر نیلے رنگ کا شاپر یاد آگیا تھا۔ وہ دوبارہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گئی۔

شہریار کافی کے مگ اور ٹرے اٹھائے کچن میں رکھنے چلا گیا۔ کمرے میں واپس آکر واش روم میں گھس گیا۔ واش روم سے نکلنے کے بعد اس کے بستر میں لیٹنے تک وہ نیلے شاپر کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

"سو جاؤ اب' دن کی روشنی میں دیکھ لینا شاید مل

جائے۔" وہ غنودگی بھری آواز میں بولا تھا۔ اگلے ہی لمحے دن بھر کی تھکان اس کو اپنے حصار میں لے کر نیند کی وادی میں اتار چکی تھی۔

نصف سے زیادہ رات گزر چکی تھی جب شہریار کی آنکھ ذرا کی ذرا کھلی تھی اور نائٹ بلب کی روشنی میں اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے عینی سامنے کاؤچ پر کوئی چیز گود میں لیے گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ دوبارہ آنکھیں بند کر سونے سے پہلے ایک تصور جو اس کے ذہن میں روشن ہوا تھا وہ اسی نیلے شاپر کے متعلق تھا جو غالباً" عینی کے قریب کاؤچ پر رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شہریار کو تو آج گاڑی سروس کرانے جانا ہے ممی اور میں..." وہ فون کان سے لگائے گھر میں ادھر اُدھر گھومتی چیزیں سنبھالتی، ٹھیک کرتی پھر رہی تھی۔ "میں کہاں فارغ ہوں گی۔ آپ تو جانتی ہیں۔ آج مجھے لانڈری کرنی ہوتی ہے اور پھر ہفتہ بھر کے کام' آئی ایم سوری ممی میں بھی آپ کی طرف نہیں آسکوں گی۔"

اس نے قریب سے گزرتے شہریار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور نظروں کے اشارے سے اس سے پوچھنے لگی وہ اپنی ممی سے بات کرسکتا تھا یا نہیں جواب میں شہریار نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے منع کردیا۔ وہ ممی کے سامنے ذکر بھی نہ کرے کہ وہ گھر پر موجود تھا۔

"جی ممی! پری سے پتا چلا تھا ڈیڈی کو ایک بار پھر پیٹ کی تکلیف ہوگئی۔" شہریار سے مایوس ہو کر اس نے خود ہی اگلی بات شروع کردی۔ "ڈیڈی کو انزائمز کا پرابلم ہے ممی! ڈاکٹرز کی بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ الٹی سیدھی دوائیں دے دیتے ہیں۔"

واشنگ مشین میں کپڑے لوڈ کرنے کے لیے وہ پل بھر کو جھکی اور اس کے سیدھے ہونے تک شہریار گاڑی کی چابی والا ہاتھ لہراتا اسے خدا حافظ کہتا دروازے سے باہر جاچکا تھا۔

"آپ انہیں ہلکی غذا دیا کریں نا!" فون کان اور کندھے کے درمیان دبا کر اس نے سنک میں رکھے ناشتے کے برتن دھونے شروع کیے۔ جواب میں ممی' ڈیڈی کے مزاج کی طویل شکایات سنانے لگی تھیں۔

"ٹھیک ہے ممی! اس بار نہیں تو اگلے ویک اینڈ پر ہم ضرور کوشش کریں گے آپ کی طرف چکر لگالیں۔" ممی کی بات آدھی ادھوری سننے کے بعد اس نے خدا حافظ کہنے سے پہلے کی تسلی دینا چاہی۔

"ارے ہاں۔" ممی کا جواب سن کر اس کا ہاتھ پیشانی پر جا ٹکا۔ "نیکسٹ ویک اینڈ پر تو روزے شروع ہو رہے ہیں' میں تو بھول ہی گئی تھی۔" افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کا سر ہلا۔ "رمضان میں تو ممکن نہیں ہوگا نا ممی! آپ جانتی ہیں رمضان میں تو ساری ٹائمنگز' سب روٹین ہی بدل جاتی ہے۔ اکثر تو ہم دونوں افطار کے ٹائم بھی گھر پر نہیں ہوتے۔ سحری کا ٹائم کتنی جلدی ختم ہوجاتا ہے۔ انسان رات میں کب سوئے' کب جاگے' اس لیے ہم سحری تک وقت جاگ کر ہی گزار لیتے ہیں۔ سحری کے بعد کچھ دیر کی نیند اور پھر وہی جاب' ہاں ٹف لائف ہے' مگر کیا کریں ممی! اب اس کا کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا نا۔" اس نے برتن دھونے کے بعد کچن کاؤنٹر پر کپڑا پھیرا۔

"چلیں پھر بھی میں خود نہ سہی تو شہریار سے ضرور کہوں گی' ایک بار ڈیڈی کو دیکھ آئے' آپ سے مل آئے۔" اس نے ایک بار پھر تسلی دی اور فون کان سے ہٹا کر بند کردیا۔

"اف..." اس نے لمبا سانس لیا اور سر جھٹکا۔ "کتنا بولتی ہیں شہریار کی ممی اور اوپر سے اونچا سننے لگی ہیں۔ چیخ چیخ کر بندے کے دماغ کا فیوز اڑ جائے بس۔" واشنگ مشین کا ٹائمر بجنے لگا تھا وہ اس کی طرف لپکی۔

ہمیشہ کی طرح چھٹی کا وہ دن بھی ہفتہ بھر کے ٹالے کاموں کو نمٹاتے گزر گیا۔ پورے گھر کی صفائی' لانڈری اور آنے والے سات دنوں کے لیے اپنے اور شہریار کے کپڑے استری کرکے لٹکانے تک دوپہر کے پونے تین بجے گئے۔ شہریار ابھی بھی گھر واپس نہیں آیا تھا۔

"اپنے کسی دوست کے ساتھ ایم ایم عالم روڈ کے کسی کیفے میں بیٹھا لنچ اڑا رہا ہوگا۔" لاؤنج کے صوفے

پر بیٹھ کر اپنی پنڈلیاں اور پیر سہلاتے اسے خیال آیا تھا۔

"کیسا ہیرو ہے یہ میری کہانی کا' شادی سے پہلے میرے بغیر جس کے حلق میں نوالے اٹکتے تھے اور اب..." شادی کے بعد یہ لو اسٹوری ایسے ہی انجام سے دوچار ہوجاتی ہے۔ لو اپنے بچوں کے ساتھ سالگرہ' اینورسری کے موقعوں پر دیواروں پر سجا نظر آتا ہے اور اسٹوری... پرانے اخبار کی فیچر اسٹوری بن جاتی ہے۔ جس کی اہمیت ان ہی دنوں تک محدود ہوتی ہے' جن دنوں وہ چل رہی ہوتی ہے۔

اس نے اپنے ہاتھوں کی تھکی ہوئی انگلیوں پر زیتون کے تیل کا مساج کرتے ہوئے سوچا۔ اس وقت اسے سخت بھوک لگ رہی تھی اور کچھ بنانے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔



"کچھ پتا نہیں چلتا' بتی کدھر آتی ہے کدھر پھر سے چلی جاتی ہے۔ بتی کی ان آنیوں جانیوں میں میری پانی کی موٹر کا کباڑا ضرور ہوجاتا ہے آئے دن۔ یہ چار پیڑ پودے جو میں نے لگا رکھے ہیں اب اس غضب کی گرمی میں بھی ان کو پیٹ بھر کے پانی نہ ملے تو ناراض ہوکر مرجھانے لگتے ہیں۔"

انہوں نے سبز رنگ کا پانی کا فوارہ بمشکل اٹھایا اور پودوں کو پانی دینے لگیں۔

پھر فوارہ صحن کے ایک کونے میں رکھا اور خود موٹر کے قریب نصب ہینڈ پمپ چلا کر ہاتھ اور منہ دھونے لگیں۔ گیلے چہرے اور ہاتھوں کو' سر پر رکھے ململ کے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے وہ واپس اس چارپائی تک پہنچیں جو صحن کے وسط میں نیم کے درخت کے نیچے بچھی تھی۔ اور جس پر کشیدہ کاری کا فریم اور دھاگے رکھے تھے۔

"اللہ غنی۔" انہوں نے چہرہ اور ہاتھ خشک کرنے کے بعد دوپٹا سر پر اوڑھا اور چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ "ٹھپے لگانے والے نے بھی اس بار عجیب ہی پھول چھاپ دیے۔ میز پوش کے کپڑے پر مدت ہوئی سوتی چور ٹانکا تو میں نے بنایا ہی نہیں کپڑے پر' اب خدا جانے ٹھیک سے بنے گا بھی یا نہیں۔" فریم میں جڑے سوتی کپڑے سے کشیدہ کاری کی سوئی نکالتے ہوئے وہ ایک بار پھر بڑبڑائی تھیں۔

اسی دم داخلی دروازہ کھلنے اور کسی کی گھر کے اندر آمد کی وجہ سے قدموں کی چاپ ان کے کانوں تک پہنچی۔

"آجاؤ' آجاؤ۔" وہ کپڑے پر نظر جمائے بولیں۔

"بتی کی آنکھ مچولی جاری رہنے کی وجہ سے برف کچی ہے۔ کچی برف لے جاتے ہو تو لے جاؤ۔" انہوں نے محلے کے کسی بچے کی آمد کے خیال سے بلند آواز میں کہا۔ محلے کے کئی بچے دن بھر ان سے برف مانگنے آتے رہتے تھے۔ اپنی بات کا جواب نہ پاکر انہیں کشیدہ کاری سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھنا پڑا تھا۔ ہینڈ پمپ کے قریب وہ کھڑی تھی۔ وہی جسے پچھلے روز بازو سے پکڑ کر وہ اپنے گھر زبردستی لے آئی تھیں۔ بے اختیار قریب کی نظر کا چشمہ انہوں نے آنکھوں سے ہٹا کر دیکھا تھا۔

"ارے آؤ... آؤ... وہاں کیوں کھڑی ہو۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا فریم چارپائی پر رکھا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ وہ ہنوز اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

"اگرچہ تم نے کہا نہ ہی میں نے بلایا پھر بھی مجھے یقین تھا تم ضرور آؤگی۔" انہوں نے خود آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور چارپائی تک لے آئیں۔

"بیٹھو ادھر۔" انہوں نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "ٹھہرو' میں تمہارے لیے مونڈھا لے کر آتی ہوں۔" وہ تیز قدموں سے چلتی چھوٹے سے برآمدے تک گئیں اور سرخ چمڑے کی سیٹ اور بیک والا مونڈھا اٹھا لائیں۔

"لو ادھر بیٹھو۔" انہوں نے مونڈھے کی سرخ چمڑے والی سیٹ ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔

"میں نے آنے سے پہلے اس نمبر پر کال کی تھی جو آپ نے اس دوپٹے میں لپیٹ کر رکھا تھا۔" آنے والی نے دھیمی آواز میں کہا۔ "لیکن آپ نے کال اٹینڈ نہیں کی۔"

"اب اس عمر میں میرا فون ادھر اُدھر ہی پڑا رہتا ہے۔ کسی کا فون آنے کی امید بھی تو نہیں نا!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔

"آپ نے مجھے تو نمبر دیا تھا نا۔ اسی لیے دیا تھا کہ میں آپ کو کال کروں۔" اس نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

جواب میں انہوں نے اقرار کرنے کے انداز میں سر ہلایا۔

"رات میں آپ کے والا تھیلا شاپر کہیں رکھ کر بھول گئی۔" وہ مسکرائی۔ "آدھی رات تک ڈھونڈتی رہی۔ مل کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ خیال ہی نہیں آیا کہ جوتوں کے ریک میں بھی جھانک لوں۔ کل گھر واپسی پر جوتے اتارے تو بے دھیانی میں شاپر بھی ایک میں رکھ دیا۔" وہ بتا رہی تھی پھر اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"جانتی ہیں' وہ دوپٹا بہت پیارا ہے۔ اس پر بنے پھول اور بوٹیاں اور اس کو آپ نے کہاں سے کرش کرایا بھلا میرا ڈائر تو ذرا بھی اچھا کرش نہیں کرتا دوپٹا۔"

"اچھا لگا تھا تو اوڑھ کر آتیں۔ مجھے بھی بہت اچھا لگتا۔ تمہیں وہ دوپٹا اوڑھا دیکھ کر۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ جواب میں وہ خجل ہوتے ہوئے خود میں ذرا سا سمٹی۔

وہ پھولدار جمپر پر گول گھیرے کی چھوٹی قمیص پہنے صبح سے گھر کا کام کر رہی تھی اور اسی طرح اٹھ کر ادھر چلی آئی تھی۔ پیروں میں وہی گھر میں پہننے کی چپل تھی جو اس سے پہلے کبھی وہ گھر سے باہر پہن کر نہیں نکلی تھی۔

"خیر عادت نہ ہو تو کون اوڑھے' مگر بات یہ ہے کہ اوڑھنیاں تو اوڑھنے کے لیے ہی ہوتی ہیں نا۔" انہوں نے اسے خجل ہوتے دیکھ کر کہا۔

"یہ بتاؤ کیا پیو گی؟ اتنی گرمی میں چل کر آئی ہو تو پیاس تو لگ رہی ہوگی نا!" وہ اٹھتے ہوئے بولیں "لیکن میرے گھر میں تو تمہیں گھر کا بنا ہوا شربت ہی پینے کو ملے گا۔ بازاری شربت اور ٹھنڈے مشروب میں گھر میں نہیں رکھتی۔"

"آپ جو بھی پلادیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"اچھا!" وہ خوش ہو گئیں۔ "پھر بتاؤ کون سا والا پیو گی۔ کیری کا' بادام کا یا فالسے کا؟"

"فالسہ؟ فالسے کا پلادیں۔"

"تو تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔" وہ کمرے میں گھس گئیں اور وہ نیم کے درخت کے نیچے بچھی اس چارپائی پر بیٹھی سوچ میں گم ہو گئی۔

اسے اپنے گھر سے اس گھر تک کے فاصلے کے درمیان مختلف جگہوں پر رہنے والے شناسا' دوست احباب یاد آئے' جن میں سے کسی کے گھر بھی وہ تھوڑا سا وقت گزارنے جا سکتی تھی پھر اسے یاد آیا کہ یہاں آنے سے پہلے اسے شدید بھوک لگ رہی تھی اور اس گھر تک پہنچنے کے راستے میں کتنے ہی ریسٹورنٹ' کیفے اور ڈھابے اسے نظر آئے تھے وہ ان میں سے کسی پر بھی نہیں رکی پتا نہیں وہ رکی۔ نہیں تھی یا رک نہیں سکی تھی۔

چھٹی کے اس دن جب وہ کہیں بھی کسی کے گھر جانے کے تصور سے ہی بے زار ہو جاتی تھی۔ اس بھری دوپہر میں دوپہر کا آرام چھوڑ کر وہ یہاں کیوں آگئی تھی اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسی دم وہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے کمرے سے نمودار ہوئیں۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر ٹرے ان کے ہاتھ سے لے لی۔ ان کے ہاتھوں کی خفیف سی لرزش اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

"یہ میٹھا ہے' کھٹا ہے' ٹھنڈا ہے اور بے حد ری فریشنگ ہے۔" اس نے تین گلاس شربت پینے کے بعد ان سے کہا۔ "میرا مطلب جاں فزا۔"

"جانتی ہوں' جانتی ہوں۔ ریفریشنگ سمجھتی ہوں میں۔" وہ جو اس کے شربت کے گلاس چڑھانے کے دوران خوش ہوتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ "چھبیس سال اسکول کی بچیوں کو انگریزی پڑھائی ہے میں نے ایم سی ہائی اسکول نمبر ون میں۔"

ان کے منہ سے یہ انکشاف سن کر حرمت العین لحہ بھر منہ کھول کر انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"ایم اے انگریزی کیا تھا میں نے کسی زمانے میں۔" وہ ہنس کر بولیں۔ "یہ ہی اپنے گورنمنٹ کالج سے۔"

ایسی عاجزی اور بے نیازی کے ساتھ وہ جو کہہ رہی تھیں وہ سچ تھا۔ حرمت کو یقین آیا۔

"تم یہ بتاؤ بھوک لگی ہے کیا۔ کچھ کھاؤ گی؟" وہ حرمت کی بے یقینی بھانپ چکی تھیں۔ شاید اسی لیے موضوع بدلنا چاہ رہی تھیں۔

"بھوک۔" حرمت کو ان کا انگریزی میں ماسٹر ہونا بھول گیا اور پیٹ میں دوڑتے وہ چوہے یاد آگئے جنہوں نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔

"دال کریلے پکائے تھے میں نے، اب پتا نہیں تم کھاتی ہو کہ نہیں دال کریلے۔" وہ قدرے شرمندگی سے بولیں۔ "ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔ گلی میں کوئی بچہ نظر آجائے تو تمہارے لیے بریانی منگوالیتی ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھیں حرمت نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"آپ مجھے دال کریلے ہی کھلادیں۔" وہ خود پر حیران تھی۔ وہ ایسی بے تکلف اور ندیدی کب سے ہوگئی تھی۔ جو اپنے منہ سے کسی میزبان کو اپنے انتخاب بتانے لگی تھی۔

"اچھا!" وہ خوش ہو گئیں۔ "دس منٹ دو مجھے، روٹی ڈالتی ہوں تمہارے لیے۔" وہ ایک بار پھر اٹھ کر کسی کمرے میں گھس گئیں۔

حرمت نے نظر اٹھا کر نیم کے درخت کی شاخوں کو دیکھا جو اس کے سر پر سایہ کیے ادھر ادھر بکھری تھیں۔ جن کے سائے تلے اسے گرمی کا کم احساس ہو رہا تھا۔ مختصر سے اس گھر کے صحن کا فرش اینٹوں سے بنا تھا۔ کہیں سے اونچا کہیں سے نیچا۔ صحن کے ایک طرف موڑا اور اس کے ساتھ ہینڈ پمپ جس کے ادگرد نصف دیوار اٹھائی گئی تھی۔ اس نصف دیوار پر پیتل کا لوٹا اور صابن دانی رکھی تھی۔ صابن رکھا نظر آرہا تھا۔ صحن کے دوسرے کونے میں داخلی دروازے سے ذرا ہٹ کر کوڑا دان جو گھی کے کنستر سے بنایا گیا تھا ڈھکا رکھا تھا جس کے ساتھ جھاڑو اور ڈسٹ بین سہارا لیے کھڑے تھے۔

اس ماحول کو کیا نام دیا جائے۔ ایسا ماحول جس پر غربت، مسکینی اور مفلسی چھائی ہوئی ہے یا ایسا ماحول جس پر قناعت، سلیقے اور سکون نے اپنا سایا کر رکھا ہے۔

سوچتے سوچتے چارپائی پر لیٹ جانے کی خواہش میں اس کا ہاتھ کشیدہ کاری کے فریم سے ٹکرا گیا۔ اس نے فریم اٹھا کر نظروں کے سامنے کیا۔ ایک بڑا پھول جس کی ان گنت پتیاں کپڑے پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں اور جس کے سروں پر گندم کے سٹوں جیسے سٹے بھی نکل رہے تھے۔

"اف کتنی محنت کا کام ہے!" اس نے بے خیالی میں کپڑے میں اٹکی سوئی نکالی اور پھر گھبرا کر واپس اٹکا دی۔ "میری نظریں تو اسے دیکھ ہی کر چکرا گئیں، یہ اس کو بنا رہی ہیں۔" اس نے سر جھٹکا اور فریم چارپائی کے کنارے پر رکھ دیا۔ چارپائی کے قریب ہی ایک اونچی تپائی پر سلائی مشین رکھی تھی جس کی سوئی کے نیچے کوئی ان سلائی کپڑا اٹکا تھا۔ "کشیدہ کاری کے فریم، سلائی مشین۔" حرمت العین کے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔

"لو کھانا کھالو۔۔۔" روشنی کے اس جھماکے میں ابھرتی تیرتی وہ تصویریں دیکھنے کا موقع اسے نہیں مل سکا جو وہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے لیے کھانا آچکا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ادھر نلکے سے ہاتھ دھو لو اور پھر پیر اوپر کر کے آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔" وہ ٹرے چارپائی پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"شاید مجھے بہت زیادہ بھوک لگی۔" ندیدوں کی طرح سادہ، کسی تکلف سے پاک کھانا کھاتے ہوئے ذرا کی ذرا ہاتھ روک کر اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تو پیٹ بھر کر کھاؤ، کسی تکلف کی ضرورت

نہیں۔" اماں جی نے مسکرا کر جواب دیا۔
کھانا کھانے کے دوران کیوں، کیا، کیسے کے ابتدائیے کے ساتھ بے شمار سوال اس کے ذہن میں آتے رہے تھے۔ جن پر دھیان دیے بغیر وہ شوق سے کھانا کھاتی رہی تھی۔
"بتا کر آتیں تو تمہارے لیے کچھ خاص بنالیتی۔"
کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ اس چارپائی پر لیٹی نیم کے پتوں کو ہوا کی زد پر ہولے ہولے لرزتے دیکھنے میں مگن تھی وہ اس کے قریب مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "میں چنے کی دال کی کھچڑی بہت اچھی بناتی ہوں، ساتھ میں پودینے، کیری کی چٹنی اور کھیرے کا رائتہ۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں۔ منہ میں پانی آتا محسوس ہو رہا تھا۔ "صبغت اللہ کو بہت اچھی لگتی تھی جب میں یہ کھچڑی بناتی تھی۔ بہت شوق سے کھاتا تھا وہ۔"
"صبغت اللہ!" نیم کے پتوں کو ہلکورے لیتے دیکھتے وہ چونکی اور اس نے سوالیہ نظروں سے اماں جی کی جانب دیکھا۔
وہ نرمی سے مسکرائیں۔ "بیٹا ہے میرا، صبغت اللہ" اور پھر ہنس دیں۔ "میں نے بڑے شوق سے اس کا نام صبغت اللہ رکھا تھا۔ اللہ کا رنگ۔"
"لگتا ہے ان کا بیٹا یا تو مر گیا یا انہیں چھوڑ کر چلا گیا۔" اس نے نظریں واپس نیم کے پتوں پر ٹکائیں۔
"سائنس دان ہے، جرمنی میں رہتا ہے۔ بڑے نام والا آدمی بن چکا ہے۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں۔ حرمت العین چونک کر اٹھی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"آپ کا بیٹا جرمنی میں رہتا ہے۔" اس نے کہا اور قریب رکھے فون پر نیٹ آن کر کے گوگل سے صبغت اللہ کے متعلق دریافت کرنے لگی۔
"وہ ایک نامور سائنس دان ہے۔" اس نے گوگل کا جواب پڑھنے کے بعد ان کی طرف دیکھا۔
"تو آپ اس چھوٹے سے مکان میں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہیں۔ اپنے بیٹے کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں۔" اس نے اس صحن پر نظر دوڑائی۔
"میری چھوڑو اپنی سناؤ۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "شادی تمہاری ہو چکی ہے نا بھلا۔"
حرمت نے سر ہلایا۔ "اچھا!" وہ خوش ہو کر بولیں۔ "بچے کتنے ہیں۔"
"ابھی نہیں ہیں بچے۔" حرمت نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکتے ہوئے کہا۔
"نئی نئی شادی ہوئی ہے کیا۔" اگلا سوال آیا۔
"نہیں چار سال ہو چکے شادی کو۔" حرمت نے ان کی طرف دیکھا اس کا جواب سن کر ان کے چہرے کا تاثر بدل سا گیا۔
"یہ پودے بہت فریش ہیں اور ان پر پھول بھی خوب آئے ہیں۔ لگتا ہے آپ ان کی بہت اچھی دیکھ بھال کرتی ہیں۔" اب کے حرمت نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔
"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا۔ "میری ساس کے ہاتھ کے لگائے ہوئے ہیں یہ پودے۔ ساس سسر اور شوہر کے بعد میرے ساتھی بن گئے یہ۔" انہوں نے کشیدہ کاری کا فریم اٹھا کر تانکا نکالا۔ "ان کی صفائی، نلائی، پانی دینا، ان کی کتر بیونت سب خود کرتی ہوں۔"
"ہوں۔" حرمت نے گہرا سانس لیا۔ "اور یہ کڑھائی، سلائی بھی۔" اس نے ان کی ہاتھ کی طرف دیکھا۔
"نہ کروں تو کیا کروں۔" انہوں نے ہاتھ روک کر آنکھوں سے چشمہ ہٹایا۔
"پہاڑ جیسے دن، طویل دوپہریں، عجلت بھری شامیں اور مختصر راتیں گزارنی ہیں تو کوئی نہ کوئی کام تو کرنا پڑے گا۔" انہوں نے چشمہ دوبارہ آنکھوں پر جمایا۔
"لیکن سچ پوچھو تو مزا نہیں رہا اب کسی کام میں بھی۔"
"کیوں؟" وہ چونکی۔
"صبغت اللہ اکلوتا بیٹا ہے میرا۔ مجھے بیٹی کی بڑی خواہش تھی اللہ نے نہیں دی۔ میں نے کہا ٹھیک

ہے۔ اللہ تیری مرضی۔" وہ ہنسنے لگیں۔ "صبغت اللہ کو ہی اس کے بچپن میں طرح طرح کی فراکیں سی سی کر پہناتی تھی۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے۔ کوئی آٹھ 'ایک برس ہوئے ہوں گے مجھے اسکول کی نوکری سے ریٹائر ہوئے۔ جب تک ریٹائر نہیں ہوئی تھی زندگی میں رونق سی لگی محسوس ہوتی تھی۔ ایک دسویں جماعت جاتی تھی ہر سال ایک نئی آجاتی تھی۔ کورس کی کتابیں اگرچہ سالہا سال ایک سی ہی رہیں' لیکن میں پڑھاتے نہیں تھکتی تھی۔ پھر اسکول سے چھٹی کے بعد بھی کون سا آرام کا موقع مل جاتا تھا۔ کبھی ایک شاگرد آرہا ہے۔ کبھی دوسرا' مس رقیہ ٹینس سمجھادیں' ایکٹو وائس' پیسو وائس' ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ پڑھادیں' مضمون لکھنا ہے' درخواست لکھنی ہے۔ رات گئے تک آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں بھی مگن تھی' ساس' سسر اور شوہر کی جدائی کا غم بھول گئی تھی۔ صبغت اللہ کو جرمنی اپنی مرضی سے اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے بھیجا۔ وقت مانو اڑتا چلا گیا اور پھر ایک دن آیا کہ مس رقیہ حفیظ ریٹائر ہوگئیں۔"

"اوہ۔" حرمت نے ہونٹ سکیڑے۔ "مطلب سب مصروفیت ختم۔"

"ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "مصروفیت تو ختم ہوگئی' لیکن فرصت سے جو اپنے اردگرد نظر ڈالی تو سمجھو دم بخود رہ گئی۔"

"ہیں' وہ کیوں؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"ارے زمانہ' سال' دن کدھر بیت گئے۔ جو مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

سر اٹھا کر جو چاروں طرف نظر ڈالی تو اپنے زمانے کے پرانے' کشادہ مکان کہیں نظر نہ آئے' یہ اپنا ماڈل ٹاؤن' مسلم ٹاؤن' صدر' کیسی کیسی شاندار کشادہ کوٹھیاں ہوا کرتی تھیں یہاں۔ سب ختم۔ ان کی جگہ دیکھا تو کنکریٹ اور لوہے سے بنی بلند و بالا عمارتیں' گھر' پلازے کھڑے تھے۔ سڑکیں کشادہ' گلیاں کشادہ' سر کے اوپر سے' پیر کے نیچے سے فلائی اوور اور انڈر پاس گزرتے نظر آئے۔ بھلا لگا' برا نہیں لگا۔" انہوں نے رک کر وضاحت کی۔ "مگر وہ جو سڑکوں کے کنارے' پرانی کوٹھیوں اور مکانوں میں فلک بوس درخت ہوا کرتے تھے' وہ کدھر گئے۔ کہیں نظر نہیں آتے۔"

انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "جامن کے درخت دیکھے ہیں کبھی تم نے؟"

حرمت کے دماغ میں کہیں روشنی کا جھماکا دوسری بار ہوا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ "جامن کے درختوں میں کوکتی کوئلیں۔ انسانوں کو بلاتی تھیں کہ آؤ ہمیں ڈھونڈ لو اور تجسس کے مارے انسان انہیں ڈھونڈنے بھی نکلا کرتے تھے۔"

حرمت العین نے روشنی کے جھماکے کے اندر جھانکا۔ کالی کالی جامنوں سے لدے درخت' گرما کی طویل روشن دوپہریں' کوئل کی آواز۔ نیکر' شرٹ پہنے ایک سات سالہ لڑکا' اسموکنگ والی فراک پہنے ایک پانچ سالہ بچی۔۔۔ درخت پر چڑھے اس کے ان گنت پتے ہٹا ہٹا کر دیکھتے کوئل کو ڈھونڈتے متجسس بچے۔ کوئل جو کبھی نظر نہ آئی تھی کی جستجو جو عرصہ تک قائم رہی تھی۔

"جامن کے وہ گھنے درخت اب اول تو نظر ہی نہیں آتے' نہیں جو نظر بھی آجائیں تو ان میں کوکتی کوئلوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ کبھی اب کہیں سنی ہیں تم نے کوئلوں کی کوک۔"

حرمت العین نے اپنے ذہن پر پورا زور دیا۔ "آخری بار کب سنی تھی' کہاں سنی تھی' ہار کر اس نے اماں جی کی طرف دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

"ڈر گئی ہیں' بھاگ گئی ہیں کوئلیں۔" وہ بے بس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "انسانوں کے گھر' انسانوں کی گاڑیاں' شور ہنگامہ' ان بے چاریوں کی کوکو اس نقار خانے میں کس کان تک پہنچتی اور پھر یہ جو آگئے انسان کی زندگی میں اللہ مارے۔"

انہوں نے کشیدہ کاری کے سامان کی ٹوکری سے ایپل کا ٹیبلٹ نکال کر حرمت کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ حرمت حیرت سے وہ ٹیبلٹ دیکھتی' صرف پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔

"انسان کے پاس فرصت ہی کہاں رہی تھی درختوں میں کوکتی کوئل کا غم سننے کی' سو ہار کر وہ اپنے ٹھکانے چھوڑ کر کہیں اور چل دیں۔"

"آپ کے پاس یہ گیجٹ ہے نا۔" حرمت نے ان کے ٹیبلٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں سب دیکھا جاسکتا ہے نئی' پرانی سب تصویریں سب سنا جاسکتا ہے نئی' پرانی سب آوازیں۔"

"ہاں!" وہ ہنسیں۔ "سیر بین ہے یہ سیر بین۔" انہوں نے جیسے راز کی بات بتائی۔ "لیکن خالی تصویروں اور آوازوں سے تو کام نہیں بنتا نا' ہر چیز اپنے خاص ماحول ہی میں اچھی لگتی ہے اب ان ہی کو دیکھو۔" انہوں نے صحن میں نظر آتے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ موتیا' چنبیلی' رات کی رانی ذرا قریب جاکر سونگھو' خوشبو ہے ان میں یا نہیں۔" حرمت نے اٹھ کر موتیا کے کتنے ہی سفید پھول توڑ کر ہتھیلی پر رکھتے اور ناک کے قریب لاکر سانس کو اندر کھینچا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" اماں سرہلا کر بولیں۔ "نہ پھولوں میں وہ باس رہی ہے نہ ہی مٹی میں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں نے ان پودوں کو پانی دیا ہے' گیلی مٹی کی خوشبو محسوس ہوئی تجھے۔" حرمت نے پودوں کے پیروں میں بچھی گیلی مٹی کی طرف دیکھا۔ اس کے دل یک دم اداس ہوگیا۔ کچھ کھودینے کا احساس اس کے دل میں جاگا۔ وہ مرے قدموں سے چلتی واپس اماں جی تک پہنچی۔

"بدلا ودلا کچھ نہیں۔" اماں جی نے سرہلایا۔ "یہ پودے' یہ پیڑ' پرندے' مٹی سب ویسے ہی ہیں' بدلی ہے تو صرف انسان کی نیت۔" وہ فرش پر نظریں جمائے کہہ رہی تھیں۔

"انسان کی نیت میں کھوٹ آگیا ہے اور 'اور' اور کی ہوس میں مبتلا ہوچکا ہے۔ آج کا انسان میلی' بدرنگ بدشکل نیت کے ساتھ جیتا ہے۔ جب ہی تو قدرت نے بھی اپنی صناعی اور دلکشی سے رنگ اور خوشبو کھینچ لیے ہیں۔"

وہ کہتے کہتے رکیں اور حرمت العین کی طرف دیکھنے لگیں جس کی آنکھیں بند تھیں۔ بند آنکھوں پر سایہ کرتی پلکیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں کے کونے بھیگے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"اب خود ہی کو لے لو۔" انہوں نے حرمت کو بند آنکھیں کھولنے پر اکسانے کے لیے کہا۔ "کیا کہہ رہی تھیں کل تم۔ تمہاری عید کی ساری چھٹیاں سارا دن سوتے' آرام کرتے گزرتی ہیں نا۔"

حرمت العین نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اماں جی کی طرف دیکھا۔ "چار سال تمہاری شادی کو ہوچکے۔ بچہ پلان نہیں کیا تم نے۔ ہے نا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔



اپنے اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ مقفل دیکھ کر شہریار کو حیرت ہوئی تھی۔ اس روز عینی نے کہیں جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا' ہاں اس شام ان دونوں کا ہفتہ بھر کے لیے گروسری کے بعد اپنے اپارٹمنٹ کے نیچے والے بڑے شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں کھانا کھانے اور اس کے بعد وہیں فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔

ڈپلیکیٹ چابی سے تالا کھول کر گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے فون پر عینی کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری یا شاید تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے عینی کی آواز سنائی دی تھی۔

"ہاں کہاں ہو یار؟" شہریار نے گاڑی اور گھر کی چابیاں میز پر پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑی دیر میں آرہی ہوں بس۔" اس کے فون کے ایئر پیس پر عینی کی آواز ابھری۔ شہریار اندازہ نہیں کرپایا کہ عینی کو زکام ہو رہا تھا یا پھر یوں ہی اسے اس کی آواز بھاری لگی تھی۔

شہریار نے قریب میز پر ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول یونٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کردیا۔ ٹھیک بیس منٹ بعد عینی گھر واپس آچکی تھی۔

"میں بہت تھک چکی ہوں۔ آرام کروں گی۔" ہیلو ہائے کے بعد وہ سیدھی اپنے بیڈ روم میں گھس گئی

تھی۔ شہریار نے اسے بیڈ روم میں جاتے دیکھا اور اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "عینی اور اس حلیے میں کہیں باہر چلی جائے۔ وہ بھی ویک اینڈ پر۔۔۔ عام سے کپڑے' بغیر میک اپ اور پیروں میں چپل۔ وہ تو کبھی سینڈلز' پمپس یا کھسے پہنے بغیر مارکیٹ سے ڈبل روٹی تک خریدنے نہیں جایا کرتی تھی۔

"ڈنر کا کیا پروگرام ہے؟" عینی کے حلیے پر غور کرتے کرتے اس نے گردن موڑ کر بلند آواز میں پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" بیڈ روم سے جواب آیا۔

"اور وہ گروسری۔" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"پھر کسی روز۔" مختصر جواب ملا۔

"کافی پیو گی' بناؤں؟" شہریار کو یہ ہی تو ایک کام ڈھنگ سے کرنا آتا تھا۔

"ہاں ضرور!" وہ جانتا تھا کافی سے انکار نہیں ہوگا۔ اسی لیے اٹھ کر کچن کی طرف آگیا تھا۔



وہ پچھلے چالیس منٹ سے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کے قریب کھڑی کھڑکی کے پار پھیلے منظر کو دیکھے چلی جارہی تھی۔ وہ روشنیوں کے شہر کی باسی تھی اور روشنیوں کے شہر پر اس وقت رات اپنی تاریکی کی چادر پھیلا چکی تھی۔ جلتی روشنیوں کی بہتات رات کی تاریکی کا پوری طرح مقابلہ کرنے میں مصروف تھی۔

"کیا کچھ دیر پہلے جب میں کمرے سے باہر گیا تھا ہم برف پانی والا کھیل کھیل رہے تھے۔" گرم کافی سے لبریز دو مگ ٹرے میں رکھے شہریار نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا تھا۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے تمہیں منجمد ہوجانے کا اذن دے کر گیا تھا۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"مطلب؟" اس نے اپنے سامنے کے منظر سے ذرا کی ذرا نظر ہٹا کر پوچھا تھا۔

"مطلب' جب میں کمرے سے باہر گیا تھا اس وقت بھی تم بالکل اسی زاویے پر کھڑی باہر کچھ دیکھ رہی تھیں اور اب جب میں واپس آیا ہوں تو ابھی بھی تمہارا زاویہ وہی ہے۔ تمہاری نظریں اسی ایک نقطے پر جمی ہیں۔" وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ٹرے میز پر رکھی اور کافی کا ایک مگ اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔

"شکریہ!" اس نے کافی کا مگ پکڑتے ہوئے کہا۔

"خوشبو بہت اچھی ہے۔"

"ہوں؟" وہ اپنا مگ ہاتھ میں لے کر اس کے سامنے کھڑکی کے ساتھ کمر ٹکاتے ہوئے بولا۔ "کیا سوچا جارہا ہے بائے دا وے۔"

"ان روشنیوں کی طاقت کا اندازہ کررہی تھی۔ دیکھو تو ان کی چکاچوند سے۔ آسمان پر بکھرے ستارے ان کے سامنے مات کھاتے نظر آتے ہیں۔"

"ہاں۔" شہریار نے ایک نظر باہر کے منظر پر ڈالی "اس لیے کہ یہ روشنیاں ہماری نظر کی حد سے قریب ہیں اور ستارے' بہت دور۔"

"جب ہی ہم ان میں کھو کر رہ گئے۔" وہ بڑبڑائی اور پھر شہریار کی جانب دیکھنے لگی۔

"شہریار کتنے سال ہوگئے بھلا ہمیں عید منائے۔ ذرا گن کر تو بتاؤ۔"

جواب میں شہریار نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے اس کے سوال کی درستی پر شک ہورہا ہو' اور پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیا۔

"ہر برس ہی تو مناتے ہیں عید' ایک نہیں دو' دو عیدیں۔ تم شاید یہ پوچھنا چاہ رہی ہو کہ اب تک ہم دونوں نے اکٹھے کتنی عیدیں منائیں۔" تو اس کا حساب میں تمہیں ابھی بتادیتا ہوں۔"

"نہیں نا۔" وہ آنکھیں میچ کر۔۔۔ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔ "میرا سوال وہی ہے جو تم نے سنا۔ ہمیں عید منائے کتنے برس ہوگئے؟" اب شہریار اس کے سوال پر کنفیوز ہوگیا تھا۔

"وہ عید' جسے ہم عید منانا کہتے ہیں' وہ عید تھوڑی ہوتی ہے۔" شہریار کی طرف سے جواب نہ پاکر وہ بولی تھی۔ "وہ تو بس ایک عام سا دن ہوتا ہے' چھٹی کا جسے

ہم عید اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں ڈھیر سارا آرام کرنے کا موقع مل جاتا ہے اس دن۔"

"اچھا تو تمہارے خیال میں عید کچھ اور چیز ہوتی ہے؟" شہریار نے مضحکہ اڑانے کے سے انداز میں کہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ عید تو تہوار ہوتا ہے۔ تہوار، جو منایا جاتا ہے گرم جوشی سے، خوشی سے۔"

"جیسے۔۔۔ جیسے ہم اپنے بچپن میں منایا کرتے تھے۔" وہ کسی یاد کے حصار میں آگئی "یاد کرو۔۔۔ چاند رات جب بے چینی سے بار بار سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جایا کرتے تھے۔ ہر چاند رات پر دل چاہتا تھا بس انتیس کا چاند ہو جائے، تیسواں روزہ آئے ہی نہیں۔"

"ہاں!" شہریار نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے گھونگھریالے بالوں کی چہرے پر گرتی ایک لٹ کو سلجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن ڈارلنگ! اب ہمارے لائف اسٹائل بدل چکے ہیں۔ چاند رات پر تو ہم عام دنوں سے زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔ عید کی چھٹیوں سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ کام نمٹانے کا خبط ہوتا ہے کہ نہیں۔" اس نے عینی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"رہا چاند دیکھنے والی بے چینی کا سوال تو یار! اب آپ کا الیکٹرانک میڈیا جو پل پل کی خبر دے رہا ہوتا ہے۔ چھتوں پر چڑھ کر چاند دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" اور پھر وہ رک کر ہنسا۔ "ان ملٹی اسٹوریز بلڈنگز کے اپارٹمنٹس میں رہنے والے رہائشیوں کے لیے کون سی چھت اور کیسی زمین۔ کہاں چڑھ کر چاند کا نظارہ کریں گے۔"

"چاند تو چاند ہوتا ہے شہریار! جسے دیکھنا چاہیں تو نظر آہی جاتا ہے۔" اس کے لہجے میں تھکن تھی۔ "ہم نے چاہ کرنا چھوڑ دی ہے شہریار۔ ہم سب کچھ بھول گئے ہیں۔ ہمیں چاند راتیں اور عیدیں منائے صدیاں بیت چکی ہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو ہنی؟" شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "کب ایسا ہوا کہ ہم نے عید نہ منائی ہو۔۔۔ ابھی یہ جو پچھلے سال کی دو عیدیں تھیں انہیں ہی یاد کرلو۔"

"یاد ہیں، اچھی طرح یاد ہیں۔" عینی نے اپنا ہاتھ شہریار کی گرفت سے چھڑایا۔ "دن بھر ہم سوتے رہے، دوپہر میں ایک بار کہیں سے پزا آرڈر کرایا، دوسری بار لزانیہ، کیونکہ ہم مٹن نہیں کھاتے۔ یاد!" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "شام ہوتی ہے، ہم فریش ہوتے ہیں، ہمیں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کہیں ڈنر کرنا ہوتا ہے۔ جس کے لیے میں نے مہنگا والا ڈیزائنر ڈریس خریدتے پر اپنی بچت کا اچھا خاصا حصہ صرف کیا ہوتا ہے اور تم۔۔۔ تم بھی کسی مہنگے ڈیزائنر کی شلوار قمیص پہن کر ڈنر کرنے چل دیتے ہو، عید کے لیے خاص طور سے تیار ہونے کے بجائے۔ ہر کوئی ایک سے بڑھ کر ایک نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔"

"سیلیبریشن اور کس بلا کا نام ہے ڈارلنگ؟" شہریار نے نرمی سے کہا۔

"نہیں ہوتی یہ سیلیبریشن۔" وہ چلا کر بولی تھی۔ شہریار نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہم روزے رکھتے ہیں۔" ذرا دم لینے کے بعد وہ نارمل آواز میں دوبارہ سے گویا ہوئی "سحری تک جاگتے ہیں کیونکہ اگر سو جائیں تو سحری نکل جائے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ آرام سے بیٹھ کر سحری کریں۔ دوڑتے بھاگتے ادھر سے ایک بن ادھر سے دودھ کا گلاس یا پھر براؤن بریڈ کے دو ٹکڑے اور چائے کا کپ۔۔۔ لو جی سحری ہو گئی۔۔۔" وہ شانے اچکا کر بولی۔ "ایک عام دن کے ناشتے اور رمضان کی سحری میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔"

"سحری کے لیے اٹھنا، سحری میں کھانا۔" شہریار نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ عام دنوں کی روٹین سے ہٹا ہوا معمول نہیں ہے۔"

"بس۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "یہ اہتمام ہے ہمارا سحر کے لیے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں شہریار نہیں۔" وہ شہریار کا بڑھا ہوا بازو مسترد کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ دن، کچھ مہینے کچھ وقت

ایسے ہی ہوتے ہیں جن کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔"

"کیا ہوگیا ہے یار۔" شہریار نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ "کل سے تم کچھ عجیب سے موڈ میں نظر آرہی ہو؟" اس نے حرمت کے بال کیچو سے آزاد کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "میرا خیال ہے تمہیں چھٹی کے کسی دن کسی اچھے سے Spa میں تھوڑا وقت گزارنا چاہیے۔ تمہارے جسم کو سکون کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد دیکھنا تم کتنا اچھا فیل کروگی۔ ایک دم فریش ہوجاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے۔" حرمت العین نے شہریار کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہلکا سا پرے دھکیلا۔ "اب تم سوجاؤ شہریار۔۔۔ صبح آفس کے لیے لیٹ ہوجاؤ گے۔"

شہریار مزید کوئی بات کیے بغیر کافی کے کپ اور ٹرے اٹھائے کمرے سے باہر چلا گیا۔ حرمت نے شہریار کو جاتے ہوئے دیکھا اور دیوار سے سر ٹکا دیا۔ اس کا ذہن ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔

ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، اسے اپنے پروگرام کی ریکارڈنگ کے دوران میں رقیہ کی درخواست پر ان کے گھر چلے جانے پر افسوس ہونا چاہیے تھا یا خوشی۔ مس رقیہ کے طلسم کدہ میں گھس کر اس نے خود کو کھو دیا تھا یا پھر سے پالیا تھا۔

برتن کچن میں رکھنے کے بعد شہریار کمرے میں واپس آچکا تھا۔ ایک دلکش سی مسکراہٹ حرمت کی طرف پھینک کر وہ واش روم میں گھس گیا تھا۔

"بہت پیارا انسان ہے شہریار' دنیا میں بسنے والے ہزاروں انسانوں سے کہیں بہتر۔" حرمت سوچ رہی تھی۔ "لیکن یہ میری بات کبھی بھی سمجھ نہیں پائے گا۔ بلکہ قصہ تو یہ ہے کہ شہریار تو کیا خود میں بھی اپنی بات سمجھ نہیں پارہی ہوں۔" دیوار کا سہارا چھوڑ کر اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ "مجھے رنج' دکھ اور غصہ کس بات پر ہے۔ وہ گلٹ جو میری پسلیوں میں اٹکا محسوس ہورہا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔"

روشنیوں کے شہر کو روشنیوں سے جگمگاتے دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔



"صبغت اللہ چار سال کا تھا جب ہم نے اس کا عقیقہ کیا۔" مس رقیہ سیاہ کارڈ بورڈ پر چپکے سرخ کناروں میں سجی تصویریں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں پکڑے البم میں لگی بیشتر تصویریں بلیک اینڈ وائٹ تھیں۔

"اس عقیقہ کے ساتھ ہی ہم نے پہلی بار اس کی سالگرہ بھی منائی تھی۔" وہ ماضی کے کسی منظر میں جھانکتے ہوئے مسکرائیں۔ "میں نے صبغت اللہ کے ابا کی شادی والی شیروانی صبغت اللہ کے لیے چھوٹی کرکے عقیقہ کے لیے تیار کی تھی۔ یہ دیکھو" انہوں نے البم کا رخ حرمت العین کی طرف موڑا۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں ایک چار سالہ بچہ سنہری شیروانی کے نیچے چوڑی دار پاجامہ پہنے' پیروں میں طلائی کھسہ پہنے سر پر سنہری ٹوپی جمائے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھا نظر آرہا تھا۔

"خاندان' برادری' دوست احباب کوئی رشتہ، تعلق ایسا نہ تھا جسے صبغت اللہ کے عقیقہ پر ہم نے مدعو نہ کیا ہو۔ ایک نہ دو پوری اٹھارہ دیگیں اٹھی تھیں اس تقریب میں۔"

وہ کسی معمول کی طرح صبغت اللہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "وہ خالی دیگیں اس رات واپس نہ جاسکی تھیں۔ تقریب کا اختتام ہی رات بہت دیر سے ہوا۔ بارہ بج گئے رات مہمانوں کو کھانا کھلانے اور محلے میں بانٹنے' اگلے روز پھر سے ان دیگوں کی ضرورت پڑ گئی ہمیں۔"

"کیوں؟" حرمت چونکی۔

"اگلے روز صبح ناشتے سے پہلے ہی صبغت اللہ کے والد ماسٹر حفیظ احمد کا انتقال ہوگیا۔"

"اوہ۔۔۔ سیڈ۔" حرمت کے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا ہوا تھا انہیں؟"

"صبح تک بھلے چنگے تھے' اچانک دل میں درد اٹھا۔ منٹوں میں چٹ پٹ ہوگئے۔ انتقال کے وقت بتیس برس کی عمر تھی ان کی۔"

"اوہ! آئی ایم ریئلی سوری۔" رٹے رٹائے جملے حرمت کے منہ سے نکلے۔

"ٹھیک ٹھاک خوشحالی تھی گھر میں' ماسٹر حفیظ کے جانے کے بعد وہ تنگی میں بدل گئی۔" مس رقیہ نے حرمت کے افسوس بھرے الفاظ کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "عقیقہ اور قل کے ختم کے اخراجات کا حساب چکانے کے بعد گھر میں دس روپے بچ رہے تھے۔ صرف دس روپے۔"

"دس روپوں سے زندگی دوبارہ سے شروع کی ہم نے؟" انہوں نے حرمت کی طرف دیکھا۔ "ساس' سسر بوڑھے تھے۔ دو نندیں تھی جو بیاہی تھیں۔ ماسٹر حفیظ کے ایک بھائی کا انتقال ان سے پہلے ہوچکا تھا۔ بوڑھے ماں باپ دو بیٹوں کی عین جوانی کی موت کا صدمہ لیے چارپائیوں ہی پڑ گئے سمجھو۔"

"پھر... کیسے مینیج ہوا سب کچھ؟" حرمت' رقیہ کے لیے برسوں بعد پریشان ہوئی۔

"میں نوکری کرتی تھی نا پہلے سے۔" انہوں نے کہا۔ "میں نے وہ سارے بوجھ جو ماسٹر حفیظ احمد گھر کی دہلیز پر رکھ کر فوراً" چل دیے' اپنے کندھوں پر اٹھا لیے۔"

"اپنی ایک نوکری کے بل پر۔" حرمت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نوکری کے ساتھ ساتھ جو بھی کام ملا کرتی گئی۔ سلائی کڑھائی' گھر پر بچوں کی ٹیوشن' اسکول کی کینٹین چلانے کا کام' گرمی کی چھٹیوں میں چھوٹی کمپنیوں کے لیے تیار مسالے پیک کرنے کا کام۔ بہت سے کام تو اب یاد بھی نہیں آرہے۔"

"اوہ... اتنے مشکل دن کاٹے آپ نے؟"

"پتا نہیں۔" وہ سادگی سے بولیں۔ "اس وقت تو بس کٹتے چلے گئے۔ پتا ہی نہیں چلا کہ مشکل دن تھے یا آسان۔ جوانی تھی نا شاید اس لیے محسوس نہیں ہوا۔"

"اتنے کام کرتی تھیں تو آپ کے ساس' سسر اور بیٹے کو کون سنبھالتا تھا۔"

"میں ہی سنبھالتی تھی اور کس نے سنبھالنا تھا۔ ان ہی کی خاطر تو کارزار حیات میں کودی تھی۔ انہیں کسی اور پر کیسے چھوڑتی۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ دوسرا کوئی کا ہے کو میرے بوجھ اٹھاتا' ہر کسی کے پاس اپنے کرنے کے کام تھوڑے تھے۔"

"اس طرح تو دن' بہت چھوٹا پڑجاتا ہوگا آپ کے لیے'؟ حرمت کے ماتھے پر بل پڑ گئے' آنکھیں سکڑ کر چھوٹی نظر آنے لگی تھیں۔ اسے مس رقیہ کے حالات زندگی انتہائی تکلیف دہ محسوس ہورہے تھے۔

"کبھی محسوس نہیں ہوا کہ دن چھوٹا پڑ گیا ہو۔ سب کام ہوجاتے تھے' وقت کی تنگی' وقت کی کمی جیسی شکایت کبھی ہوئی نہیں تھی' جہاں تک مجھے یاد ہے۔"

"ہوں۔" حرمت نے کچھ سوچتے ہوئے سرہلایا۔ "ہوسکتا ہے' لیکن اس طرح تو پھر آپ بس ان کاموں ہی کی ہوکر رہ گئی ہوں گی۔ دوست احباب' رشتہ دار' وہ تو سب چھوٹ گئے ہوں گے۔"

"ارے کاہے کو۔" وہ ہنسیں۔ "دوست' احباب' عزیزوں رشتہ داروں کے بغیر کوئی زندگی ہوتی ہے۔ خوشی' غمی' عید' شب برات' ہر دکھ' سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں وہ سب تو۔ سب کے ساتھ سارے تعلق نبھاتے تھے ہم اور پورے دل اور نیت کے ساتھ نبھایا کرتے تھے۔"

"اچھا..." حرمت نے خجل ہوکر اپنے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"کام سارے کیے' رشتے سب کے سب نبھائے میں نے۔ مگر اپنے دل کی لگن' اپنے من کا شوق صرف ایک تھا میرا۔"

"وہ کیا؟" حرمت نے ان کی طرف دیکھا۔

"میرا صبغت اللہ بغیر کسی رکاوٹ کے اچھے سے اچھا پڑھ جائے' اعلا سے اعلا تعلیم حاصل کرلے۔"

"وہ تو آپ نے دلوائی نا اس کو۔" حرمت نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اعلا تعلیم کے ساتھ میرا من یہ بھی تو تھا کہ اس کا کردار' اس کی سیرت بھی اعلا ہو۔"

"وہ ممکن نہ ہوسکی کیا؟" حرمت چونکی۔۔۔ ایک کمزور نقطہ تو ہاتھ آیا رقیہ کی زندگی کا۔

"زندگی میں کبھی موقع ملا تو جرمنی ضرور جانا۔ وہاں جاکر ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں کسی سے پوچھنا صبغت اللہ کے بارے میں' اس سے ملنا اور مل کر سچ سچ بتانا کہ صبغت اللہ ' صبغت اللہ ہے کہ نہیں۔" انہوں نے سرہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب وہ چھوٹا تھا تو میں اسے بتاتی تھی صبغت اللہ۔۔۔ تو اللہ کا رنگ ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بولے گا' بددیانتی کرے گا' کسی کا دل دکھائے گا' مار پیٹ' چوری چکاری کرے گا تو اللہ کا رنگ میلا کرنے والوں میں شامل ہوجائے گا اور اللہ کو اپنا رنگ بہت پیارا ہے' وہ اپنا رنگ میلا کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔" انہوں نے حرمت العین کی طرف دیکھا۔ "تو جانا ہائیڈل برگ یونیورسٹی' وہیں ہوتا ہے وہ کارلا کیٹلسٹ ریسرچ لیبارٹری میں۔ لوگ جانتے ہیں وہاں سب اس کو' تو خود مل کر دیکھ کر بتانا کہ مجھے صبغت اللہ۔۔۔ اللہ کا رنگ میلا کرنے والوں کے جتھے میں شامل تو نہیں ہوا نا۔"

"وہ یقیناً" بہت نیک سیرت انسان ہوں گے۔" حرمت نے مس رقیہ کے ستے ہوئے سفید چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن پھر وہ آپ کو تنہا یہاں کیوں چھوڑ کر خود وہاں بیٹھے ہیں۔ آپ نے تو اپنی عمر ان کے لیے لگادی۔ وہ نہیں جانتے کیا؟"

"بال بچے والا ہے وہ بھی اس کے بچے وہاں کے باسی ہیں۔ اب تو جوان ہوچکے وہ تینوں' ان کے لیے وہی ان کا ملک ہے۔ بعض رشتے انسان کو مجبور کردیتے ہیں پیروں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔"

حرمت کو مس رقیہ کی دلیل کمزور لگی مگر وہ چپ رہی۔

"اللہ نے مجھے دیا ہی ایک بیٹا۔ میں اس پر راضی تھی' میرا اپنا بس ہوتا تو میں بچوں سے آنگن بھر لیتی اپنا۔" وہ ہنسیں۔ "بچے اللہ کی رحمت ہوتے ہیں نا۔"

"ہوں۔" حرمت العین نے بے نیازی سے سرہلایا۔

"تو بتا مجھے۔ تو نے اللہ کی رحمت سے اب تک کیوں منہ موڑ رکھا ہے بھلا۔" انہوں نے حرمت کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرا اپنی طرف موڑا تھا۔



"ابھی تو زندگی شروع کی ہے ہم نے۔ شادی کے چھ مہینے بعد ہی ہم شہریار کے ممی اور ڈیڈی سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ اپنا گھر ہے شہریار کے ڈیڈی کا کنٹونمنٹ ایریا میں' فوج کے ریٹائرڈ افسر ہیں شہریار کے ڈیڈی لیکن شادی کے چھ مہینے بعد ہی شہریار کو محسوس ہونے لگا کہ ہمارے اور اس کے والدین کا معمول اور طرز زندگی بالکل ہی مختلف ہے۔ ہم دونوں جاب کرتے تھے اور وہ دونوں ایک پرسکون ریٹائرڈ زندگی کے عادی تھے۔ ہمارے گھر آنے جانے کے اوقات عجیب ہی تھے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ' ہم نے سوچا ان دونوں کی پرسکون زندگی منتشر کرنے کے بجائے ہمیں ان سے علیحدہ ہوجانا چاہیے۔ ان دونوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

شادی سے پہلے ہی شہریار یہ اپارٹمنٹ بک کراچکا تھا۔ شادی سے پہلے وہ اکیلا اور بعد میں ہم دونوں مل کر اس کی قسطیں بھر رہے تھے۔ ایک اچھی رقم بھرے جانے کے بعد ہم اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوسکتے تھے' اس لیے پہلے پہل ہم نے ایک چھوٹا فلیٹ کرائے پر لیا اور کرایہ بھرنے کے ساتھ اپارٹمنٹ کی قسطیں بھرتے رہے۔ پہلے شہریار کی گاڑی قسطوں پر تھی' ڈیڑھ سال بعد جب ہم اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئے تو فلیٹ کے کرائے سے جان چھوٹنے پر میں نے اپنے لیے الگ گاڑی بک کرائی' اپارٹمنٹ' دو گاڑیوں کی قسطیں۔ یوٹیلیٹی بلز' لائف اسٹائل مین ٹین کرنے کے چکر۔۔۔ ابھی بھی بھاگا دوڑی لگی ہوئی ہے۔ اس

لیے ہم بے بی پلان نہیں کر رہے زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آئے تو سوچیں نا اس بارے میں بھی۔" حرمت کے لیونگ روم میں رکھی آرام کرسی آگے پیچھے جھول رہی تھی اور اس پر بیٹھی حرمت العین یاد کر رہی تھی کہ اس نے مس رقیہ کے سوال کا کیا جواب دیا تھا۔

"اور پھر ہم دونوں ہی نو سے پانچ کی جاب کرتے ہیں۔ صبح گھر سے جلدی نکلنا پڑتا ہے۔ ٹریفک کے رش کی وجہ سے آفس وقت پر پہنچ جائیں، شام پانچ بجے آف ہو بھی جائیں تو اس ٹریفک کی وجہ سے گھر پہنچتے پہنچتے سات ساڑھے سات بج جاتے ہیں۔ اب ایسے میں بچہ پیدا کر کے اسے کس وقت پالیں، میٹرنٹی پیریڈ گزارنے کا وقت ہی کہاں ہے ابھی اور پھر اسے پیدا کر کے، بندہ چھوڑے کہاں۔ بے بی سٹرز کے پاس؟ اچھی بی بی سٹر ملتی کہاں ہیں بھئی؟"

"بے بی سٹرز کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تمہاری ساس، تمہاری ماں، بچہ پالنے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتیں کیا؟" مس رقیہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"میری ماں۔" حرمت العین کی آگے پیچھے جھولتی کرسی جیسے ٹھنک کر ساکت ہوئی۔ "مجھے اپنی ماں سے ملے بھی شاید دو ڈھائی سال ہو چلے۔" اسے یاد آیا۔

"تمہارے ماں باپ پاکستان میں نہیں رہتے کیا۔" مس رقیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"یہاں ادھر ہی رہتے ہیں پاکستان میں۔" حرمت نے جواب دیا۔ "حویلیاں کا نام سن رکھا ہے آپ نے۔"

"حولیاں؟ ہاں۔۔۔ حویلیاں، ہری پور ہزارہ، ایبٹ آباد۔" مس رقیہ کو پورا جغرافیہ یاد آ گیا تھا۔

"وہیں کی رہنے والی تو ہوں میں۔" حرمت نے یوں کہا جیسے کوئی اعزاز کی بات سنا رہی ہو۔

"تو پھر اتنے عرصے سے اپنی ماں سے کیوں نہیں ملی تو۔"

"وہی۔" حرمت نے بالوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں برابر کیا۔ "وقت نہیں ملتا نا مس رقیہ۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔ "آپ جانتی ہیں پرائیویٹ سیکٹر میں جاب کرنا کتنا مشکل ہے۔ دو دن کی چھٹی پر جاؤ، پیچھے سے جاب کی کوئی گارنٹی نہیں، حویلیاں جانے کے لیے تو کچھ دن چاہیے ہوتے ہیں نا۔ خالی ویک اینڈ پر جانے کا کیا فائدہ اور پھر ویک اینڈز کون سے خالی ہوتے ہیں، سو کام نمٹانے ہوتے ہیں اور چھٹی کے صرف دو دن شہریار کے پاس اور میرے پاس تو وہ بھی ایک ٹائم ہی نہیں نکل پاتا۔ لیکن امی سے فون پر روز بات ہو جاتی ہے۔ اسکائپ پر بھی کر لیتی ہوں بات۔"

مس رقیہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔ "تو نہیں جا سکتی ان سے ملنے تو وہ تو آ سکتی ہیں نا تیرے پاس۔"

"ہاں آ سکتی ہیں۔" حرمت نے انگلی میں پڑی سونے کی واحد انگوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "لیکن وہ آئیں تو ایک دو دن کے لیے تھوڑی آئیں گی اور یہ بھی ہے کہ اکیلی تو نہیں آئیں گی نا۔ ابو بھی ساتھ ہوں گے اور ہمارا اپارٹمنٹ۔۔۔ اس میں اتنے کمرے نہیں ہیں، مطلب کمرے تو ہیں لیکن زیادہ دن والے مہمان نہیں رکھ سکتے ہم اور امی ابو بھی اکیلے تو نہیں آ سکتے نا، جگو بھی ساتھ ہو گا اور جگو آئے گا تو اس کی فیملی بھی ساتھ آئے گی اور جگو کی فیملی۔۔۔" اس نے سر پر ہاتھ رکھا "اف۔ تین سالوں میں دو بچے بھی پیدا کر لیے اس نے۔" وہ جیسے مس رقیہ سے شکایت لگا رہی تھی۔

"جگو کون؟" وہ اپنی پھٹی آنکھیں سیکڑ کر بولیں۔

"جگو۔ میرا اکلوتا بھائی جہانگیر۔۔۔ بس اس لیے میں امی ابو سے بھی اپنے ہاں آنے پر اصرار نہیں کرتی۔ میری تو کوئی بات نہیں لیکن ہر یار۔۔۔ وہ داماد ہے نا، اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ کمفرٹیبل نہیں تھا تو امی ابو، جگو اور اس کی فیملی کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہے۔"

"تو وہاں جاتی نہیں، ان کو یہاں بلاتی نہیں۔ تیرا دل اداس نہیں ہوتا اپنے ماں باپ کے لیے، اپنے بھائی کے لیے۔" مس رقیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو سن رہی تھیں وہ حقیقت ہے۔

"بتایا تو ہے نا آپ کو امی ابو سے روزانہ بات ہو جاتی ہے۔ جگو سے بھی۔" مس رقیہ کو محسوس ہوا اس بار اس کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

"اور وہ تیری ماں... تجھ سے کہتی نہیں تو اس سے ملنے آ۔ اس کا دل اداس نہیں ہوتا تیرے لیے۔ ماں کا دل تو بچے کی طرح اپنے بچے کے لیے ہر دم ہمکتا رہتا ہے۔" مس رقیہ نے پریشان ہو کر پوچھا تھا۔

حرمت کی آرام کرسی دوبارہ سے حرکت میں آئی۔

اس پر ہنگام شہر سے دور، بہت دور وہ سرسبز علاقہ، اس سرسبز علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بینک کی نوکری سے ریٹائر ہو کر اپنی آبائی زرعی اراضی پر کاشت کاری کرتے اس کے ابو اور اس کا بھائی جہانگیر عرف جگو۔ دادا دادی کا وہ مختصر اور قدیم مگر خوب صورت سا گھر جسے ابو نے جدید تقاضوں کے مطابق سجا رکھا تھا۔

اس پر رونق گھر میں حرمت کی پوری دنیا آباد تھی۔ دادی، امی، ابو اور جگو کے ساتھ زندگی کے مزے اڑاتی حرمت العین۔ اس گھر اور اس کے ارد گرد جہاں ابو کے کھیت تھے، ڈیرہ تھا، مویشی تھے، مرغیاں اور بکریاں تھیں اور ان سب کو سنبھالنے والے ملازم۔ اس سادہ اور پرسکون ماحول میں وہ جگو کے ساتھ اڑتی پھرتی تھی۔ اپنے فارم کی بھینسوں اور گائے کا خالص دودھ، مکھن، ملائی اڑاتی، دیسی چوزوں اور بکروں کا گوشت کھانے والی، گڑ کی پھلیاں چوسنے اور مکئی کے دانے چبانے والی حرمت العین کی زندگی میں جدیدیت کا پہلا انقلاب تو اس مختصر سے گاؤں سے اٹھ کر اس پرہنگام شہر میں آ کر پڑھائی کے دوران آیا تھا، اور پھر دوسرا اور حتمی انقلاب شہریار مسعود سے ٹکرانے کے بعد آ گیا تھا۔

وہ این سی اے کی طالبہ تھی اور شہریار لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز میں پڑھ رہا تھا۔ دونوں کی پہلی ملاقات لمز میں ہونے والے فلم میلہ پر ہوئی تھی اور پہلی ملاقات کا شاخسانہ وہ ضد تھی جو حرمت نے اپنے امی ابو سے شہریار ہی سے شادی کرنے کے لیے کی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے ماں باپ دل سے رضامند نہیں تھے مگر شہریار کو پا لینے کی چاہ اتنی طاقت ور تھی کہ اس نے خود کو منوا کر ہی دم لیا تھا۔ یوں وہ سادہ اور پر فضا ماحول کی باسی، شہریار کی جدید اور پر تکلف زندگی میں آ بسی تھی۔ پہلے پہل اسے امی ابو کے سامنے ضد کی جھجک رہی اور پھر اس کے بعد وہی وقت کی کمی کا رونا رہا۔ وہ ایک دو بار کے بعد دوبارہ اپنے اس مختصر سے میکے میں جا ہی نہیں پائی تھی۔ اور مس رقیہ نے سوال کیا تھا کہ کیا اس کی امی یا ابو سے اپنے پاس بلاتے نہیں تھے۔ اسے امی کے کئی بار کے بلاوے، ان کے آنسو بیٹی سے اداسی کی داستانیں یاد آنے لگیں۔

"ارے امی کیا ہو گیا ہے۔ دیکھ لیں میں بالکل ٹھیک ہوں، ایک دم فٹ۔" وہ اسکائپ کیمرے کے سامنے سیدھی کھڑی ہو کر بتاتی تھی۔

"قسم سے امی! اگلے چھ ماہ میں تو کہیں نظر نہیں آ رہا کہ میں آپ کے پاس آ پاؤں گی۔ شیڈول ہی اتنا ٹف ہے، ہاں اس کے بعد پکا وعدہ جیسے ہی وقت ملا سب سے پہلے آپ کے پاس آؤں گی۔"

اسے وہ تسلیاں یاد آئیں جو وہ وقتاً "فوقتاً" انہیں دیا کرتی تھی۔ امی، ابو، جگو، دادی، باری باری ایک ایک چہرہ یاد آیا جو اس کی باتیں اور تسلیاں سن کر مایوس ہو جاتا تھا، بجھ جایا کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی، سمجھتی تھی مگر وقت کے ساتھ بھاگنے کی دوڑ اسے ادھر ادھر کہیں دیکھنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ ہر چھ ماہ بعد وہ پروگرام بناتی تھی۔ ہر بار ہی کسی نہ کسی وجہ سے پروگرام رہ جاتا تھا۔

اور اب تو کچھ عرصے سے امی نے اسے بلانے کی بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی بلکہ اب تو ہفتے میں شاید ایک آدھ بار ہی امی سے بات ہو پاتی تھی۔ ابو سے وہ بھی نہیں اور جگو، غالباً "وہ بھی اپنی بیوی بچوں میں مصروف ہو چکا تھا۔ آخری بار جگو سے شاید اس کی بڑی بیٹی کی سالگرہ پر بات ہوئی تھی۔

آرام کرسی ایک بار پھر ساکت ہو چکی تھی۔ وہ وقت

کے ساتھ بھاگنے کی دوڑ میں شامل تھے لیکن وقت کہا تھا' وقت کہاں رہ گیا تھا۔



وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لاؤنج میں بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اپنے جوتوں کے تسمے باندھتے شہریار نے اسے یہ سب کرتے دلچسپی سے دیکھا اور مسکرادیا۔

"سحری میں اگر تم نے پراٹھے بنانے کی کوشش کی تھی تو جان لو کہ وہ کوشش خاصی بھونڈی تھی۔ تم نے دیکھا' وہ مجھ سے کھایا نہیں گیا۔" اس نے حرمت کو تنگ کرنے کے ارادے سے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں' ایک دو دن لگیں گے' اس کے بعد پراٹھے صحیح بننے لگیں گے۔" وہ مصروف انداز میں بولی۔

"یعنی یہ طے ہے کہ ہم سحری میں پراٹھا ہی کھائیں گے اس رمضان میں۔ چاہے وہ ہضم نہ ہو۔" شہریار پریشان ہوا۔

"ضروری نہیں۔" حرمت نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم پھینیاں بھی کھاسکتے ہو دودھ میں بھگو کر۔"

شہریار اٹکا "پھینیاں" وہ بوکھلا گیا۔ "خدا کا خوف کرو یار۔ نہیں کھایا جائے گا یہ سب۔"

"نہ کھانا۔" وہ اس کے ساتھ والی ڈائننگ چیئر پر آکر بیٹھ گئی۔ "اپنی مرضی کا کچھ بھی کھالینا۔ ساتھ میں تھوڑا سا کچھ ایسا بھی چکھ لینا۔۔۔ تھوڑا سا احساس تو لائیں نا ہم رمضان کی سحری میں رمضان کا۔" وہ شہریار کے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ کر بولی۔ "یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے۔ کیسی ہوتی سحری کیا کرتے تھے۔ میری امی تو پراٹھوں کے ساتھ خاگینہ بنایا کرتی تھیں کبھی بھنا قیمہ بھی۔ ہمارے گھر میں لسی اور دہی ضرور استعمال ہوا کرتا تھا سحری میں۔ پتا ہے ابو کا ایک ملازم ہوا کرتا تھا معراج دین اس کا خیال تھا کہ جس گھر میں دودھ دینے والا جانور نہ ہو' اس گھر میں رمضان کا کیا مزا۔"

وہ ماضی میں کھو رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ شہریار نے اپنے چہرے کا بگڑا زاویہ درست کیا۔

"لیکن ہمارے ہاں تو کبھی بھی دودھ دینے والا جانور نہیں رہا پھر بھی رمضان کے روزے پورے رکھے جاتے تھے۔"

"افوہ! وہ تو معراج دین مرحوم کا فرمان تھا نا۔ تم اس کو جنرلائز کیوں کرنے لگے۔" وہ ہنسی۔ "لیکن تمہارے گھر میں رمضان ایسا پھیکا اور بے رنگ بھی تو نہیں ہوا کرتا ہوگا نا جیسا ہم گزار رہے ہیں۔"

"یعنی۔۔۔ میری جان وقت بدل چکا ہے۔" شہریار دل میں جھلایا تھا لیکن حرمت کے ساتھ اسی نرمی سے بولا تھا جس کی وہ عادی تھی۔ "وہ زمانہ اور تھا۔ لوگوں کے پاس فرصت تھی' وہ ہر موقع' ہر تہوار فرصت سے مناسکتے تھے۔ ہم اپنے تھوڑے سے وقت کو پہلے ہی بہت سے خانوں میں تقسیم کرنے کے چکر میں ہلکان ہو رہے ہیں۔" وہ حرمت کی بدلتی ہوئی روش کو دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

"ہم سے پہلی نسلوں کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ ہم ایسی تاویلیں نہیں گھڑا کرتے تھے۔ کام تو انہوں نے بھی بہت کیے شہریار۔ ہم خود' میں اور تم خود سے پہلی نسل کے وقت اور معمول کے تال میل کا ہی تو نتیجہ ہیں۔ کیا کمی چھوڑی میرے اور تمہارے والدین نے ہم دونوں کی شخصیت سازی میں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "لیکن میں نے کبھی انہیں وقت کی کمی کا رونا روتے ہوئے کوئی کام چھوڑ دیتے نہیں دیکھا تھا۔ جانتے ہو کیوں؟"

شہریار نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ "اس لیے کہ ان کی نیتیں نیک اور نظر بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے ان کے وقت میں بھی برکت تھی اور معمولات میں بھی۔"

"مطلب ہم تو جھک ہی مار رہے ہیں نا۔" شہریار خفا سا ہو گیا۔ "وقت کے ساتھ رہو دھیرے دھیرے چلنے کے عادی ہمارے ماں باپ وقت سے پیچھے رہ گئے نا۔ وقت کے ساتھ قدم ملانے اور اس کے ساتھ بھاگنے کی

کوشش کی ہوتی تو آج ہمارے لیے کوئی جائیداد' کچھ روپیہ پیسہ ہی جوڑا ہوتا۔ وہ ایسا کر لیتے تو ہم یوں خوار نہ ہو رہے ہوتے۔ میں اور میری بہن اس انتظار میں نہ بیٹھے ہوتے کہ کب ماں باپ کا انتقال ہو' کب ان کا بنایا وہ اکلوتا پرانا گھر بیچ کر اپنا اپنا حصہ بانٹ لیں تاکہ ہمارے بینک بیلنس میں بھی کچھ ٹھہراؤ آئے۔"

"یہ ہی تو۔" حرمت نے اس کی بات کاٹ دی "یہ ہی تو نیت کا وہ فرق ہے جس نے زندگی کا سارا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس اتنے بڑے شہر میں آج تمہیں کتنے پرانے گھر نظر آتے ہیں شہریار۔"

"یہ کیا سوال ہوا۔" شہریار کو اس کا سوال بے تکا محسوس ہوا۔

"بہت کم' اکا دکا' کہیں کہیں اس شہر میں پرانے گھر باقی رہ گئے ہیں۔ باقی سب کے سب تمہارے جیسی اگلی نسلوں نے بٹوارے اور بینک بیلنس میں ٹھہراؤ کی خاطر بیچ دیے۔ ان کو گرا کر اونچے اونچے پلازے' نئی ہاؤسنگ اسکیمیں بنادی گئیں۔ ان کھلے کمروں اور ہوادار برآمدوں والے گھروں میں کنکریٹ پتھر اور لوہے کے دیوہیکل بدصورت اسٹرکچر کھڑے کردیے گئے۔ جنہیں بنانے کے لیے درخت کاٹنے پڑے تو کاٹے گئے۔ پانی کی گزرگاہوں کو بند کرنا پڑا تو کردیا گیا۔ نیت کے ایک فتور نے شہر کا سارا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا۔ درختوں کے باسی روٹھ کر کہیں چلے گئے۔ پھولوں میں خوشبو اور مٹی میں زرخیزی باقی نہیں رہی۔ ہم جدید دور کے انسانوں نے اپنی اقدار' روایات اور عقائد کا سودا کر کے بھلا کیا خریدا؟" حرمت نے سوال کیا۔

شہریار نے جواب میں سر جھٹک دیا۔

"ہواؤں میں اڑتے خواب' آسمان پر سجے آدرش اور ان سب کو پانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے خود پر طاری ڈپریشن' انگزائٹیز' بے خوابی اور ذہنی تنہائی۔" وہ گھٹنوں پر بازو رکھے شہریار کی طرف جھکی اور پھر سر جھٹکتے ہوئے سیدھی ہوئی۔ "تم خود فیصلہ کرلو سودا برا ہے یا اچھا۔"

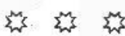
"آئی ایم سوری حرمت العین میں شاید ان نئی ڈیفی نیشنز سے متفق نہ ہو پاؤں جن سے مجھے متعارف کروانے کی کوشش تم کر رہی ہو۔" شہریار نے گہرا سانس لیتے ہوئے سر ہلایا۔ "تم بھول رہی ہو کہ آج کے دور میں پتھر کے زمانے کے انسان کی قدروں کو اپنا کر ہم اس معاشرے میں کچھ بھی نہیں کرسکتے سوائے یہاں مس فٹ قرار دیے جاکر آؤٹ ہو جانے کے۔"

حرمت العین بنا پلکیں جھپکے شہریار کو دیکھ اور سن رہی تھی۔ گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ تمہاری اپنی چوائس ہے' کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان پر اپنی سوچ کیسے مسلط کرسکتا ہے۔"

شہریار نے سر ہلایا اور اٹھ کر اپنا آفس بیگ اٹھانے کے ارادے سے کونے میں رکھی میز کی طرف بڑھا۔

"لیکن جو تم سمجھ رہے ہو میں وہ کہہ ہی نہیں رہی۔" اس کے قدم عینی کی آواز پر لمحہ بھر کو رکے۔ "شاید مجھے اپنی بات کہنے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔" اس کے لہجے میں مایوسی جھلکی "بات تو وہ ہے جو کہنے والا براہ راست الفاظ میں کہے بھی نہیں اور سننے والا سن بھی لے۔ مگر یہ ہنر تو قسمت سے ہی کسی کو آتا ہوگا۔ جیسے مس رقیہ۔ بات تو وہ کچھ اور کر رہی ہوتی ہیں۔ سمجھ کچھ اور آرہا ہوتا ہے۔"

شہریار نے اس کی طرف دیکھا اور پھر رکے قدم آگے بڑھا دیے۔



"عینی گھر پر نہیں ہے۔" پریشے نے سنا۔ اس کے سامنے اسکائپ کیمرہ کے ذریعے نظر آتا۔ شہریار کہہ رہا تھا۔

"کسی افطار ڈنر پر گئی ہوئی ہے کیا یا پھر کسی خاص پروگرام کی ریکارڈنگ چل رہی ہے۔"

"افطار ڈنر۔" شہریار کی ہنسی میں جھلاہٹ تھی۔ "اس بار رمضان میں دوستوں کے افطار ڈنر میں اکیلا ہی اٹینڈ کرتا ہوں' عینی میرے ساتھ نہیں جاتی۔"

"تو پھر وہ کہاں ہے اس وقت۔" پریشے حیران ہوئی

تھی۔

”حرمت العین کو ایک ایسی بیماری نے آن لیا ہے‘ جس کو میڈیکل سائنس نے تو اب تک کوئی نام نہیں دیا ہے‘ لہٰذا فی الوقت اپنی سہولت کے لیے میں نے اس کا نام مس رقیہ رکھ دیا ہے۔“ شہریار کہہ رہا تھا۔

”عیدین‘ رمضان اور دیگر اہم و خاص مواقع ان کے میرٹ پر نہ منانے کا غم‘ اخلاقیات‘ روایات‘ تہذیب و ثقافت کے جنازے اٹھنے کا واویلا۔

یار! کسی مس رقیہ نے عینی کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ میں‘ تم ہم سب۔ جو اس نئی جنریشن کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ہم نیچر پر چھائے اللہ کے رنگ کو میلا کرنے کے قصوروار ہو رہے ہیں۔ ہماری وجہ سے چیزوں سے نیتوں سے‘ خوشیوں اور سکون سے اور سب سے بڑھ کر وقت میں سے برکت اٹھتی چلی جا رہی ہے۔“

”اچھا پھر۔ پھر وہ کیا کہتی ہے۔“ پریشے پر جیسے یک دم سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ بدقت بولی تھی۔

”کچھ کہنے کی اس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اس لیے وہ کچھ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے آج کل۔“ شہریار نے قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”کیا۔ کیا کر رہی وہ آخر؟“ پریشے تجسس میں پڑ چکی تھی۔

”صبح گھر سے نکلتے وقت اپنے ہاتھ سے تیار کیا سوپ‘ دلیہ اور کسی بھی اور ڈش کے ڈبے اپنے ساتھ گاڑی میں رکھتی ہے۔ آفس جانے سے پہلے ممی کی طرف جاتی ہے کھانا ان کے حوالے کر کے آفس کے لیے نکل جاتی ہے۔“

”ممی کی طرف“ پریشے بڑبڑائی۔ ”مگر تمہاری طرف سے ممی کے گھر کا فاصلہ اور وہاں سے عینی کا آفس سب الٹے ہاتھ چلتا ہے یہ تو۔“

”یہ ہی نہیں‘ آگے سنو۔ آفس سے آف ہونے کے بعد بھی وہ گھر آنے سے پہلے ممی کی طرف جاتی ہے۔ ممی اور ڈیڈی کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ ڈیڈی کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو اب یہ ذمہ داری حرمت نبھاتی ہے۔ ان سب کاموں کے بعد وہ گھر واپس لوٹتی ہے۔ پونے گیارہ بجیں گے تو حرمت العین گھر واپس لوٹ چکی ہوگی۔“

”شہریار! تم مذاق کر رہے ہو۔“ پریشے نے بے یقینی سے دیکھا۔ ”اگر وہ ایسا ہی کر رہی ہے تو تم کہاں رہ گئے اس کے معمولات میں۔ تم روزے نہیں رکھ رہے کیا۔“

”رکھ رہا ہوں‘ روزے کیوں چھوڑوں گا میں۔“ شہریار نے کہا۔ ”مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے اس سارے چکر میں بھولتی نہیں وہ‘ میرے لیے افطاری کا سامان اور کھانا بنا کر رکھ جاتی ہے۔ مجھے کہیں سے کچھ آرڈر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی‘ جبکہ پچھلے چار سال رمضان میں ہم افطاری یا تو کہیں باہر کیا کرتے تھے یا پھر کہیں سے کچھ آرڈر کر لیا کرتے تھے۔“

”وہ یہ سب مینیج کیسے کر رہی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ عینی میں کسی روبوٹ کی طاقت حلول کر چکی ہے۔“ پریشے نے سر جھٹکا۔

”روبوٹ نہیں مس رقیہ۔ عینی میں مس رقیہ کی روح حلول کر چکی ہے۔ جانتی ہو‘ ہم ہر سال جو اپنے دوستوں کے ساتھ کبھی کسی ڈھابے پر‘ کسی ریسٹورنٹ میں کسی کیفے میں افطار ڈنر کیا کرتے تھے‘ وہ سب بند ہو گئے۔ اس بار حرمت العین شہریار خود افطار ڈنر ارینج کر رہی ہیں وہ بھی ممی کے گھر پر۔ جس میں ممی ڈیڈی کے رشتہ دار اور دوست انوائیٹ کیے جا رہے ہیں۔ تم اپنے سسرال والوں کو آگاہ کر دو۔ کیا خبر انہیں بھی بلاوا چلا جائے۔“

”اور وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔“ پریشے اپنی جگہ سے اٹھ کر کیمرے کے بالکل قریب آئی۔

”رمضان المبارک کو اس کے عین تقاضوں کے مطابق منانے کے لیے۔ سوچو! عرصہ دراز سے کھوئے ہوئے چچا‘ پھوپھو‘ خالہ‘ ماموں جو بھی شادیوں یا اموات پر ہی اکٹھے ہوتے تھے۔ افطار ڈنر پر جمع ہو رہے ہیں۔“

”اور ممی ڈیڈی... وہ۔“ پریشے کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔ ”انہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے کیا؟“

"خبر نہیں۔" شہریار نے منہ بنا کر کہا۔ "ممی سے فون پر ایک آدھ بار بات ہوئی ہے۔ انہوں نے ہی بتایا کہ حرمت ڈیڈی کا بہت خیال رکھنے لگی ہے۔ گھر میں اس نے باہر لان میں جگہ جگہ برڈز ہاؤس بنا کر لٹکا دیے ہیں' روزانہ جن میں دانہ پانی اپنے ہاتھ سے رکھ کر جاتی ہے۔ لان کے پودوں' پیڑوں اور درختوں کا خود بھی خیال رکھتی ہے اور ان کے لیے نیا مالی بھی رکھوا دیا ہے۔

"ہوں۔" پریشے شہریار کی سنائی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ "اور یہ افطار ڈنر کب ہے جس میں سب رشتہ دار' دوست عزیز مدعو ہیں۔" اس نے پوچھا تھا۔

"اسی ویک اینڈ پر۔" شہریار نے پریشے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔



ریٹائرڈ کرنل مسعود احمد اپنے گھر کے لان میں کین کی آرام دہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے جب انسان کے قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی سماعت اور نظر کی کمزوری کا شکار ہو چکے تھے۔ کان میں آلۂ سماعت اور آنکھوں پر چشمہ لگانے کے باوجود انہیں لگتا کہ سماعت اور نظر ان کا پورا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ معدے کے پرانے مریض تھے جو اب وقت کے ساتھ پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکا تھا۔ معدے کی اس کمزوری کے باعث چہرے اور ہاتھوں پر جھریاں اور ہاتھ میں ہلکی سی لرزش رہنے لگی تھی۔ کرنل صاحب اپنی تمام کمزوریوں کے باعث دن بدن ذہنی تنہائی کا شکار ہو رہے تھے۔ قریب قریب یہی حال ان کی بیگم شائستہ مسعود کا تھا۔ جو عمر میں اگرچہ کرنل صاحب سے سات آٹھ برس چھوٹی تھیں لیکن سماعت کی کمزوری کا شکار وہ بھی تھیں۔ اس وقت شائستہ مسعود لان کے ہلکے پرنٹ اور ہلکے رنگ والے سوٹ پر شیفون کا دوپٹا اوڑھے کرنل صاحب سے اگلی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ کانوں میں ہیرے کے چھوٹے ٹاپس چمک رہے تھے۔ دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ہیرے ہی کی انگوٹھی دمکتی تھی۔

ہاتھ میں نازک سا رومال پکڑے وہ اپنی نشست پر ہی بیٹھی اپنے گھر میں آنے والے مہمانوں سے مل رہی تھیں۔ سب مہمان آمد کے ساتھ ہی کرنل صاحب اور شائستہ مسعود کی طرف بڑھتے تھے۔ دونوں سے جھک کر ملتے۔ کوئی پیار بھرا جملہ بولتے جنہیں سن کر دونوں ہی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ کتنے ہی عرصے کے بعد ان کے گھر میں ایسی رونق لگی تھی۔ کتنے ہی عرصے کے بعد ان دونوں کے علاوہ بہت سے دوسرے انسانوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ان کے لان کے ایک حصے میں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوسری طرف کھانے کی میزیں تھیں اور سامنے سب کے لیے نماز پڑھنے کا خصوصی انتظام تھا اور یہ سب انتظامات اس افطار ڈنر کے سلسلے میں کیے گئے تھے جو ان کی اکلوتی بہو حرمت العین دے رہی تھی۔ بوڑھے کرنل صاحب اور شائستہ مسعود اپنی نظروں کے سامنے اپنے پیاروں' دوستوں' عزیزوں' بہن بھائیوں کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر کھل اٹھتے' نظر آ رہے تھے۔ دونوں نے اپنے مہمانوں پر نظر ڈالنے کے بعد ایک بار ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظریں ذرا فاصلے پر کھڑی حرمت العین پر ٹھہر گئیں جو سفید شلوار پر آسمانی پھولوں والی قمیض پہنے سر پر سفید شیفون کا دوپٹا اوڑھے اپنے کسی مہمان کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

"آپ لیٹ ہو گئیں مس رقیہ۔ روزہ تو بس اب کھلا ہی چاہتا ہے۔" وہ اپنی مہمان سے کہہ رہی تھی۔

"میرے گھر سے یہاں تک کا فاصلہ جانتی ہو کتنا ہے۔" آنے والی مہمان کہہ رہی تھیں۔

"مجھے بہت افسوس ہے آپ کو تکلیف ہوئی۔ میں اگر یہاں اتنی مصروف نہ ہوتی تو خود آپ کو لینے جاتی۔" حرمت نے کہا تھا اور مس رقیہ نے پیار سے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کرا دیا تھا اور پھر وہ کرنل اور مسز کرنل مسعود سے ملنے آگے بڑھ گئی تھیں۔

"یار! کیا کلاسیکل میٹنگ ہے تیرے اس افطار ڈنر

کی۔" دور بیٹھا شہریار جو غور سے حرمت اور مس رقیہ کو باتیں کرتے دیکھ رہا تھا' اپنے کولیگ بابر کی آواز پر چونکا۔

"تیرا یہ پرانا گھر' اس کا یہ کھلا لان' پرانی دعوتوں کے سے انداز میں لگی یہ کرسیاں اور میزیں' یہ سب بابے اور مائیاں جو تیرے قریبی انکلز اور آنٹیز ہیں' بہت اچھا لگ رہا ہے یار۔ یہ ایک بالکل مختلف منظر ہے' لگتا ہے کچھ دیر کے لیے زندگی میں ٹھہراؤ سا' تھوڑا سکون سا آگیا ہو۔"

وہاں موجود ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق تبصرہ کر رہا تھا۔ شہریار کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہ خاموشی سے صرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔



"تم نے بہت اچھا کیا جو اپنے بوڑھے ساس سسر کے اردگرد چار جی اکٹھے کر لیے' دیکھا تھا وہ کتنے خوش نظر آ رہے تھے اس رونق کو دیکھ کر۔" مس رقیہ حرمت العین سے کہہ رہی تھیں۔

"ہوں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "جیسے وہ اس رونق کے لیے نجانے کب سے ترس رہے ہوں مگر ایک بات ہے۔" اس نے مس رقیہ کی طرف دیکھا۔ "جب ہم نے ان سے الگ ہو کر علیحدہ گھر لینے کی بات کی تھی اس وقت مجھے لگا انہیں اس خیال پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ شاید وہ خوش تھے۔"

"انسان جب تک تنہائی کا مزا چکھ نہ لے اسے تنہائی سے وحشت کیسے محسوس ہو۔ ان دونوں کے اندر چار سال پہلے کچھ ہمت باقی ہو گی' اعضاء بھی ساتھ دیتے ہوں گے۔ سوچا ہو گا' اچھا ہے بچے اپنی زندگی گزاریں اور ہم اپنی۔ لیکن چار سال بہت ہوتے ہیں انسان کو یہ سبق سکھانے کے لیے کہ اس عمر میں جہاں تنہائی دل و دماغ کو چاٹنے لگتی ہے' اولاد کا ساتھ کیسی نعمت ہوتا ہے۔" مس رقیہ کہتے کہتے کہیں کھو گئی تھیں۔

"ہاں' اب لگتا ہے وہ دونوں کسی تیسرے کی کمپنی کو ترس رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ کی ضرورت تو ہے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل رہتے رہتے بور ہو چکے ہیں۔ میں ان کے پاس صبح شام جاتی ہوں نا تو جیسے جی اٹھتے ہیں۔"

مس رقیہ نے اسی طرح کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "تو بڑی نیکی کما رہی ہے حرمت العین۔ یوں ہی صبح شام ان کے پاس جایا کر' ملا کر ان سے' ان کی سنا کر۔ دیکھنا وہ جی اٹھیں گے اور اس کے بعد بہت جئیں گے۔"

"جی' لیکن۔" حرمت کہتے کہتے رک گئی اور اس نے سر جھکا لیا۔

"کیوں' کیا ہوا؟"

"مجھے بھی ممی اور ڈیڈی کو کمپنی دینا اچھا لگنے لگا ہے۔ کوئی کہے ان کے پاس یوں صبح شام آنا جانا اتنا آسان نہیں ہے لیکن مجھے یہ مشکل نہیں لگتا لیکن ایسا لگتا ہے' یہ روٹین میری اپنی زندگی پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال رہی۔" وہ کہتے کہتے رکی اور پھر سے کہنا شروع ہوئی۔ "شہریار کچھ کہتا تو نہیں لیکن اب وہ چڑ رہا ہے۔ اپنے گھر سے ممی کے گھر تک کا فاصلہ پھر مڑ کر واپس آنا۔ آفس جانا' شام دوبارہ پھر سے ادھر ہی نکل جانا اور پھر گھر واپس آنا۔ وقت لگتا ہے بہت اور فیول کا خرچہ بھی دگنا تگنا ہو گیا ہے۔ شہریار کو لگتا ہے ہمارا بجٹ گڑبڑ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم ناپ تول کے چلنے والے لوگوں کے لیے بجٹ میں ایسا اپ سیٹ قابل قبول نہیں ہوتا نا۔"

"مگر وہ تو شہریار ہی کے ماں باپ ہیں پھر بھی ایسے۔" مس رقیہ حیران ہوئی تھیں۔

"جو اپنے پیرنٹس کے ساتھ ہی رہ رہے ہوتے ہیں۔ پیرنٹس کے بوڑھے یا بیمار ہو جانے پر ان کے پاس انہیں توجہ دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا' وہی لوگ تو والدین کو اولڈ ہومز میں چھوڑ آتے ہیں۔"

"جانتی ہوں۔" مس رقیہ پھر سے کہیں کھو سی گئیں۔ "ہر وہ گھر جہاں کوئی بڈھا' بڑھیا تنہا رہ رہے ہوتے ہیں وہ بھی اولڈ ہوم ہی بن جاتا ہے کیونکہ ان کے

بچوں کے پاس انہیں توجہ دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔"

"اسی لیے شاید میں ممی کے گھر جانے والی روٹین کو زیادہ دیر نہ نبھا سکوں۔ شہریار نئے دور کا انسان ہے، عملی سوچ کا حامل شخص، شاید وہ بہت حقیقت پسند بھی ہے، مگر وہ جیسا بھی ہے مجھے بہت پیارا ہے، وہ دل میں ہی سہی مجھ سے ناراض ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یوں بھی انسان کب تک اپنے کانوں اور آنکھوں پر پردے ڈال کر جی سکتا ہے۔"

مس رقیہ نے ایک تاسف بھری نظر حرمت العین پر ڈالی، حرمت کے چہرے پر اپنی ناکامی کا اعتراف سجا تھا۔



"کچھ عرصے سے مجھے لگنے لگا تھا تمہارے ڈیڈی بہت جلد مر جائیں گے۔" شائستہ مسعود اپنے قریب بیٹھے اپنے بیٹے شہریار مسعود کو بتا رہی تھیں "مجھے اس وقت سے خوف محسوس ہوتا تھا جب ان کے بعد میں اور بھی زیادہ تنہا رہ جاؤں گی لیکن اب مجھے لگنے لگا ہے کہ تمہارے ڈیڈی ابھی اتنے بھی بوڑھے اور کمزور نہیں ہوئے، وہ جئیں گے۔ ابھی بہت سارا جئیں گے۔"

"آپ نے آنکھوں میں آئی لوشن ڈال لیا تھا نا ممی۔" شہریار نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اس روز یہاں سب اکٹھے ہوئے تھے ادھر ہمارے گھر میں۔" شائستہ مسعود کی آواز میں بچوں کی سی خوشی جھلکی۔ "میرے بہن بھائی، کرنل صاحب کے بہن بھائی، بھتیجے بھانجے ان کے بچے۔ کسی زمانے میں ہم بھی سب کو اکٹھا کیا کرتے تھے یوں ہی کسی موقع کے بہانے۔ افطاری ہو گئی، بقر عید کی دعوت ہو گئی۔ تمہاری یا پری کی سالگرہ کے موقع پر۔" وہ مسکرائیں۔ "یہیں گھر ہی پر۔ آج کل کے فیشن کی طرح نہیں کبھی کسی ہوٹل، ریسٹورنٹ میں جمع کر لو سب کو۔" انہوں نے منہ بنایا۔ "بڑا اچھا لگا اس روز کے بعد سے دل ابھی تک اس ملاقات کی خوشی میں ڈوبا ہوا ہے۔"

"ممی! ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے آپ کو تین طرح کے آئی ڈراپس وقفے وقفے سے آنکھوں میں ڈالنے ہیں یاد ہے۔" شہریار نے دوسری جمائی روکتے ہوئے کہا۔ اس روز حرمت اپنے پروگرام کی ریکارڈنگ میں مصروف تھی اور ممی آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ذمہ داری اس کے حوالے کر گئی تھی۔

"کیا زمانے تھے جب لوگ پورے دل سے، خلوص سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ کماتے تو تم لوگوں سے شاید کم ہی ہوں گے لیکن ایک دوسرے کی خوشی غمی میں توفیق بھر شامل ضرور ہوتے تھے۔ وہ بھی پورے شوق و ذوق سے، ہمارے زمانے میں شوشا کم محبتیں زیادہ تھیں۔" ممی کہے چلی جا رہی تھیں۔

شہریار نے ممی کی ذہنی رو پر سر جھٹکا۔

"عینی کا اللہ بھلا کرے۔ اس نے پرانے زمانے کی یاد پھر سے تازہ کر دی۔ وہ زمانہ جواب کہیں کھونے لگا تھا، گم ہو چکا تھا اور تم نے دیکھا۔ سب آئے، کوئی پیچھے رہ گیا نہ کسی نے کوئی بہانہ بنایا جیسے سب ہی یوں اکٹھے ہونے کو ترسے ہوئے تھے۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے دل کی بے آباد ویران پڑی زمین پر کسی نے تازہ پانی کے چھینٹے مار دیے ہوں۔"

"یہ وہ ہی ممی ہیں جو اپنے زمانہ عروج میں ان ہی عزیزوں رشتہ داروں کو حاسد اور بری نظر والے لوگ قرار دیا کرتی تھیں۔" شہریار نے تیسری جمائی روکتے ہوئے سوچا۔

"تم نے پرندوں کی یہ چہچہاہٹ سنی ہے۔" پھر انہوں نے شہریار کے بازو پر ہاتھ رکھا "کیسی رونق محسوس ہوئی ہے نا ان آوازوں میں۔"

"عینی بہت سمجھ دار طبیب ہے شہری، اس کے پاس وہ سارے نسخے موجود ہیں جو ختم ہوتے انسان کے جسم میں جان ڈال سکتے ہیں۔ یاد ہے میں اس سے تمہاری شادی کی مخالف تھی لیکن اب سوچتی ہوں تم نے اپنے لیے کیسا باکمال انتخاب کیا۔ اپنے ڈیڈی کو

دیکھا تم نے بیٹی! کہ انہی ننھوں نے ان کے جسم میں جان ڈال دی' جینے لگے ہیں پھر سے وہ۔"

ممی کے چہرے پر الوہی خوشی پھیل رہی تھی۔ انہوں نے اسی خوشی کے عالم میں شہریار کی جانب دیکھا۔ اگلے لمحے ان کے منہ کا زاویہ بگڑ چکا تھا۔ شہریار نجانے کب سے ان کی باتوں سے بور ہو کر اپنا فون نظروں کے سامنے کیے غالباً" کوئی گیم کھیل رہا تھا۔



اس شام حرمت آفس سے فارغ ہونے کے بعد ممی کی طرف نہیں گئی تھی۔ افطاری کے وقت شہریار نے اسے میز چنتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی فطری پھرتی کے ساتھ کچن اور ڈائننگ روم کے درمیان چکر لگا رہی تھی۔ افطار سے پانچ منٹ پہلے وہ بیڈ روم کی طرف چلی گئی تھی۔

شہریار نے ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالی جو اپنی طرف کھینچ لینے والی ڈشز سے سجی تھی وہ سستی سے لاؤنج میں ٹانگیں پسارے صوفے پر بیٹھا رہا۔

"اذان ہو رہی ہے شہریار! آجاؤ اب۔" بیڈ روم سے نکلتے ہوئے حرمت نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گیلا تھا اور قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے سر پر رکھے دوپٹے سے چہرہ اور بازو خشک کرنے کے بعد آستینیں سیدھی کیں اور دوپٹہ جھاڑ کر سر پر اوڑھ لیا۔

"آ بھی جاؤ۔" وہ کھانے کی میز کی طرف بڑھی۔ شہریار ست قدموں کے ساتھ چلتا ڈائننگ ٹیبل تک پہنچا تھا۔

"تم آج ممی کی طرف کیوں نہیں گئیں؟" افطاری کرنے کے دوران شہریار نے حرمت کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"یونہی بس۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی کھجور کا ٹوپی نما حصہ کھینچا۔

"یا ان کی طرف' وہ جو ہیں تمہاری مس رقیہ۔" جواب میں اس نے ایک ہلکی سی بے بس ہنسی کے ساتھ شہریار کی طرف دیکھا۔ "وہ میری مس رقیہ کہاں ہیں۔ وہ سب بچے تو بہت خوش نصیب ہوں گے جنہوں نے ان سے پڑھا ہو گا۔ ان کے مکتب میں میرا داخلہ تو بہت دیر سے ہوا اور وہ بھی اتفاقیہ مگر عارضی۔"

"اتفاقیہ مگر عارضی داخلے ہی کی وجہ سے تو تمہاری زندگی کے سب ٹھیک کام اچانک سے غلط ہو گئے.... ہیں نا۔" شہریار ہنسا۔

"خدا جانے کیا ٹھیک ہے کیا غلط۔" وہ کھانے کی میز پر رکھے شیشے کے چھوٹے سے مرتبان میں سجے پھولوں کی پتیوں کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک تو وہی ہوتا ہے۔ جس کو انسان کا دل ٹھیک سمجھے۔"

"شاید نہیں۔" حرمت نے سر ہلایا "ٹھیک کا پیمانہ تو وہ زمانہ ہے۔ جس میں ہم موجود ہوتے ہیں۔"

"لوگوں کا کیا ہے' وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ جن باتوں کو انہوں نے اچھا یا برا قرار دے رکھا ہے' دوسرے ان پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ لوگوں کی نہیں اپنے دل کی سنا کرو۔" شہریار نے۔ اپنی پلیٹ میں دہی بڑے ڈالتے ہوئے کہا۔ حرمت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو کیا تم مجھ سے یوں روزانہ ممی کی طرف چلے جانے پر ناراض نہیں تھے۔" اس نے گھٹی آواز میں پوچھا "کیا تم زندگی کے بارے میں میرے بدلتے نظریات پر مجھ سے چڑ نہیں چکے تھے۔"

"دیکھو حرمت العین!" شہریار نے ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں رکھا۔ "میں تمہارے نظریے سے متفق ہوں یا نہیں' تمہیں تو اپنے بارے میں شیور ہونا چاہیے' جو تم سوچ رہی ہو' جو تم کر رہی ہو وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔"

"مطلب تم میرے نظریے سے بالکل بھی متفق نہیں ہو۔" حرمت کے لہجے میں مایوسی اتری۔

"ہو سکتا ہے میں تم سے سو فیصد کبھی بھی متفق نہ ہو پاؤں۔" شہریار نے اس کے مایوس ہوتے چہرے کی طرف دیکھا۔

"دیکھو! اگر نظریات کا اختلاف باقی نہ رہے اور کل سوچ ایک جیسی ہو جائے تو کیا ہو گا بھلا۔"

"کیا؟"

"پھر تو سب انسان فرشتے بن جائیں گے۔ اور فرشتہ بن جانا انسان کا مقصد نہیں ہے۔" حرمت ہونٹوں پر ہاتھ رکھے شہریار کی بات سن رہی تھی۔ اس کا ذہن الجھاؤ کا شکار ہو رہا تھا۔

شہر کے بڑے بڑے شاپنگ مالز پر جن میں سے ایک وہ بھی تھا جس کے ٹاپ فلور پر اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ روشنیوں کی بارش ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ تمام بڑے برانڈز کی دکانیں رات گئے تک کھلی رہتی تھیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر ٹریفک کا رش اور لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ لوگ خوش تھے لوگوں کو خوش رہنا آتا تھا۔ اسے یاد آیا کچھ دن پہلے تک وہ بھی لوگوں کی طرح ہی خوش تھی لیکن اب۔

کمرے کی تمام روشنیاں بند تھیں اور اس کی تاریکی میں صرف شہریار کے لیپ ٹاپ کی کھلی اسکرین روشنی بکھیر رہی تھی۔ اس نے اسی روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے شہریار کی موجودگی پر غور کیا۔ وہ اسی کمرے میں موجود تھا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔

"نہیں۔" اس نے لاشعوری طور پر سر ہلایا۔

"شاید جو میرے دل کو لگی، جو میرے من کو بھائی میں اس بات پر عمل نہ کر سکوں گی۔ مجھے شہریار اور اس سے جڑی زندگی بہت پیاری ہے۔ اس زندگی کے لیے ہی تو میں نے وہ سب اور ان سب کو پیچھے چھوڑ دیا جن کے نہ ہونے کا احساس اب میرے دل میں چیخنے لگا ہے۔" اس نے اپنے آنسو پیے اور چودھویں کے پیلے اداس چاند پر نظریں جمالیں۔

"آئی ایم سوری مس رقیہ۔ میں بھولے بھٹکے آپ کے مکتب میں داخل تو ہو گئی مگر فیضان حاصل نہ کر پائی۔ میری دنیا کی مجبوریاں کچھ اور ہیں۔ میں چاہ کر بھی آپ جیسی توانا اور ہٹ کی پکی نہ بن پاؤں گی۔"

اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا تھا۔

اسی دم، شہریار نے کانوں سے ایئرفون نکال کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں نے اپنے باس کو چھٹی کی درخواست بھیج دی ہے۔ کل تم بھی اپنے آفس میں چھٹی کے لیے اپلائی کر دو۔ ہم عید سے پہلے چند دن تمہارے امی ابو کے ساتھ گزاریں گے تمہارے گاؤں سچ کوٹ میں۔"

کمرے کی خاموشی میں شہریار کی آواز ابھری تھی۔ حرمت نے چونک کر بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ شہریار کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ راستہ جس کے دونوں طرف وسیع سبزہ زار تھے اور ان سرسبز قطعات کے دونوں طرف بلند پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ حرمت العین کا جانا پہچانا تھا۔ زندگی میں سینکڑوں بار وہ اسی راستے سے گزر کر اپنے گھر آتی جاتی رہی تھی۔ جوں جوں اس کے اور اس کی ماں کے گھر کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا اس کو اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"تم سچ کہو شہریار! تم نے یہاں آنے کا فیصلہ میرے اس عمل کے رد عمل میں تو نہیں کیا۔"

اس نے سامنے نظر آتی سڑک پر نظریں جمائے پوچھا تھا۔ "ممی اور ڈیڈی کو میں نے کسی لالچ میں کمپنی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ میرے دل کی آواز تھی۔" اس نے گردن موڑ کر شہریار کی طرف دیکھا۔

"تم مجھے اتنا جذباتی اور نان پریکٹیکل سمجھتی ہو۔" شہریار نے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلایا اور دوبارہ سڑک پر نظریں جمالیں۔ شہریار نجانے کیوں اس روز اتنی کم رفتار پر گاڑی چلا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

دھوپ کی دھول کو جب
جھاڑ کر مزدور پرندے
آشیانوں کی طرف لوٹ کے آجاتے ہیں
اور پلکوں کی طرف شام اترتی ہے زمین پر

رات آتی ہے
بجھا دیتی ہے رنگوں کو
اپنے دروازے پر تب
لو کا اک ٹیکا لگا دیتا ہوں
تم اگر لوٹ کے آؤ تو نہ بھولو یہ گھر

جہانگیر نے گھر کی طرف جاتے راستے پر چلتے چلتے اپنے پیچھے کسی گاڑی کی آواز سن کر یوں ہی پلٹ کر دیکھا تھا اور وہ جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔

وہ مسافر اس کے اپنے گھر کے مہمان تھے جنہیں جب وہ اپنے ساتھ لیے گھر کے پھاٹک تک پہنچا تو مرغیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے آوازیں لگاتی اس کی ماں کی آواز جیسے کہیں گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ لکڑی کے پھاٹک کے دونوں پٹ آج بھی دو دیواروں کے درمیان اسی طرح جھول رہے تھے جیسے حرمت العین کے بچپن، لڑکپن اور آتی جوانی میں جھولا کرتے تھے اور ان دونوں پٹوں کے ساتھ جھولتے وہ دونوں بہن بھائی عینی اور جگو۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور ان کے سامنے کا منظر دھندلانے لگا تھا۔

لکڑی کے اس پھاٹک کے پار گھر کی رہائشی عمارت تک کے کچے راستے پر وہ اپنی ماں اور بھائی کے بازوؤں کے حصار میں چل رہی تھی کہ جب ہی جھکی کمر والی دادی کی نظر اس مختصر سے قافلے پر پڑی تھی۔ بے چاری دادی ہاتھ میں دودھ سے بھرا اسٹیل کا چھوٹا سا ڈول لیے بھینسوں کے باڑے سے باہر نکلی ہی تھیں۔ اس مختصر قافلے کو دیکھ کر ان کا ہاتھ لرزا اور ڈول دودھ سمیت کچے فرش پر جا گرا۔ اتنی مدت بعد اس گھر کی وہ بیٹی لوٹ کر ان سے ملنے آئی تھی جس کے لیے وہ سب اتنے دنوں میں رات کے وقت دروازے پر لو کے ٹیکے لگاتے رہے تھے۔ کبھی وہ لوٹ کے آئے تو نہ بھولے کہ یہ اس کا گھر تھا۔

☆☆☆

"شہر کی دھول اور دھوئیں نے تمہاری رنگت سنولا دی ہے۔ پہلے کیسی چمک دار، صاف رنگت ہوا کرتی تھی تمہاری۔" اس کی امی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "اور یہ بال" انہوں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"چھوڑیں امی۔" اس نے محجوب ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ بال ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں ان کا نہ تو کچھ بگڑ سکتا ہے نہ بن سکتا ہے۔"

"مگر ان میں وہ رونق نہیں رہی جو پہلے تھی۔ یاد ہے میں تمہارے بالوں میں ہی اور انڈا لگایا کرتی تھی۔ ناریل کے خالص تیل سے مالش کیا کرتی تھی۔" وہ کہہ رہی ہیں "سب چھوڑ دیا نا۔ خالص گھی، دودھ، مکھن، گڑ شکر سب" حرمت نے ایک چور نظر شہریار پر ڈالی جو اسی کمرے میں ابو کے پاس بیٹھا تھا۔ "کیا سوچے گا ایسی ایسی زندگی گزارتی رہی ہوں میں۔" اس کے دل کے چور نے کہا۔ "اسی لیے تو میں اتنے سال ادھر نہیں آئی۔ امی، ابو، دادی اور سب ہی بہت بے ساختہ ہیں بھئی، سوچے سمجھے بغیر سب بول دینے والے۔"

"میں تو سوچتا تھا شاید ہی کبھی زندگی میں بیٹی کو یوں اپنے گھر بیٹھے دیکھ پاؤں گا۔" دوسری طرف ابو شہریار سے مخاطب تھے۔ "میرے مرے پیچھے آتی بھی تو میں تو نہیں دیکھ پاؤں گا نا۔"

ابو کی بات تو امی کو بھی چبھی تھی۔ ایسا پڑھا لکھا شہری داماد جو صرف دوسری بار ان کے گھر آیا تھا، اس سے ایسا گلہ شکوہ زیب دیتا تھا بھلا۔ امی نے سر جھٹکتے ہوئے ابو کو دیکھا۔ اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ زندگی میں دوسری بار مہمان بن کے آتے داماد کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

"میں تمہارے لیے باغ سے تازہ خوبانیاں اور لوکاٹ توڑ کر لایا ہوں عینی! تمہیں بہت پسند تھے، یاد ہے۔" جگو بید کی دو ٹوکریاں اٹھائے کمرے میں داخل ہوتا اعلان کر رہا تھا۔

"اور منیرہ کو دو دیسی مرغیاں بھی ذبح کر کے دی ہیں میں نے، دیسی مرغی کے گوشت کا ذائقہ تو بھول گئی ہوں گی تم اب تک۔" حرمت نے ایک چور نظر شہریار پر ڈالی جو زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"بیٹی باجی! آئیں نا باہر صحن میں آئیں۔ موسم بہت پیارا ہو رہا ہے۔ روزہ بھی بس کھلنے ہی والا ہے۔ باہر ہی افطاری کا انتظام کیا ہے میں نے۔" جگو کی بیوی منیرہ نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے بھئی! سب ہی بہت بے احتیاط ہیں۔ آہستہ بولنا تو جیسے جانتے ہی نہیں۔" حرمت نے پیروں میں چپلیں پہنتے ہوئے دل میں سوچا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی مبادا گھر کا کوئی اور فرد کمرے میں آکر کچھ نیا نہ بول جائے۔



باہر صحن میں فضا خوشگوار تھی۔ گرما کی اس شام میں بھی ہلکی سی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ حرمت نے صحن میں آکر دیکھا برسوں پرانا منظر ویسے کا ویسا ہی نظروں کے سامنے سجا تھا۔ چارپائی پر لیٹی دادی، صحن میں ادھر سے ادھر بھاگتے بکری کے بچے، اور ان بچوں کے پیچھے بھاگتے جگو کے بیٹے اور بیٹی۔ دادی کی چارپائی کے ساتھ گول دائرے کی شکل میں بچھی چار مزید چارپائیاں جن کے درمیان افطاری کی میز سجی تھی۔

ایک مانوس منظر جس کو ہمیشہ سے دیکھتے وہ بڑی ہوئی تھی۔ اس وقت التباس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ منظر کہیں کھو گیا تھا یا وہ خود کھو گئی تھی۔ یہ سادہ، بے ریا، اپنا ماحول کہاں رہ گیا تھا اور وہ کہاں نکل گئی تھی۔ فضا میں اذان کی آواز بکھرنے لگی۔ یہ مولوی نور محمد کی آواز تھی۔ سدا سے اسی طرح اذان دیا کرتے تھے جیسے کوئی نیند میں بول رہا ہو۔ سوئی سوئی سی آواز۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اس مانوس آواز کو بھی محسوس کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ ہو گیا چاند اور یہ تارا۔" اس نے ننھی رمشاء کے ہاتھ پر مہندی سجاتے ہوئے کہا۔

"بابا کہتے ہیں پھوپھو! آپ آرٹسٹ ہیں، آپ کو تصویریں بنانا آتی ہیں۔" جگو کا بیٹا معاذ قریب سے بولا۔ "مگر میں نے تو آپ کو ٹی وی پر دیکھا ہے، لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے۔ آپ ٹی وی پر تصویریں تو نہیں بنا رہی ہوتیں نا۔"

"تمہارے بابا کو پتا نہیں۔" اس نے جھک کر معاذ کے گال چھوئے۔ "میں آرٹسٹ نہیں ہوں۔ میں نے فلم اینڈ ٹیلی ویژن میں گریجویشن کی تھی۔"

"آپ ٹی وی پر بہت پیاری نظر آتی ہیں۔" بچے کی سمجھ میں اس کا جواب نہ آیا۔

"اچھا تو یوں میں پیاری نہیں ہوں، اصل میں۔" وہ ہنسی۔

"یہ تو پاگل ہے۔ اسے کیا پتا آپ اصل میں زیادہ پیاری ہیں۔" رمشاء نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "میں دادی، بڑی دادی اور ماما کو اپنی مہندی دکھا کر آتی ہوں۔" پھر وہ کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ معاذ بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اور کچھ دیر بعد دونوں کے آگے پیچھے بھاگنے اور کھیلنے کی آوازیں اندر کمرے تک سنائی دینے لگی تھیں۔ بچے اس گھر میں تو اصل رونق ہی اب ان کے دم سے ہے۔ جیسے کبھی میرے اور جگو کے دم سے ہوا کرتی تھی۔ اسے اپنا اور جہانگیر کا بچپن یاد آنے لگا۔



"سچ کوٹ آبشار، ایک حیران کن منظر" شہریار نے چند تصویریں اپ لوڈ کرتے ہوئے لکھا اور پھر اپنا فون حرمت کی نظروں کے سامنے کر دیا۔

"سچ بتاؤ شہریار! تم یہاں آکر بے آرام تو نہیں ہو رہے۔ تم صرف میری خوشی کی خاطر۔" حرمت نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ اس کے سامنے نیچے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ "سچ بتاؤں اگر میں یوں یہاں آکر یہ چند دن نہ رہتا تو مجھے بھی پتا نہ چلتا کہ میں اپنی زندگی میں کیا مس کر رہا ہوں۔"

حرمت نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہارے بدلتے نظریات سے سو فی صد تو شاید کبھی بھی متفق نہ ہو پاؤں

لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں تم بالکل ٹھیک ہو۔"
حرمت چونکی۔
"یہ صحیح ہے کہ ہم نے ہماری جنریشن نے خود کو حد سے زیادہ مصروف کرلیا ہے اپنی ضرورتیں لامحدود کر لی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے ہم میں سے ہر کوئی کولہو کا بیل بن رہا ہے۔
سچ کہتی تھیں تم کہ یہ مہینہ یعنی رمضان اس کا احترام اس کے تقاضے مختلف ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت آگے بڑھتا جا رہا ہے ہم اس مہینے کا وہ احترام اور تقدس بھلاتے چلے جا رہے ہیں جن کا تصور ہمارے بچپن میں ہمارے ماں باپ نے ہمارے دلوں میں ڈالا تھا۔ غلط ہے نا کہ ہم اس خیال سے رات بھر سوتے نہیں کہ سو گئے تو سحری مس ہو جائے گی اور جو رات بھر جاگتے ہیں تو کسی عبادت کسی تسبیح میں مصروف نہیں ہوتے بلکہ اپنے لیپ ٹاپ پر کوئی مووی دیکھتے ہوئے کوئی شو کوئی ڈراما دیکھتے ہوئے یا یوں ہی دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں لگے وقت گزار رہے ہوتے ہیں۔ غلط ہے بالکل غلط ہے۔
رمضان کی سحری کے لیے نیند سے جاگنے کی اپنی فضیلت ہے جو ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ سحری میں کھانے پینے کے بھی کچھ اصول ہیں جنہیں ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ ادھر ادھر سے پکڑ کر کچھ بھی کھا لیا ساتھ ساتھ اسٹیٹس اپ ڈیٹ کرتے رہے۔ ہم نے کیا کھایا سوشل میڈیا پر دوسروں کے ساتھ رمضان کے تمام عشروں میں پڑھی جانے والی دعائیں اس کے تقاضے اس کا تقدس سب شیئر کرتے رہے۔ خود ان میں سے ایک پر بھی عمل نہیں کرتے۔
روزہ رکھا اور پھر دن بھر کی بھاگ دوڑ میں ایک بھی نماز کا اہتمام نہ کر پائے۔ خالی بھوک پیاس کاٹتے رہے۔ ہمارے روزے کچھ بھی نہیں محض دکھاوا ہوتے ہیں۔ جعلی عبادتیں اور ہم خوش رہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔"
حرمت پوری آنکھیں کھولے شہریار کی بات سن رہی تھی۔ "یہ بھی سچ ہے۔" وہ ایک وقفے کے بعد گویا ہوا کہ ہم اپنی ثقافت ریت روایت خلوص سب بھول چکے ہیں۔ اس روز ممی کی طرف تمہارے افطار ڈنر میں بیٹھے میں نے سوچا کہ پہلے لوگ ایسی سادہ تقریب میں سب کو اس لیے اکٹھا کرتے تھے کہ ایک دوسرے کے حال احوال سے باخبر رہیں۔ ایک دوسرے سے اسی بہانے مل لیں ایک دوسرے کو دیکھ لیں جبکہ اب ایسی تقریبات محض نمود و نمائش اور دوسروں پر اپنے متمول ہونے کا اثر ڈالنے کے لیے منعقد کی جاتی ہیں۔ وہی فیک گیدر نگز جن کے بعد ایک دوسرے کے بارے میں جی بھر کر چغلیاں کی جاتی ہیں۔ منافقت اور دکھاوے کا عملی نمونہ ہیں۔
ایسی تقریبات اسی طرح عید کی تیاری اور عید منانا بھی اب ویسا نہیں رہا جس میں اس کے باقی دنوں سے مختلف ہونے کا احساس موجود ہو۔
دراصل پہلے لوگوں کی رسائی ہر چیز تک ویسی نہیں ہوتی تھی جیسے اب ہے۔ عید شب برات پر نئے کپڑے ہی سال بھر کے نئے کپڑے ہوا کرتے تھے۔ جن میں جارم تھا۔ جنہیں پہننے کا شوق دل میں ابھرتا تھا۔ جو عید کے دن تک کئی بار راتوں کو خواب میں بھی نظر آتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں ہر شخص کی دسترس میں بہت سی چیزیں آچکی ہیں اسی لیے کسی چیز میں وہ کشش باقی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔"
حرمت نے کچھ کہنا چاہا۔ شہریار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔
"پھر بھی یہ سچ ہے کہ ہمیں عید کو باقی دنوں سے مختلف دن کی طرح منانا چاہیے۔ ان لوگوں سے عید ملنے جانا چاہیے جن سے آگے پیچھے ہم کم ہی ملنے جاتے ہوں۔ دور کے رشتہ دار تو کیا ہم اپنے سگے ماں باپ سے کئی کئی دن نہیں ملتے جو ہمیں پال پوس کر یہاں تک لائے۔ جہاں آکر ہمیں ایسا لگنے لگا جیسے اب وہی ماں باپ ہمارے معاملات کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہم اپنی زندگیاں اپنے انداز میں گزارنے کی خاطر یا تو ان سے مکمل طور پر الگ ہو جاتے ہیں یا پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ ہم

شخصی آزادی کے علم بردار کسی بھی روک ٹوک سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

"ہماری اپنی مثال ہی لے لیتے ہیں۔ مجھے لگا میں تم سے شادی کے بعد ان کے گھر میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس اتنے کھلے، کشادہ گھر کو چھوڑ کر دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں چلا آیا۔ مجھے اپنی شخصی آزادی جو عزیز تھی۔ ہم کس وقت گھر سے نکلتے ہیں کس وقت واپس آتے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں، کیا پکاتے ہیں۔ کچھ پکاتے بھی ہیں یا نہیں۔ کیا پہنتے اوڑھتے ہیں۔ کن لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں، کوئی دیکھے نہ ہی کوئی اعتراض کرے۔ اسی لیے میں ڈیڈی کا گھر چھوڑ آیا تھا نا۔" اس کی ہنسی میں تلخی تھی۔

"تم اتنے سال اپنے ماں باپ سے نہیں ملیں کیوں کہ تمہیں لگتا تھا کہ تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ تمہیں یہ بھی لگتا تھا تمہارے ماں باپ کا سوشل اسٹیٹس اس سے کم ہے، جو میں نے تمہیں دیا۔ تم مجھ سے جھجکتی رہیں۔ میرے دیے اسٹیٹس کو مین ٹین رکھنے کے لیے مجھ سے بھی زیادہ تیز بھاگتی رہیں۔ تمہارا لباس بدلا، تمہارا دوپٹہ اترا، تمہارا وہ ہنر، سلیقہ مندی اور سگھڑاپا جو تمہاری امی نے گھٹی میں گھول کر تمہیں پلایا تھا۔ طاق پر چلا گیا۔ اب جو اگر ہم ان سب رشتوں سے دور نہ ہوتے ...... تو کیا اس قدر بدلتے ہوئے تمہیں ان سب کی روک ٹوک کا ڈر نہ ہوتا۔ کسی کی ناراضی کا ڈر نہ ہوتا۔

یہ ہی وجہ ہے ہمارے ڈی ٹریک ہونے کی۔ ہمیں ماڈرن سے ماڈرن گھر، جدید ترین ماڈل کی گاڑیاں، عمدہ ترین لائف اسٹائل درکار ہے۔ اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے پیسہ چاہیے جو جتنا ہو کم ہے۔ اس چکر میں ہمارے روزے، ہماری نمازیں، ہماری چاند راتیں اور ہماری عیدیں بھی چھوٹنے لگیں۔ ہم نے زندگی کے سب ذائقے کھو دیے۔"

"یعنی تم نے اس نظریہ کو سمجھ لیا جسے میں بیان نہیں کر پا رہی تھی۔" حرمت نے بے صبری سے پوچھا۔ "مطلب تم بھی متفق ہو گئے۔" اس کی آواز میں اس سی۔

"سو فی صد نہیں۔" شہریار نے سر ہلایا۔

"رشتوں، ناتوں، رسموں، روایتوں، عقیدوں اور ان پر عمل کی حد تک میں تم سے متفق ہوں۔ ہمیں یہ سب چیزیں پوری اسپرٹ اور ان کے میرٹ کے ساتھ نبھانی اور منانی چاہئیں۔ ایسا نہیں کریں گے تو رفتہ رفتہ اپنی شناخت کھو دیں گے۔"

"کتنے فی صد متفق نہیں ہو۔" حرمت نے تھک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"بس تم اپنی مس رقیہ کو میری طرف سے یہ پیغام دے دینا کہ ہم پوری کوشش کریں گے اپنی نیت پھر سے نیک کرنے کی۔ اپنی نظر بھری رکھنے کی۔ ہم کوشش کریں گے کہ پرندوں کے آشیانوں، پھولوں کی خوشبوؤں اور لوگوں کے دلوں کو مسمار نہ کریں۔ زندگی پر چھائے اللہ کے رنگ کو میلا نہ ہونے دیں۔ لیکن انہیں ادراک ہونا چاہیے کہ ہم ان سے دو نسلیں آگے کے انسان ہیں۔ ہمارا زمانہ ان کے زمانے سے آگے بڑھ چکا ہے۔ ہمارے زمانے کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہیں جنہیں اگر ہم نہیں نبھائیں گے تو اس زمانے میں مس فٹ ہو جائیں گے۔

انہیں بتانا کہ نو سے پانچ کی جاب کرنے والوں کو، دفتر جاتے اور آتے وقت ٹریفک کے اژدھام کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے۔ جابز کی ڈیمانڈز بھی سخت ہوتی ہیں۔ اس سب سے نمٹنے کے بعد ہم بری طرح تھک بھی جاتے ہیں اور ہمیں ذہنی آرام کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ہمارا ذہنی سکون، جسمانی آرام اپنے انداز کی تفریح ہی میں مضمر ہے۔ دوستوں سے چیٹنگ، موویز، سوشل میڈیا، کبھی کبھار کے گیٹ ٹو گیدرز..... ہم کیا کریں ہمارے دور میں ان سے دور رہ کر زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ آئی ٹی انفارمیشن کا دور ہے۔ ہمیں اس کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ ہمارے بڑوں کو ہمیں اتنی جگہ تو دینی ہی پڑے گی۔"

"ہاں!" حرمت نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم دنیا سے کٹ کر جی نہیں سکتے۔ دنیا جواب

ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے۔"

"ہاں۔" شہریار نے سرہلایا۔ "ایسا نہ کرپائے تو اپنی شناخت گم کردیں گے۔" حرمت نے آنکھیں میچتے ہوئے گہرا سانس لیا۔ جس نقطے پر اس کا دھیان مرتکز نہیں ہوپارہا تھا' اسے شہریار نے بنا کسی بحث کے سمجھ لیا تھا۔

"میں نے تمہارے امی 'ابو' دادی اور جگو کو منالیا ہے۔ اس بار ہم اکٹھے عید منائیں گے ہمارے گھر پر۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں کل صبح۔" شہریار نے ایک اور خبر اسے دی۔

حرمت نے ان سب کو اپنے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ امی' ابو' دادی' جہانگیر' منیرہ' ان کے دونوں بچے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے نفاست سے سجے لاؤنج میں ٹریولنگ بیگز کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ چکا تھا۔

"یہ سب کہاں سمائیں گے۔" اس نے ہول کر سوچا تھا۔

"تم نے دیکھا' دل میں جگہ ہو تو چھوٹی سی جگہ میں بھی اتنے سارے لوگ سما جاتے ہیں۔" اگلی سحری کی تیاری کے دوران اس کے مختصر سے کچن میں کھڑی امی نے اس سے کہا تھا۔ "رشتے قائم رہنے چاہئیں' دل سلامت رہنے چاہئیں جگہ کا کیا ہے۔ گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ تم سے بڑے دل کا تو وہ ہی نکلا تمہارا میاں حالانکہ غیر تھا۔" وہ جتانا چاہ رہی تھیں۔

حرمت نے اپنے لاؤنج پر نظر ڈالی۔ جگو کے دونوں بچوں نے لاؤنج میں حشر مچا رکھا تھا۔ نازک چترالی کرسیوں کے کشن نیچے فرش پر پڑے تھے۔ سیاہ گراموفون کی سوئی ٹوٹ چکی تھی۔ دیواروں پر سجی اقبال جعفری اور حنیف رامے کی پینٹنگز پر مارکرز سے لکیریں کھنچی نظر آرہی تھیں۔ لکڑی کے فرش پر کہیں کہیں بچھے قیمتی رگز الٹے پڑے تھے۔

"جی امی! دل میں جگہ ہو تو کچھ بھی برداشت کیا جاسکتا ہے۔" اس نے مبہم سا جواب دیا تھا۔

"تمہارا یا بورچی خانہ اتنا چھوٹا ہے کہ انسان دو قدم چلے تو یہ ختم ہوجائے۔" امی نے سر جھٹکا "کیسے کرلیتی ہو اس میں کھڑے ہو کر کام' میرا تو دم ہی گھٹ جائے۔"

حرمت کی نظر لاؤنج میں آکر بچوں کی پھیلائی چیزیں اٹھاتے شہریار پر پڑی۔ وہ امی کو متنبہ کرنا چاہ رہی تھی کہ سوچ سمجھ کر بولیں لیکن اس سے پہلے ہی امی دوسری بات پر پہنچ چکی تھیں۔

"مجھے یہ تو بتاؤ یہ جو تمہارے گھر ابھی تک کوئی بچہ نہیں ہے' یہ کیا چکر ہے۔ فون پر تو تم سے پوچھ نہیں پاتی تھی۔ لیکن اس سونے سے گھر میں آکر تو پریشان ہوگئی ہوں میں۔ کسی ڈاکٹر واکٹر سے ملی ہو کبھی۔ پتا بھی کیا ہے کہ بچہ کیوں نہیں ہو رہا اب تک۔ دیکھو اپنا چیک اپ کراؤ پوری تفصیل سے اور دیر ہوگئی تو بہت مشکل ہوجائے گی۔"

امی اپنی دھن میں بولے چلی جارہی تھیں۔ حرمت نے چور نظروں سے شہریار کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"زبردستی مسکراتے ہوئے یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا اور امی کو اب میں کیا بتاؤں کہ ان کا داماد ان سے ایک نسل آگے کا نمائندہ' اس گھر کے مکمل قبضہ ملنے اور گاڑیوں کی قسطیں پوری ہوجانے کے بعد بھی جب تک اسے اپنی فنانشل پوزیشن مضبوط ہوجانے کا یقین نہیں ہو جائے گا' بچہ پیدا کرنے کا سوچے گا بھی نہیں۔" حرمت نے چائے کی کیتلی میں پتی ڈالتے ہوئے سوچا۔

"آپ فکر نہیں کریں امی۔" شہریار امی کے قریب آکر ان کا بنایا ہوا آملیٹ چکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بس سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ آپ نانی بن جائیں گی ان شاء اللہ" اس نے حرمت کی طرف دیکھا اور اسے آنکھ ماری۔ "میں جگو کے بچوں کو دیکھ کر بے ایمان ہو گیا ہوں۔ بچوں کے بغیر زندگی بالکل بے رونق ہوتی ہے یار!" اس نے حرمت کے کان کے قریب جھک کر کہا تھا۔

"اپارٹمنٹ اور گاڑیوں کی قسطیں اور وہ بینک

اکاؤنٹس کی اسٹیپ لیٹی۔" حرمت بڑبڑائی۔

"میرے ممی اور ڈیڈی دونوں بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ان سے دور رہ کر ان کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں اور خود اپنے ساتھ بھی۔" سحری کے دوران وہ حرمت کے ابو کو بتا رہا تھا۔

"یہ تو ہے۔" ابو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو خود حیران ہوں تم لوگوں نے ان سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"غلط کیا نا۔" شہریار نے اعتراف کیا۔ "اسی لیے عید کے بعد ہم واپس ممی کی طرف شفٹ ہو جائیں گے۔ اس اپارٹمنٹ کو کرائے پر دے دیں گے۔ کرائے کی رقم، اس کی اور گاڑیوں کی قسطیں بھرنے کے لیے کافی ہوگی۔"

"گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔" حرمت نے دل میں دہرایا "ممی کا وہ پرانی وضع کا بنا وسیع اور کشادہ گھر جس میں کتنے ہی بڑے بڑے کمرے ہیں اور آگے پیچھے لان بھی ہے۔ لان میں پیڑ پودے اور درخت بھی ہیں جہاں تھوڑی سی محنت کر کے روٹھے ہوئے پرندوں کو واپس بلایا جا سکتا ہے۔ خوشبودار پھولوں کی مہک کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔" حرمت کا دل کھل سا گیا۔

"ممی اور ڈیڈی کے ساتھ رہنے کا مطلب پچھتاوے سے بچ جانا بھی ہوگا جوان کو توجہ نہ دے سکنے پر دل پر بوجھ کی مانند رہتا ہے۔"

وہ خوش تھی، خوش ہو رہی تھی زندگی کی تمام جہتیں جیسے ایک دم سے بدل گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں جو سن رہی ہوں عینی کیا وہ سچ ہے۔" اگلے روز کام کے دوران آدھے گھنٹے کے وقفے میں وہ پریشے سے واٹس ایپ پر بات کر رہی تھی۔

"تم نے کیا سنا ہے پریشے" وہ اپنی سیٹ پر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

"یہ ہی کہ تم ماضی اور مستقبل پرستی کے درمیان

حال کے لیے جگہ بنانے میں لگی ہوئی ہو۔ ٹریڈیشنز کی طرف فیشن کے مارے نہیں اس لیے واپس چلی گئی ہو کہ تمہیں لگتا ہے انہیں چھوڑ کر تمہاری شناخت مسخ ہو رہی تھی۔ عینی کیا واقعی تم نے شلوار قمیص پر دوبارہ سے دوپٹا اوڑھنا شروع کر دیا ہے۔"

"ہاں' اس لیے کہ شلوار قمیص دوپٹے کے بغیر ادھوری لگتی ہے۔ یہ ہماری تہذیب و روایت کا حصہ ہے۔"

"لیکن میں تو ٹی وی پر دیکھ رہی ہوں' ادھر پاکستان میں ممی کی عمر کی خواتین نے بھی دوپٹا اوڑھنا چھوڑ دیا ہے۔" پریشے کہہ رہی تھی۔

"ہاں!" حرمت ہنسی یوں جیسے دوپٹا کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جس سے چھٹکارا پر یوم نجات منایا جا رہا ہو۔

"تم لوگ ممی کی طرف شفٹ ہونے کا پروگرام بھی بنا رہے ہو کیا؟" پریشے نے اگلا سوال کھنکھارنے کے بعد کیا تھا۔

"یہ شہریار کا پلان ہے۔ میرا نہیں۔"

"یعنی تم ایسا نہیں چاہتیں۔ صرف شہریار کے لیے مان گئی ہو۔" پریشے کو لگا جس خیال کے تحت اس نے گلا کھنکھارا تھا' وہ درست تھا۔

"تم بھول رہی ہو' ممی اور ڈیڈی کو کمپنی دینے کے لیے میلوں کا سفر میں نے کرنا شروع کیا تھا۔ ممی کے گھر کا آرکیٹیکچر اور ان کے لان دیکھ کر وہ میرا ہی دل تھا جو ہو کتا تھا کہ ہم دوبارہ سے وہاں رہنے لگیں۔ شاید ہم وہاں رہتے ہوئے روٹھی ہوئی نیچر کو منانے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"لیکن تم نے کہا تو نہیں۔" پریشے کو اس کا جواب ایک بہانہ سا محسوس ہوا تھا۔

"اس لیے کہ میں شہریار سے صرف اپنی محبت میں کوئی کام کرانا نہیں چاہتی تھی۔"

"تم سمجھتی ہو وہ تمہاری محبت میں ایسا کر لیتا؟ جانتی ہو وہ زندگی کو کیسے ناپ تول کر گزارنے کا عادی ہے۔"

"تو تم مجھے بتاؤ پری! شہریار میری محبت میں مجھے سچ کوٹ لے گیا تھا یا صرف ڈیڈی کو توجہ دینے کے جواب میں اس نے میرے ماں باپ کو اہمیت دینے کی کوشش کی تھی۔" حرمت کے دل کی کھٹک ایک بار پھر سوال بن گئی۔

"صرف تمہاری محبت میں۔" پریشے کے لہجے میں یقین تھا۔ "تم سمجھ رہی تھیں وہ تمہارا نقطہ نظر سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ اسے بھی احساس ہو گیا کہ رشتوں ناتوں اور روایتوں کے بغیر زندگی پھیکی اور بے مزا ہے۔ جسے ہم لوگ مزا سمجھتے ہیں' اس کا رنگ کچا اور احساس ناپائیدار ہے۔ میں تو خود بھی تمہاری قائل ہو گئی عینی۔ تم نے ماں باپ کی تنہائی اور کمزوری کو ان کا اور میرا کرب بننے سے بچا لیا۔ میں تو خود بھی کوشش کر رہی ہوں کہ وقت کے بہاؤ میں توازن پیدا کرنے کی کوئی ترکیب سمجھ جاؤں۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔



رات اس نے عید کا چاند بہت سالوں بعد دیکھا تھا۔ اس چاند کے انتظار میں وہ کتنی دیر چھت پر ٹنگی رہی تھی۔ اس کے انداز میں بچوں کا سا شوق اور بے چینی تھی اور چاند نظر آ جانے پر خوشی کے مارے اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں بھی یوں ہی نکلی تھیں جیسے کسی بچے نے من مرضی کی چیز پالی ہو۔

"مبارک ہو' اس بار جوان عید ہو گی۔" مس رقیہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ حرمت العین کے ساتھ شہریار کے ہاتھ بھی دعا کے لیے اٹھ گئے تھے۔

"لوگ اب اسے بھی ایک غیر ضروری رسم سمجھنے لگے ہیں۔" دعا مانگنے کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مس رقیہ کہہ رہی تھیں۔ "حالانکہ عید کا چاند دیکھنے اور دیکھنے کے بعد دعا مانگنے میں بڑی برکت ہے۔ زندگی میں خوشی اور سکون کا احساس رہتا ہے۔ آزما کر دیکھ لینا۔"

"ہم جانتے ہیں' اسی لیے تو خاص طور سے عید کا

چاند دیکھنے آپ کے گھر آئے ہیں۔ آپ کی چھت سے یہ چاند کتنا صاف نظر آرہا ہے۔" حرمت نے اردگرد کی چھتوں پر چڑھے لوگوں کو ایک دوسرے کو عید کے چاند کی مبارک دیتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"چلیں اب!" شہریار نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "ممی کی طرف وہ سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ہاں تم چلو گاڑی ریورس کرو۔ میں آتی ہوں۔" حرمت نے سر ہلایا۔ شہریار سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔

"مس رقیہ!" شہریار کے جانے کے بعد حرمت چھت پر بچھی چارپائی پر بیٹھی مس رقیہ کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اگر اس رمضان سے صرف ایک ہفتہ پہلے میں اتفاق سے آپ سے نہ ملی ہوتی تو آج اس چاند رات پر میرے اردگرد، میرے اندر، باہر ایسی رونق ہرگز نہ ہوتی۔ اس بار بھی میری عید پچھلے کئی سالوں کی طرح سوتے ہوئے گزر جاتی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس روز میرا دل تمہیں بازو سے پکڑ کر اپنے گھر لے آنے پر کیوں مچلا تھا۔ جبکہ مجھے تم سے کوئی کام تھا نہ غرض۔" وہ ہنسیں "آج سمجھ میں آگیا۔"

"جانتی ہیں، اس عید پر میرے اپنے گھر والے، شہریار کے ممی ڈیڈی اور ہم سب اکٹھے ہیں۔ ہم نے اتنے سارے پلان بنائے ہیں آج چاند رات منانے کے۔ کل عید منانے کے۔ خوب انجوائے کریں گے۔" عینی کے لہجے میں کھنکناہٹ تھی "اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ صرف آپ کی وجہ سے۔ سمجھ میں نہیں آتا آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔" جواب میں انہوں نے حرمت کا ہاتھ ہولے سے دبایا اور مسکرا دیں۔

"یہ دیکھیں۔" حرمت نے گلے میں پڑا دوپٹا دکھاتے ہوئے کہا "یہ وہی دوپٹا ہے نا جو اس روز نیلے رنگ کے شاپر میں ڈال کر آپ نے مجھے دیا تھا یہ آج میں نے پہلی بار اوڑھا ہے۔ سچ کہا تھا آپ نے اوڑھنیاں تو اوڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ زندگی میں میری ماں کے بعد دوسری بار یہ سبق آپ نے مجھے یاد کروایا۔" وہ اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"اگر دوسری بار تو نے یہ سبق پڑھ ہی لیا ہے تو اب اسے بھول نہ جانا۔ اب کے بھولیں تو تیسری بار یہ ہی سبق پڑھانے کے لیے خدا جانے تمہیں کوئی مس رقیہ ملے نہ ملے۔"

حرمت نے سیڑھیاں اترتے اترتے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ پہلی سیڑھی پر کھڑی تھیں۔ نیچے صحن میں جلتے کم طاقت کے بلب کی ناکافی روشنی میں ان کا چہرا ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر ان کا لہجہ ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"اف، آج کا پورا دن اتنا مصروف گزرا۔ آئی ایم سوری، پری میں تمہیں ٹیکسٹ نہیں کر سکی۔" عید کا پورا دن اپنی اور شہریار کی فیملی کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ اور شہریار واپس اپنے گھر آئے تھے اور اس وقت وہ بیڈ روم میں اسٹڈی ٹیبل پر رکھے لیپ ٹاپ کے کیمرے میں جھانکتی پریشے سے بات کر رہی تھی۔

"امی، ابو اور جگنو کی فیملی ادھر ہی ہے ممی کی طرف۔ ہم دونوں ایک ساتھ تھوڑی سی عید منانے



ادھر آئے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے شہریار کی طرف دیکھا جو اپنی قمیض کے کف لنکس کھول رہا تھا۔

"میرے یہ کپڑے!" پریشے کے سوال کے جواب میں اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور ہنس دی "مس رقیہ نے تحفے میں دیے تھے۔"

"لگتا ہے انہوں نے خود بنائے ہیں۔ یہ چنری کا سوٹ، یہ گوٹے کا کام۔۔۔ اس پر تمہاری حسین زلفوں میں پڑا یہ پراندہ، یہ کھسے، یہ جھمکے۔۔۔ واہ حرمت العین تم تو آج بہت دیسی نظر آرہی ہو۔" پریشے ہنسی۔

"دیسی نہیں، ایک دم ٹریڈیشنل، ایک دم ایشین، ایک دم پاکستانی۔" شہریار نے پریشے کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ "لیکن ابھی جب یہ اپنا پراندہ کھولے گی تو سمجھو اس کے بالوں میں بم پھٹ جائے گا۔"

"بس عید کی ان چھٹیوں کے بعد ری بونڈنگ پکی۔" حرمت نے منہ بنایا۔

"ہرگز نہیں، خبردار! سوچنا بھی مت۔" شہریار نے تنبیہہ کی۔

"آج ہم دن بھر گھومتے پھرتے رہے۔ سب چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں سے ملنے گئے اور پھر جگنو کے بچوں کو شہر گھماتے رہے۔" حرمت نے پریشے کو بتایا "بہت مزا آیا۔ لیکن بہت تھک بھی گئے۔ اس لیے یار ابھی اجازت دو۔ کل بات کریں گے۔"

"ہاں ضرور۔" پریشے نے کہا۔ "ایک بار پھر عید مبارک اللہ حافظ اور شب بخیر۔"

پھر وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین سے غائب ہوگئی۔

حرمت کپڑے بدل کر جب وہ واپس کمرے میں آئی شہریار بیڈ پر لیٹ چکا تھا۔

"تم سونے لگے ہو۔ دیکھو تو سارا شہر ابھی جاگ رہا ہے۔" اس نے شہریار سے کہا اور کھڑکی کی طرف آ گئی۔ عید کی رات پر شہر کی رونقیں، روشنیاں عروج پر تھیں۔ نیچے سڑک پر چند منچلے ون ویلنگ کرتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ ہر کوئی رنگ روشنی کے اس سیلاب میں اپنے انداز میں عید مناتا نظر آرہا تھا۔

ایسے میں حرمت کو اچانک اسی پر رونق شہر کے ایک محلے کی تنگ گلی میں واقع اپنے مختصر سے مکان سے موجود وہ تنہا دل یاد آگیا۔ وہ دل تنہا تھا اور اداس بھی۔ جسے اس نے دن بھر اپنے ساتھ تفریح میں شامل ہونے کی پیشکش بھی کی جسے اس نے یہ کہتے ہوئے منع کردیا کہ اس کے ساتھ تو اس کے محلے والے اس کے پڑوسی اور اکا دکا رشتہ دار تھے۔ وہ ان کے ساتھ عید منا سکتا ہے۔ حرمت کا دل ایک دم بوجھل ہوگیا۔

اس نے مڑ کر شہریار کی طرف دیکھا اور اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ اسٹڈی چیئر پر بیٹھ کر وہ لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

"کیا ہو رہا ہے؟ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اسے شہریار کی آواز سنائی دی۔

"بس پانچ منٹ اور میں آرہی ہوں۔" اس نے ٹائپنگ کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس تنہا اداس دل کی کہانی ٹائپ کر رہی تھی۔ اس کہانی میں اس نے اس دل سے اپنی ملاقات کا قصہ بھی لکھ ڈالا تھا۔

"مس رقیہ کے ارد گرد یادوں کا ہجوم ہے اور شاید اپنے مکتب کے شاگردوں کا میلہ بھی۔ لیکن ان کے دل میں صرف ایک شبیہہ محفوظ ہے۔ ان کی نظروں کو صرف ایک چہرے کا انتظار ہے۔ وہ شبیہہ، وہ چہرہ جس سے ان کی دنیا آباد ہے۔ ان کی دنیا کو ویران ہونے سے بچالو۔ آس، امید اور انتظار کا دیا ٹمٹمانے اور پھر ہمیشہ کے لیے بجھ جانے سے قبل ان کے لیے، خود اپنے لیے بہترین فیصلے کا انتخاب کر ڈالو۔ مس رقیہ کی زندگی پر چھائے اللہ کے خاص رنگ کو میلا ہونے سے بچانے کی خاطر صبغت اللہ لوٹ آؤ۔"

اس نے اس تنہا اور اداس دل کی کہانی کی آخری سطر ٹائپ کی اور پھر وہ کہانی ای میل کی شکل میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے منسلک کارلا کیٹلسٹ لیبارٹریز کے نامور پروفیسر صبغت اللہ حفیظ کے نام روانہ کر دینے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کی فالتو بتیاں بند کرتے ہوئے شہریار کی طرف آگئی۔





فیصلہ

فوزیہ اشرف

"ستارہ دیکھو، آگئے تمہارے ابا جان!" صغریٰ بیگم نے گاڑی کا ہارن سن کر کہا۔

"جی اماں آگئے ہیں۔" ستارہ نے کھڑکی سے جھانک کر گیٹ کے اندر داخل ہوتی گاڑی کو دیکھ کر کہا۔ صغری بیگم بھی کھڑکی میں آن ٹکیں۔

چودھری شوکت علی اگلی نشست سے اترے۔ پچھلی سیٹ سے ان کی رشتہ کی بیوہ بھاوج اور اس کی بیٹی افشاں بڑے بڑے شاپر سنبھالے اتریں اور حویلی کی پچھلی طرف بنے پورشن کی طرف بڑھ گئیں۔ جبکہ چوہدری شوکت مردان خانے کی طرف چلے گئے۔

ڈرائیور نے گاڑی گیراج میں لگادی۔

"ہوں، آگئے ہیں اب سخی داتا!" صغریٰ بیگم بولیں۔

"بس کریں اماں آپ بھی نا۔" ستارہ اکتا کر بولی۔

"پتا نہیں کیا کچھ خرید ڈالا ہے آج۔" صغریٰ بیگم کی سوئی وہیں۔ اٹکی ہوئی تھی۔

"جب ابا جان نے کہا تھا کہ آپ بھی ساتھ چلی جائیں تو چلی جاتیں نا۔ اب کیوں ٹینشن لے رہی ہیں۔" ستارہ نے ٹوکا۔

"میری جاتی ہے جوتی۔ خود ہی کریں ان کی چاکری۔ میں نوکر نہیں ہوں صائمہ بی کی جو گری میں ان کی بیٹی کی خریداری کے لیے نور۔ لور پھرتی رہوں۔" صغری بیگم نے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اماں! جب ابا نے کہہ دیا ہے کہ شادی کا سارا خرچ وہ اٹھائیں گے تو آپ کیوں جان ہلکان کرتی ہیں اپنی۔" ستارہ سے چھوٹی چندا نے بھی ماں کو سمجھایا۔

"ہاں حاتم طائی ہیں نا یہ۔ شہنشاہ کی اولاد ہیں۔ کیا پروا خرچے کی۔ اے میں تو کہتی ہوں خرچ اٹھائیں۔ سو بار اٹھائیں، مگر انہیں ان کی حد میں رکھتے ہوئے خرچا کریں۔ مگر نا بھئی نا، یہ تو پیسہ پانی کی طرح بہارہے ہیں۔ ارے تھوڑا بہت جہیز بنا کر خاموشی سے چار بندے بلوا کر نکاح پڑھوا دیتے، مگر انہوں نے تو بس میرا دل ہی جلانا ہے اور کیا۔"

☼ ☼ ☼

صائمہ بی۔ صغریٰ بیگم کی رشتے میں جٹھانی ہوتی

تھی۔ شوکت کے تایا مرحوم کی بہو تھیں وہ۔ کرنا خدا کا یہ ہوا شوکت کے تایا اور صائمہ بی کے شوہر دونوں باپ، بیٹا اکٹھے ہی ایک حادثے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے شوہر اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ لہٰذا بیوہ بھاوج کو تین بیٹیوں کے ساتھ دوسرے شہر اکیلا چھوڑنے پر شوکت صاحب راضی نہ ہوئے اور انہیں اپنی بڑی ساری حویلی میں پچھلی طرف پر بنے دو چھوٹے کمروں کو تھوڑا بہت درست کر کے کچن باتھ روم وغیرہ بنا کر الگ پورشن کی شکل دے کر وہاں ہی ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔

صائمہ بی نے بھی دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ رکھے تھے۔ سو اسی کو غنیمت جان کر اپنی تین بیٹیوں کو لے کر اسی کونے میں دبک گئیں۔ تاکہ اپنی بچیوں کو دنیا کی گندی نظروں سے بچا سکیں۔ مگر یہاں ان کی عزت نفس کو تار تار کرنے کو صغریٰ بیگم موجود تھیں۔ حالانکہ وہ الگ پورشن میں رہ رہی تھیں اور شوکت صاحب پر کوئی ایسا بوجھ بھی نہ تھا کہ ان کا اپنے مکان کا جو دوسرے شہر میں تھا کرایہ بھی آتا تھا۔ کچھ وہ اپنی بیٹیوں کو ساتھ لگا کر سلائی، کڑھائی کا کام بھی کر لیتی تھیں۔

اب ان کی بڑی بیٹی کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ رشتہ بھی شوکت صاحب نے خود دیکھ بھال کر کروایا تھا اور اسے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی رخصت کرنا چاہ رہے تھے اور صغریٰ بیگم کو یہ بات بڑی چبھ رہی تھی۔



"امی! باہر ارشاد آئی ہے۔ بیمار ہے۔ کہہ رہی ہے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" چندا نے ماں کو بتایا۔

"دبٹھایا کدھر ہے اسے؟" صغریٰ بیگم نے رعونت سے پوچھا۔

"باہر لاؤنج میں بیٹھی ہے۔"

"اے سی کی کولنگ تو بڑھا دے۔" صغریٰ بیگم نے چندا سے کہتے ہوئے کروٹ بدلی۔

"امی! پہلے اسے تو فارغ کر دیں۔ آپ تو دوبارہ سے سونے کی تیاری کر رہی ہیں۔" چندا نے ماں کو یاد دہانی کروائی۔

"اچھا کر دیتی ہوں فارغ۔ تو زیادہ پردھان نہ بن۔ ابھی تھوڑی دیر تک باہر نکلوں گی تو سن لوں گی اس کی فریاد۔" صغریٰ بیگم نے لاپروائی سے کہا۔

تقریباً" گھنٹے بعد ہلکا سا دروازہ بجا کر اجازت ملنے پر سندر اندر داخل ہوئی۔

"چوہدرانی صاحبہ! وہ ارشاد کو بہت تیز بخار ہے۔ کافی دیر سے بیٹھی ہے۔ اگر کچھ مدد ہو جائے تو۔۔۔" سندر نے بڑے ڈرتے ڈرتے جھجک کر کہا۔

" لو جسے دیکھو اس کا سفارشی بن کر آ رہا ہے۔ میرا تو دو گھڑی آرام کرنا مشکل کر دیا۔" صغریٰ بیگم غرا کر بولیں۔

پھر کچھ یاد کر کے کہا۔ "اسے حویلی کی دوسری سائڈ پر لے جا۔ وہاں زینب اور حاجرہ گندم کو دھوپ لگوانے کا کام کر رہی ہیں۔ کچھ ان کی مدد کروا دے، پھر کرتی ہوں کچھ۔"

"چوہدرانی جی اس کو تو بخار بڑا تیز۔۔۔" سندر نے حیران ہو کر کہا۔

"تو پھر؟ بخار ہی ہے، کون سا ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں جو تھوڑا سا بھی کام نہیں کر سکتی۔ تجھے جو کہا ہے وہ کر۔ جس کو دیکھو مجھے ہی نصیحت کرنے لگا ہوا ہے۔" صغریٰ بیگم نے بڑبڑ کرتے ہوئے سر دوبارہ تکیے پر رکھا۔

سندر مجبور ہو کر ارشاد کو حویلی کی دوسری طرف پر لے آئی۔ "تو بس یہاں بیٹھ جا، ایک طرف سائے میں ہم تیرے حصے کا کام ہم خود ہی کر لیں گے۔ پھر دوبارہ تھوڑی دیر تک جاتی ہوں میں چوہدرانی صاحبہ کی طرف۔" سندر نے ہمدردی سے کہا۔

خدا خدا کر کے تقریباً" دو تین گھنٹوں کے بعد صغریٰ بیگم نے ارشاد کو پانچ سو روپے بھجوا ہی دیے۔

"چوہدرانی جی کہہ رہی ہیں کہ یہاں ہی ڈسپنسر کو دکھا کر دوا لے لینا۔ قصبے کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ وہی دوائی یہاں سے بھی مل جائے گی۔ قصبے والا ڈاکٹر تو زیادہ پیسے لے گا۔ یہ نہ ہو کل اور

مانگنے آجاؤ۔" سندر نے پانچ سو روپے کے ساتھ صغریٰ بیگم کا پیغام بھی ارشاد کو دے دیا۔



چوہدری شوکت بڑے خوش گوار موڈ میں اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ بیٹھے میٹھے آموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، جو کہ ان کے اپنے باغ کے تھے۔ یہ کوئی چھوٹے موٹے چوہدری نہ تھے، پھلوں کے کافی سارے باغات تھے ان کے۔ غیر ملکی منڈیوں میں بھی کافی مانگ تھی ان کے پھلوں کی، آدمی دیالو تھے۔ دل کھول کر بیوی، بچوں کے ساتھ ساتھ غریبوں پر بھی خرچ کرتے اور اللہ اتنا ہی ان کے رزق میں اضافہ کرتا جاتا۔ مگر ان کی بیگم صغریٰ کی عادت بالکل ان کے الٹ تھی۔ اسے پیسہ دانتوں سے پکڑ کر رکھنے کی عادت تھی۔ اکثر اسی عادت کی وجہ سے اس کی اور چوہدری صاحب کی جھڑپ ہو جاتی تھی۔

"کتنی خریداری کروا ڈالی صائمہ بی کو؟" اس وقت بھی صغریٰ بیگم نے چوہدری شوکت کا موڈ دیکھتے ہوئے اپنی جلن نکالنے کی ٹھانی۔

"اری بھلیے لوک۔ کیا خریداری کروانی ہے میں نے انہیں۔ بس جوان کی بیٹی کے نصیب کا ہوگا۔ وہ اسے مل جائے گا۔" چوہدری صاحب نے نرمی سے جواب دیا۔

"اکڑ تو اتنی ہے ان میں۔ ان جیسے لوگوں کی کیا مدد کرتی۔"

"اکڑ... مگر کس بات کی اکڑ۔ میں نے تو ان میں ہمیشہ نرمی و حلاوت ہی دیکھی۔"

"ہاں... ہاں... آپ کو تو نرمی اور حلاوت ہی دکھانی ہے انہوں نے۔ مگر... اتنی عقل تو ہونی چاہیے کہ جب اگلا بندہ تمہاری بیٹی کے لیے اتنا کر رہا ہے تو تم بھی آکر ادھر کا چکر لگا جاؤ۔ میں اکیلی ہلکان ہوتی پھرتی ہوں۔ یہ نہیں کہ کبھی آکر کام کاج میں ہاتھ ہی بٹا دو۔"

"حد کرتی ہو تم بھی۔ جتنا تم کام کاج میں ہلکان ہوتی ہو، میں سب جانتا ہوں۔ کبھی ہل کر پانی تک تو پیا نہیں تم نے۔ اپنے ذاتی کام تک کام والیوں سے کرواتی ہو۔ اور وہ آکر تمہارے کام کیوں کریں۔ وہ کیا ملازمہ ہیں تمہاری اللہ کی راہ میں دیتے وقت تم اپنے کام کروانے کا کیوں سوچتی ہو۔" چوہدری صاحب گرم ہو گئے۔ ان کے سارے موڈ کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ اتنی گھٹیا بات سن کر۔

"اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اس جمعے افشاں کے سسرال والے آ رہے ہیں۔ دن مقرر کرنے سے پہلے وہ ایک چکر لگا کر بچی کا ناپ وغیرہ لینا چاہ رہے ہیں اور سارا انتظام ہماری طرف ہی ہوگا۔ کیونکہ ادھر کا لاؤنج بھی کھلا ہے اور ڈرائنگ روم بھی۔ مہمانوں کے حساب سے بیٹھنے کا اچھا انتظام ہو جائے گا۔ انتظام سارا میں خود دیکھ لوں گا۔ بس تم ذرا اپنا منہ بند رکھنا۔ کوئی بدمزگی نہ ہو۔" چوہدری صاحب کڑے لہجے میں کہتے ہوئے مردان خانے میں چلے گئے۔

صغریٰ بیگم نے سارا غصہ اپنی بچیوں کے سامنے جل کڑھ کر نکالا۔

"امی! آپ اپنی عادتوں کو بدلیں، اللہ تعالیٰ نے بھی صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔" ستارہ نے جو میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی ماں کو سمجھایا۔

"بس کرو تم۔ ایک میں ہی بے وقوف ہوں۔ باقی تم سارے تو بہت عقل مند ہو جیسے۔" صغریٰ بیگم جلتی بھنتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔



مہمان آئے۔ خاصے پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ لڑکے کے والد، والدہ، دو بہنیں اور تائی امی کو ملا کر کل دس افراد تھے۔ چوہدری صاحب نے کھانا باہر سے آرڈر کیا تھا۔ مہمانوں کی اچھی خاصی خاطر تواضع کی گئی۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے جاتے ہوئے ناپ لینے کا کوئی تذکرہ نہ کیا اور خاموشی سے ناپ لیے بغیر ہی رخصت ہو گئے۔ اگلے دن ہی ان کی طرف سے معذرت کر لی گئی۔

صائمہ بی کا تو رو، رو کر برا حال تھا۔ دنیا دکھاوے کو

[illegible]

"صغریٰ! کیا بنے گا میری بچیوں کا۔ ان تینوں کی فکر سے میری راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے۔ سوچا تھا کہ ایک کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ مگر۔۔۔ کیا بنے گا میری بچیوں کا۔"

صائمہ بی نے سسکتے ہوئے کہا۔ صغریٰ بیگم کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اوپری دل سے ہمدردی جتاتی رہیں۔

"تم فکر مت کرو۔ میں پتا کرواؤں گا کہ ان لوگوں کو کیا تکلیف ہوئی ہے۔" شوکت صاحب نے کہا۔

"ارے رہنے دیں آپ۔ یوں ہی خواہ مخواہ۔۔۔ اب بٹی والے ہو کر ہم کیا پتا کرواتے اچھے لگتے ہیں۔ ہماری بچی میں کیا کمی ہے اور جگہ ہوجائے گا رشتہ۔" صغریٰ بیگم نے پریشان ہو کر فوراً" ٹوکا۔ چوہدری صاحب بڑے برہم مزاج کے ساتھ اندر آئے۔

"ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے کلیجے میں صغریٰ بیگم۔"

"کیوں تم کیا ہوا؟"

"اتنی بھولی نہ بنو۔ آج تفصیلی بات ہوئی ہے میری سرفراز احمد سے۔ آج پتا چلا ہے کہ رشتہ ٹوٹنے میں تمہارا ہاتھ تھا۔ تمہاری تنگ دلی کا تو مجھے پتا تھا۔ مگر اتنی کمینی نکلو گی تم۔ یہ مجھے اندازہ نہ تھا۔"

"کیا کہا انہوں نے؟" صغریٰ بیگم نے فق ہوتے چہرے کے ساتھ دوبارہ سوال کیا۔

"کیا ہوا ابو!" ستارہ بھی باپ کا غصہ دیکھ کر ڈر گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ تمہاری ماں نے انہیں کہا کہ یہ لوگ ہمارے گھر کا کام وغیرہ کردیتی ہیں۔ اس لیے ہم اس کی شادی پر اتنا خرچا کررہے ہیں اور یہ کہ ہم اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

شوکت صاحب نے تھوڑا سا وقفہ دے کر بات جاری رکھی۔ "اب سرفراز احمد کہہ رہے ہیں کہ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے رشتے دار ہیں کہ ہمارے ساتھ میری بڑی بھابھی اور دیگر لوگ بھی تھے۔ انہوں نے آکر میرے بیٹے کو بھڑکا دیا ہے اور اب میرا بیٹا رضامند نہیں ہے اس رشتے پر۔ صغریٰ بیگم اب جو میں کروں گا، تم ساری عمر سر پکڑ کر روؤگی۔ بہت سمجھایا تمہیں،

[illegible] چوہدری صاحب سے لال پیلے ہوتے باہر نکل گئے۔



"امی جان' ابا جان کل سے گھر نہیں آئے۔ رات پتا نہیں کس وقت مردان خانے میں آئے یا نہیں۔ کوئی پتا نہیں اور گھر کے اندر تو چکر ہی نہیں لگایا۔" ستارہ نے فکر مندی سے کہا۔

"کل آئے بھی تو بڑے غصے میں۔ دیکھا نہیں کیسے ہاتھ مار کر جاتے جاتے ساری ٹرے کے برتن میز سے نیچے گرا کر گئے تھے۔" چندا نے بھی پریشانی ظاہر کی۔

"ہونہہ سمجھتا ہے میں ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جاؤں گی۔" صغریٰ بیگم نے مزے سے کٹے ہوئے آڑوؤں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ "اب آیا تو میں نے تو منہ ہی نہیں لگانا۔" انہوں نے مزے سے آڑو کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"تو تم بھی کھاؤ' ہر وقت کی ٹینشن نہ لیا کرو۔" انہوں نے پلیٹ بچیوں کی طرف بڑھائی۔

"نہیں دل نہیں چاہ رہا۔" دونوں نے سہولت سے انکار کردیا۔

"دفع ہو تم دونوں۔ تم نے تو پریشان ہو' ہو کر مجھے بھی بیمار کردینا ہے۔ کیا ہوا جو رشتہ ٹوٹ گیا۔ نواب زادی کا اتنا اچھا رشتہ ہوجاتا۔ اس قابل ہیں یہ لوگ' رہنا جھونپڑیوں میں 'خواب محلوں کے۔"

"واہ صغریٰ بیگم واہ۔" شوکت صاحب نے اندر داخل ہو کر کہا۔ ساتھ صائمہ بی بھی تھیں۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگائے ہوئے۔

"تمہاری اسی سوچ کی وجہ سے میں نے آج صائمہ بی سے نکاح کرلیا ہے۔ اب یہ ہمارے اوپر والے پورشن میں رہا کریں گی اپنی بچیوں سمیت۔ اب تم ہماری بچیوں کی شادی میں روڑا اٹکا کر دکھنا۔"

"آپا! میں نے اپنی بچیوں کی وجہ سے مجبور ہو کر ان سے نکاح کرلیا ہے۔ میں اکیلی کہاں ان کے رشتے دیکھتی پھروں گی۔" صائمہ بی اور چوہدری شوکت زینہ طے کرکے اوپر چلے گئے۔



سمیرا حمید

کیسی جیت کیسی مات

ناولٹ

میری فلائٹ لیٹ ہو رہی تھی اور میں ایئرپورٹ پر اپنا سامان گھسیٹتے ہوئے بھاگ رہا تھا کیونکہ بار بار میرے نام کا اعلان ہو رہا تھا۔

"آ رہا ہوں یار!"

میں ایسے چلایا جیسے رن وے پر دوڑتا ہوا جہاز اپنی رفتار دھیمی کرلے گا اور ایئر ہوسٹس دروازے میں لٹک کر کہے گی۔

"تھوڑا تیز بھاگو... ہاتھ دو' ہاتھ دو... ہاں اب بس کود جاؤ۔"

اور میں بس کود گیا۔ کاؤنٹر سے پیپرز چیک کرواتے' تیزی سے پیچھے پلٹتے' خوش بختی سے بد بختی کی طرف...

اس کے بیگ پر... ای ی ی ی...

یہ آواز بیگ پر گرنے کے بعد نکلی تھی۔ اس سے پہلے میں اس لڑکی سے ٹکرایا تھا' جس کے گھونسلا بالوں میں سے اس کی شکل ڈھونڈ کر دیکھنی پڑتی تھی۔ میں لڑکھڑا کر گر گیا' وہ لڑکھڑا کر سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے ہل میں جھونک کر وہ واٹ دا ہیل بڑبڑاتی ہوئی اپنے گھونسلے میں سے متوقع انڈوں یا چوزوں کو تلاش کرنے لگی اور میں وہ آنکھ جو چند سیکنڈ پہلے تک تو سب کچھ صاف دکھا رہی تھی' لیکن اب اس نے ایئرپورٹ ورلڈ کو 'بلڈ ورلڈ میں بدل دیا تھا... ایسا کیوں...؟

کیونکہ میں منہ کے بل کسی ہتھیار پر گرا تھا... یقیناً "کوئی خونی آلہ... یا پھر جنونی آلہ...

اس کا ہینڈ بیگ... اتنا بڑا کہ پورے پانچ کلو آم' ایک کلو برف' چار پلیٹیں اور دس چمچے اس میں آسکتے تھے۔ یہ اندر کی بات تھی۔ باہر کی بات یہ تھی کہ اسے اتنی کیلوں' زنجیروں' شمشیروں سے سجایا گیا تھا کہ اگر وہ بیگ نہ ہوتا تو نیشنل جیو گرافی کی اگلی "قدیم جنگی آلات" سیزن کی پہلی ڈاکومنٹری کا موضوع ہوتا۔

وہ موضوع بنے گا یا نہیں' مگر میں وہاں موجود ہر آنکھ کی بینائی کا موضوع بن گیا تھا۔

"میری آنکھ... مجھے دکھائی نہیں دے رہا... ای ی ی ی..."



جب میں آنکھ مسلتا ہوا' کراہتا' واویلا مچاتا ہوا کھڑا ہوا تو ایک ساتھ کئی لوگوں نے بھی چیخیں ماریں۔

"کیوں؟"

کیونکہ میری آنکھ سے خون نکل رہا تھا اور میں کسی خونی بلا کی طرح' ادھر ادھر جھول رہا تھا۔ نتیجے میں جیسے بھینسا سرخ کپڑا دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے نا' ایسے ہی وہاں موجود سب بچے مجھے دیکھ کر دیوانے مستانے ہو گئے کہ ان کی چیخوں سے ائیرپورٹ اپنی اونچی چھت تک کانوں سے بہرا ہو گیا۔۔۔ اور میں۔۔۔ کانا۔

وہ خون میری آنکھ سے تین دن تک نکلتا رہا۔ میری امریکہ جانے والی فلائٹ مجھے لیے بغیر ہی چلی گئی' کیونکہ میں ائیرپورٹ پر ہی بے ہوش ہو چکا تھا اور مجھے ایمرجنسی میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ میرے گھر والے جن کے ہاتھ "بائے بائے" کرتے ابھی تھمے ہی تھے کہ وہ "ہائے' ہائے" کرتے دہائی دینے لگے۔ میری دادی نے البتہ ہائے ہائے نہیں کیا۔ بے ہوشی سے پہلے انہوں نے بس اتنا کہا۔

"لڑکے کی آنکھ گئی۔۔۔ کانا ہو گیا بس اب یہ۔ اب اسے کون لڑکی دے گا۔"

"کوئی لڑکی دے نہ دے' مجھے بندوق کی گولی ضرور دے کہ میں اس لڑکی کو مار سکوں۔"

جس دن میری آنکھ کی پٹی کھلی اس دن ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"یہ کیا ہے احد؟"

"یہ آپ کے دو ہاتھ ہیں سر۔"

"یہ دو نہیں ایک ہاتھ ہے۔"

دادی اور ضبط نہیں کر سکیں۔ "گئی بس اس کی آنکھ۔"

"دس منٹ آنکھیں بند رکھو احد! پھر دیکھو۔۔۔ اور پرسکون رہو۔۔۔ آپ خاموش رہیں خاتون۔"

"یہ آپ کے چار ہاتھ ہیں ڈاکٹر۔"

پرسکون رہ کر' دس منٹ بعد دیکھا تو دو سروں' چار آنکھوں والا ڈاکٹر میرے سامنے اپنی بیس انگلیاں لہرا رہا تھا۔ کیا میرے کانا ہوتے ہی لوگوں نے دو دو سر لگوا لیے۔۔۔ اتنی ترقی۔۔۔ اتنی جلدی۔۔۔ واللہ۔

ایک ماہ دس دن بعد میں پرانا ہو کر یونی ورسٹی جا سکا۔ ساری دنیا کے مزے مزے کے کارنامے ہو ہو کر بند ہو چکے تھے۔ سینئرز نے جتنا فریشر کو الو بنانا تھا۔ بنا لیا تھا' اب میں الو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

فرسٹ ڈے۔۔۔ فریشر ڈے۔۔۔ یہ دن میرے نصیب میں باسی ہو کر بھی نہیں آیا۔

بائیں آنکھ اندھی ہونے سے بچ گئی تھی' لیکن اس آنکھ سے رات کو کم دکھائی دیتا تھا۔ شروع میں مجھے دو سے تین نظر آتے تھے' علاج کے بعد تین سے چھ ہو گئے۔ قصور پاکستانی ڈاکٹروں کا نہیں تھا' قصور تو اس کیل کا تھا جو میری آنکھ کے عدسے میں لگی تھی اور اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

اس اکیلی آنکھ کے لیے مجھے دوسری آنکھ پر بھی چشمہ چڑھانا پڑا۔ نقصان ایک کا ہوا تھا' سزا دونوں کو ملی تھی۔

عینک۔۔۔ یعنی چشمہ پر پیچ پیچ۔۔۔ چشمہ۔

اب اسے کتنا بھی ڈیسنٹ' شریف' نیک' فیشن ایبل بنا لیا جائے' یعنی آئی گلاسز' ریڈنگ گلاسز' کہہ لیا' مان لیا' منوا لیا۔ لیکن اس کے "تکلیف استعمال" میں کوئی کمی نہیں آئی۔ گول شیشوں کی دو عدد کھڑکیاں' جن کی دھند بار بار صاف کرنی پڑتی ہے اور ناک سے اوپر اٹھا کر رکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ مجھے عادت نہیں تھی تو میں نے ناک کے کنارے پر کرسٹل ٹیپ کا چھوٹا سا گولا بنا کر چپکا لیا تھا' وہاں عینک و ٹکا کر رکھتا تھا۔ عینک تو وہاں ٹکی رہتی تھی' لیکن میری ناک "پھوں پھوں" کرتی تھی۔ کرتی رہے' اب میں کس کس کے ناز نخرے اٹھاؤں۔

"ویسے ہی شکل اماوس کا چاند تھی' اوپر سے یہ دو ٹائر بھی چڑھ گئے۔"

ایک دن دادی نے کہہ دیا۔ دادی کو عادت ہے سچ بولنے کی' وہ اتنا سچ بولتی ہیں کہ ایک دن باتوں ہی باتوں میں اپنی اصل عمر بھی بتا گئیں۔ خاندان کی دوسری دادیوں کے بقول میری دادی تھیں تو ساٹھ سے کہیں

اوپر کی، لیکن بتاتی پھرتی تھیں کہ ابھی تو ساٹھ کا ہونے میں کئی سال ہیں اور اصل میں دادی کے ستر کا ہونے میں صرف ایک سال بچا تھا۔

خیر تو اگلے ہی دن میں نے دونوں کالے ٹائر بدلوا لیے کہ وہ ٹائر کم اور ٹائیگر وڈ کے گولف بال زیادہ لگیں۔

لیکن پھر بھی میں جب جب آئینہ دیکھتا، مجھے یہ احساس ہوتا کہ دو عدد ٹائر، میری آنکھیں کچل رہے ہیں۔ اصولاً تو مجھے اس لڑکی کا سر کچل دینا چاہیے تھا جو اپنے ساتھ ایسا ہٹلرانہ بیگ لے کر گھوم رہی تھی۔

میں حیران ہوں کہ آج کل فیشن کے نام پر ہو کیا کیا رہا ہے۔ اب کیل کانٹوں، زنجیروں سے فیشن کیا جائے گا اور یہ کون سے ڈیزائنر ہیں جو ایسے بیگ بنا کر برانڈ کے نام پر دہشت پھیلا رہے ہیں۔ یا لڑکی خود لوہارنی، اپنے یہ شوق پورے کر رہی ہے۔

میں اس لڑکی سے یہ سب ضرور پوچھوں گا، جب کبھی وہ مجھے نظر آ گئی۔ لیکن چونکہ عموماً "قاتل ہمیشہ روپوش رہتا ہے تو میرا قاتل بھی روپوش تھا اور مقتول کی روح ہمیشہ بے چین رہتی ہے اور ادھر ادھر بھٹکتی ہے تو میری روح کا بھی بس یہی کام تھا۔ عینک کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکنا... ادھر دو سے تین... اور کبھی تین سے چھ سروں والوں کو دیکھنا۔

میرا شیر دل... ایسے مناظر پر بڈی ہو جاتا ہے... تب بھی جب میں خود کو ہی آئینے میں دیکھ لیتا ہوں۔

☆ ☆ ☆

"میں کاؤنٹر سے اپنا ٹکٹ چیک کروا کر پلٹی ہی تھی کہ وہ مجھ سے ٹکرا گیا اور میں گرتے گرتے بچی، لیکن وہ بچتے بچتے گر ہی گیا۔"

"اور اس لڑکے کو کیا ہوا؟"

"جب وہ لڑکا اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا جا رہا تھا تو بابا ریسٹ روم سے میری طرف آتے ہوئے بولے اور کہانی کو اپنی مرضی کا رخ دینے کے لیے میں نے جھوٹ بولنے میں تامل کرنا نالائقی سمجھا۔

"وہ مجھ سے بدتمیزی کر رہا تھا،" میں نے یہ بیگ گھما کر اس کے سر پر دے مارا...“

"کیا واقعی؟" خوشی سے بابا کی آواز کانپنے لگی۔

"اگر سیکیورٹی والے نہ آجاتے تو وہ اسٹریچر پر جانے کے قابل بھی نہ رہتا۔" میں نے اپنی قابلیت کا قابلانہ مظاہرہ کیا۔

"کیا کہہ رہا تھا تم سے...؟"

"الو کا پٹھا... مجھے آواز کیوں نہیں دی۔"

"کیوں دیتی آواز، جبکہ آپ نے ایسے ہی کسی وقت کے لیے مجھے گوریلا ٹریننگ دی ہوئی ہے۔ پھر یہ بیگ بہت کام کا ہے۔"

"فخر کرو اپنے باپ پر شہزادی! اگر میں نے آج تمہیں وہ سب نہ سکھایا ہوتا، تو تم ایسے لفنگوں سے ڈر ڈر کر رہتیں۔"

ڈر ڈر کر منہ بنا بنا کر میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ بابا کو یہ وہم لاحق تھا کہ دنیا کا ہر شخص مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہر شخص 'لچا' ہے 'لفنگا' 'بدمعاش' اور بدذات ہے۔ تو ایسے لفنگوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجھے ٹریننگ دی جانی چاہیے، جو برے وقت میں میرے کام آ سکے۔

برا وقت باہر سے تو مجھ پر کبھی نہیں آیا اور گھر کے اندر کا برا وقت کبھی ٹلا نہیں۔ پہلے مجھے کراٹے سکھایا گیا، پھر باکسنگ... گو بابا کو میرے محمد علی کلے بننے پر پورا یقین تھا اور وہ خواب میں مجھے لیلیٰ علی کے ساتھ مقابلہ کرتے دیکھ بھی چکے تھے، لیکن وہ شہزادی ہی کیا جو محمد علی بن کر لیلیٰ علی کے دانت توڑ ڈالتی۔ میں دو مہینوں میں ہی بابا کے بظاہر سیدھے سادے پنچ کھا کر، ڈھیر ہو گئی اور تین مہینے تک بیماری کا ڈراما بنا وقفے کے جاری رکھا۔ تب کہیں جا کر، لیلیٰ علی ہمارے گھر سے رخصت ہوئیں۔

اب بابا مجھے کچھ ٹرکس سکھانے لگے جن کی مدد سے میں ایمرجنسی میں اپنا دفاع کر سکتی۔ ان ٹرکس میں سب سے سادہ ٹرک یہ تھا کہ کیسے میں بجلی کے تار کو پیچھے سے پکڑ کر کسی کے بھی ناک، کان میں گھسیٹر سکتی ہوں۔ گو یہ ٹرک سکھاتے ہوئے دوبار انہیں اور

پورے چودہ بار مجھے کرنٹ لگ چکا تھا' لیکن میں سیکھوں گی نہیں تو دفاع کیسے کروں گی۔ چھوٹی بڑی چوٹیں تو کھیل کا حصہ ہوتی ہیں۔ گو اس حصے داری میں میرا کچھ زیادہ ہی حصہ نکل آتا تھا لیکن بابا دُھن کے بہت پکے تھے۔

میرے پاس کھیلنے کے لیے وقت نہیں تھا' کیونکہ مجھے سیکھنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ ویسے بابا نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا' مجھے کنگ فو پانڈا بنانے میں' لیکن میں نے بھی ایک کک مار کر نہیں دی۔ آخر وہ سمجھ گئے کہ میں کھوتا تو بن سکتی ہوں' لیکن گوریلا نہیں۔ تو کھوتے نے جب امریکہ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا تو بابا نے بھی امریکن ویزے کے لیے اپلائی کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں میرے ساتھ رہ کر ماحول دیکھنا چاہتے تھے۔

میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ ماحول دیکھنے نہیں' میرے ساتھ وہاں دو سال گزارنے جا رہے ہیں' تاکہ میری نگرانی کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر دفاع۔۔۔

دفاع میں نے ایئر پورٹ پر کر لیا تھا۔ بے چارے کا چہرہ خون سے بھر گیا تھا اور بابا کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"کوئی امریکی تمہیں ہاتھ لگائے تو ایسے ہی منہ توڑ دینا اس کا۔"

"میں ان کے منہ تو نہیں لگوں گی' لیکن میں ان کی ٹانگیں توڑنا پسند کروں گی۔"

گو یہ اتنا آسان تو نہیں تھا' لیکن ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ ایئر پورٹ پر ہوئے حادثے نے بابا کو کچھ کچھ یقین دلا دیا تھا کہ ضرور اس "کھوتے" میں تھوڑا بہت گوریلا جاگ اٹھا ہے۔ اس لیے دو مہینے میرے ساتھ امریکہ رہ کر وہ پاکستان واپس چلے گئے۔ مجھے بابا سے بہت محبت ہے' لیکن میں کیا کروں میں کرنٹ کھا کھا کر تنگ آ چکی ہوں اور ہر بار اس لوہے کے شکنجے میں' میں اپنا ہی ہاتھ پھنسا لیتی ہوں۔ جس میں مجھے کسی لفنگے کی گردن دینی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔

کہاں تک سنیں گے۔۔۔ کہاں تک سناؤں۔۔۔ کہ زخم ہزاروں اور آہیں بڑی ہیں۔

وہ لڑکا میرے لیے لکی تھا۔ دل ہی دل میں' میں نے اس لڑکے کو بہت دعائیں دی تھیں لیکن مجھے ہنسی بھی آتی رہتی تھی۔ قصور میرا نہیں تھا' قصور اس کا بھی نہیں تھا' لیکن فائدہ صرف میرا ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے' جس آنکھ سے خون نکل رہا تھا' وہ آنکھ تو گئی۔ اتنا تو چلتا ہے۔۔۔ کچھ پانے کے لیے کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ ویسے میں اتنی ظالم نہیں ہوں' لیکن کیا کروں؟ میں اپنی سہیلیوں کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے والی وہ واحد بچی ہوتی تھی' جس کے بابا ساتھ ہوتے تھے اور مجھے ہوشیاری سے آس پاس نظر رکھنے کے لیے کہتے رہتے تھے۔ ایک بار تو ثریا کی شادی میں بھی بابا میرے ساتھ ساتھ تھے۔ ایسی دکھیاری بچی اگر اپنی خوشی کے لیے تھوڑی بہت ظالم ہو جاتی ہے تو یہ اس کا حق بنتا ہے۔

یہ بیگ وہ کسی شاپنگ مال سے نہیں بلکہ "بے کار کے مال" کے گودام سے ڈھونڈ کر لائے تھے۔ ویسے تو وہ کیل' کانٹوں' زنجیروں' شمشیروں سے فیض یاب تھا ہی' لیکن سب سے زیادہ حیرت مجھے گھوڑے کی نعل دیکھ کر ہوئی۔

"یہ کیا ہے۔ یہ تو گھوڑے کے پیروں پر نہیں لگتا؟"

"ہاں تو پھر۔۔۔؟ جب یہ کسی لفنگے کے منہ پر لگے گا نا تو اسے دکھائی دینا بند ہو جائے گا۔ سر گھوم جائے گا اس کا۔"

سر گھوم گیا میرا۔ "یہ بیگ آپ کس لوہار' ہتھیار فروش سے بنوا کر لائے ہیں؟"

"بدتمیزی نہ کرو۔۔۔ ٹھیک ہے' یہ تھوڑا اسپیشل ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ فیشن ایبل نہیں ہے۔"

فیشن ایبل تو نہیں' البتہ وہ "قاتل ایبل" ضرور لگ رہا تھا۔ بابا کو نہ جانے کیوں یہ لگتا تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی اپنی ٹانگوں کو ایڑیوں پر گھما کر' کسی کا سر گھما سکتی ہے۔ بھلا مجھ جیسی تنکی سی نازک لڑکی کو ایسے محنتانہ کام کرنا زیب دیتا ہے۔ گو میرے ہاتھ بچپن سے

اب تک کی کنگ فو مشقوں سے مزدورانہ ہو چکے تھے' لیکن میں ابھی بھی خود کو گلاب کی پنکھڑی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

ویسے بھی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر 'حلق پھاڑ کر "مدد' مدد" چلانے میں میرا جاتا ہی کیا تھا اور ابھی دنیا اتنی بھی غیر محفوظ نہیں ہوئی' جتنا خبروں اور فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے بدمعاشوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے' لیکن یہ بھی تو سوچیں ناکہ مجھ جیسے شریف اور معصوم لوگوں کا ایسا بھی کوئی قحط نہیں پڑ گیا۔ ہم اچھے لوگ ابھی بھی میسر ہیں۔

☼ ☼ ☼

کیا ہی اچھا ہو تا کہ اچھے لوگ ایک الگ پلانٹ اور برے لوگ کروڑوں نوری سال کے فاصلے پر کسی گندے سے پلانٹ پر الگ تھلگ رہتے۔ اب ایسا نہیں ہوا تھا اور اچھے اور برے لوگ ایک پلانٹ پر تھے تو.....

یہ جدید کاروں کی نمائش تھی' جس میں ہم سب کلاس فیلوز آئے تھے۔ نہ ہمیں کار لینی تھی' نہ ہمیں کوئی تحقیقی مقالہ تحریر کرنا تھا۔ ہم بس ان ٹاپ ماڈلز کو قریب سے دیکھنے آئے تھے' جو دور سے بھی زندگی میں کبھی دکھائی دینے والی نہیں تھیں۔

بیس منٹ میں' میں نے کل ملا کر سات ٹاپ ماڈلز کو دیکھ لیا تھا اور اکیسویں منٹ پر "ہٹ اینڈ رن گرل" کو.....

وہ... و... وہ... وہ... سامنے وہ کھڑی تھی... میری... ق... ق... قاتل کچھ دور کھڑی وہ ہنس ہنس کر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ بائیں کانی آنکھ پھڑکنے لگی۔

"مجھے رلا کر تم ہنس رہی ہو۔" میں نے آنکھ پیستے ہوئے کہا۔

پتا نہیں یہ میرے بدلے کی آگ کی تپش تھی یا اس لڑکی کی چھٹی ساتویں حس ہی باکمال تھی کہ اس نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کے سر کے پیچھے سے ترچھا

کر کے اپنا سر نکالا' بالوں کے گھونسلے میں چھپے چہرے کو تھوڑا نمایاں کیا اور ابرو اچکا کر مجھے دیکھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ مچل گئی۔

میں جان گیا کہ وہ مجھے جان گئی ہے۔

جیسے میں اسے پہچانتا تھا' وہ بھی مجھے پہچانتی تھی۔

قاتل کو مقتول یاد نہیں ہوگا تو پھر اس کا منہ فٹے منہ ہی ہوگا۔ میں ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔ مجھے اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ رولز رائس کے پاس کھڑی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو ایک طرف ہو جانے کے لیے کہا' شاید وہ خود کو مجھ سے ملاقات کے لیے تیار کر رہی تھی۔ آج اس کے پاس وہ ہتھیار بھی نظر نہیں آرہا تھا' جس سے اس نے مجھ پر وار کیا تھا۔

اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اسپائیڈر مین بن جاتا تو ایک جال اس پر پھینکتا اور اسے چھت کے ساتھ مکھی کی طرح لٹکا دیتا اور کوئی دو سو کروڑ سال اسے وہاں ایسے ہی لٹکا رہنے دیتا۔ لیکن میں "کانا مین" تھا اور مجھے اسے دونوں آنکھوں سے کانا کرنا تھا اور یہ یاد دلانا تھا کہ ایسے ویسے ہتھیار لے کر وہ سفر نہیں کر سکتی۔ اسے یہ اجازت کس نے دی ہے کہ وہ جنگی آلات سے لیس ہو کر میدان میں نکل آئے اور معصوم انسانوں کو زخمی کرے۔ کیا یہ معمولی بات تھی کہ میری آنکھ کی بینائی بس جاتے جاتے بچی تھی اور اب بس اتنی بچی رہ گئی تھی کہ بس میری عزت بال بال بچتی تھی۔ اکثر راتوں کو میں دو' دو سروں والوں کو دیکھ کر خوف سے 'موت کے قریب ہو جاتا تھا۔

تو میں اس کی طرف جا رہا تھا اور بس اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی' لیکن صرف مجھے ہی نہیں دیکھ رہی تھی' پیچھے بھی دیکھ چکی تھی اور پھر ابرو کو سوالیہ اچکا کر۔۔۔ نیچے کی طرف اشارہ کر کے۔ (یہ اشارہ مجھے بعد میں یاد آیا) وہ، بس بھی وہی تھی۔

میں رو ہی تو دیا تھا۔ سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے' لیکن آج بھی زنجیروں کی گول کھمبوں' ڈنڈوں کے ساتھ باندھ کر حد بندی کرنے کا رواج ختم نہیں ہوا۔ میں رولس رائس کار کی حد بندی کی طرف بڑھ رہا تھا اور چونکہ آنکھیں صرف پیشانی کو میسر ہیں اور پیر ان سے مبرا ہیں تو میرے پیر دیکھ نہ سکے کہ وہ "بے پیر" ہونے جا رہے ہیں۔

محبت اندھی ہوتی ہے' سنا تھا۔۔۔ نفرت اس سے زیادہ اندھی ہوتی ہے' اس وقت دیکھ لیا۔

میرے پیر زنجیروں اور کھمبوں میں الجھے اور میں شیشے کی طرح چمکتے صاف شفاف فلور پر' کچھ اڑتا' کچھ مڑتا اور زیادہ تڑ تڑ۔۔۔ ٹوٹتا ہوا منہ کے بل گرا۔

مجھے یاد نہیں پھر کیا ہوا۔۔۔ بس ایک آخری منظر یاد ہے کہ سب کاروں کو چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔

جس آنکھ کی بینائی متاثر ہوئی تھی' اسی آنکھ کے ابرو پر ایک گہرے کٹ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ آنکھ بچ گئی ورنہ پتھر کی تیلی لگوانی پڑتی اور لوگوں کو میری آنکھ کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہنا پڑتا "میں یہاں کھڑا ہوں۔۔۔ تم کہاں دیکھ رہے ہو۔"

"یہیں سامنے ہی تو۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ تم یہاں کھڑے ہو۔"

"میرا کان تو چھوڑو یار۔"

سامنے کے تین دانت' ناک کی ہڈی میں فریکچر اور تھوڑی پر ایک لمبے زخم کے انعام کے ساتھ' وہ لڑکی میری زندگی میں آکر چلی گئی۔ دو ہفتے گردن پر نیک کالر چڑھا کر رکھنا پڑا۔ اسی حالت میں یونیورسٹی جانا پڑا۔

بچپن میں ایک لطیفہ سنا تھا کہ ایک بچے کا بازو فریکچر ہو جاتا ہے تو وہ ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ زخمی بازو پر بینڈیج کرنے کے بجائے دوسرے بازو پر بینڈیج کر دی جائے۔

"پر ایسا کیوں بیٹا! اگر فریکچر بازو پر بینڈیج ہو گی تو آپ کے کلاس فیلوز اس بازو کو ٹچ نہیں کریں گے' ایسے آپ کو درد نہیں ہو گا۔"

"وہ اسے ہی تو ٹچ کریں گے ڈاکٹر صاحب! آپ پلیز دوسرے بازو پر بینڈیج کر دیں۔"

مجھے بھی ڈاکٹر سے کہنا یاد نہیں رہا کہ میری فریکچر گردن پر کالر نہ چڑھائیں بلکہ پیروں یا ٹخنوں پر چڑھا

دیں۔
میری ایک کلاس فیلو نے اسی حالت میں میرے ساتھ ایک سیلفی لینی چاہی۔ ابھی سامنے کے تین دانت لگے نہیں تھے۔ ڈینٹسٹ کا کہنا تھا کہ ٹوٹے ہوئے دانتوں کے زخم ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لیے اوپر کے جبڑے میں تین دانتوں کی آرائش کے لیے مجھے کچھ مہینے صبر سے انتظار کرنا ہو گا۔

میں بے صبرا۔ کم عقل۔ انتظار نہیں کر سکا اور جب لڑکی نے اسمائل کہا تو میں ہنس دیا۔

ہنس دیا... ہر وہ بندہ جس نے سیلفی دیکھی۔

جنگل کی آگ کی طرح وہ سیلفی عام ہوئی۔

دادی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ "آگ لگے ان موئے موبائلوں کو۔"

آگ لگے ان موبائلوں کے صارفین کو... جنہوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔

"ویسے تو تو انسان ہے' لیکن ضرورت پڑنے پر اگر تجھے گدھوں کی جماعت میں دھکیل دیا جائے' تو انہیں کوئی ایسا اعتراض نہیں ہو گا' بلکہ وہ تو خوش ہوں گے کہ گدھا گدھوں میں لوٹ آیا۔" دادی یہ بھی تو ٹھیک کہتی ہیں۔

گدھا بچکانہ حرکتوں سے باز رہا۔ بچکانہ' قاتلانہ' زخمانہ' حادثانہ' آخر میں کیا کر کے دم لوں گا؟ اپنا قتل؟ اپنے مقام' رتبے اور قابلیت کا زبان زد مذاق...



اس کے گرنے کے انداز و بیان پر میں اپنی ہنسی روکنے میں ناکام رہی۔ کیا کرتی' کہتے ہیں کبھی بھی قہقہے اور ہنسی کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیے۔ ورنہ گلے میں خراش ہونے لگتی ہے۔

اسے کئی خراشیں آئی ہوں گی کیونکہ اس کے منہ سے کچھ خون وغیرہ نکل رہا تھا۔ خیر تھوڑا بہت خون کا نکلنا تو چلتا ہی ہے۔ ویسے میں نے خود کو اس کی بھڑاس کے لیے تیار کر لیا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ میرے پاس کیوں آ رہا ہے تاکہ وہ مجھ پر تھوڑا چلا سکے' زیادہ غصہ کر سکے' دس بارہ گالیاں دے سکے وغیرہ وغیرہ۔ ٹشو کو رول بنا کر میں نے کانوں میں ٹھونس لیا تھا تاکہ وہ بولتا رہے تو مجھے غصہ نہ آئے اور بات بڑھ نہ جائے۔

لیکن...

بات وہیں رہی' اس کے زخموں کی تعداد بڑھ گئی۔ سب لوگ اس پر جھک گئے تو میں بھی جھک گئی۔ لیکن وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ کیا وہ اتنا ہی نازک تھا کہ بات بے بات گر جائے۔ میں نے اسے آنکھ سے اشارہ بھی کیا تھا کہ نیچے دیکھ لو' لیکن جب اس نے نہیں دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ اس نے دو آنکھیں پیروں میں لگا رکھی ہیں اور اسے پورا یقین ہے ان کی کارکردگی پر۔

جس وقت اس کے دوست اسے اٹھا کر لے جا رہے تھے' اس وقت میں لیزا کے ساتھ سینما ہال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ لیزا ہی تھی جو مجھے اس بور سی نمائش میں لے آئی تھی۔ بھلا میرا ایسی جگہوں پر کیا کام؟ مجھے کون سی کوئی کاروائی لینی تھی یا کوئی کمپنی کھولنی تھی۔

"وہ لڑکا تمہیں دیکھ رہا تھا۔" مووی دیکھتے ہوئے لیزا نے پوچھا۔

"ہاں... تو؟"

"تو یہ کہ تم اسے جانتی ہو؟"

"نہیں..."

"وہ تمہاری طرف ایسے آ رہا تھا جیسے کوئی پرانا شناسا ہو۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "پرانا حساب کتاب برابر کرنے آ رہا تھا۔"

"بے چارہ کافی زخمی ہو گیا ہے۔ اسپتال جاؤ گی اس کا پتا کرنے؟ میں اس کے ڈپارٹمنٹ کو جانتی ہوں۔"

"ہمیں اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اپنے زخموں کو اکیلے انجوائے کرنے دینا چاہیے۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"انسانیت بھی کسی چیز کا نام نہیں؟"

"یہ چیز اس کے کسی کام کی نہیں ہے۔ تم مووی دیکھو' وہ زندہ ہی ہو گا۔ پھر اتنا ٹائم کہاں ہے لائف میں

کہ ارے غیروں کی خبر گیری کی جائے۔"



ارے غیرے نہیں، میرے اپنے ذاتی تھے جو فلور پر گرتے ہی پاش پاش ہو کر منہ سے جھڑ گئے۔ ابھی میری عمر ہی کیا تھی کہ میرا جبڑا بے دانت ہوتا۔ میں جوان جہان، یونیورسٹی اسٹوڈنٹ، چار بڈھوں کے ساتھ ڈینٹسٹ کے کلینک میں بیٹھا، نقلی دانتوں کو اصلی منہ میں فٹ کروائے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا مجھے یہ سب کرنا تھا؟ فرینڈ کے ساتھ چل (chill) کرنے کی بجائے میں متوقع تکلیف کے خیالات کو کل (kill) کر رہا تھا۔

"دانت بالکل اصلی ہی دکھیں گے نا؟" یہ سوال میں کوئی بیس بار ڈاکٹر کی اسسٹنٹ سے پوچھ چکا تھا۔

"نقلی دانت اصلی کیسے دکھیں گے۔" اکیسویں بار وہ چڑ گئی۔

"مذاق کر رہی ہیں نا آپ۔ اچھا اصلی اور نقلی دانتوں کی میچنگ تو ٹھیک سے ہو جائے گی نا۔" میں نے جبڑا کھول کر اس کے سامنے پیش کیا اور ہاتھ سے "مرحومین کے لواحقین" کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ٹھیک سے میرے اصلی دانت دیکھ لے۔

"پھر آپ ایسا کریں کہ یہ سارے دانت نکلوا کر، نقلی لگوالیں۔ میچنگ کا پرابلم نہیں رہے گا۔"

میں واپس جا کر انکل انٹیوں میں بیٹھ گیا اور ایک درد مند آنٹی ڈھونڈ کر ان سے اپنی مشکل بیان کرنے لگا۔ انہوں نے مجھے کافی تسلی دلاسے دیے لیکن اس دیسی دل کا کیا کیا جائے، جو بار بار مجھے کارٹون گلہری کی یاد دلا رہا تھا۔

"میں ایسا نہیں لگوں گا نا؟ سائز وغیرہ ٹھیک سے لیا ہے نا آپ نے۔"

آخری کوشش کے طور پر میں نے گوگل سے کارٹون گلہری کی تصویریں نکال کر ڈاکٹر کے سامنے پیش کیں۔ چونکہ اوپر کے دانتوں کا معاملہ تھا، وہ بھی سامنے کے تین کا تو میں تھوڑا سا فکر مند تھا۔

"آپ ایسے کیوں لگیں گے یہ تو کافی کیوٹ ہے۔" ڈاکٹر نے گلہری کی طرف اشارہ کیا۔

"تو میں کیا ہوں؟" ڈاکٹر کا سڑا ہوا طنز میرے سینے میں آگ لگا گیا۔

"یہ۔" ڈاکٹر نے چھوٹا سا گول مرر میرے سامنے رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے میں نے سوال پوچھ پوچھ کر ڈاکٹر کا سر کھا لیا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میرا ننھا سا دل ایسے توڑ دیتی۔ آنکھ، ناک، دانت ٹوٹ تو رہے تھے۔"

چیخیں دبا کر میں، دانت لگواتا رہا اور فارغ ہونے کے بعد جب مرر دیکھا تو۔۔۔

تو۔۔۔

تو یہ کہ سب ٹھیک تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار میرے ساتھ کچھ برا ہی ہو۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ سارا بچپن میں لوگوں کے گھر کی گھنٹیاں بجا بجا کر بھاگتا رہا ہوں، کلاس میں بچوں کے لنچ باکس کھاتا رہا ہوں۔ بازار سے دودھ دہی لانے جیسے نیک کام بھی کرتا رہا ہوں۔

تینوں دانت لگ گئے، نیک کالر اتر گیا۔ ٹھوڑی کا زخم بھر گیا لیکن آنکھ کے کنارے کا کٹ جوں کا توں رہا۔ ڈاکٹر سے ملا تو اس نے کہا کہ اسکن سرجری سے ٹھیک ہوگا۔ لاگت پوچھی تو وہ اتنی زیادہ تھی کہ میں گھبرا کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب یا اسکن سرجری کروالی جائے یا اسٹڈی کر لی جائے۔ ایک سگھڑ دوست نے ٹپ دی کہ میں اپنے اسکن شیڈ کی نیل پالش یا اسکن پینٹ کلر لے لوں اور اسے اس کٹ پر لگا لیا کروں ایسے کٹ چھپ جائے گا۔ مجھے یہ مشورہ اچھا لگا اور میں نے اس پر عمل کا سوچ لیا۔

جیسے تیسے میں نے مارکیٹ سے اپنی اسکن سے میچ شیڈ ڈھونڈ نکالا۔ گھر آکر لگایا تو واقعی میرا کٹ چھپ گیا تھا۔ کیسے۔ ایسے کہ صبح تک تو وہ کٹ پھول کر کپا ہو چکا تھا۔ اور کٹ اس غبارے میں غڑپ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"اس پر کیا لگایا ہے؟"

"شاید رات میں کچھ کاٹ گیا ہے۔"

"کیا کاٹ گیا؟ سانپ یا مگرمچھ؟"

"اُف یہ ڈاکٹر بھی نا۔ مزاج کی سمجھ نہیں تو مذاق کرتے ہی کیوں ہو۔ جب ہنسا نہیں سکتے تو رلاتے بھی کیوں ہو۔

ڈاکٹر عجیب نظروں سے مجھے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک سائنسی محلول کا نام لیا کہ یہ اس کے اثرات لگتے ہیں۔ باقی اوپری اسکن کاٹ کر لیبارٹری میں بھیجی جائے گی تو ہی کنفرم ہو گا۔

مجھے نہیں کروانا تھا کچھ کنفرم۔ مجھے نہیں کٹوانی تھی اپنی کھال۔

آدھے گھنٹے تک میں ڈاکٹر کو جھوٹا ثابت کرتا رہا کہ ایسا کچھ نہیں ہے، میں رات کو سویا تو صبح یہ پھولا ہوا زخم ملا۔ جواب میں ڈاکٹر بھی آدھے گھنٹے تک میرا زخم کاٹتا، چھیلتا، ادھیڑتا رہا اور پھر بینڈیج کر دی۔

"دروازے کھڑکیاں بند کر کے سویا کرو۔ ایسا نہ ہوا اگلی بار "شارک یا نیولا" آکر کاٹ لیں۔"

جاتے ہوئے ڈاکٹر نے طنزیہ کہا۔ میں گلہری صفت دانت پیس کر ہنس دیا۔ کیا کرتا، ڈاکٹر کو حقیقت کیسے بتا دیتا۔ جو میں خرید کر لے آیا تھا، وہ اسکن پینٹ نہیں 'فرنیچ اسکریچ پینٹ' تھا۔

تین ہفتے تک بینڈیج ہوتی رہی، جب آخری بینڈیج بھی اتر گئی تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آنکھ گال تک پھیل چکے اس کٹ کو اب میں منہ نہیں لگاؤں گا۔ ویسے بھی تھوڑا بہت بدصورت دکھنے پر کوئی ٹیکس تو نہیں لگتا نا۔ اتنا زیادہ خوب صورت ہو کر میں نے کرنا بھی کیا ہے؟

واش روم کے شیشے پر البتہ میں نے اخبار اس طرح سے لگا رکھا ہے کہ شیو کرتے ہوئے کٹ دکھائی نہیں دیتا۔ باقی گھر کے شیشوں کے ساتھ بھی یہی کیا ہے۔ موبائل کے آئینے کو ڈس ایبل کر دیا ہے۔ میرے فرینڈز کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں اپنا اعتماد ڈگمگانے نہیں دوں گا۔ میں زندگی سے بھرپور ہی رہوں گا اور کبھی یہ نہیں سوچوں گا کہ میرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ میں ابھی بھی خوب صورت ہوں۔

"یہ کس منحوس نے شیشے سے اخبار ہٹایا ہے۔ جبران تو گیا اب۔ تیرے منہ پر ایسے دس کٹ بناؤں گا۔"

اتنا غصہ ٹھیک تو نہیں لیکن انسان ہوں نا، تو ایسے اچانک سے اپنا اصل چہرہ دیکھ کر ڈر سا جاتا ہوں۔ گو آنکھوں سے ٹائز مستقل طور پر ہٹا دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے لینز لگانے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن پھر بھی، وہ جو کٹ ہے نا وہ میرا دل کاٹ دیتا ہے۔

ہائے وریا۔ نیش چھپ اکٹ میرا

م۔ مم۔ کہتے ہیں نا کہ بدبختی آپ کو ڈھونڈتی ہوئی آتی ہے۔ اور کبھی آپ خود اس تک چل کر جاتے ہیں۔

سنڈے کو میں میوزیم گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے ڈائنوسار کے پاس اسے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شکل پر آئن اسٹائنی طاری کیے۔ وہ ڈائنوسار کا مشاہدہ کچھ ایسے کر رہی تھی، جیسے ان کے انڈوں سے اپنے برآمد نہ ہو سکنے کا دکھ انہیں گھور کر منا رہی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ڈائنوسارنیاں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں، لیکن اگر ذرا سا غور کیا جائے تو یہ "ڈراؤنی سارنیاں" ابھی بھی اسی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔

وہ دیکھیں سامنے 'براؤن جیکٹ' اور سرخ لپ اسٹک میں 'ڈیئر سارنی'۔

میں نے دو سیکنڈ سوچا اور پلٹ کر واپس جانے لگا لیکن پھر میری غیرت جاگ اٹھی۔ اتنے نقصان پر بھی مجھے ہی اس سے دور بھاگنا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سب سلامت ہیں، اور میں پیوند لگوا لگوا کر تھک جاؤں۔ پھر بھی میں ہی بھاگوں۔ وہ بھی کانی آنکھ، نقلی دانت اور کیا کٹ چھپا کر۔ ٹھیک ہے کہ یہ لڑکی کوئی اعلا نسل کی منحوس ہو گی لیکن اب زیادہ دیر تک اس کی منحوسیت چلنے والی نہیں تھی۔ سمجھی وہ۔۔۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ قسمت ہمیں بار بار ملوا رہی ہے۔" میں اس

کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

قسمت مجھے بار بار پٹوا رہی تھی۔

وہ میری طرف پلٹی اور اس کے عین پیچھے چھپا ہوا اس کا باڈی گارڈ۔۔ فیانسی۔

وہ طبلے کی طرح کا ساز' میرا مطلب چھوٹا "ڈائنوسار" مجھے پہلے کیوں نہیں نظر آیا۔ بھلا فیانسیوں کے ساتھ میوزیم دیکھنے کون آتا ہے۔ وہ بھی ڈائنوسار' آخر وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی کہ کینڈل لائٹ ڈیٹ کا زمانہ پرانا ہوا' اب ڈائنوسار کی دم کے پاس کھڑے ہو کر محبوب کی آنکھوں میں دیکھا جائے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ سب لڑکیاں گھسی ہوئی جینز پہن کر' گھونسلہ بالوں میں ایک آدھ تنکہ اڑس کر' آنکھوں پر خواہ مخواہ کی سقراطی عینک چڑھا کر' ڈائنوسار دیکھنے جائیں اور کہیں۔

"تمہاری محبت میرے دل میں اس آگ کی طرح دہکتی ہے' جیسے ڈائنوسار کے منہ سے آگ نکلتی ہے۔"

"یہ کون ہے؟" لڑکے کے منہ سے آگ نکل ہی آئی۔

"یہ؟" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"میں مذاق کر رہا تھا۔" حالات سنگین' بلکہ مخدوش ہوتے دیکھ کر میں نے مسکرانے کی پوری کوشش کی۔

"میں مذاق نہیں کرتا۔" اس نے تو مسکرانے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی۔ چیٹنگ ہوئی نا یہ تو پھر۔

"کب سے جانتے ہو شنزا کو؟"

یہی کوئی پانچ چھ۔۔ ما مہینوں۔

میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنے بھاری ہاتھ کو مکے میں بدل کر' اجازت لیے بغیر اس نے میرے منہ پر دے مارا۔ عین ڈائنوسار کی دم کے پاس کھڑے ہو کر' اس نے مجھے کیڑا سمجھ کر' میرا شوربہ ہی تو بنا لینا چاہا۔ بھیڑیا کہیں کا۔

کامیاب رہا۔

شکر ہے میرا پورا چہرہ سلامت رہا' بس۔۔ کان۔۔ وہ اب شائیں شائیں کرتے ہیں۔ سیٹیاں سی بجتی ہیں ان میں۔ شاید میرے کانوں کی کارکردگی بڑھ گئی ہے۔ ایک دو بار میں نے دیواروں سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی کہ شاید میں دیوار کے دوسری طرف کی بات چیت سننے کے لیے لائق ہو چکا ہوں' لیکن بس ہر طرف **سیٹیاں** ہی **سیٹیاں** گونجتی ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ کیا ساری دنیا اب وسل بجانے لگی ہے۔ جب بھی بیمار ہوتا ہوں' دنیا جھٹ پٹ بدل جاتی ہے۔ پہلے دوسروں والی ہو گئی تھی' اب **سیٹیاں** مارنے لگی ہے۔

اکثر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انہیں اپنی بات دہرانی پڑتی ہے۔ جھوٹ بولتے ہیں' میں تو پہلی بار ہی سن لیتا ہوں' بس چند لفظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔

"میرا خون نمبر او پازیٹو' تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" یہ دانت کیوں نکال رہے ہو؟ دفعہ ہو جاؤ' میرے کان کے پاس چلانا بند کرو۔ سن لیا ہے میں نے' بہرا نہیں ہوں میں' سب سنائی دیتا ہے مجھے' دیکھو اب تم ہونٹ ہلا رہے ہو لیکن آواز نہیں نکال رہے۔ مجھے الو سمجھا ہے نا' سب سمجھتا ہوں میں۔"

"لیکن اب سب سنتے نہیں ہو۔ ہاہاہا۔" اس نے میری فائل پر لکھا اور بھاگ گیا۔

جھوٹا' فراڈی مجھے پاگل بناتے ہیں۔ بھلا میری عمر میں بھی کوئی ایسے بہرا ہوتا ہے۔



میرا خیال ہے کہ اب واقعی مجھے رک کر پا ڈھونڈ کر اس لڑکے کا شکریہ ادا کر دینا چاہیے۔ وہ تو واقعی میرے لیے خوش بختی لے کر آتا ہے۔ اس بار اس نے کمال کر دیا۔ میری منگنی ہی تڑوا دی' کتنا خوش بخت انسان ہے وہ۔

جیسے بابا خود تھے' ویسا ہی لڑکا ڈھونڈ کر بابا نے میرا فیانسی بنا دیا۔ دور کی ایک رشتہ دار خالہ نے میرے لیے مطلوبہ رشتہ ڈھونڈا اور بابا نے میری بات زید سے پکی کر دی۔ آن لائن چھوٹی سی تقریب بھی ہو گئی۔ مجھ سے میری مرضی کچھ ایسے پوچھی گئی۔

"دیکھ لیا تم نے زید کو؟"

"جی۔"
"کیسا ہے۔۔؟"
"وہ دراصل۔۔ بابا۔۔ وہ نا۔۔"
"چلو بھئی ٹھیک ہے، واپسی پر شادی ہے تمہاری۔ اس سے تھوڑا تمیز سے پیش آنا۔"
اس سے تھوڑی نہیں بہت زیادہ بدتمیزی سے پیش آنا چاہیے تھا لیکن میں مجبور تھی۔ یہ گوریلا ہر وقت میرے ساتھ سائے کی طرح چپکا رہتا تھا۔ بچوں کی طرح مجھے یونیورسٹی پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔ مجھے دن بھر کیا کیا کرنا ہے، کہاں کہاں جانا اور کس کس سے ملنا ہے، مجھے دو دن پہلے ہی اسے بتا دینے کی ہدایات تھی تاکہ وہ اپنے حساب سے میرا ٹائم ٹیبل سیٹ کر سکے اور میرے ساتھ ساتھ رہ سکے۔
اس کا کہنا تھا کہ وہ یہ سب میری محبت میں کرتا ہے۔ م۔۔ محبت۔۔ اچھا۔۔
اس کی یہ م۔۔ محبت۔۔ میوزم میں 'ڈائنوسار کی دم کے پاس ہی "دم توڑ" گئی۔ اس دم توڑتی محبت کا گلا گھونٹنے کی میں نے پہلے بھی بہت بار کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی تھی۔
"تم نے جراسک پارک نہیں دیکھی؟"
"دیکھی ہے نا۔۔ ٹی وی پر۔" وہ مجھے لنچ پر کسی رومانٹک جگہ لے جانا چاہتا تھا لیکن مجھے تو ڈائنوسار ہی دیکھنا تھا۔
"تو کیا وہاں اڑ کر جانا تھا؟ ساری دنیا نے ٹی وی پر ہی دیکھی ہے۔"
"لیکن میوزیم میں اصل ڈائنوسار بھی تو رکھا ہے۔"
"وہ ڈھانچہ ہے۔ ویسے بھی یہ امریکی ساری دنیا کو الو بناتے ہیں، لکڑی کا بنا ہے وہ کوئی کھدائی ودائی سے نہیں نکلا۔"
"تم بھی تو امریکی ہی ہو۔ تم بھی الو ہو؟ مجھے وہ لکڑی کا بنا ڈھانچہ دیکھ کر خود پر دہشت طاری کرنی ہے۔"
"تم لوگوں کو دہشت سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم مجھے دہشت گرد کہہ رہے ہو؟"
"کہا تو نہیں لیکن تم نے پہلے ہی بمباری شروع کر دی۔"
"تم امریکیوں کو تو بہانہ چاہیے دہشت گرد، دہشت گرد کا راگ الاپنے کا۔ اٹھا کر پھینک کیوں نہیں دیتے ہمیں باہر۔ کیوں گھسنے دیتے ہو امریکا میں؟"
وہ سٹپٹا کر میری شکل دیکھ کر، یو یو کرنے لگا۔ ایسے موقعے پر اس کی امریکی انگلش، فرنچ لبادے اور اٹالین ٹوپی میں لپٹ جاتی تھی۔ ہکلا رہا ہے، گا رہا ہے، گالیاں دے رہا ہے یا پھر ہنستا رہا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔
"تو تمہارا اس کے ساتھ سیکرٹ افیئر چل رہا ہے۔ ہے نا؟"
"ایسا ہوتا تو میری منگنی اسی سے ہوتی۔"
"انکل کبھی اس کے لیے نہیں مانتے۔"
"کیوں؟ تم سے اچھی شکل ہے اس کی۔"
"وہ اچھی شکل میرے ایک مکے سے بچ گئی۔"
"تمہاری بغیر مکے کے ہی پچکی ہوئی ہے۔" میری زبان پھسل گئی۔
وہ دو گھنٹے تک مجھ سے لڑتا رہا۔ بابا کو کال کی۔ سب بتایا۔ میں نے بھی بابا کو روتے ہوئے کال کی اور۔۔۔
"یہاں کے لوگ بہت بولڈ ہوتے ہیں بابا!" اتنا کہا اور بس۔
آفیشلی میری منگنی ٹوٹ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے زید زہر لگتا تھا۔ بس اتنا تھا کہ وہ مجھے زہر سے کم بھی نہیں لگتا تھا۔ میں نے پھولوں کا ایک بکے لیا، ایک چٹ لکھی اور اسے لیزا کے ہاتھ اس خوش بخت انسان کے ہاسٹل بھجوا دیا۔

☆ ☆ ☆

پھول اور وہ چٹ مجھے میرا ہی مذاق اڑاتے ہوئے لگے۔
"تم ایک اچھے لڑکے ہو، اپنا خیال رکھا کرو۔ مجھ

سے دور رہا کرو۔ شنزا۔"
یعنی میں ایک اچھا لڑکا احد... وہ ایک اچھی منحوس لڑکی 'ڈیئر سارہ'... ہونہہ...
دادی اور اماں کے کچھ حکیمی نسخوں سے میرے کان ٹھیک ہونے لگے تھے۔ سیٹیاں کم ہو گئی تھیں۔ گو ابھی بھی کبھی کبھی دغا دے جاتے تھے لیکن مستقل بے وفائی بھی نہیں کرتے تھے۔ چہرے کا زخم بھی دادی کے بتائے 'لیپ' کو چہرے پر تھوپنے سے دھندلا گیا تھا۔ گو اس لیپ کو لگانے کا طریقہ کوئی ایسا آسان نہیں تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ خوب صورتی کے لیے ایک ہزار ایک جتن کرنے پڑتے ہیں۔ بس مجھے ایک ہزار ایک چھوڑ ایک لاکھ ایک جتن کرنے پڑے۔ لیپ زخم پر لگتا تھا لیکن اس کی بدبو سے بچنے کے لیے مجھے ناک میں روئی ٹھونسنی پڑتی تھی۔ روئی ٹھونسنے کی وجہ سے سانس نہیں آتی تھی تو مجھے منہ کھول کر سانس لینا پڑتا تھا۔ پھر بار بار ناک سے روئی نکال کر بدلنی پڑتی تھی۔ وہ دراصل وہ گیلی ہو جاتی تھی نا اور خیر اب کیا کیا بتاؤں۔
میرے فرینڈ کا ماننا تھا کہ رات کے وقت میری سرگرمیاں کچھ مشکوک ہو جاتی ہیں۔ اب انہیں کیا بتاتا کہ رات کو دادی کے بھیجے گئے تیل کو کانوں میں ڈال کر، مجھے جو تھوڑا بہت سنائی دیتا ہے، وہ بھی سنائی دینا بند ہو جاتا ہے۔ لیپ لگا کر، میری اپنی سانس بو سے بند ہونے لگتی ہے تو ان کے دل کی دھڑکن کی گارنٹی کون دے گا۔
ان حکیمی نسخوں سے مجھے فائدہ نہ پہنچ رہا ہوتا تو بخدا نارمل حالات میں کوئی مجھے ایک لاکھ ڈالر بھی دیتا تو بھی میں ان نسخوں کے خنجر کی نوک سے اپنی سانسیں قتل نہ کرتا۔ لیکن سوچتا ہوں کہ لڑکیاں بھی تو اتنا اتنا کچھ کرتی ہیں۔ ایک لڑکی کو دیکھا اس نے گوبر منہ پر تھوپا ہوا تھا۔ میں اتنا متاثر ہوا اتنا متاثر ہوا کہ متاثرین کی فہرست میں سے اپنا نام خارج کروانے کی ٹھان لی۔
ایک دن مجھے پارک میں وہ نظر آ گیا۔ وہ جو شنزا کا فیانسی تھا۔ سوچا پرانی باتیں بھول جانا چاہئیں۔ میں اس کے قریب گیا اور کہا۔
"ہیلو فرینڈ! کیسے ہو؟ اور تمہاری فیانسی شنزا؟"
"شنزا تمہاری فیانسی تھی؟"
قریب سے ہی کہیں دھاڑ کی طرح یہ آواز سنائی دی۔ پانی کے تالاب سے جیسے گینڈا نکل کر آتا ہے، ایسے ہی قریب کے درخت سے ایک گینڈی نکل کر سامنے آئی۔ بخدا میں ڈر کر بدک گیا بھاگ بھی سکتا تھا لیکن مجھے ایسا لگا کہ یہ مقام میرے بھاگنے کا نہیں، بلکہ پچھلے حساب برابر کرنے کا ہے۔
"تم نے تو کہا تھا تم دونوں جسٹ فرینڈ تھے۔"
"اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔
اگر ایسا تھا تو زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے میں میرا کیا جاتا تھا۔
"لیکن تم نے تو کہا تھا، عنقریب تم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو۔ اوہ! تم دونوں کا بریک اپ ہو چکا ہے؟ پر کیسے؟ تم تو اس کے بغیر سانس بھی نہیں لیتے تھے۔"
جو سانس وہ اب لے رہا تھا وہ، وہ آئندہ بھی لیتا رہے گا یا نہیں؟ اس کی گارنٹی اب کون دے سکتا تھا؟
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
اس نے اپنی انگلیوں کو چٹخایا اور ان میں سے چپس کھانے جیسی آوازیں آنے لگیں۔ آتی رہیں، میں بھی کیچپ کو ک لایا تھا۔ ہاہاہا۔
"تم نے ان دونوں کو لاسٹ ٹائم کب ساتھ دیکھا؟"
وہ میری طرف گھومی، میرے بازو پر اپنا بلڈوزر ہاتھ رکھا اور ہلایا۔ ہلایا، بس اتنا کہ میں اگلے تین دن تک اپنا بازو ہلا پایا۔
"لاسٹ سنڈے ٹپ ٹاپ کیفے میں... دونوں کافی خوش تھے۔"
"تم نے تو کہا تھا تم اپنے فرینڈ کے فادر کے جنازے میں جا رہے ہو۔"
وہ کچھ اس انداز سے گرجی کہ پہلے بجلی چمکی۔ پھر بارش برسی اور پھر اولے پڑے۔ یہ بڑے بڑے 'وزنی اولے۔

ڈاکٹر کی بیوی ڈاکٹر' پروفیسر کی بیوی پروفیسر' تو باکسر کی بیوی باکسر کیوں نہیں۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔

مکا اس کے کان کے پاس پڑا ہی تھا کہ اس نے اپنے کڑکڑائے اور میری طرف بھاگا۔ لیکن دیر ہو گئی تھی میں اس سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ چکا تھا۔ وہ بھی دوڑ تک میرے پیچھے بھاگ سکتا تھا اگر پیچھے سے دختر محمد علی نے اس کے ہڈ میں اپنا بلڈوز ہاتھ ڈال کر اسے زمین پر نہ پٹخ دیا ہوتا۔ کیا سمجھا تھا اس نے خود کو' کہ وہ معصوم لڑکیوں کو الو بناتا رہے گا' اور وہ بنتی رہیں گی۔ وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ اب بے وفائی پر چھپ چھپ کر آنسو نہیں بہائے جاتے' بلکہ مکے مار مار کر آنسو نکلوائے جاتے ہیں۔

پارک کے باہر آکر میں نے خوشی سے گہری سانسیں لیں۔

"میرے تو کان سائیں سائیں کرتے تھے نا' تمہاری روح سائیں سائیں کرے گی بچو۔"

جس وقت میں بھاگ کر سڑک پار کر رہا تھا' اس وقت سڑک کے دوسری طرف وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں نے سیٹی ماری تو ٹیکسی کے ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر مجھے دیکھا۔ میں نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا لیکن میڈم نے ہاتھ سے اسے ٹیکسی بھگانے کو کہا۔

"آگے پیچھے دیکھ کر نہیں چل سکتے۔" ایک خاتون میرے کانوں کے پاس آکر چلائیں۔

جب میں اسے دیکھتا ہوں تو بس اسے ہی دیکھتا ہوں' اور ساری دنیا میرا تماشا دیکھتی ہے۔ لیکن کوئی نہیں' جو تماشا آج اندر دیکھ آیا تھا اس پر میرے لگائے ہزار تماشے قربان۔

میں کچھ اتنا خوش تھا کہ رات کو ڈنر کرنے کے لیے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ میز پر جا کر بیٹھا اور آرڈر دیا اور کچھ سیلفیاں لینے لگا۔ پھر اچانک میری سیلفی میں اس کی سیلفی بھی آ گئی۔ وہ عین میری میز کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اکیلی تھی اور آرڈر پر جھکی ہوئی تھی۔

"سنو۔"

کچھ دیر بعد مجھے اپنے پیچھے سے آواز آئی۔ گردن موڑ کر دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ میں جواب کیوں دیتا۔ منہ آگے پھیر لیا۔

"میرا پیچھا کرنا بند کرو' سمجھے۔"

میں نے حیرت سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "مجھے زخمی کرنا بند کرو۔ سمجھیں۔"

"میری خوب صورتی دیکھ کر تو سب زخمی ہو جاتے ہیں۔ سب کے دلوں پر مرہم رکھنے کا میں نے کانٹریکٹ تو نہیں لیا ہوا۔"

"پر سب کو لولا' لنگڑا' اندھا' بہرا کرنے کا کانٹریکٹ جو لیا ہوا ہے۔"

گھونسلے کی شاخیں چہرے پر گرا کر وہ اپنا کھانا کھانے لگی اور میں اپنا۔ جب میں بل دے رہا تھا' تب وہ ٹشو سے اپنا منہ پونچھ رہی تھی اور زیر لب طنزیہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا' اور میں نے قابو میں کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لیکن......

ویٹر کی پوری ٹرے مجھ پر آگری۔

جب میں اسے دیکھتا ہوں' تو کسی اور کو نہیں دیکھتا۔ صرف ٹرے ہی نہیں گری' میرا پیر' میز میں الجھا اور میں اس کے قدموں میں جا گرا۔

"تم بات بے بات گرتے بہت ہو۔ اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے۔"

اپنا خراب ٹشو مجھ پر پھینک کر' مجھے پھلانگ کر وہ چلی گئی۔



وہ پوری طرح سے جاتی نہیں تھی کہ بری طرح سے پھر واپس آجاتی تھی۔

دور سے مجھے ایک لڑکی تیزی سے بھاگتی ہوئی نظر آئی' تو میں نے لفٹ کو وہیں روک لیا تاکہ وہ میڈم بھی لفٹ میں سوار ہو سکے۔ لیکن جیسے ہی وہ ذرا قریب آئی اور میں ذرا صاف طور پر اسے دیکھ سکا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں "اپنی وجہ بربادی" کو لفٹ میں لفٹ دے چکا

تھا۔
اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا' لیکن جیسے ہی لفٹ رکی اور وہ جلدی سے باہر نکلنے لگی تو میں نے اپنا جوتا اس کی ہیل کی راہ میں حائل کر دیا۔ بس اتنا ہی۔۔

اس نے آتش فشاں اگلتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اپنا گھونسلہ منہ پر سے سمیٹا فائل اور بیگ فرش پر سے اٹھائے اور چلی گئی۔

اتفاق سے جہاں جہاں مجھے جانا تھا' وہ بھی وہیں وہیں ہی جا رہی تھی۔ بلکہ جہاں میں بیٹھا تھا' وہ بھی وہیں آ کر بیٹھ گئی تھی' اور ہونٹ سے اپنا خون صاف کرنے لگی تھی۔ اب کہاں اس کے ہونٹ سے نکلنے والے چند قطرے اور کہاں میری آنکھ سے پھوٹ پڑنے والا دریا۔ میرے بدلے کی آگ ٹھنڈی تو نہیں ہوئی تھی لیکن اب ایسی بھڑکی ہوئی بھی نہیں رہی تھی۔

پھر ایک دم سے وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ یقیناً" وہ بھی وہاں جاب انٹرویو کے لیے آئی تھی۔ اب مجھ جیسے لائق فائق اسٹوڈنٹ کو وہاں بیٹھے دیکھا تو مایوس ہو کر میدان ہی چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ شاید۔۔

شاید یہ میری نظروں کا دھوکا تھا۔ یقیناً"۔۔ جب میں آفس میں داخل ہوا تو وہ پرائم چیئر پر بیٹھے یعنی میرے مستقبل کے باس کی کرسی کے عین پیچھے کھڑی تھی۔ خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا' اور میری رگوں میں جم گیا تھا۔ میں نے دروازے سے کرسی تک کا فاصلہ طے کرنا "فضول" سمجھا' اور وہیں سے پیچھے پلٹ گیا۔ آفس سے باہر نکلا' لفٹ میں آیا اور نیچے آ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گو کان اب ٹھیک کام کرنے لگے تھے' لیکن ایسے موقع پر "شائیں شائیں" کرنے لگتے تھے۔

وہ اس کے چچا' ماما' پھوپھا یا والد صاحب تھے' یہ دونوں ہی جانتے ہیں' لیکن میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں' یہ صرف میں جانتا ہوں۔ پہلی جاب ایسے ہاتھ سے چلی گئی۔ اگر میں اپنی ٹانگوں کو ذرا کنٹرول میں رکھتا' تو جاب حاصل کر لیتا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے' یہ سنا تھا۔ لاتوں سے بھوت سر چڑھ آتے ہیں' یہ آج دیکھ لیا۔

اگلی بار وہ مجھے شاپنگ مال میں شاپنگ کرتی ہوئی ملی۔ یہاں نہ اس کا کوئی باس باپ تھا' نہ مجھے کسی جاب کی ضرورت تھی۔ برقی زینے سے میں اسے بہت آرام سے دھکا دے سکتا تھا۔

آرام سے ہی چلتا ہوا میں چپکے سے اس کے عین پیچھے جا کھڑا ہو گیا' اور جیسے ہی آگے کو جھک کر اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دینا چاہا عین اسی وقت وہ دائیں طرف ہو گئی اور میں۔۔ میں بائیں طرف سے فٹ بال کی طرح رول ہوتا ہوا نیچے "گول" ہو گیا۔

"میرا پیچھا کرنا بند کرو۔ سمجھے۔" سر کو میری طرف جھکا کر' وہ غرا کر بولی۔

"امی۔۔ ی ی۔۔" سر کو پیچھے فرش پر گرا کر میں کراہ کر بولا۔



آج اس کے بدلے کی آگ ٹھنڈی ہو جانی چاہیے تھی۔ اس نے مجھے گرا دیا تھا۔ میرے منہ سے خون بہا دیا تھا۔ اسے خوش ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ خوش ہوا بھی۔ اسے مسکراتے ہوئے میں نے دیکھا بھی' اور پھر۔

پھر یہ ہوا کہ مجھے اچانک سے یاد آیا کہ میں کوئی ڈسٹ بن نہیں ہوں جس میں آ کر وہ اپنا غصہ اگل دے۔ میں ہیں ہوں اور مجھے زخمی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی شرمندہ' جو کچھ ایئرپورٹ پر اس کے ساتھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر کاروں کی نمائش میں بھی۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ میری زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہے۔ اسے زخمی کرتے رہنا' زخمی دیکھنا (ویسے مقصد اچھا ہے)

لیزا کے بابا کے آفس میں' میں لیزا کے کہنے پر ایک فائل دینے آئی تھی۔ لیزا کو ضروری کام تھا' وہ نہیں آ سکتی تھی' اس لیے مجھے آنا پڑا۔ فائل دینے کے بعد مجھے اپنے جاب انٹرویو کے لیے بھی جانا تھا۔ اسی افراتفری میں اس نے مجھے گرا دیا تو میں نے بھی اسے

اس کے فیوچر باس کی نظروں میں گرا دیا۔ جو جاب شاید اسے آسانی سے مل سکتی تھی، وہ آسانی سے ہاتھ سے نکل گئی۔

پھر اس نے مجھے برقی زینے سے گرانے کی کوشش کی۔ اگر سن گلاسز میرے ہاتھ میں نہ ہوتے تو میں کبھی نہ دیکھ پاتی کہ وہ میرے پیچھے کھڑا، مجھے دھکا دینے والا ہے۔ دیا یا نہیں دیا، بات تو ایک ہی ہوئی نا۔ اب میری غیرت مجھے اکسا رہی تھی کہ مجھے بھی اسے منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

میں ہدیٰ کو انکار کرنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔ وہ... وہ واحد لڑکی تھی جس نے مجھے کافی کے بعد، ڈنر اور پھر پارٹی پر ساتھ لے جانے کی آفر کی تھی۔ اب مجھ جیسے تقریباً" کانے اور بہرے ہو چکے تھے انسان کے ساتھ اگر وہ سانولی سلونی لڑکی جانا چاہتی تھی تو مجھے ناشکری نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ویسے بھی دو سمسٹرز تک میرے کانوں کی وجہ سے میرا اتنا مذاق بنایا جا چکا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں یہاں سے اچھی ڈگری تو لے جاؤں گا لیکن "زیادہ عزت" نہیں۔ کچھ بدتمیز سے فرینڈ تو ابھی بھی میرے کانوں کے پاس تالی بجا کر بات کرتے تھے۔

"تالی... سماعت اوپن... اپنی بات کی... تالی... کان بند... سماعت بند..."

بہت مشکلوں سے میں نے اپنی سماعتیں کھڑی کی تھیں کہ میں وہ سب سن سکوں جو سامنے والا کہہ رہا ہو۔

"میرے ساتھ پارٹی میں چلو گے؟"

"افطاری میں؟ لیکن ابھی تو رمضان گیا تھا... اتنی جلدی پھر آ گیا۔"

اس کا غصے سے منہ پھول گیا تو میں نے جلدی سے چند ممکنہ فقروں پر غور کیا اور ہنس کر کہا۔

"پارٹی... اچھا پارٹی... ہاں کیوں نہیں۔"

وہ مسکرا دی تو میری سانس بحال ہوا... ہشاش بشاش سا میں پارٹی میں مزے کر رہا تھا کہ...

☆ ☆ ☆

اسے بے فکری سے ایسے ہنستے دیکھ کر پتا نہیں یوں میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ چند دن پہلے اسے جاب سے ناک آؤٹ کروایا تھا اور اب یہ یہاں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اس دن میوزیم میں تم نے مجھے پروپوز کیا تھا... اب آگے کیا پلان ہے؟" میں اس کے پاس آئی۔

"کون ہو تم؟" وہ استہزائیہ ہنس کر پوچھنے لگا۔

"کون ہوں میں؟ اب مجھے بتانا پڑے گا کہ کون ہوں میں۔" وہ مذاق اڑانے لگا تو میں "اس قدر چلائی" تھی کہ سب ہمیں دیکھنے لگے تھے۔

"یہ کون ہے؟" لڑکی نے اس سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کون ہوں میں؟" میں نے اس کا گریبان جھنجوڑتے ہوئے واپس اس سے ہی پوچھا اور پھر جھٹک کر چھوڑ دیا۔ ٹشو سے آنکھیں صاف کیں۔ تھوڑا سوں سوں کیا اور اس کی سمت سے رخ پھیر کر چلنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد مجھے اپنے پیچھے، سوئمنگ پول میں کسی کے شڑاپ گرنے کی آواز سنائی دی۔

پلٹ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں اس کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔

"میری بدقسمتی، میری تکلیف کا موجب..." اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اگر وہ مجھے پسند کرتی ہے تو مجھ سے سیدھی طرح سے آ کر کہے کہ وہ مجھ پر مرمٹی ہے۔ میرے نام پر آہیں بھرتی ہے... ایسے... اتنی ٹھنڈ میں مجھے پانی میں گرا کر اسے کیا ملا... مجھے تو تقریباً" نمونیہ ملا۔ یقیناً" ایک سو تین بخار ملا... فلو اور سپر فلو کا جرثومہ ملا... اسے کیا ملا۔

میں ٹھیک ہو گیا تو اس کے ڈپارٹمنٹ گیا کہ شاید وہ مجھے زخمی کر کے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ ویسے کافی کامیاب رہی تھی۔

"تمہیں مجھ سے محبت تھی تو تمہیں سیدھی طرح

سے کہنا چاہیے تھا۔"

"محبت اور تم۔۔۔ ہا۔۔۔ اپنی شکل آئینے میں دیکھی ہے۔"

"تم نے دیکھنے کے لائق ہی نہیں چھوڑی۔"

"بس جو چھوڑ دی ہے اس پر گزارہ کرو۔۔۔ اور کوئی اپنے جیسا ڈھونڈ لو۔۔۔" گھونسلے میں ہاتھ گھما کر وہ چلی گئی۔

میں بھی چلا آیا۔ دادی ٹھیک کہتی ہیں' میں ان ہی لڑکوں میں سے ہوں جو گھر میں شیر ہوتے ہیں اور باہر کے گیدڑوں سے بھی پٹ جاتے ہیں۔ میں بھی پٹ آیا تھا' چمگادڑ سے۔

"اب وہ سرعام تو تم سے محبت کا اقرار نہیں کر سکتی تھی نا۔۔۔ تم اسے خط لکھو۔" جبران نے کہا۔

"خط؟ اس زمانے میں۔۔۔"

"محبت بھی تو خطوں کے زمانے کا ہی جذبہ ہے نا؟ خط لکھو اور اس کے ہاتھ میں دے کر آؤ۔"

"پوسٹ مین کو نہ دے آؤں؟ یہ نہ ہو جس ہاتھ سے دے کر آؤں وہ ہاتھ۔۔۔ ہاتھ ہی نہ رہے' اسے عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے۔"

"اُف۔۔۔ کتنے بزدل ہو تم۔۔۔"

"اُف۔۔۔ کتنا۔۔۔ ہاں بزدل ہی ہوں۔۔۔ خط کوریئر کر دیتا ہوں۔"

"یار! اس کے ہاسٹل چلے جاؤ نا۔"

"وہاں اس کی فرینڈز بھی ہوں گی۔"

"تو۔۔۔؟"

"وہ سب مل کر میرا مذاق اڑائیں گی۔"

"تو کیا چارلی چپلن ہے جو تیرا مذاق بنائیں گی اور ہنسیں گی۔"

"اگر وہاں کوئی پنجاب کی لڑکی ہوئی اور اس نے جگت ماری دی کہ "جاوے کھوتیا ایس کی چھ ماری او" تو فر۔۔۔؟"

"پھر ہوتا ہے "فر" نہیں۔۔۔ تم اتنا کیوں سوچ رہے ہو؟"

میں رکا اور سوچا کہ ہاں میں اتنا سوچ کیوں رہا ہوں۔

میں نے پین اٹھایا اور خط لکھا اور اس کے ہاسٹل کی سمت چلا آیا۔



جس وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی' اس وقت ہم فرینڈز مل کر ہارر مووی دیکھ رہی تھیں۔ چونکہ ہر لڑکی کو اپنے علاوہ دوسری لڑکی کا کمرہ اچھا لگتا ہے تو ان پندرہ لڑکیوں کو اپنے کمرے کے بجائے میرا کمرہ پسند تھا۔ کچھ یہ وجہ تھی اور زیادہ وجہ یہ تھی کہ جب ان کے کمروں میں کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تھا تو وہ ٹھونسنے کے لیے کسی کے بھی کمرے میں گھس جاتی تھیں۔ آج وہ "کسی" میں تھی۔

جب دستک دی گئی تو سب نے حیرت سے دروازے کی سمت دیکھا کہ یہ ہاسٹل کے اخلاقی اصولوں کی کون دھجیاں اڑا رہا ہے؟ اس طرف کون بدتہذیب' جاہل' عقل سے عاری کھڑا ہے جو دستک دے کر کمرے میں آنا چاہتا ہے؟

وہی جو۔۔۔ اڑے اڑے رنگ لیے دہلیز پر کھڑا تھا۔۔۔ اگر میری دوربین نگاہیں صحیح تھیں تو وہ کانپ بھی رہا تھا۔۔۔

"لیں۔۔۔؟" میں اس کی طرف بڑھی۔

اس نے مجھے اور پھر باقی سب کو دیکھا۔ "سوری۔۔۔ میرا خیال ہے میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔"

وہ غلط جگہ نہیں' غلط وقت پر آیا تھا۔ جو سفید لفافہ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور جس پر میرا نام یہ بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا اور جس کے کنارے پر ایک چھوٹا سا دل بھی بنا ہوا تھا' وہ میرے دائیں بائیں سے جھانکتی' دائیں سے بائیں جھولتی نازنین کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ تو لیٹر نہیں۔۔۔ شاید لو لیٹر؟" لیزا نے جھٹ وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"پتا نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"اس پر پتا نہیں؟ تو لکھنا تھا نا پتا۔" وہ شرارت سے مسکرائی اور باقی سب قہقہوں میں ہنہنائیں۔

"پتا نہیں جی کہ کیسے لکھنا تھا جی۔۔۔"

وہ کچھ اتنی دھیمی آواز سے بڑبڑا رہا تھا کہ پندرہ بیس لڑکیاں ایک دوسرے کو شش کرتیں اس کے منہ کے قریب جھک آئیں۔

"وہ مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے جی۔"

"ہم سے۔" ایلیزا چلائی اور باقی سب بھی۔

وہ چونکا ان سب کو دیکھا اور سرپٹ وہاں سے بھاگا۔

کچھ شور ہونے پر جب ہم سب نے کھڑکیوں سے سر نکال کر نیچے دیکھا تو وہ مین انٹرنس کی سیڑھیوں کے پاس گرا پڑا تھا۔۔۔ ایسا گرتا پڑا۔۔۔ رلتا ملتا۔۔۔ انسان مجھے لیٹر لکھے گا۔۔۔ وہ بھی لو۔۔۔

☆ ☆ ☆

محبت اور وہ بھی اس سے۔۔۔ مجھے ڈوب مرجانا چاہیے تھا۔۔۔ جس لڑکی کی وجہ سے میں کتنی ہی بار مرتے مرتے بچا تھا، میں دل ہی دل اس پر مرمٹا تھا۔۔۔ یہ تو سنا تھا انسان بے غیرت ہوتے ہیں، یہ تحسیں معلوم تھا کہ دل بھی بے غیرت ہوتے ہیں۔ نہ اس دل کے پاس آنکھ کی شرم نہ، ماضی کی کیس ہسٹری پر کشش وپنج۔ یہ سمجھتے کہ وہ دل ہی دل میں مجھ سے محبت کرنے لگی ہے، میں دل ہی دل اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس پر آنے والا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، دھول کی طرح اڑ گیا اور رہ گئی دل کی وہ دھڑکن، جو اس کا نام لینے لگی کہ اب سانس نہیں آتی، اس کی یاد آتی ہے۔

لیکن شہد کی مکھیوں کی طرح شہر کی لڑکیاں بھی کم ڈنک نہیں مارتیں اور انسان ان کے چھتے سے ایسے گھبراتا ہے جیسے گیلے ہاتھ، مین سوئچ کو ہاتھ لگانے سے۔ تو جب میں نے اس کا کمرا شہد کی مکھیوں سے جتا ہوا دیکھا تو میرے دماغ نے الارم بجانا شروع کر دیا اور یہ الارم کچھ اتنی زور سے بجا کہ وہ سب جو میری طرف دیکھ رہی تھیں مجھے دو دو سروں والی دکھائی دینے لگیں۔ پھر وہ دو سے تین اور تین سے چھ سروالی ہوگئیں۔

اتنا ہجوم شہد کی مکھیوں کا۔۔۔ ڈراونی سارنیاں۔۔۔

میں نے تیزی سے وہاں سے نکل جانا چاہا۔۔۔ اتنی تیزی سے کہ میں ڈور میٹ سے الجھ سڑک پر ڈھیر ہوگیا۔ پانچ منٹ بعد ہوش آیا تو وہ سب لڑکیاں مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ تین چار تو سیلفیاں لے رہی تھیں۔

"تو لیٹر لے کر آئے ہو اور ایسے گیدڑوں کی طرح بھاگ رہے ہو۔۔۔ شیر بنو۔"

اتنی ساری شیرنیوں میں تو اصل شیر بھی گیدڑ بن جاتا، میں تو نیچرل گیدڑ تھا۔ (بقول دادی)

ذرا دور مجھے وہ کھڑی نظر آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے اٹھا کر کسی گٹر میں پھینک دے۔ ہاتھ میں پکڑے لیٹر کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے، سڑک پر بچھی میری لاش پر پھینک کر وہ چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس کے ہاتھوں آنکھ، ناک، کان، گردن، ہاتھ، پیر زخمی کروانے کے بعد میں نے دل بھی زخمی کروا ہی لیا تھا تو اب پیچھے کیسے ہٹ سکتا تھا۔

میں ہفتے میں ایک بار اس کے ڈپارٹمنٹ جانے لگا۔ اس سے ہیلو ہائے کرنے کی کوشش کرتا تو وہ منہ بنا کر، تو کبھی پھیر کر چلی جاتی۔۔۔ جاتی ہے تو جائے۔۔۔ میں بھی زیادہ سے زیادہ جانے لگا۔۔۔ اتنا کہ شہد کی مکھیوں نے مجھے چائے، کافی آفر کرنا شروع کر دی۔ میں اس حد تک کامیاب ہوگیا تھا تو میں نے اس سے ہیلو ہائے کرنا ہی چھوڑ دیا۔

اب میں جاتا، اس کی فرینڈز سے باتیں کرتا، اسے اگنور کرتا اور ہنستا مسکراتا ہوا واپس آجاتا۔ میں نے سنا ہے کہ دنیا میں اگنور کرنے سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہوتی۔۔۔ میں اسے یہی سزا دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے لگتا تھا کہ وہ مجھے اگنور کرے گا، مجھ سے ہیلو ہائے نہیں کرے گا تو میں اداس ہوجاؤں گی۔ ڈسٹرب ہو کر چڑچڑی ہوجاؤں گی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔

"شیزا۔۔۔ ایسے ٹیرس پر کیوں بیٹھی ہو؟"

"تو کیسے بیٹھوں؟ چیل کوا تو ہوں نہیں کہ ریلنگ سے جھول جاؤں۔۔۔"

"آج کل تم ہر ایک سے جھگڑنے کیوں لگی ہو؟"

"ہر ایک سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"سارہ، جینی اور۔۔۔"

"ہاں تو مجھے ان کی منحوس شکلیں پسند نہیں۔۔۔ ہر وقت ٹر ٹر کرتی رہتی ہیں۔۔۔ ہر ایک سے باتیں کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔"

"ہر ایک سے تو نہیں، بس وہ احد سے ہی۔ تم بھی اس سے باتیں کرو نا، کیوں ایسے اداس اداس پھرتی رہتی ہو؟"

"اداس ہوں میرے دشمن۔۔۔ زہر لگتا ہے مجھے وہ۔"

"حیرت ہے کل وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"اچھا۔۔۔ تو اس زہر کو اس نے لو لیٹر کیوں لکھا تھا۔"

"وہ تو تم نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا نا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لو لیٹر ہی تھا؟"

"ڈیئر شیزا کے ساتھ ہارٹ بنا تھا۔"

"ڈیئر تو تمہیں میں بھی کہتی ہوں۔۔۔ سویٹ ہارٹ بھی۔ دل، دل بنانے سے کیا ہوتا ہے۔"

"وہ بہت تیار ہو کر آیا تھا۔"

"یہ تو سراسر تمہاری خوش فہمی ہے۔۔۔ ایسا بھی کوئی تیار نہیں تھا وہ۔"

"وہ روز میرے لیے کلاس میں آتا ہے۔۔۔ سمجھیں؟"

"تم ناسمجھی کی باتیں کر رہی ہو۔۔۔ وہ تمہارے لیے آتا تو تم سے بات نہ کرتا؟"

"اس نے کرنے کی کوشش کی تھی، میں نے ہی گھاس نہیں ڈالی۔"

"جواب وہ تمہیں نہیں ڈال رہا اور تم تلملا رہی ہو۔"

"شٹ اپ!"

اس نے مجھ سے ہیلو ہائے کرنا ترک کر دیا تھا تو ٹھیک ہے بھاڑ میں جائے۔



زخموں کا کیا ہے، مرہم لگاؤ ٹھیک ہو ہی جاتے ہیں۔ بس یہ دل کے زخم۔۔۔ یہ دل کے درد۔۔۔ یہ کہاں جاتے ہیں۔۔۔ مجھے لیزا نے بتایا کہ وہ میرا نام بھی سننا پسند نہیں کرتی تو مجھے کچھ دیر کے لیے برا لگا، لیکن عاشق اگر ڈھیٹ نہ ہو تو بس پھر اسے ڈوب مرنا چاہیے۔۔۔

میں تیار ہوا۔۔۔ چاکلیٹس لیں اور اس کے ہاسٹل چلا گیا۔

"کیا لینے آئے ہو یہاں؟" دروازہ کھولتے ہی وہ دھاڑی۔

"لینے نہیں دینے۔" چاکلیٹس آگے کیں۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ سمجھے۔" اترا کر اس نے گردن اٹھائی۔

"تمہیں نہیں لیزا کو۔۔۔ وہ اپنے روم میں نہیں ہے۔ یہاں ہے کیا وہ؟"

"ہاں میں یہیں ہوں۔" ٹیرس سے لیزا چلائی، ہاتھ لہرایا اور مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔

جس وقت میں ٹیرس پر لیزا کے سامنے کرسی پر بیٹھ رہا تھا، اس وقت دروازہ دھاڑ سے بند کر کے وہ باہر کی طرف جا رہی تھی۔ مین ڈور پر رکھے دو گملوں میں سے ایک کو ٹھوکر مارنے کی غلطی کرتے، وہ اپنے پیر کے درد کو چھپاتے، سڑک پر بظاہر لاپروائی سے چل رہی تھی، لیکن میں اور اس کی تین فرینڈز اپنے اپنے کمرے کے ٹیرس پر کھڑے ہو کر دیکھ سکتے تھے کہ۔۔۔

اٹ ہرٹس۔۔۔ کہ آپ کے لیے لو لیٹر لانے والا کسی اور کے لیے چاکلیٹس لے آئے تو۔۔۔ دل کے دو نہیں دو سو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے بیگ سے الجھ کر وہ زخمی ہو سکتا تھا تو مر بھی سکتا تھا، لیکن وہ مرا نہیں بلکہ میرا دل جلانے کے لیے زندہ رہا۔

"یہ اپنی چاکلیٹس اٹھاؤ اور اپنے کمرے میں

جاؤ۔"

"سویٹ ہارٹ! ایک تم بھی لے لو۔"

"تمہارے لیے آئی ہیں' تم کھاؤ۔"

"تو تمہیں یہ افسوس ہے کہ یہ تمہارے لیے نہیں آئیں؟"

"میرے پاس پیسے ہیں۔۔۔ میں مارکیٹ سے لے سکتی ہوں۔"

"مارکیٹ سے سب کچھ مل جاتا ہے۔۔ بس دل نہیں ملتا ڈیر! یہ چاکلیٹس بہت دل سے لائی گئی ہیں۔"

"تو پھر اس دل کو اٹھاؤ اور دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔"

"تمہارا غصہ تو ٹھنڈا ہونے میں نہیں آرہا جب کہ موسم کافی ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ دیکھو' یہ ٹھیک ہے کہ وہ تمہیں لفٹ نہیں کروا رہا' تو اب تم اسے لفٹ دے دو۔"

"اسے الٹا نہ لٹکا دوں۔۔۔ لفٹ میں۔"

"دل ہی دل میں تم اسے پسند کرنے لگی ہو نا؟"

"دل ہی دل میں اسے قتل کرنے کا پلان بنانے لگی ہوں۔"

"محبت سے قتل؟؟ ایسے گھائل کرو گی اسے؟"

"ایسے اسے اپنی زندگی سے فارغ کروں گی۔"

میری ہر دوست جیسے میرے ہی خلاف ہو گئی تھی۔ آئے دن وہ اس کے ساتھ لنچ' کافی اور آؤٹنگ کے لیے جانے لگی تھیں۔ پتا نہیں اس کے پاس کتنا مکھن تھا جو اس نے میری ہر فرینڈ کو لگا دیا تھا اور اب وہ سب "بٹر برگر" بنیں میری آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھیں۔



اس لڑکی کا نام شہزانہ ہوتا تو شرارہ ہوتا۔ میری زندگی کے دامن میں آگ لگا کر' میرے دل کو محبت کی بھٹی میں جھونک کر وہ مجھے زخمی کرنے کے بعد کنگال کرنے پر تلی تھی۔ اس کی فرینڈز کے ساتھ کافی' لنچ بھگتاتے بھگتاتے میری جیبیں خالی ہونے لگی تھیں۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کا منہ اتنی دیر تک پھولا رہے گا کہ میری پھولی ہوئی جیبیں پھس ہونے لگیں گی۔ اب میں ان سے ملنے نہیں بھی جاتا تھا تو وہ خود آجاتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی پروگرام بنا لیتی تھیں۔

"آج کل شہزا بلیک کلر بہت پہن رہی ہے۔" ایک نے کہا۔

"تو؟" میں نے پوچھا۔

"تو یہ کہ یہ اداسی کی نشانی ہے۔ وہ تمہیں مس کر رہی ہے۔"

"مس شہزا مسٹر احد کو مس کر رہی ہے۔" میری خوشی ابھی نوک دل پر تھی کہ۔۔۔

"یہ تم نے کس نفسیاتی جرنل میں پڑھا ہے؟؟" دوسری نے پہلی سے پوچھا۔

"تمہاری ڈائری میں۔"

"شٹ اپ۔"

وہ دونوں آپس میں لڑنے لگیں اور میں اپنے آپ سے کہ کہاں پھنس گیا میں۔ اچھا بھلا سیدھا سادا سا انسان تھا۔ اب نہ بھلا رہا' نہ سیدھا۔۔۔

آہ میری کمر۔۔۔ سردیوں میں درد کرتی ہے' بہت۔۔۔



شہر کے حالات خراب ہو گئے تھے یا ٹی وی والوں نے مجھ جیسی چڑیا دل لڑکیوں کو خوف زدہ کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا کہ ہاسٹل سے نوٹس ملنے لگے کہ رات کو غیر ضروری باہر نہ رہا جائے اور کسی اجنبی پر بھروسا نہ کیا جائے۔ ہفتہ دس دن تو سب نے اتنی زیادہ احتیاط کی' تین لڑکیوں نے معصوم راہ گیروں کی ہیلوں سے پٹائی' دھلائی' صفائی کر دی اور دو نے اپنی جان کے بچاؤ کے لیے ممکنہ حد تک کچھ اتنی بلند و بالا چیخیں ماریں کہ بلند و بالا عمارتیں تک ہل کر رہ گئیں۔

اب جب سے ایسی خبریں آرہی تھیں تو مجھے بھی وارڈ روب میں پھینکا گیا بابا کا دیا اپنا بیگ نکال لینا پڑا۔ ایک اسپرے کی بوتل لی' واش روم میں تین زبانوں میں ہیلپ ہیلپ کی چیخوں کی مشق کی۔۔۔ فر۔۔۔ میرا مطلب

پھر کمرے میں اپنی چیخوں کی عمدگی اور فریکونسی کا دائرہ کار چیک کیا اور پورے تین منٹ تک حلق پھاڑ کر چلاتی رہی، لیکن کوئی بھی لڑکی کمرے سے نکل کر میرے کمرے کی طرف نہیں آئی۔

کیا میں گونگی چیخیں مار رہی تھی....

"کیوں، ہم لڑکیوں کا نام ڈبونے پر تلی ہو.... تمہاری نازک چیخیں صرف پانچویں فلور تک جاسکتی ہیں، کیا وجہ ہے کہ یہ ساتویں فلور کی سرزمین سے دور رہی ہیں۔"

سینے پر ہاتھ باندھے، آنکھوں پر چشمہ لگائے، ہاسٹل کی سب سے پڑھاکو چینی لڑکی میرے سامنے کھڑی، میرے شان میں رطب اللسان تھی۔

وجہ تو میں خود نہیں جانتی تھی شاید کمزوری ہوگئی تھی۔ اماں نے کتنی بار کہا کہ دیسی گھی کھایا کرو، طاقت آئے گی، لیکن میں نے بھی کھا کر نہیں دیا۔

"اگر کوئی چھپکلی، چوہا یا کاکروچ دیکھ ہی لیا ہے تو سارے جنگل کو اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس جنگل میں ایسا کوئی ٹارزن نہیں رہتا جو تمہیں ان دلوسکل، خونخوار جانوروں کے چنگل سے آزاد کروائے۔ کوشش کرکے تم خود ہی کیوں نہیں شیر بن جاتیں؟"

"شیر....؟؟"

"شیرنی بن کر گرج رہی ہو نا.... تو شیر بھی بن جاؤ.... کیا مشکل ہے؟"

مشکل یہ تھی کہ میں اندر سے کافی ڈر گئی تھی۔ بابا ٹھیک کہتے تھے، ہنر کوئی بھی ہو، کبھی نہ کبھی کام آہی جاتا ہے۔ میں نے بھی لاتیں، گھونسے مارنے کا ہنر سیکھ لیا ہوتا تو آج کام آتا۔

خاص کر اس رات جس رات بارش بھی ہو رہی تھی، بادل بھی گرج رہے تھے اور دل بھی خوف سے بیٹھا جارہا تھا اور اپنے عین پیچھے چلتا ہوا سیریل کلر بھی سامنے سائے کی صورت دکھائی دے رہا تھا کہ اپنے بیگ کے اسٹریپ میں ہاتھ ڈال کر میں پلٹی اور جتنی بھی طاقت، خوف کے ہاتھوں بچی رہ گئی تھی اسے زور بازو میں لاکر پیچھے والے کو ہٹ کیا اور....



اور جیسے الاسٹک کو دو افراد پکڑ کر کھینچیں اور پھر ایک چھوڑ دے تو اس کے سیریل کلر بیگ کو پکڑ کر میں نے جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ بادل زور سے گرجے، بجلی چمکی اور وہ دھڑام سے زمین پر جاگری۔ اس کا اپنا ہی بیگ اس کے منہ پر غلیل کی طرح لگا۔

گو بادل گرج رہے تھے، لیکن بخدا اس کی چیخیں ان سب پر سبقت لے جاچکی تھیں۔ گرنے سے، بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے کچھ اس انداز میں ہیلپ ہیلپ کہا کہ سنگین سچویشن کے باوجود میں خود کو قہقہہ لگانے سے روک نہیں پایا۔ یہ لڑکیاں بھی نا، پتا نہیں کون کون سی زبانیں سیکھ لیتی ہیں اور پھر خوف میں ساری زبانوں کو مکس کردیتی ہیں۔ انگلش، اردو، فرنچ، میں اس نے جو کہا تھا اس پر شہر کی عوام کو ہنسایا تو جاسکتا تھا، مدد کے لیے بلایا نہیں۔

وہ بے ہوش ہوچکی تھی۔ گرنے کی وجہ سے ٹانگ کی ہڈی تڑوا بیٹھی تھی۔ ایسا اس کا کہنا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا البتہ یہ تھا کہ اس کی ٹانگ ٹھیک ہے، لیکن وہ بضد تھی کہ ایکسرے وغیرہ کو اس کی ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی دکھائی نہیں دے رہی۔ وہ چلتی ہے تو "کیرچ کیرچ" کی آوازیں آتی ہیں۔ اب ایکسرے مشینیں اتنی ایڈوانس نہیں ہوئیں کہ کیرچ کیرچ کی آوازوں کا پتا لگاتیں۔ شاید اس کے کہنے کا مطلب تھا کہ کوئی بونا شونا اس کی ٹانگ کی ہڈی میں بیٹھا چپس کھا رہا ہے، جو ڈاکٹروں کی بے کار سی مشینوں کو دکھائی نہیں دے رہا۔

مجھے دکھائی دے رہا تھا.... کہ.... وہ کتنی بڑی ڈرامے باز ہے.... لیکن پھر بھی میں دو دن اس کی عیادت کے لیے جاتا رہا۔



جب وہ دو دن عیادت کے لیے آسکتا تھا تو ہفتے میں ایک بار تیس منٹ یا تیس سیکنڈ کے لیے نہیں آسکتا تھا؟ وہ اتنا خود غرض ہے اسی لیے میں اسے پسند نہیں کرتی۔ یعنی وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے کہ میں خود اپنی

وجہ سے زخمی ہوئی اور جو اس نے کالا کوٹ اور ہیٹ پہنا ہوا تھا اور پھر وہ میرے عین پیچھے کیا کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بھی جیب میں تھا۔ یقیناً" اس کے ارادے نیک نہیں تھے اور اگر نیک تھے ہی تو وہ پھر میری عیادت کے لیے کیوں نہیں آیا؟ پوائنٹ ہے یا نہیں؟

"آج بھی کوئی نہیں آیا؟"

ایک تو یہ منحوس لیزا کی عادت ہے 'کیلنڈر کے سامنے کھڑے ہو کر دائرے بنا بنا کر اپوئنٹ لکھنے کی۔ تین تاریخ پر اس نے "شنز اٹریجڈی 'کیرٹچ کیرٹچ" لکھا ہوا ہے اور سات تاریخ سے پندرہ تک "وہ آج بھی نہیں آیا" لکھا ہوا ہے۔

"میں تمہارے غلیظ چہرے پر تیزاب پھینک دوں گی لیزا!"

"کچھ تیزاب ماؤتھ واش کے طور پر بھی یوز (استعمال) کرلینا۔ اتنی گندی دوائیوں کی بدبو آتی ہے کہ جیسے ہی منہ کھولتی ہو' ناک بند کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے کچھ اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارنا چاہا' لیکن سامان تو میسر تھا لیکن "ہاتھ" نہیں۔ دونوں ہاتھ کہنی تک پلستر میں تھے۔ اگر بارش نہ ہو رہی ہوتی اور میں نے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو کر خود کو پیچھے نہ گرا دیا ہوتا تو ہاتھ زخموں سے آزاد ہوتے۔

"یہ تمہارے لیے پھول آئے ہیں۔" جینی کمرے میں آئی۔

"کون دے کر گیا ہے؟"

لیزا نے چٹ پکڑی اور پڑھنے لگی۔ پھر بکے میرے سرہانے رکھ دیا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ پندرہ دن بعد یاد آیا تھا پھول بھیجنا۔ ہونہہ۔

"ڈسٹ بن میں پھینک دو انہیں۔"

"اچھا... لیکن کیوں؟"

"مجھے نہیں چاہیے اس منحوس انسان کے بھیجے ہوئے پھول۔"

"کس انسان کے؟"

"احد کے"

"یہ احد نے نہیں... تمہاری جم انسٹرکٹر نے بھیجے ہیں۔"

دیکھا' کیسا خود غرض انسان ہے وہ۔ میری بے عزتی پر بے عزتی کروا رہا ہے۔ وہ دونوں ہنس رہی ہیں اور میں بس رو دینے کو ہوں۔



یونیورسٹی کے باغ سے پھول توڑ کر بکے ضرور بنایا' لیکن اسے گلاس میں ڈال کر' کھڑکی کے پاس رکھ کر' کافی کے مگ اور کھلی کتاب کے ساتھ اپنی تصویر لے کر فیس بک پر پوسٹ کر دیا۔

ویسے میں اپنی کینگی پر دل ہی دل کافی خوش تھا اور کیوں خوش نہ ہوتا' کتنا رویا' کراہا' زخمایا گیا تھا میں۔ صرف اسی کی وجہ سے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہر روز پانچ ڈالر خرچ کر کے' بکے لے کر اس کے پاس جاتا اور اس کے پھولے ہوئے منہ کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے گلدان میں لگا دیتا۔ اس مہنگائی کے دور میں' اتنی بڑی قربانی کون دیتا ہے۔ محبت اپنی جگہ' لیکن بچت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ویسے بھی میں ایسی محبت کے حق میں نہیں جو آپ کو کنگال کر دے۔ اگر وہ کھڑکی میں بیٹھ کر میری آمد کا انتظار کرتی ہے تو پھر کیا ہوا۔ میں نے بھی تو ڈینٹسٹ کے پاس بیٹھ کر اپنے آدھے ٹوٹے دانت کی جڑ نکلنے کا انتظار چلا چلا کر کیا تھا اور پھر ایئرپورٹ کے پاکستانی ڈاکٹر نے تو مجھے سن کیے بغیر ہی سلائی کیا تھا کہ میں بس سن سن سنسنا ہی تو گیا تھا۔

کتنا کچھ سہا تھا میں نے..... اور وہ..... کھڑکی کے پاس بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے..... وہ بھی گردن تانے' منہ پھلائے' انا سے دماغ بھرے۔ اس کی فرینڈز نے مجھے پھولوں والی بات سنائی تو میں بے اختیار ہنس دیا۔ پتا نہیں یہ لڑکیاں اتنی حسد کیوں کرتی ہیں۔ ناک کو اوپر اٹھا کر رکھتی ہیں کہ ناک' ناک نہیں رہتی مسٹر بین کی ناک میں بدل جاتی ہے۔

میں نے اس کے لیے ایمبولینس بلوائی' اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروایا۔ اس کے روم میں اس کا

حال چال پوچھنے گیا، پھر بھی اس کا منہ پھولا رہا جب کہ وہ مجھے ائیر پورٹ پر اور پھر کاروں کی نمائش پر اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اسی لیے میرا ماننا ہے کہ مرد کا ظرف بڑا ہوتا ہے۔ وہ معاف کر دیتا ہے اور دوستی کا ہاتھ آگے بڑھا دیتا ہے۔



جس وقت مجھے ایمبولینس میں بٹھایا جا رہا تھا اور میں تکلیف کی شدت سے کراہ رہی تھی تو وہ منہ چھپا کر ہنس رہا تھا۔ اتنا چھوٹا ظرف ہے اس کا۔ جس وقت مجھے روم میں شفٹ کیا گیا، اس وقت وہ نرس سے گپیں لڑا رہا تھا، کافی اور برگر کھا رہا تھا۔ میں میڈیسن اور ڈرپ پر آگئی تھی اور وہ جیب سے چاکلیٹ نکال کر کھاتے ہوئے، کھڑکی میں کھڑا، سہانی بارش کو انجوائے کر رہا تھا۔ جیسے پاکستان میں تو کبھی بارش ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ تو صحرا میں رہتا رہا تھا۔ گرجتے چمکتے بادل، ٹپ ٹپ پڑتی بوندیں اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ عامر خان کی طرح وہ تو کرکٹ کھیل کھیل کر تھک گیا تھا، لیکن ساون تھا کہ آکر نہیں برس رہا تھا۔

"ویسے تم گریں کیسے؟"

مجھے گرا کر وہ پوچھ رہا تھا۔ اور۔۔۔ اور زیر لب ہنس رہا تھا۔ میرا ہونٹ تھوڑا سا زخمی تھا، بینڈیج لگی تھی، ڈاکٹر نے بات کرنے سے منع کیا تھا۔۔۔ ورنہ میں آواز سے ہی نہیں، انداز سے بھی بتاتی کہ میں کیسے گرائی گئی تھی۔

"رات دس بجے، تم مسٹر مائیکل کی شاپ پر سموسے پکوڑے لینے گئی تھیں؟ یا سموسے لے لیے تھے، لیکن چٹنی لینا بھول گئی تھیں؟"

"میں اس کی چٹنی کرنا کیسے بھولوں گی اب۔"

کھڑکی سے اپنا "نظارہ برسات" موخر کر کے وہ میرے بیڈ کے پاس آیا۔

"عجیب ہو تم لڑکیاں، ایمرجنسی میں بھی کہیں جانا ہو تو ہیل پہننا نہیں بھولتیں، مسکارا، کاجل، لپ گلوز۔۔۔ میچنگ کوٹ، شرگ۔۔۔ اتنا کچھ یاد رکھا تھا تو یہ بھی یاد رکھ لیتیں کہ گرتے ہوئے اپنا توازن کیسے سنبھالتے ہیں۔ اگر تم سڑک پر گرتی تو شاید اتنی زخمی نہ ہوتیں، لیکن تم سڑک اور فٹ پاتھ پر آدھی آدھی گریں۔۔۔ اور۔۔۔ پھر میری شکل دیکھتے ہی تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ کیوں اتنا بوکھلا جاتی ہو؟ ٹھیک ہے میں بہت ہینڈسم ہوں، مجھے اتنا نقصان پہنچانے کے باوجود تم میری خوب صورتی کا کچھ زیادہ نہیں بگاڑ سکیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنا احساس کمتری، ایسے بوکھلا کر ظاہر کرو۔۔۔

اور وہ تمہارا بیگ۔۔۔ کل ملا کر یہی کوئی سولہ بینڈیج لگی ہیں تمہارے منہ پر۔۔۔ جب وہ خنجر اور تلواریں تمہاری کھال میں گھسی ہوں گی تب تمہیں معلوم ہوا ہوگا کہ لاہور کا ائیر پورٹ میری چیخوں سے کیوں گونج اٹھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے گردن موڑ کر تمہیں دیکھا تھا تو تم شانے اچکا اچکا کر گارڈ کو لاپروائی سے کچھ بتا رہی تھیں اور بار بار اپنی نیل پالش چیک کر رہی تھیں۔

میں نیل پالش تو نہیں لگاتا، ورنہ میں بھی تمہارے گرنے پر یہی سب کرتا، لیکن میں بہت زیادہ رحم دل انسان ہوں۔ تمہاری طرح میں وہاں تمہیں اکیلا چھوڑ کر بھی جا سکتا تھا، لیکن میں تمہیں اسپتال تک لایا۔ اب اتنا کچھ کر لیا ہے تو یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے ڈیوز بھی بھروں گا اور وہ چیخیں۔۔۔ کیا برانڈڈ چیخیں مارتی ہو یار تم۔۔۔ مہنگی ہوں گی کافی؟ ہے نا۔۔۔ لمیٹڈ ایڈیشن ہوگا ان کا یا پھر ڈاؤن لوڈ کی تھیں۔۔۔ کسی ویب سائٹ سے یا کسی بل میں منہ دے کر۔۔۔؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دفعان ہو جانے کے لیے کہا، لیکن وہ کھڑکی میں کھڑا بارش دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد باہر گیا اور ایک کپ کافی اور لے آیا۔ اگر میرے ہاتھ پیر سلامت ہوتے اور مجھ پر غنودگی طاری نہ ہو رہی ہوتی تو میں اس پر غشی طاری کر دیتی۔ ٹھیک ہے میں وہ سب نہیں سیکھ سکی تھی جو بابا نے سکھانا چاہا تھا، لیکن ایسی گئی گزری بھی نہیں رہی تھی کہ اسے مزا نہ چکھا سکتی۔

☼ ☼ ☼

میری زندگی ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی کہ میں اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر' ایک پھول ہونٹوں میں دبا کر' اسے دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی ہونے کا احساس دلاتا رہتا۔ ہاں البتہ اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزر کر' لیزا کو آواز دے کر' میں کلاس کے لیے ضرور بلایا کرتا تھا۔

بیمار لوگوں سے جو دوائیوں کی بو آتی ہے نا' وہ مجھے بہت ناگوار گزرتی ہے۔ پھر وہ تو بیمار شیرنی تھی۔ اس کے چمکتے ہوئے پنجے مجھے نیچے اتنی دور سے بھی نظر آجاتے تھے۔

"اس کی آنکھوں کی گرمی' مجھے جھلسا رہی ہے۔"
آنکھ دبا کر میں نے لیزا سے کہا۔

ایک بار تو ایک موٹی سی فائل عین میرے سر سے کچھ انچ دور جا گری۔ سر اٹھا کر دیکھا تو کھڑکی بند ہو چکی تھی۔ میں زیر لب ہنس دیا تو وہ مجھے زخمی کر کے اپنی فرینڈز سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ کتنی معصوم اور بھولی تھی نا وہ۔

اگلی بار فائل کی جگہ ایک چھوٹا سا گملا آیا۔ جسے میں نے کیچ کر لیا۔ جو بھی تھا' مجھے اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ میں نے گملے کو عزت سے اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھا اور اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ پانچویں بار دستک پر بھی "کم ان" نہیں کہا گیا تو میں خود ہی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

بیڈ پر نیم دراز وہ کتاب پڑھ رہی تھی... دکھا تو وہ یہی رہی تھی۔

"یہ گملا تم نے مجھ پر پھینکا ہے؟"

میں اس کے عین سامنے جا کر کھڑا ہو گیا' لیکن اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یعنی وہ بہت زیادہ خفا تھی۔ دادی کہتی ہیں لڑکیوں کے دل چڑیا جیسے ہوتے ہیں۔ ننھے دل' بے چارے دل۔ گو اس چڑیا دل نے مجھ شیر دل کو کافی نقصان پہنچایا تھا' لیکن پھر بھی میں اس وقت یہ مان گیا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا چکی ہیں اور وہ آنسو مجھ سے چھپانے کی کوشش میں سر نہیں اٹھا رہی۔

"گملا مار کر اپنی یاد دلانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی اتنی دور اوپر سے۔ ایسی حالت میں تم اٹھیں' ٹیرس تک گئیں' گملا اٹھایا' کتنی تکلیف ہوئی ہو گی نا۔ اچھا چلو یہ لو گملا۔ سامنے سے مار لو۔"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ آنکھیں تو اس کی خشک ہی تھیں' لیکن یقیناً "چڑیا دل رو رہا ہو گا۔

"ہاں یہ لو۔ اگر تمہاری خوشی مجھے زخمی کرنے میں ہی ہے تو' ہو جاؤ خوش۔"

وہ ہو گئی خوش۔ اس نے اپنی خوشی پوری کر لی اور... اور شیر دل چلا اٹھا' امی...

☼ ☼ ☼

اور گملا میں نے اس کے سر پر دے مارا۔ اب ایک انسان ایسے درخواست کر رہا ہے' منت تک کرنے پر آگیا ہے تو کیا میرا یہ فرض نہیں بنتا تھا کہ میں اس منگتے کی منت کو پورا کروں۔ گملا چھوٹا تھا' لیکن پتھر کا تھا... جب اس کے سر پر پڑا تو گملا سلامت رہا' لیکن اس کا سر... وہ صرف سر نہ رہا۔

☼ ☼ ☼

سر سر نہ رہا اور سر قلم ہی ہو گیا۔ مجھے تو پھر سے سیدھا سیدھا ڈوب مرجانا چاہیے نا۔ جب ایئرپورٹ سے زخم کھانے شروع کر دیے تھے تو آگے کیسے دلار ملتا؟ دادی ٹھیک کہتی ہیں' گھر سے کھا کر نکلو تو آگے بھی کھانا ملتا۔ ایئرپورٹ پر شمشیریں ملی تھیں تو یہاں گملا کیوں نہ ملتا؟

"تم سے کس نے کہا تھا کہ تم گملا اس کے حضور پیش کرو اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ کہ آؤ شہزادی' کرو میرا قیمہ۔"

"مجھے کیا پتا تھا' وہ مار ہی دے گی۔"

"اب پتا چل گیا نا۔ اب جان چھوڑ دے اس ریڈ بیلٹ کی۔ اس سے پہلے کہ تیرا جسم تیری جان چھوڑ دے۔"

"منہ اچھا نہ ہو تو بات اچھی کر لیتے ہیں۔"
سامنے والے کا سر ایسا گومڑ و گومڑ و ہوا ہو تو بات بھی اسپرٹ' پیناڈول جیسی ہی نکلتی ہے۔ اب تو نہیں جائے گا اس کے پاس؟"

میں کیوں جاتا اس کے پاس؟ ایک اور گملا کھانے؟ ایک اور گومڑ لینے۔ وہ خود کو کیا سمجھ رہی تھی کہ جب وہ سو کر اٹھتی ہے اور کھڑکی میں آتی ہے تو نیچے اس کے دیوانے دھکم پیل کر رہے ہوتے ہیں یا جب وہ سن گلاسز لگا کر' سر کو تھوڑا سا اٹھا کر سڑک پر چلتی ہے تو ٹریفک جام کر دیتی ہے؟ ورنہ اپنی ایک تصویر پوسٹ کرنے کی دیر ہوتی ہے اور سوشل میڈیا پر پکڑ دھکڑ مچ جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسے تو فرمائش پر بھی سبزی کے ساتھ دھنیا مفت نہیں ملتا ہو گا۔ سبزی والے بھی اسے ہاتھ پر چپت مار کر بھگا دیتے ہوں گے۔

وہ سمجھتی کیا ہے خود کو؟ ہونہہ۔۔۔

☼ ☼ ☼

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب میں نے گملا اس کی فرمائش پر اس کے سر پر دے مارا تو میری فرینڈز سمیت وہ خود بھی کیوں منہ سجا کر بیٹھا ہے۔ میرا قصور ہی کیا ہے؟ میں نے آج تک اسے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جو کچھ ہوا' جب ہوا' وہ اتفاق سے ہوا۔ جتنے بھی حادثے ہوئے' وہ اتفاق رائے' یعنی بغیر جانے بوجھے ہوئے۔ پھر بھی میری فرینڈز مجھے ذلیل کرتی ہیں۔ طنز کرتی ہیں۔

مجبوراً مجھے اس سے سوری کہنا پڑا۔ پھولوں کے ساتھ میں نے اسے سوری لکھ کر بھیج دیا۔ گو یہ سوری میرے دل پر کسی بوجھ کی طرح پڑا رہا' لیکن کچھ کام دل پر پتھر رکھ کر کرنے ہی پڑتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

پھر سے سر پر گومڑ پڑا ہوا اور پھر سوری آئے۔۔۔ پھولوں کے ساتھ۔۔۔ چار ہفتے اور تین دن کے بعد۔۔۔ پیشانی پر گومڑ بیٹھ چکا تھا' لیکن ایسے گم گشتہ سوری کی آمد پر وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجھے غیرت دلائی۔ "خبردار جو یہ سوری قبول کیا تو۔"

اگلے ہی دن کوریئر سے میں نے پھول اور سوری اسے واپس بھجوا دیا۔

"دوبارہ اپنی شکل نہ دکھانا۔۔۔ کسی بھی ذریعے سے۔"

اس کے سوری کے نیچے میں نے لکھ دیا۔ ٹھیک ہے مجنوں نے بھاگ بھاگ کر لیلیٰ کے لیے صحرا پار کیا ہو گا' فرہاد نے نہر نکالی ہو گی' رانجھے نے چاکری کی ہو گی' لیکن ہم یہ سب کیوں کریں؟ وہ سب تو دیوانے تھے' مجھے کیا ضرورت تھی خواہ مخواہ اتنا مستانے کی۔

اگلے دن اس کا رقعہ موصول ہو گیا۔

"پھول کیوں واپس کیے؟ پیسے دو ان پھولوں کے؟ اور کوریئر سروس کے بھی۔"

اب ایسی لڑکی کے لیے میں کیا دودھ کی نہر نکالوں' جو مجھ سے پائی پائی کا حساب لے رہی تھی۔

میں نے پیسے دے دیے' لیکن پیسے بھی واپس آ گئے۔

"یہ کم ہیں' پورے کر کے دو۔"

"بل بھیج دو۔"

اس نے رسیدیں بھیج دیں۔ یہی کوئی آدھا ڈالر کم تھا۔ وہ آدھا ڈالر پورا کر کے میں نے بھیج دیا۔

"زیادہ پیسوں کی شو مارنے کی ضرورت نہیں شوخے۔ امیر ہو گئے تو اپنے گھر' یہ رکھو اپنے بقایا پیسے۔"

"پچاس سینٹ میرے منہ پر مارنے کے لیے' پانچ ڈالر بس کے کرایہ جتنا پیدل چل کر آئی ہو۔"

"ہاں۔۔۔ عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"عزت نفس اتنی ہی پیاری ہے تو پھولوں کے پیسے کیوں لیے؟ میں نے کہا تھا مجھے پھول بھیجو۔"

"مگر بھیج دیے تھے تو کسی گملے میں لگا لیتے۔۔۔ واپس کیوں بھیجے۔۔۔ اب بھگتو۔"

"دو سال سے تمہارے ستم بھگت تو رہا ہوں۔ پتا نہیں کس کا منہ دیکھ کر ایئرپورٹ کے لیے نکلا تھا کہ

آفتیں، بلائیں، چڑیلیں۔۔۔ یعنی جھمیلے ختم ہونے میں ہی نہیں آرہے۔"

"تو کس نے کہا تھا اپنی شکل دیکھ کر نکلو۔ بات کو زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ کیا میں سمجھتی نہیں۔ یہ ٹرکس اب پرانی ہو چکی ہیں۔"

"تو جو نیا ہے وہ کر لیتا ہوں۔ وہ سامنے دیکھ رہی ہو، اسے دروازہ کہتے ہیں۔"

"یہ میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو، اسے بیگ کہتے ہیں۔"

ہاں اب وہ اپنا بیگ ہمہ وقت لے کر گھومتی ہے۔ میں کوئی ڈرا تو نہیں تھا لیکن بس میں نے لڑائی کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی لڑکیوں سے کیا لڑنا۔ آخر ایک دن سب کی طرح وہ بھی مر ہی جائیں گی۔ بلکہ شاید کچھ پہلے ہی مر جائیں۔ مرنے والوں سے کیسی دشمنی۔



"تم بدھو ہو یا دیوانے؟"

"میں تو بس سیانا ہوں۔ کیوں؟"

"کیوں کہ تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے کہ وہ تمہیں پچاس سینٹ واپس کرنے نہیں آئی تھی۔"

"وہ یہی واپس کرنے آئی تھی۔ اس نے ایسے میرے سامنے پھینکے۔۔۔ ایسے۔۔۔ سچی۔"

"اور سچ جاننے والے جھوٹے! وہ جو بار بار پیسے لینے، پیسے دینے آرہی تھی تو وہ دراصل پیسوں کے لیے نہیں تمہارے لیے آرہی تھی۔۔۔ تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے۔"

میں اتنی سی بات کیسے سمجھتا! جب میرے سر پر، میرے دماغ کے قرب و جوار میں ارفع و اعلا اقسام کی نادر و نایاب چوٹیں لگ چکی تھیں تو میں کیسے سمجھتا۔

"تمہارا مطلب ہے وہ مجھ سے ملنے آرہی تھی۔"

جبران نے اپنی فائل میرے سر پر دے ماری، اور چلا گیا۔ میں بھی چلا گیا۔ اس کے ہاسٹل۔۔۔ شام تھی اور سناٹا بھی۔ وہ شاید ابھی ابھی یونیورسٹی سے واپس آئی تھی۔ ٹیرس پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اب چونکہ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا، اور کافی ہوتی بھی گرم ہے تو میں واپس لوٹ آیا۔ جبران کا کیا ہے، کچھ بھی سمجھ لیتا ہے۔

رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ اس کی یاد میں نہیں، بلکہ ان کراہوں سے جو وہ مجھے دیتی رہی تھی۔

اگلے دن میں اس کی کلاس میں گیا اور پچاس سینٹ کا سکہ اس کے سامنے دے مارا۔

"یہ پکڑو، یہ چل نہیں رہا۔"

"چلے گا کیسے۔۔۔ اس کے پیر ہی نہیں ہیں۔"

"کیوں اسے بھی تم نے لنگڑا کیا ہے؟"

وہ سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "یا اپنے الفاظ بدل لو یا انداز، سمجھے! مجھے عادت نہیں ایسے لہجے سننے کی۔"

"مجھے تو بہت عادت تھی نا، تلواریں اور گھوڑے کے نعل کھانے کی۔"

"وہ تمہارا نصیب تھا۔"

"وہ میرا نصیب تھا۔۔۔ تو تم بھی بن جاؤ۔"

موٹی سی کتاب کو اس نے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ گو میں ڈرا نہیں لیکن ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔۔۔ چار قدم۔۔۔ چھ۔۔۔

"یہ پچاس سینٹ لو اور بدل کے دو۔" یہی کوئی اس سے دس قدم دور ہو کر میں نے کہا۔

اس نے سکے کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور بیگ میں رکھا اور نیا سکہ نکال کر ٹیبل پر زور سے دے مارا۔

"یہ لو اور دوبارہ اپنی شکل نہ دکھانا۔"

مجھے کیا ضرورت تھی اسے دوبارہ اپنی شکل دکھانے کی۔ میں نے اپنا سکہ لیا اور۔۔۔ اور۔۔۔



ابھی وہ کلاس سے باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے تیزی سے سکہ بیگ سے واپس باہر نکالا۔ مجھے ایک دم سے یاد آیا کہ اس میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔ سکے کے ایک

طرف شنزا اور دوسری طرف احد لکھا تھا۔ جب میں تیزی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی گئی تو وہ کچھ گنگنا رہا تھا اور میرے دیے سکے کو ہوا میں اچھال رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے سکہ اس کے سامنے کیا۔

"شنزا اور احد..... میں نے اس پر ہم دونوں کا نام لکھ دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میرا تو دور دور تک کوئی عظیم کارنامہ سر انجام دینے کا پروگرام نہیں کہ میرا نام کسی سکے پر کندہ ہو۔ تمہارا ارادہ ہوا بھی تو بھی تمہارے نصیب میں یہ سب نہیں ہوگا۔ اس لیے لکھ دیا۔"

اب کوئی انسان آگے سے ایسے فلسفے جھاڑے تو کوئی کیا کرے۔



وہ اتنے غصے میں چلتی ہوئی میرے پاس آئی تھی کہ میں چاہ کر بھی نہیں کہہ سکا کہ لوگ پرپوز کرتے ہیں تو انگوٹھی دیتے ہیں، میں سکہ دے رہا ہوں۔ وہ بھی پچاس سینٹ کا..... وہ بھی امریکی..... وہ بھی امریکا میں کھڑے ہو کر.....

"بس کیا کروں، بچپن میں، مجھے چڑیا کا روسٹ کھانے کا بہت شوق تھا۔ کھایا بھی تھا..... اسی لیے..... بس..... میرا دل....."

"سنو شنزا!" میں نے کچھ اتنی بلند آواز سے کہا کہ سب چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ کچھ دور اس کی فرینڈز بھی کھڑی تھیں۔ وہ زیر لب مسکرادیں۔

"کیا ہے۔" مس شنزا پلٹ کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"اس سکے پر میں نے ہمارا نام اس لیے لکھا تھا کیونکہ میرے پاس رنگ خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا تم پاگل ہو۔" کچھ دیر بعد وہ یہی کہہ سکی۔

"ہاں..... ہو تو چکا ہوں۔ جب سے تمہارے ہاتھوں زخمی ہونے لگا ہوں۔"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور تھوڑا سا جھک گیا۔ مجھے دیکھ کر سب ہنس دیے۔

"بند کرو اپنا یہ ڈراما۔"

"ٹھیک ہے ڈراما بند کر دیتا ہوں۔ فلم شروع کر دیتا ہوں۔ ہیروئن بنو گی میری؟" میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا، تھوڑا سا لہرایا اور مسکرا دیا۔

"تم ولن تو بن سکتے ہو لیکن ہیرو نہیں۔" اس نے اپنی مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ سکے کو اس نے اپنی ہتھیلی پر رکھا، اور پھر مٹھی بند کر لی۔

"بدلے میں تم مجھے اپنا وہ بیگ دے دو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" چار قدم دور سے ہی اس نے اپنا بیگ پوری قوت سے میری طرف اچھال دیا..... اور..... اور.....

میں بچ گیا، ضروری نہیں کہ ہر بار میرے ساتھ سب برا ہی ہو۔ جو اچھا تھا وہ میرے سامنے کھڑا تھا، اور جو برا تھا وہ میرے بازو سے لٹک رہا تھا۔

"جیسے میں یہ سکہ سنبھال کر رکھوں گی تم بھی اس بیگ کو سنبھال کر رکھنا۔"

اس کی آواز اتنی نرم بھی ہو سکتی تھی، مجھے آج پتا چلا تھا، لیکن اسے یہ نہیں پتا چل پائے گا کہ اس بیگ کی قسمت میں کیا لکھا جائے گا۔ اب یا اس سے اپنے زخموں کا بدلہ لے لوں یا یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھ لوں؟ آپ کیا کہتے ہیں؟



سرورق کی شخصیت

ماڈل ..... ندا علوی

میک اپ ..... سلیک بائی عینی

فوٹو گرافی ..... ایم۔ کاشف

ہاں کہو کہ عید ہو

فریدہ سیفی

"میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔" حمدان نے آنکھوں میں اشتیاق بھر کے سوال کیا تھا۔

"بکواس۔" پلوشہ نے فوراً جواب دیا تو وہ احتجاجاً رخ موڑ گیا۔

پلوشہ نے اسے دیکھا۔ دراز قد وجیہہ 'ہنڈسم۔ ایک مرد کی مردانہ وجاہت کو بیان کرنے کے لیے جس



قدر الفاظ ڈکشنری میں موجود ہیں وہ ان سب کے مطابق تھا۔

"کیا برائی کیا خرابی ہے مجھ میں؟" اب وہ پلٹ کر پھر پوچھ رہا تھا۔

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔" پلوشہ نے اپنے شہد رنگ بالوں کی ڈھیلی ہوتی پونی کو دوبارہ کس کر باندھا۔

حمدان نے ایک ماہر وکیل کی طرح خرابیوں کی تفصیل نہیں پوچھی اور اپنے حق میں دلائل دینے شروع کر دیے۔

"جو بے شمار پلس پوائنٹس ہیں، تم ان پر غور کیوں نہیں کرتیں۔ نمبر ایک میں تمہارے چچا کا بیٹا ہوں یعنی ہمارا خاندان ایک ہے۔ ذات برادری کا کوئی مسئلہ نہیں۔ نمبر دو، میں اکلوتا ہوں یعنی فیملی چھوٹی ہے۔ نمبر تین، میں اسی گھر کے اوپر والے پورشن میں رہتا ہوں، تمہیں شادی کے بعد اپنے ماں باپ سے دور نہیں جانا پڑے گا نمبر چار...."

"بس بس...." پلوشہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا تھا۔

"یہی تمہارے نیگیٹو پوائنٹس ہیں۔ نمبر ایک تم میرے چچا کے بیٹے ہو اور میں کزن میرجز کے خلاف ہوں۔ خواہ مخواہ کی پرابلمز۔ نمبر دو تم اکلوتے ہو۔ میں بھی اکلوتی ہوں، ساری عمر میں تنہا رہی ہوں۔ اب میں کسی بڑی فیملی میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ نمبر تین شادی کے بعد بھی اگر میری لائف چینج نہیں ہونی اور میں نے یہیں رہنا ہے تو کیا فائدہ ایسی شادی کا اور نمبر چار سب سے اہم بات میرا اور تمہارا مزاج نہیں ملتا۔ پسند ناپسند نہیں ملتی۔"

"اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ تم ہر وقت جلتے توے پر بیٹھی انگارے چباتی رہتی ہو۔ اور میں ایک خوش مزاج انسان ہوں تم اصل چیز ہوتی ہے محبت اور وہ میں تم سے کرتا ہوں۔" حمدان نے کندھے اچکا کر اپنے ہی انداز میں اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"میں سڑیل ہوں تو تم کس خوشی میں میرے پیچھے پڑے ہو۔" پلوشہ کو حسب معمول غصہ آگیا۔ "نہیں کرتی میں تم سے شادی۔ بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ پاؤں پٹختی واک آؤٹ کر گئی تھی۔

"دونوں مل کے جائیں گے.... ہنی مون پر۔" حمدان نے پیچھے سے بلند آواز میں اسے چڑایا اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"یہ دل بھی کیا چیز ہے۔ ذلیل کروا کے رکھ دیتا ہے۔" اس نے خود کو کوسا۔ "کیا ہے آخر اس پلوشہ میں جو مجھے یہ اس قدر اچھی لگتی ہے۔ بس بڑی بڑی آنکھیں جنہیں دیکھتے ہی ان میں ڈوبنے کو دل چاہتا ہے۔ سویٹ سی چھوٹی سی ناک جسے چڑھا کے جب وہ بولتی ہے تو خواہ مخواہ ہی اس پر پیار آجاتا ہے۔ گالوں میں پڑنے والے ڈمپل جو جان نکالنے کو کافی ہیں۔" وہ سوچتے سوچتے پٹڑی سے اترنے لگا تھا۔



چچی کی وفات تب ہوئی تھی جب حمدان ایف ایس سی میں تھا۔ کافی عرصے تک تو سعید چچا اور حمدان اس ناگہانی موت سے سنبھلے ہی نہیں اور جب حالات کچھ معمول پر آئے تو سب جاننے والے اور رشتہ داروں نے سعید صاحب پر دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کر لیں حتیٰ کہ حمدان کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

وہ ایک عملی سوچ رکھنے والا سمجھ دار لڑکا تھا، جانتا تھا کہ باپ کو سہارے اور ساتھی کی ضرورت ہے اس لیے فضول جذباتی پن دکھانے کے بجائے اس نے ہر حال میں سعید صاحب کو اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا لیکن سعید صاحب کا دل چچی کی وفات کے بعد ذکر الٰہی کی طرف مائل ہو چکا تھا۔

چنانچہ اب کافی عرصے سے صورت حال یہ تھی کہ آفس کے اوقات کو نکال کر باقی کا سارا وقت سعید چچا اور حمدان سعید نیچے حمید صاحب کے پورشن میں ہی گزارتے تھے۔ ان حالات میں جبکہ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا اچانک حمدان سعید کو پلوشہ حمید سے محبت ہو گئی۔ اب اگر وہ اپنے طور پر صرف محبت کرتا رہتا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ اللہ کا بندہ اس

محبت تو کبھی شکل دینے کے لیے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔ اور گھر میں سب بڑے اس کی اس خواہش پر دل و جان سے راضی تھے سوائے پلوشہ کے۔

وہ ایک خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ جسے شادی کے لیے ناولوں والا ہیرو چاہیے تھا۔ وہ ہیرو جو چپکے چپکے ہیروئن کی سالگرہ مناتا ہے۔ کھانے پکا کر اس کے سامنے رکھتا ہے اور کسی بچے کی مانند ہیروئن کے سب لاڈ اور ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ ایسے ہیرو کی آمد کا انتظار کرنا چاہتی تھی لیکن حمدان نے سب کچھ چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ پہلے بھی اسے کچھ خاص نہیں بھاتا تھا لیکن اب تو اسے دیکھتے ہی پلوشہ کو آگ لگ جاتی تھی۔ وہ تو بھلا ہو حمید صاحب کا جنہوں نے اس رشتے کے لیے پلوشہ کی مرضی کی شرط رکھ دی تھی ورنہ رضوانہ بیگم کا بس چلتا تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کر کے پلوشہ کو اوپر والے پورشن میں بھیج دیتیں۔



"مما! چاند نظر آگیا ہے۔ کل پہلا روزہ ہوگا۔" پلوشہ نے کچن میں داخل ہو کر ماں کو اطلاع دی تھی۔

"چلو اللہ مبارک کرے۔" رضوانہ بیگم نے روٹی بیلتے ہوئے بیٹی کو دیکھا۔ "تم مان جاؤ تو اس عید پر تمہاری اور حمدان کی منگنی کر دیں گے۔"

"افوہ مما!" وہ بری طرح جھنجلائی تھی۔ "آپ سب تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ یہ بتائیں پکایا کیا ہے۔" اس نے آگے بڑھ کر پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا اور چٹخارہ لیا۔ "واؤ! کریلے گوشت۔"

رضوانہ بیگم نے آخری روٹی توے سے اتار کر دسترخوان میں لپیٹی۔ "تم کھانا پکاؤ۔"

"تائی! کریلے پکائے ہیں آج آپ نے۔" حمدان کی آواز پر پلوشہ نے چونک کر دیکھا وہ وہیں کھڑا پانی پی رہا تھا اور اب کریلوں کے بارے میں سن کر برے برے منہ بنا رہا تھا۔

"ارے!" رضوانہ بیگم پیار سے بولیں۔ "میں نے اپنے بیٹے کے لیے الگ سے گوشت نکال لیا تھا۔"

"اوہ! میری گریٹ تائی۔ آئی لو یو۔" وہ ہنستا مسکراتا کچن سے نکل گیا تھا۔

"مان جاؤ ناں وشی، دیکھو کتنا پیارا لڑکا ہے۔" رضوانہ بیگم نے پلوشہ سے کہا۔

"مما میں ساری زندگی دو دو سالن نہیں پکا سکتی۔" اس نے پلیٹیں نکالنا شروع کیں۔

"جب پیار ہو گا تو دو دو سالن بھی پک جائیں گے اور کریلے گوشت میں سے گوشت الگ کرنا تو بہت آسان ہے بیٹا۔" رضوانہ بیگم ہنسیں۔

"پیار ہی تو نہیں ہے مما!" وہ کچن سے باہر نکل گئی۔

"وہ بھی ہو جائے گا۔" حمدان باہر ہی کھڑا تھا۔ "تم ایک بار ہاں تو کرو۔"

"حمدان تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔" وہ جھنجلائی۔

"تم صفائی پسند ہو ناں اس لیے۔" اس نے دانت نکالے۔

"افوہ۔" وہ پاؤں پٹختی ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی۔



رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اب روزمرہ کے معمولات میں عبادات کے اوقات بڑھ گئے تھے۔

اسٹڈی کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے حمدان نے ٹھٹک کر دیکھا۔ پلوشہ جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا دودھیا چہرہ دمک رہا تھا وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

"تمہاری ساری دعائیں قبول ہو چکی ہیں پلوشہ!" وہ دروازے سے ٹیک لگائے وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔

"کیا مطلب۔" پلوشہ نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ ایک بہت اچھا، پیارا اور ہینڈسم

انسان تمہاری قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔"
"تم کتنے خود پسند ہو حمدان۔" پلوشہ نے طنز کیا۔
"یعنی۔" وہ ایک لمحے کے لیے رک کر شرارت سے مسکرایا۔ "تم یہ مانتی ہو کہ وہ بہت اچھا پیارا اور ہینڈسم انسان میں ہی ہوں۔"
"حمدان! میری ابھی تراویح رہتی ہیں۔" وہ تنگ کر بولی۔ "اور تم بھی کچھ اس رمضان کے مہینے میں عبادت کرلو تو شاید تمہاری قسمت بھی سنور جائے۔"
"مشکل ہے۔ میرے نصیب میں تو ایک جھگڑالو' نک چڑھی لڑکی لکھی جا چکی ہے۔ بس اس کے ساتھ رہ کے صبر شکر کروں گا اور سیدھا جنت میں جاؤں گا۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔
"میں مانوں گی تب ناں!" وہ حسب معمول بپھر گئی تھی۔ "نہیں کرنی میں نے تم سے شادی۔ جاؤ یہاں سے۔" اس نے اٹھ کر دوبارہ نیت باندھنا چاہی۔ حمدان کا قہقہہ بے ساختہ تھا بڑی مشکل سے ہنسی روک کر بولا۔
"یعنی تم یہ مانتی ہو کہ وہ جھگڑالو اور نک چڑھی لڑکی تم ہو۔" نماز پڑھتے ہوئے بھی پلوشہ کے ماتھے کے بل واضح تھے۔



گھر میں سب ہی روزہ رکھتے تھے۔ چچا' بابا اور حمدان تو روزہ رکھ کر اپنے آفس چلے جاتے۔ گھر میں رضوانہ بیگم اور پلوشہ ہی رہ جاتیں۔ رضوانہ بیگم کی خصوصی تاکید تھی کہ روزے کے اوقات کو فضول کاموں میں ضائع کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ ذکر' تلاوت اور عبادت میں گزارا جائے چنانچہ دن تو اسی مشغولیت میں گزر جاتا۔
افطاری کے بعد بھی برتن دھونے' کچن سمیٹنے کے علاوہ مغرب اور عشا کی نماز و تراویح کے دوران کسی اور چیز کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ انہی مصروف دنوں میں پلوشہ کو عید کی شاپنگ یاد آگئی تو اس نے ماں کو بھی یاد دلانا ضروری سمجھا اور اس کے لیے مناسب ترین وقت افطاری کے بعد کا تھا۔
"حمدان گھر پر ہی ہے' اس کے ساتھ چلی جاؤ بازار۔" مما نے فوراً مسئلہ حل کر دیا۔
"آپ نہیں چلیں گی؟" پلوشہ نے پوچھا۔
"نہیں بھئی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں تو بس تراویح کے بعد سونے کے لیے لیٹوں گی۔ سحری کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے۔"
"اچھا۔" پلوشہ خاموش ہو گئی۔
"اب کس سوچ میں گم ہو گئی ہو۔" رضوانہ بیگم نے ڈپٹا۔ "ابھی چلی جاؤ عشا واپس آکر پڑھ لینا۔"
"اُفوہ مما۔ آپ تو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے لگ جاتی ہیں۔ چلی جاؤں گی پھر کسی دن۔" وہ سستی سے بولی۔
"پلوشہ! جوں جوں دن گزرتے جائیں گے دکانوں پر رش بڑھتا جائے گا۔ آج تمہارا موڈ نہیں ہے کل حمدان گھر پر نہیں ہوگا بہتر ہے آج ہی یہ کام نپٹالو۔" انہوں نے سمجھایا۔
"بس آپ کو یاد کیا دلا دیا آپ بھی مجھے بھیج کے ہی دم لیں گی۔" وہ منہ بنا کے اٹھ گئی تھی۔ اور اب وہ ایک مشہور زمانہ مارکیٹ کی دکانوں میں گھوم رہی تھی اور اتنی مغز ماری کے بعد جس طرح کے کپڑے وہ پسند کر رہی تھی انہیں دیکھ کر حمدان کو تاؤ آ رہا تھا۔
"ان میں سے کون سا زیادہ اچھا ہے۔" پلوشہ نے سوٹ اس کے سامنے کیے۔ ایک ہلکا بادامی اور ایک ہلکا گلابی۔ حمدان گہری سانس لے کر رہ گیا۔
"کوئی بھی نہیں۔" اور مڑ کر ریک سے ایک سوٹ نکالا۔ "تم یہ کیوں نہیں لیتی ہو۔" وہ ایک ہرے اور کاہی امتزاج کا خوب صورت کڑھائی والا سوٹ تھا۔ پلوشہ نے دیکھا اور منہ بنا کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔
"اسے پیک کردو۔" حمدان نے پاس سے گزرتے سیلز بوائے کو سوٹ پکڑایا اور پلوشہ کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے چند اور گہرے اور کھلتے رنگوں میں جوڑے بھی خرید ڈالے۔ واپسی میں جب اس نے پلوشہ کو اس کے شاپنگ بیگز تھمائے تو ساتھ دو مزید شاپنگ بیگز بھی تھے۔

"یہ کیا ہے؟" پلوشہ نے تھیلوں میں جھانک کر دیکھا۔ ایک میں کپڑے اور دوسرے میں جوتے اور جیولری وغیرہ تھی۔

"تمہاری شاپنگ۔" حمدان نے ڈگی بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں لوں گی یہ۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"میرے تو کسی کام کی نہیں ہیں یہ چیزیں۔ تم ہی رکھو۔" وہ کی رنگ لہراتا اندر چلا گیا۔ پلوشہ شاپنگ بیگز اٹھائے اس کے پیچھے تھی۔

☆ ☆ ☆

اے سی آن تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں گہری خاموشی تھی۔ پلوشہ صوفے پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی، جب حمدان سیٹی پر کوئی شوخ دھن گنگناتا آیا۔ پلوشہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ سارا ماحول غارت کر دیا تھا اس نے۔ وہ اب دوسرے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر رہا تھا۔

"اب کوئی واہیات سی انگلش مووی لگا کے نہ بیٹھ جانا۔" پلوشہ نے اسے اپنی موجودگی کی اطلاع دینی ضروری سمجھی تھی۔

"انڈین کے بارے میں کیا خیال ہے۔" حمدان مسکرایا۔

"پھر مجھے یہاں سے اٹھنا پڑے گا۔" پلوشہ نے جل کر کہا۔

"تو آپ یہاں کیا چلّہ کاٹ رہی ہیں جو یہاں آپ کی موجودگی ضروری ہے۔" حمدان نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ ساتھ ساتھ وہ چینل سرچنگ کر رہا تھا۔

"تم اوپر اپنے پورشن میں جا کر ٹی وی دیکھو ناں۔"

پلوشہ نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔

"وہاں مزا نہیں آتا۔" حمدان نے برا مانے بغیر صاف انکار کر دیا پھر اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"ویسے ایک تو بتاؤ پلوشہ! تم اتنے فضول حلیے میں کیوں رہتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ تپ گئی تھی۔

"نہ تم ہاتھوں میں کچھ پہنتی ہو، نہ کانوں میں، مطلب چوڑیاں، بندے وغیرہ کپڑے بھی تم عجیب بے رنگ سے پہنتی ہو۔ زندگی سے آخر اتنی بیزار کیوں ہو تم۔"

"میں زندگی سے بیزار نہیں ہوں۔ یہ میرا اسٹائل ہے، مجھے واہیات قسم کے فیشن پسند نہیں ہیں۔" پلوشہ اترا کر بولی۔

"یہ واہیات قسم کے فیشن نہیں ہیں بے وقوف۔" حمدان نے ڈانٹ کر کہا پھر نرم پڑتے ہوئے بولا "تم کبھی گہرے رنگوں کے کپڑے پہن کر تو دیکھو، ساتھ چوڑیاں، کانوں میں ائررنگز تم بے حد خوب صورت لگو گی۔" وہ جیسے تصور میں اسے سجا سنورا دیکھ رہا تھا۔

"میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔" وہ تنک کر بولی۔

"لیکن مجھے یہ سب پسند ہے یار۔" وہ بے چارگی سے بولا تھا۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" پلوشہ نے بے نیازی سے کہا۔

حمدان نے گہری سانس لی اور انگلش مووی دیکھنے لگا۔

پلوشہ نے بھنا کر ٹی وی کی طرف دیکھا ابھی تک تو مووی صاف ستھری ہی لگ رہی تھی لیکن انگلش مووی ہو اور اس میں کوئی ایسا ویسا سین نہ آئے یہ تو ہو نہیں سکتا لہٰذا اس نے یہاں سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا لیکن جاتے جاتے اتنا ضرور سنا گئی۔

"رمضان کا مہینہ ہے۔ کم از کم اس میں تو گناہ کم سے کم کرنے کی کوشش کرو۔"

ٹی وی دیکھتے ہوئے حمدان کی نظر ٹیبل پر پڑی کتاب پر پڑی جو پلوشہ چھوڑ گئی تھی۔ اس نے کتاب اٹھالی۔

آخر کیا پڑھ رہی تھیں میڈم! اس نے کتاب کا ٹائٹل دیکھا "راجہ گدھ....." ہوں! جہاں وہ نشان رکھ کر گئی تھی وہیں سے اس نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک دو پیراگراف پڑھ کر ہی چکر آنے لگے تھے۔ گہری سانس لے کر کتاب رکھ دی اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن ٹی وی تو پلوشہ کو جلانے کے لیے آن کیا تھا،

اب وہ چلی گئی تھی تو ٹی وی دیکھنے کی کیا ضرورت تھی چنانچہ ٹی وی بھی بند کر دیا۔۔۔ آخر وہ بھی مسلمان تھا رمضان کا احترام اس پر بھی واجب تھا۔

☆ ☆ ☆

بارش نے ایک دم ہی ماحول خوب صورت کر دیا تھا۔ پلوشہ کھڑکی کے سامنے مبہوت سی اللہ کی رحمت کو برستے دیکھ رہی تھی۔ اس کے شہد رنگ بال، ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

"بارش اچھی لگتی ہے ناں۔" حمدان اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔

"ہاں۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"آؤ بارش میں بھیگیں۔" حمدان نے فرمائش کی۔

"مجھے بارش کو دور سے دیکھنا پسند ہے۔" پلوشہ نے واضح کیا۔

"بارش کو دیکھتے ہوئے چائے پینا اور۔۔۔"

"میں چائے نہیں کافی پیتی ہوں۔" پلوشہ نے مڑ کر اس کی بات کاٹی پھر بولی۔ "پتا ہے حمدان میرا دل کیا چاہتا ہے۔"

حمدان بولے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں جن میں عجیب سا سحر تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے میری زندگی میں جو شخص آئے وہ بالکل میرے جیسا ہو۔ میں اس کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھوں، وہ میرے خوابوں میں رنگ بھرے۔"

"میں ہوں ناں پلوشہ۔ میں تمہارے سب خواب پورے کروں گا۔"

"تم اس کا یقین کیوں نہیں کرتی ہو۔" حمدان نے کہا۔

"تم میرے خوابوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے تو پورا کیسے کر سکتے ہو؟ حمدان! تم میرے ساتھ کیٹس اور شیلے کی پوئٹری ڈسکس کر سکتے ہو؟ تم میرے ساتھ فیض کی نظم اور غالب کی غزل انجوائے کر سکتے ہو؟ نہیں ناں۔" پلوشہ کا لہجہ تمسخر آمیز تھا۔

"پلوشہ!" حمدان نے گہری سانس لی۔ "تم تصوراتی دنیا میں رہتی ہو۔ تم جانتی ہو اچھی زندگی گزارنے کے لیے زیادہ اہم چیزیں کیا ہیں۔ محبت، عزت ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ بھروسا کرنا اور یہ سب چیزیں میں تمہیں دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی۔" وہ اس کے بالمقابل کھڑی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ "تم میرا خیال چھوڑ دو حمدان، ہم مشرق اور مغرب کی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے ہیں۔"

حمدان کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں ٹوٹتے کانچ دیکھ سکتی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے منہ پھیر کر چلا گیا کچھ بھی کہے بغیر۔ کوئی شکوہ نہ شکایت، کوئی دلیل نہ تبصرہ۔ کوئی مذاق نہ کوئی دعویٰ، گیا وہ سچ مچ مایوس ہو گیا تھا۔ وہ اب کبھی اس کے پیچھے نہیں آئے گا۔ کبھی اس کی آرزو نہیں کرے گا۔

پلوشہ نے گہری سانس لی اور اپنا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ وہی ہوا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ لیکن پھر وہ خوش کیوں نہیں تھی۔ آنسو اس کے دل کے گرد گھیرا کیوں ڈال رہے تھے۔ خلش کا کانٹا اس کے دل میں کیوں چبھنے لگا تھا۔ کیوں؟

☆ ☆ ☆

دن ایک دم ہی اداس ہو گئے تھے۔ حمدان نے اس کے آگے پیچھے پھرنا اسے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک گہری چھاپ نظر آتی تھی۔ پلوشہ چپکے سے اسے دیکھتی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ یوں نظرانداز ہونا پلوشہ کو برا لگ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی توجہ کی عادی تھی شاید اسی لیے اس نے حمدان کو اپنا حق سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک پیارا سا کزن جو ہمیشہ اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا اس کی توجہ اور التفات کا منتظر رہتا تھا اب اچانک ہی رخ موڑ گیا تو اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

اسے اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ کئی دفعہ خود کو سمجھا چکی تھی کہ سب کچھ ویسا ہی تھا

جیساوہ چاہتی تھی لیکن حقیقتاً "سب کچھ ویسا نہیں تھا جیساوہ چاہتی تھی اور یہ بات وہ جانتی تھی۔
"تائی! آپ کو شمسہ خالہ یاد ہیں؟" سحری کھاتے ہوئے اچانک حمدان نے رضوانہ بیگم کو مخاطب کیا تھا۔
"وہ جو لاہور میں رہتی تھیں۔" رضوانہ بیگم نے پوچھا۔
"جی... ان کی بیٹی نیلم ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی ہے۔ آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد آرہی ہے۔" حمدان نے اطلاع دی تھی۔
"اچھا... کب؟" رضوانہ بیگم نے یونہی بر سبیل تذکرہ پوچھا تھا۔
"آج... ہوٹل میں اسٹے کرنے کا ارادہ تھا اس کا' میں نے کہا گھر کس لیے ہے' جتنے دن ٹھہرنا ہے گھر میں ٹھہرو۔"
"ٹھیک کیا بیٹا۔" حمید صاحب نے کہا۔ "انیکسی صاف کروا دو بیگم۔" وہ رضوانہ بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔
"صاف ہے۔ میں پھر کروادوں گی۔" رضوانہ بیگم نے جواب دیا تھا۔ سحری کے بعد پلوشہ کو سونے کی عادت تھی' جب وہ دوپہر میں سو کر اٹھی تو نیلم آچکی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں مما کے ساتھ بیٹھی تھی۔ رضوانہ بیگم نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا تھا۔ پلوشہ نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ایک سنہری رنگت والی خوب صورت لڑکی تھی۔ گرمی کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لان کے سبز اور سیاہ خوب صورت پرنٹ کے سوٹ میں ہم رنگ چوڑیوں اور چھوٹی چھوٹی سبز جھمکیوں کے ساتھ وہ کہیں سے بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی سینٹر پوسٹ پر کام کرنے والی لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کا پہلا تاثر ایک بے فکر' خوب صورت' ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کا بنتا تھا۔
"روزہ ہے بیٹا!" رضوانہ بیگم اس سے پوچھ رہی تھیں۔
"جی آنٹی! الحمدللہ۔" وہ مسکرائی تھی۔

"پھر تم یوں کرو کمرے میں جاکر فریش ہو اور آرام کرو۔"
رضوانہ بیگم نے اسے مشورہ دیا تھا جس پر وہ فوراً" ہی عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ حمدان اسے چھوڑ کر پہلے ہی آفس جا چکا تھا۔



"واؤ لکنگ گڈ یار" پکوڑوں کا مسالا ملاتے ہوئے پلوشہ نے اپنی پشت پر حمدان کی آواز سنی تو چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی مخاطب نیلم تھی جو انیکسی سے نکل کر آرہی تھی۔ وہ شاید ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔ گیلے بال ہاف کیچر کیے ہوئے تھے۔ "سرخ امبر ائڈ لباس میں وہ کسی کھلتے گلاب کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ خوش دلی سے حمدان کو تھینک یو کہہ کر وہ سیدھا کچن میں ہی چلی آئی تھی۔
"آنٹی! میں کچھ ہیلپ کرواؤں آپ کی۔" اب وہ اپنی خدمات رضوانہ بیگم کو پیش کر رہی تھی۔
"نہیں بیٹا! آپ اندر جاکر بیٹھو سب تیار ہے۔ میں بھی آتی ہوں۔"
رضوانہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا تو وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ اب وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ حمدان بھی وہیں تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے بلند قہقہوں کی آواز کچن میں بھی آرہی تھی۔
"حمدان اس کے آنے سے بڑا خوش ہے۔" پلوشہ نے جل کر سوچا۔
"دھیان سے پلوشہ! پکوڑے جل رہے ہیں۔"
رضوانہ بیگم نے اسے ڈانٹ کر کہا تو اس نے جلدی سے پکوڑے کڑاہی سے نکالے تھے۔
افطاری بہت خوش گوار ماحول میں ہوئی تھی۔ حمدان کے ننھیال سے کافی مدت بعد کوئی آیا تھا اس لیے بابا اور چچا بھی نیلم کی خصوصی آؤ بھگت کر رہے تھے۔ افطاری کے بعد مغرب کی نماز پڑھ کر سب لوگ

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ پلوشہ نے سب کو چائے پیش کی تھی تب ہی نیلم اپنا بیگ لے کر آگئی تھی۔ وہ سب کے لیے تحائف لائی تھی۔ حمدان کے لیے پرفیوم اور گھڑی تھی حمدان نے پرفیوم اسپرے کر کے چیک کیا اور پھر دل کھول کر نیلم کی پسند کی داد دی تھی بابا اور چچا کے لیے بھی پرفیومز ہی تھے، رضوانہ بیگم کے لیے خوب صورت کڑھائی والی چادر اور پلوشہ کے لیے میرون اور گہرے سبز رنگ کے امتزاج کا سوٹ۔

سب ہی نے نیلم کا شکریہ ادا کیا تھا۔ ممانے اسے پیار سے ڈانٹا بھی تھا کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی وہ جواباً کچھ بھی کہے بغیر ہنستی رہی تھی۔

پلوشہ نے سوچا تھا کہ اس کا سوٹ دیکھ کر شاید حمدان کہے کہ پلوشہ اس طرح کے گہرے رنگ نہیں پہنتی یا کوئی اور طنز والی بات کرے لیکن وہ خاموش رہا تھا۔ وہ اب پلوشہ کے کسی معاملے میں بھی دلچسپی لینا مکمل طور پر چھوڑ چکا تھا۔



ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خود کو جانتے ہیں لیکن درحقیقت ہم خود کو نہیں جانتے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہماری ذات بھی ہر لمحے تبدیل ہوتی رہتی ہے، وقت ہم پر اپنے اچھے اور برے اثرات مرتب کرتا رہتا ہے اور پھر جب ہم کسی دن اچانک خود سے ملتے ہیں تو اپنے آپ کو ہی پہچان نہیں پاتے۔ پلوشہ بدل رہی تھی۔ کیا حمدان بھی بدل رہا تھا۔

رضوانہ بیگم لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں، پلوشہ ان کے پاس ہی نیچے کارپٹ پر کشن رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پروین شاکر کی "خوشبو" تھی۔

"حمدان!" رضوانہ بیگم نے باہر سے گزرتے حمدان کو پکارا۔

"جی تائی!" وہ فوراً ہی اندر آگیا تھا۔

"نیلم اور اس کی فیملی کے لیے گفٹس لینے ہیں۔ کسی وقت تم پلوشہ کو ساتھ لے جا کر خرید لاؤ۔" رضوانہ بیگم نے کہا۔

"تائی! مجھے اس کی پسند کا پتا ہے۔ میں خود ہی لے آؤں گا آپ فکر نہ کریں۔" حمدان نے جواب دیا۔

"حمدان! تمہارے لیپ ٹاپ پہ تو پاس ورڈ لگا ہے یار! اسے تو کھولو۔" نیلم حمدان کا لیپ ٹاپ اٹھائے اندر آئی تھی۔

"لاؤ۔" حمدان نے اس سے لیپ ٹاپ لے لیا تھا۔ اب وہ دونوں کشن رکھ کر نیچے ہی بیٹھ گئے تھے۔ حمدان نیلم کو اپنے بچپن کی تصاویر دکھا رہا تھا۔

"تم کتنے گولو مولو سے ہوتے تھے ناں۔ اللہ آنٹی تمہیں اٹھاتی کیسے ہوں گی۔" نیلم ہنس رہی تھی۔

"یہ کون ہے، کتنی سویٹ بچی ہے اس کے سارے منہ پر چاکلیٹ لگی ہے۔" اب وہ ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہی تھی پلوشہ جانتی تھی وہ تصویر اسی کے بچپن کی تھی۔

"اسے چھوڑو۔ یہ دیکھو کون ہے۔" حمدان نے نیلم کی توجہ ایک اور تصویر کی طرف مبذول کرادی تھی۔ پلوشہ کے دل کو دھکا سا لگا وہ اب اس کا ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

"یہ تو میری تصویر ہے۔ تمہارے پاس کیسے آئی؟" نیلم حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"بس دیکھ لو۔" حمدان نے فرضی کالر اکڑائے۔

"اچھا آئس کریم کھاؤ گی؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" نیلم فوراً تیار ہو گئی تھی ساتھ ہی پلوشہ کو بھی پوچھ لیا "پلوشہ! آئس کریم کھانے چلو گی؟"

حمدان لیپ ٹاپ بند کر کے کھڑا ہو گیا "اسے آئس کریم نہیں پسند یار! تم چلو۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔ نیلم اس کے پیچھے تھی۔

"تمہارا اور حمدان کا جھگڑا ہوا ہے؟" رضوانہ بیگم کڑی نگاہوں سے پلوشہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں تو۔" پلوشہ کی آواز مدھم تھی۔

"پلوشہ! میری ایک بات کان کھول کے سن لو۔" رضوانہ بیگم کا لہجہ غصیلا تھا "حمدان کی شادی

تمہارے علاوہ کسی اور سے ہوئی تو میں ساری زندگی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"مما! اس میں میرا کیا قصور ہے اگر وہ کسی اور سے شادی کرلیتا ہے تو؟" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

"تمہارا ہی قصور ہے۔ تمہارے ہی نخرے آسمان پہ پہنچے ہوئے تھے۔ تمہارے باپ نے تمہاری مرضی کا شوشانہ چھوڑا ہوتا تو میں اب تک تمہارا نکاح کرا چکی ہوتی۔ میں بھی کہوں اچانک ننھیال والوں کو حمدان کی یاد کیوں آگئی ہے۔ اچھا بھلا برسر روزگار خوب صورت لڑکا..." وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

پلوشہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے بہت رونا آرہا تھا۔



"اف توبہ۔ افطاری کرنے کے بعد تو بہت سستی ہو جاتی ہے۔" نیلم کسل مندی سے صوفے پر بیٹھی تھی۔

"کم کھانا تھا ناں!" حمدان ہنسا۔

"زیادہ کھاتی تو اتنی اسمارٹ نہ ہوتی۔" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" حمدان نے فوراً" ہی تسلیم کرلیا۔

"خالہ سے کہتا ہوں تمہیں ہمیشہ کے لیے اسلام آباد بھیج دیں۔"

"اونہوں!" اس نے فوراً" ہی انکار کیا "مجھے اسلام آباد پسند نہیں ہے۔ عجیب بے حس سا شہر ہے۔ تم کیوں نہیں لاہور شفٹ ہوجاتے۔"

"ہاں خیر۔ میرا ٹرانسفر تو ہو سکتا ہے۔" حمدان سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

یہ گفتگو سن کر پلوشہ کو تو آگ ہی لگ گئی۔ تو نوبت یہاں تک آگئی تھی "حمدان صرف میرا ہے وہ کسی اور کے بارے میں سوچ کے تو دیکھے میں اس کا گلا دبادوں گی۔"

اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے اس کے عزائم جارحانہ بلکہ قاتلانہ ہو رہے تھے۔

"نیلم کوئی مجھ سے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ ہلکا آسمانی جوڑا زیب تن کیے بالوں کی کس کر پونی بنائے ماتھے پر کئی بل لیے پلوشہ حمید کو اپنے روبرو دیکھ کر اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ نظروں کے سامنے نیلم کا بنا سنورا ترو تازہ وجود لہرا گیا۔ اس نے الماری کھول کر شاپنگ بیگ نکالا۔ حمدان کے دلائے ہوئے کپڑے ابھی تک یونہی رکھے تھے۔ شیفون کی آستینوں والا پرپل سوٹ نکال کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ شاور لے کر باہر نکلی تو غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ جیولری والا ڈبہ کھولا اور سلور نازک سے بندے پہن لیے بالوں کو برش کر کے کھلا چھوڑ دیا۔ اب وہ حمدان کی خبر لینے کے لیے مکمل طور پر تیار تھی۔ باہر آکر دیکھا تو حمدان اور نیلم دونوں غائب تھے۔ "گئے ہوں گے پھر آوارہ گردی کرنے" وہ آگ بگولہ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

"چاہے جتنی دیر بھی انتظار کرنا پڑے حمدان کی طبیعت تو آج میں صاف کر کے ہی چھوڑوں گی۔" اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کیا۔ نہ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا انتظار کرتے ہوئے جب اس نے کھڑکی کے باہر حمدان کی جھلک دیکھی۔

"حمدان!" وہ بلند آواز میں چنگھاڑی تھی۔

"کہاں ہے؟" وہ تیزی سے اندر آیا تھا اور اب ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟" وہ اسے بیڈ کے نیچے جھانکتے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"چھپکلی۔" وہ معصومیت سے بولا تھا۔

"چھپکلی کہاں سے آگئی۔" پلوشہ بری طرح جھنجلائی تھی۔

"تم نے چھپکلی کو دیکھ کر مجھے نہیں بلایا تھا۔" حمدان نے کہا۔

"نہیں بھئی۔" پلوشہ نے کہا۔

"اچھا!" حمدان نے سر ہلایا اور کمرے سے جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔" پلوشہ نے گڑبڑا کر اسے روکا۔ حمدان رک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگا "میرا مطلب ہے مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کرو۔" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے۔" پلوشہ نے تھوک نگلا۔ "مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ تم اتنے برے نہیں ہو جتنے مجھے لگتے ہو۔"

"ہیں۔" حمدان بھونچکا کر رہ گیا۔ "مطلب کیا ہے تمہارا۔"

"میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" پلوشہ نے جلدی سے کہہ دیا۔

"کیوں۔۔۔" وہ کڑے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔

"اب تم مجھے برے نہیں لگتے۔" پلوشہ اپنے ہاتھ آپس میں مل رہی تھی۔

"تو پھر کیسا لگتا ہوں۔" حمدان نے اگلا سوال کیا۔

"جب تم نیلم سے فری ہوتے ہو تو بہت برے لگتے ہو۔" پلوشہ نے اپنی جلن کا اظہار کر ہی دیا۔ حمدان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"تو یہ بات ہے۔"

"میری بات کا غلط مطلب نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔" پلوشہ نے اسے گھورا "تمہیں ذرا شرم نہیں آئی۔ میں نے انکار کیا تو تم فوراً" ہی ادھر ادھر۔"

وہ کوئی نامناسب بات کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"ارے تم کیا سمجھ رہی ہو۔" حمدان نے انگلی سے اس کا سر بجایا۔ "نیلم ایک پیارے سے بیٹے کی ماں ہے۔"

"کیا؟" اب حیران ہونے کی باری پلوشہ کی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ خالہ کے پاس چھوڑ کر آئی تھی اپنے تین سالہ بیٹے شازیب کو۔"

"اوہ۔ تم نے بتایا کیوں نہیں تھا۔ میں نے اتنے دن اس بے چاری سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔"

پلوشہ کو حقیقتاً" افسوس ہوا۔

"خیر وہ تو تمہاری عادت ہے۔" حمدان نے لاپروائی سے کہا۔

"میں جا کر اس سے سوری کرتی ہوں۔" پلوشہ نے باہر کا رخ کیا۔

"اسے تو میں ابھی ابھی ائرپورٹ چھوڑ کر آ رہا ہوں۔" حمدان نے اطلاع دی۔ "خیر تم کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کیا کہہ رہی تھی۔" پلوشہ نے غائب دماغی سے کہا۔

"یہی کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں۔ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے اور تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔" حمدان مسکرایا۔

"میں نے یہ سب تو نہیں کہا۔" پلوشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہارا مطلب تو یہی تھا ناں۔" حمدان نے پوچھا۔ پلوشہ نے اسے دیکھا اور مسکرا دی "ہاں۔"

"او بلے بلے۔" حمدان نے نعرہ لگایا۔

"کیا بے ہودگی ہے۔" پلوشہ اس کے انداز پر بگڑی تھی۔

"تمہیں پتا ہے چاند نظر آ گیا ہے۔ کل عید ہے۔" حمدان نے بتایا۔

"اچھا!" وہ خوش ہوئی "مبارک ہو۔"

"کس بات کی مبارک چاند کی یا منگنی کی۔" وہ جگمگاتے چہرے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"منگنی۔۔۔" پلوشہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں کل ہماری منگنی ہے۔ چلو تمہیں مہندی لگوا کر لاؤں۔"

حمدان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"منگنی۔ لیکن منگنی کے لیے جوڑا تو خریدا ہی نہیں۔" پلوشہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں خرید چکا ہوں۔ سرخ لہنگا۔" وہ باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"منگنی پہ کون پہنتا ہے سرخ لہنگا۔" پلوشہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بگڑ کر کہہ رہی تھی۔

رضوانہ بیگم نے دونوں کو تکرار کرتے دیکھا تو مسکرا دیں۔ وہ جانتی تھیں اس مرتبہ عید یادگار ہوگی۔

☆

بی سحر ملک

بن مانگی دعا کا اثر



"وہ رہا چاند۔" ضوفشاں کی آواز پر سارے چہرے خود بخود ضوفشاں کی طرف مڑ گئے۔ اس کی انگلی کی سیدھ میں سب نے رمضان المبارک کا باریک تار جیسا چاند دیکھ لیا۔ ہر طرف مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکرز سے آتی آوازیں' موتیے اور رات کی رانی کی ملی جلی خوشبو اور اس چھوٹی سی چھت پر گہما گہمی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ تب ہی فراز کی نظر منہ بنا کر اترتی تابندہ پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا؟" ریلنگ پکڑ کر سیڑھیوں پر جھکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مجھے پھر چاند نظر نہیں آیا۔" منہ بنا کر بچوں سی معصومیت سے اس نے کہا تو فراز کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ جو اس نے کمال مہارت سے چھپائی کیونکہ اس وقت ہنسنے کا مطلب رمضان کی پہلی عشاء اور تراویح قضا کرنا تھا' دو گھنٹے اسے منانے کے لیے جو چاہیے تھے۔ اس کے بعد دادا جان کی ڈانٹ پھٹکار الگ۔

"کیوں نظر نہیں آیا' سب نے تو دیکھ لیا۔"

"مجھے کیا پتا' ہو سکتا ہے چاند کی میرے ساتھ کوئی دشمنی ہو۔" اس کے سنجیدہ جواب پر بھی اسے ہنسی آئی تھی۔

"ہو سکتا ہے۔ آخر اتنی خوب صورت جو ہو۔" اس نے بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مزید تپ گئی۔

"جانتی ہوں۔ سب جانتی ہوں تم بھی سب کی طرح مذاق اڑا رہے ہو میرا۔ اڑالو' بس میں نے سوچ لیا ہے۔ ابو سے نظر کی عینک منگواؤں گی میں۔" وہ حیران ہوا۔

"نظر کی عینک کیوں؟ ٹھیک تو ہے تمہاری نظر۔"

"کہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہوتی تو چاند تو نظر آتا مجھے۔ دیکھا نہیں' ضوفی آپی کو ہر سال چاند سب سے پہلے نظر آجاتا ہے صرف اس لیے کہ ان کے پاس نظر کا چشمہ ہے۔" اس کی توجیہہ پر فراز کا دل چاہا اونچے اونچے فلک شگاف قہقہے لگائے۔

"ان کے پاس ان کا چاند ہے' تب ہی تو...." سامنے کچھ فاصلے پر شرماتی ضوفشاں کو سفیان گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ فراز نے انہیں دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کی تھی لیکن ہائے قسمت! تابندہ کے سر سے گزر گئی۔

"ہیں! آپی کے پاس چاند کہاں سے آیا؟"

"سب کے پاس اپنی اپنی قسمت کا چاند ہوتا ہے' ضوفشاں کے پاس بھی ہے۔" نیچے سے آنے والی آوازیں سن کر سب دھیرے دھیرے نیچے اترتے جا رہے تھے۔ اس کی بات سن کر ضوفشاں شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا کر سیڑھیاں اتر گئی جبکہ سفیان اور فیضان اس کے پاس رک گئے۔

"میری قسمت کا چاند کدھر ہے پھر؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا تو پاس کھڑے سفیان' فیضان کی دبی دبی ہنسی نے اس کی سماعت پر دستک دی۔

"وہ تو تمہیں خود دیکھنا پڑے گا ناں۔"

"رہنے دو۔ آسمان کا چاند تو کبھی نظر نہیں آیا۔ قسمت کا چاند کہاں سے نظر آئے گا۔" منہ بنا کر وہ نیچے اتر گئی جبکہ پاس کھڑے سفیان' فیضان کے قہقہے ابل پڑے۔

"یار فراز! تیرا کچھ نہیں ہو سکتا۔" نیچے جاتے ہوئے اس نے سنا ضرور لیکن سر جھٹک کر امی کے پاس چلی گئی جہاں تائی نفیسہ اور چاچی بتول بھی بیٹھی تھیں۔ دادا جان ان کے ساتھ رہتے تھے۔ حالانکہ کتنی بار تایا اور چاچو نے انہیں کہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ بھی رہا کریں۔ تینوں بھائیوں کے گھر گلی میں ایک ساتھ ہی تو تھے لیکن دادا جان کو منجھلا بیٹا اتنا پیارا تھا کہ انہوں نے بڑے اور چھوٹے بیٹوں کی گزارشات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اب کوئی تہوار ہو' سب اسی گھر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ سارا سال اپنے

اپنے گھروں میں علیحدہ کھانے پکانے والے بھائی بھی سحری افطاری اسی گھر میں کرتے تھے۔ تینوں بھائی خرچ مل کر کرتے اور خواتین مل کر سحری افطاری بناتیں۔ طاق راتیں بھی مشترکہ طور پر جاگ کر گزاری جاتیں۔
"السلام علیکم' چاند مبارک۔" بہ آواز بلند کہہ کر وہ امی کے پاس جا بیٹھی۔ جہاں امی سحری کے لیے ہدایات جاری کررہی تھیں۔
"ضوفی! چولھے پر دودھ چڑھا ہے' جاکر دہی لگاؤ اور سحری کے لیے آٹا بھی گوندھ لو۔"
"امی دہی سحری تک جم جائے گا؟" ضوفی نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں ہاں۔ جم جائے گا اتنی تو گرمی ہے اور شرمین تم بھی جاؤ کچن میں۔ آدھا آٹا تم گوندھ لینا آدھا ضوفی گوندھ دے گی۔ باقی میں ابھی اٹھ کر سالن بنالیتی ہوں۔" تائی نفیسہ نے صفائی کی عادت ساس سے چرائی تھی۔ نہ ان کی ساس باہر کی چیزوں سے مطمئن ہوتی تھیں نہ وہ اسی لیے زیادہ تر اشیاء ان کے گھر میں ہی تیار ہوتی تھیں۔ دودھ کے لیے ان کے بھائی کے پاس انہوں نے دو گائے رکھوا دی تھیں۔ وہیں سے ان تینوں گھروں کا دودھ آتا تھا۔ اسی دودھ سے دہی 'مکھن اور دیسی گھی بنایا جاتا تھا اور رمضان المبارک میں تو گھر کے تمام افراد دیسی گھی سے چپڑی روٹی سالن یا گھی شکر کے ساتھ کھاتے 'لسی پیتے اور دہی کے بڑے بڑے پیالے کھاتے یہ الگ بات کہ بچوں میں سے اکثر یہ سب کھا نہیں پاتے تھے۔ ایسے میں دادا جان خوب کھنچائی کرتے۔
"یہ ہے ہماری نئی نسل۔ یہ ہماری وراثت' ہمارے ورثہ کو آگے لے کر چلیں گے۔ ہڈی پر ماس نہیں جسم میں جان نہیں۔ آدھا دن گزر جائے تو بے دم ہوجاتے ہیں۔ ارے ہم روزے رکھ کر تپتی گرم دوپہروں میں اپنے بابا کے ساتھ کھیتوں میں کام کرواتے تھے۔ میں بوڑھا اب بھی تم دس جوانوں پر بھاری ہوں۔" دادا جان کی باتیں سن کر وہ سب توبہ توبہ کیا کرتے تھے۔

"ہاں بنالیا ہے۔ جاکر بھیجتی ہوں۔ اور تابندہ اٹھ جا کر کوئی کام دیکھ" جواب دیتے انہوں نے پاؤں پسار کر لیٹتے ہوئے تابندہ کو بھی جھاڑا۔
"میں کیا کام دیکھوں۔ کوئی کام ہے ہی نہیں۔ آپی اور شرمین باجی گئی تو ہیں۔ نمرہ ثمرہ بھی ادھر ہی ہوں گی۔" منہ پر ہاتھ رکھتے اس نے جمائی روکی۔ کھانا کھاتے ہی کم بخت نیند نازل ہوجاتی تھی۔ امی نے اس کے جواب پر اسے گھورا جو کمال بے نیازی سے اس نے نظرانداز کردیا۔
"کھانے کے برتن پڑے ہیں چل کے دھو اور سالن کے مسالے کے لیے لہسن پیاز لاکر دے مجھے۔" وہ جانتی تھی' تائی جان نے کہہ دیا ہے تو امی اب اسے اٹھا کر ہی دم لیں گی اسی لیے کچھ کہے بنا اٹھ گئی۔
"اسے کھانا پکانا' سینا پرونا بھی سکھاؤ۔ آخر کو کل بیاہ کرنا ہے۔ سسرال جاکر ناک کٹوادے گی۔" تائی جان کی بات پر اسے خوب غصہ آیا تھا۔
"میں شادی ہی ایسے گھر میں کروں گی جہاں ڈھیر سارے نوکر چاکر ہوں اور مجھے اٹھ کر پانی پینے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔" اس کے جواب پر جہاں تائی جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا وہیں امی نے بھی اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ تپائی پر پڑا اسٹیل کا گلاس انہوں نے پوری قوت سے اس کی طرف اچھالا تھا جو اس کے جھکائی دینے پر شور مچاتا زمین پر جاگرا تھا۔
کیسی بدزبان' بے لحاظ اور نکمی لڑکی تھی جسے ان کا بیٹا ان کی بہو بنانے کا ارمان سجائے بیٹھا تھا۔ اگرچہ کبھی کسی نے کچھ کہا نہیں تھا پھر بھی اپنے بیٹے کی نظریں وہ خوب پہچانتی تھیں۔ انہوں نے سوچ لیا تھا جس دن فراز نے ان کے سامنے تابندہ کا نام لیا' وہ ہاں کرنے کی بجائے اس سے بھی ناں کرواکر دم لیں گی۔
"بھابھی! بچی ہے' درگزر کریں۔ سمجھ جائے گی۔" دیورانی کی بات پر نفیسہ بیگم نے سر ہلا دیا تھا۔ ان کا ذہن ابھی بھی اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔

☆ ☆ ☆

ظہر کی نماز ادا کرتے ہی ساری لڑکیاں سونے کے لیے بیٹھک میں چلی گئیں۔ ایک تو بیٹھک باقی کمروں کی نسبت کشادہ تھی اور دوسرا تمام کمروں میں سب سے ٹھنڈی بھی۔ کچھ سال پہلے دادا جان کی خواہش پر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے باہر ایئر کولر بھی رکھ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے گرمیوں میں بیٹھک ان کے لیے جنت کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ تابندہ نے ایک نظر

ان سب لڑکیوں پر ڈالی اور کسمساتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ آج سحری میں ضوفشاں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے امی نے اسے سحری میں مدد کے لیے اٹھا لیا تھا اور پھر نماز تلاوت سے فارغ ہو کر وہ ایسا سوئی کہ بارہ بجے آنکھ کھلی اور اب سب سو رہے تھے اور وہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ بیٹھ کر اس نے اردگرد نظر دوڑائی تو صوفے پر پڑے تکیے کے نیچے سے امی کا موبائل جھانکتا دکھائی دیا۔ امی، تائی اور چاچی نماز کے بعد کے وظائف میں مشغول تھیں۔ خاموشی سے بنا آہٹ کیے ــــ اس نے موبائل اٹھایا اور چوروں کی طرح دبے پاؤں بیٹھک سے باہر نکل گئی۔ گیم کھیلنے کے لیے دادا جان کے کمرے سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی لیکن روزے میں گیم کھیلتے دیکھ کر وہ تابندہ کی طبیعت درست کر دیتے۔ موبائل کو وہ یوں بھی شیطانی چرخہ کہا کرتے تھے اور گیم سراسر وقت کا ضیاع۔ بندہ قرآن کھول لے، تسبیح پکڑ لے۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور ثواب کا ثواب۔ پچھلے روزوں میں انہوں نے اسے ٹی وی دیکھتے ہوئے دیکھ کر جو کہا تھا اسے من و عن یاد تھا۔ ایک نظر پیچھے دیکھ کر اس نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ چاچو سے ٹکرا گئی۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہو گیا۔ زمین پر بیٹری، کی پیڈ اور موبائل کے دیگر حصے ٹکڑوں میں پڑے تھے۔ چاچو کو دیکھ کر تو اس کی جان ہی نکل گئی تھی۔

"کہاں جا رہی تھیں فون لے کر۔" اس کے جواب دینے سے پہلے امی اور تائی بھی شور سن کر آ گئی تھیں۔

"چاچو، چارجنگ پہ لگانے جا رہی تھی۔" لڑکھڑاتے لہجے میں اس نے جھوٹ بولا۔ پتا نہیں لوگ کیسے اتنے بڑے بڑے جھوٹ بول لیتے ہیں مجھ سے تو ایک بے ضرر جھوٹ بھی نہیں بولا جاتا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

"تابندہ! جھوٹ بول رہی ہو ناں؟" تائی جان نے اس کا جھوٹ پکڑا۔

"جی.... امی کو پتا ہے میں کیا کرنے لگی تھی۔" مزید شامت سے بچنے کے لیے وہ کہہ کر تیزی سے اندر گھس گئی۔

"گیم کھیلنے لگی ہو گی۔ ایک ہی تو اس کا کام ہے۔" امی نے جھک کر موبائل کے ٹکڑے سمیٹے۔

"تم آج کیسے آ گئے جلدی؟" تائی جان نے دیور سے پوچھا۔

"دکان کے کام سے آیا تھا۔ سوچا بھائی جان کا پیغام بھی خود ہی دیتا چلوں۔ شام کو بھائی جان کے کچھ دوست افطاری پر آ رہے ہیں۔ انتظام رکھیے گا بلکہ وہ لوگ عین افطار کے وقت آئیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی میز لگوا دیجیے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں بھی کہوں، دو روزے کیسے سکون سے گزر گئے ورنہ تو پہلے روزے سے ہی ان کا افطار پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔" کہہ کر تائی جان بھی اندر چلی گئیں۔ وہ ان کے آنے تک منہ لپیٹ کر لیٹ چکی تھی۔ اسے پتا تھا، سب کی نیند کا لحاظ کرتے ہوئے امی ابھی چپ رہیں گی اور بعد میں بھول بھال جائیں گی۔ پھر باسی کڑھی کو کتنے بھی ابال اٹھیں تائی جان کے یاد دلانے پر بھی امی ان سنی کر جائیں گی۔ نیند کا ناٹک کرتے ہوئے اسے بیچ میں نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو عصر کا آخری وقت تھا۔ وہ اکیلی ہی پڑی سو رہی تھی۔ جانے کب سب اٹھ کر چلی گئیں۔ نماز ادا کر کے وہ بھی کچن میں چلی آئی۔ بہن کی طبیعت کا خیال تھا ورنہ نماز کے فوراً بعد وہ دادا جان کے پاس جا بیٹھتی تھی اور پھر افطار کے دسترخوان پر ہی جانے کے لیے اٹھتی تھی۔

ضوفشاں اور نمرہ پھل کاٹ رہی تھیں۔ امی

پکوڑے تل رہی تھیں جبکہ شرمین دہی بھلے بنا رہی تھی۔ وہ ضوفشاں کے پاس پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔
"طبیعت ٹھیک ہوگئی آپی؟" سرخ سرخ سیبوں کا شاپر اپنے آگے سرکاتے ہوئے اس نے ضوفشاں سے پوچھا۔
"ہاں اللہ کا شکر ہے ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ آج میرا روزہ ہی رہ جائے گا۔" آستین سے ماتھا پونچھتے ضوفشاں نے جواب دیا۔

"اور یہ بتاؤ آج پھر نہیں گئیں پڑھنے؟" یہ وہ موضوع تھا جس سے تابندہ کی جان جاتی تھی۔ روزہ رکھ کر تو وہ ایک کے بعد دوسری سیڑھی نہیں چڑھتی تھی کہ کہیں کھایا پیا ہضم ہو گیا تو روزہ لگنے لگے گا اور یہاں اسے سات آٹھ منٹ کی مسافت طے کر کے ٹیوشن پڑھنے بھیجا جا رہا تھا۔ وہ خوشی سے سیب کی قاشیں کاٹ کاٹ کر رکھنے لگی کہ اس وقت خاموشی ہی بھلی تھی۔ یوں ہی تو بڑے بزرگ نہیں کہہ گئے۔
"ایک چپ سو سکھ۔"
"یہ بھلا کیوں پڑھنے جانے لگی؟ پیسے تو درختوں پر اُگتے ہیں ناں۔ مہینہ ختم ہوا نہیں اور مہارانی کا فیس کے لیے واویلا مچا نہیں۔ بھلا اگر پڑھنے ہی نہیں جانا تھا تو آگے داخلہ کیوں لیا۔ رزلٹ آجاتا تو پھر دیکھی جاتی۔" امی کھولتے تیل میں پکوڑے ڈالتے ہوئے گرمی اس پر نکال رہی تھیں۔ محاورہ غلط ہو گیا۔ شاید لکھنے والے نے لکھا ہو "سب چپ سو سکھ" اپنی سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آئی۔
"شرم نام کی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ اب تو ڈانٹ پر بھی ہنسی چھوٹ رہی ہے۔"
"امی چلی جاؤں گی کل۔ اب غصہ ختم کریں۔ پتا بھی ہے روزے میں دو قدم چلنے سے ہی میرا بی پی لو ہونے لگتا ہے اور باجی کا گھر تو پھر ایک گلی چھوڑ کر وہ لمبی گلی کے آخری کونے پر ہے۔" وہ سچ میں رو نکھی ہو رہی تھی۔ روزے میں پڑھنے جانے کا خیال ہی سوہان روح تھا۔

"ارے کیا ہوا اچھی جان؟ نصیب دشمناں کسی کی شامت آئی لگ رہی ہے مجھے۔" فراز جانے کب اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بات پر وہ تپ گئی تھی۔
"ہاں تم ہو لو خوش، میں ہی تو ہوں تمہاری سب سے بڑی دشمن۔ بڑا سکون ملتا ہے ناں مجھے رلا کے۔" اس کا موڈ بری طرح آف ہوا۔ روتے ہوئے پیڑھی دھکیل کر وہ دھپ دھپ کرتی دادا جان کے کمرے میں چلی گئی۔ فراز حیران پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔
"اسے کیا ہوا؟"
"امی نے ٹیوشن سے چھٹی پر ڈانٹا ہے۔" ضوفشاں نے مسکراہٹ دبائی۔
"چلو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بھی مطمئن ہو گیا۔
غصے کے مارے وہ افطاری کے لیے بھی باہر نہیں آئی۔ اسے لگا اسے کوئی نہ کوئی افطاری پہ بلا لے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اذان پر اس نے کمرے میں پڑے جگ میں سے نکال کر پانی پیا اور عصر کے وضو سے ہی مغرب کی نماز پڑھ لی۔ بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اور باہر جا کر وہ خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے بھیڑ چھٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ سب چلے گئے تو وہ باہر آگئی۔ کچن میں صرف ضوفشاں ہی تھی اور بھلا بہنوں سے کیسا پردہ؟ تلے قدم اٹھاتے وہ کچن کی طرف چل پڑی۔ ضوفشاں دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی بیٹھک کی طرف جا رہی تھی جہاں سفیان دھونے والے برتن اور افطاری کی بچی کھچی اشیاء لیے کھڑا تھا۔ وہ وہیں گرل کے ساتھ کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ضوفشاں برتن لے کر پلٹنے لگی تو سفیان نے آواز دے کر روک لیا۔
"ضوفی۔۔۔ طبیعت کیسی ہے اب؟"
"اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں اب تو۔" جھکی نظروں سے اس نے جواب دیا۔
"اپنا خیال نہیں رکھتی ناں۔ میرے پاس آؤ گی تو دیکھنا میں کیسے خیال رکھوں گا۔" سفیان نے گہری

نظروں سے ـــــ اسے کہا تو اس نے شرمیلی سی مسکراہٹ سے سر جھکا لیا۔ تابندہ بھوک سے بے حال ہو رہی تھی اور اس کی نظریں کچن کی طرف لگی تھیں اس لیے اس نے دیکھا نہیں، دیکھ بھی لیتی تو اس کی سمجھ میں ایسے معاملات نہیں آتے تھے۔ البتہ کمرے میں بیٹھی تائی جان اور چاچی بتول نے انہیں دیکھا تھا۔ سفیان کی بات اگرچہ انہیں سنائی نہیں دی تھی لیکن ضوفشاں کے چہرے پر گلال، جذبوں کی پوری تشہیر کر رہا تھا۔

"ایک وقت تھا ہم لوگ سگے بھائیوں کے سامنے کھڑے ہوتے بھی گھبراتے تھے، اب تو جانے کیسی ہوا چلی ہے، نہ آنکھوں میں حیا ہے نہ بڑوں کا لحاظ۔ لڑکیاں پہلے تو لڑکوں کو پیچھے لگا لیتی ہیں پھر شادی ہو جائے تو لڑکے ان ہی لڑکیوں کے پیچھے ماں باپ کے منہ کو آتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کبھی بھی لڑکے کی مرضی کی جگہ شادی نہ کرو، نہیں تو سمجھو لڑکا ہاتھ سے نکل گیا۔ اپنی مرضی سے ایسی بہو لاؤ جو دب کر رہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ کر بھی دے تو کیا؟ لڑکا تو یہی کہے گا ناں کہ بھئی اپنی مرضی سے لائے تھے اب خود ہی سنبھالو۔ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ کون سا مسئلہ ہے بھلا جس کا حل نہیں سوائے بے حیائی اور بے غیرتی کے۔"

تائی کو ان کے خیالات شاید پہلے سے معلوم تھے لیکن اب یہی خیالات الفاظ کے لبادے میں اتنے بھیانک لگ رہے تھے کہ وہ کچھ سوچ نہیں سکیں۔ اندر بیٹھی بتول کا دل تو ان کی باتوں نے ہولا ہی دیا تھا۔ ضوفشاں خوش شکل، حافظ قرآن، گھر داری میں طاق اور سب سے بڑھ کر ان کے بیٹے کی خواہش تھی، جس پر آمین کہتے انہوں نے عید پر نکاح اور مہینہ بعد نمرہ کی شادی پر رخصتی رکھی تھی لیکن اب بھابھی کی باتوں نے ان کے لیے سوچ کے مزید در وا کر دیے تھے۔ من چاہی بیویوں کے آنے کے بعد دونوں بھائیوں نے جس طرح بیوہ ماں سے صرف نظر کیا تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھیں اور پھر ماں کے آخری ایام کی اذیت کی تو وہ خود گواہ تھیں۔ تو کیا ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے؟

اس سوچ نے انہیں بھری شام میں کپکپا دیا تھا۔



حسب معمول دیر تک سونے کی وجہ سے سب کے سو جانے کے باوجود اس دوپہر بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تب ہی کچن میں ہلکی سی کھٹ پٹ کی آواز سن کر کچن میں چلی گئی۔ فراز فریج میں منہ دیے کھڑا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ عین اس کے کندھے کے پاس زور سے چلائی۔ وہ جلدی میں مڑا تو بری طرح اس سے ٹکرا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔

"میں دودھ لے کر آیا تھا، سوچا خود ہی رکھ جاؤں۔" بھرے منہ کے ساتھ اس نے بمشکل جواب دیا۔ تابندہ نے تو اس کا جواب سنا بھی نہیں، وہ تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے پھولے ہوئے گال دیکھ رہی تھی جن میں جانے کیا کچھ بھرا ہوا تھا۔

"تم نے روزہ توڑ دیا؟" صدمے کے مارے اس کی آواز ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔

"نہیں تو، اصل میں روزہ نہیں رکھا میں نے۔ گھر میں تو فریج میں صرف پانی کی بوتلیں منہ چڑا رہی ہیں یا کچی سبزیاں اور گوشت۔ سوچا دودھ کے بہانے کچھ کھا لوں۔ تمہیں تو پتا ہے مجھ سے بھوک بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی بس اسی لیے۔" اسے بتانے کے ساتھ ساتھ وہ فریج سے مختلف کھانے کی چیزیں جیب اور منہ میں بھرتا جا رہا تھا۔

"میں دادا جان کو بتا دوں گی۔ وہ خود تمہیں دیکھ لیں گے۔" اگلے پچھلے بہت سے حساب بے باق کرنے کا اس سے اچھا موقع اسے کہاں ملنے والا تھا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی، سمجھیں؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی فراز کے عقب سے تائی جان کی آواز ابھری۔

"یہ بھری دوپہر تمہاری جان کو کون سی مصیبت پڑ گئی جو سارے کام دھندے چھوڑ کر یہاں آ پڑے؟" تابندہ کو دیکھ کر تو جیسے ان کی آنکھوں میں چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ ان کا دل تو چاہ رہا تھا اسی بہانے اس کا

مزاج درست کردیں۔
"دودھ دینے آیا تھا۔ سوچا سب سو رہے ہوں گے سوائے اس ویلی مخلوق کے تو اسی کو آواز دی تھی۔" "چلو اب دودھ ڈال کر برتن خالی کردو۔ جاتے ہوئے لے جاؤں گا۔" ماں کو جواب دے کر وہ اس کی طرف پلٹا۔
۔وہ جانتی تھی تائی جان مطمئن ہوئیں یا نہیں۔ اب اس مضبوط بہانے کے آگے کچھ نہیں بولیں گی۔ ہوا بھی یہی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس چلی گئیں تو اس کی جان میں جان آئی۔ جانے کیوں تائی جان سے اس کی جان جاتی تھی۔
"شکریہ۔" دودھ ڈال کر برتن دھوتے ہوئے اس نے بنا مخاطب کیے کہا تو وہ قریب آکر کھڑا ہو گیا۔
"کس بات کا؟"
"جانتے ہوئے انجان بننا ضروری ہے کیا؟" وہ کہنا چاہتی تھی 'تائی جان سے بچانے کا' پھر بات بدل گئی۔
"یہی اگر میں کہوں تو؟"
"کیا مطلب؟"
"بس یہی تمہاری بات ہر بات ختم کر جاتی ہے۔" اس نے شیلف پر مکا مارا۔
"ویسے تمہاری خوشبو بہت ظالم ہے۔" تھوڑی دیر پہلے کا منظر یاد کرتے ہوئے اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
"مجھے لگتا ہے تمہیں تمہارے ہی پسینے کی بو چڑھ گئی ہے جو یوں اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔" برتن اس کے پاس رکھ کر وہ باہر نکل گئی۔
"بیوقوف 'کور ذوق'" کہہ کر برتن اٹھا کر وہ بھی باہر چلا گیا۔

☆☆☆

افطاری کے بعد گھر کے تمام بڑوں کی میٹنگ تھی۔ آج ضوفشاں اور سفیان کے نکاح کی باضابطہ طور پر تاریخ رکھی جانی تھی۔ نمرہ اور شرمین ہم عمر ہونے کے ناتے اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ کہنے کو تو روز جیسی رونق تھی لیکن خوشی کی گہما گہمی الگ ہی ہوتی ہے۔ بڑوں کے علاوہ کمرے میں کسی بچے کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی حالانکہ وجہ تو کچھ بھی نہیں تھی بس والدین کے بے وجہ کے حکم۔ سو وہ سب باہر بیٹھے مٹھائی کا انتظار کر رہے تھے۔ میٹنگ جب اتنی طویل ہو گئی کہ عشاء کے وقت بھی۔ کوئی نہیں نکلا اور پھر تراویح کا وقت بھی نکل گیا تو اپنی اپنی جگہ سب کو تشویش ہونے لگی۔ وہ تو سب کان لگائے بیٹھے تھے پھر جب کچھ سنائی نہیں دیا تھا تو ایک ایک کر کے وہ سب ہی چھت پر چڑھ گئے تھے۔
"یہ عید سے تیرہ دن پہلے مشترکہ طور پر اعتکاف میں تو نہیں بیٹھ گئے سب؟" تابندہ کے علاوہ کون اس طرح سوچ سکتا تھا۔
"مجھے تو لگتا ہے نکاح کے ساتھ رخصتی کے معاملات بھی طے پا گئے ہوں گے اور اب سب مل کر شادی کے انتظامات پر بات چیت کر رہے ہوں گے۔" فیضان نے بھی اندازہ لگایا۔
"جو بھی ہے پھر بھی اتنا وقت ہو چلا ہے' کوئی جائے دیکھ کر آئے بھلا۔" سفیان خود الجھ رہا تھا۔
"کون جائے گا؟ تابندہ کو بھیج دیں۔"
"خبردار جو میرا نام لیا۔ تائی جان اور امی تو مجھے کچا چبا جائیں گی۔" "فوراً" سے پہلے اس نے فیضان کی تجویز رد کی۔ "یہ فراز کہاں ہے؟ اسے بھیجیں۔ بڑا تیس مار خان بنا پھرتا ہے۔" تابندہ کی بات پر سب نے غور کیا کہ فراز ان میں موجود نہیں۔ جس طرح وہ ٹولیاں بنا کر بیٹھے تھے وہ کہیں بھی ایڈجسٹ ہو جاتا اسی لیے کسی کا دھیان نہیں گیا کہ وہ وہاں موجود نہیں۔
وہ وہاں موجود ہوتا بھی کیسے؟ وہ تو جب ضوفشاں کے نکاح کا معاملہ طے پایا تھا اور مٹھائی سے منہ میٹھے ہونے کو تھے تب ہی اندر پہنچ گیا تھا اور جب اس نے گھر کے سب مردوں کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا جس کو پورا کرنے میں کسی کو کوئی قباحت نظر نہیں آرہی تھی تب وہ جو اس سے ناں کروانے کا تہیہ کیے بیٹھی تھیں اپنی چپ' اپنی دلیلوں سمیت ہار گئی

تھیں۔ ان کے بیٹے نے ایسی جگہ ایسے وقت مہو چلا تھا
کہ وہ بنا کھیلے مات کھا گئیں۔

اس رات جب انہوں نے فراز اور تابندہ کے رشتے کے لیے ہامی بھری تھی اسی وقت انہوں نے تابندہ سے ناپسندیدگی کو بیر اور نفرت میں ڈھال لیا تھا۔ فراز سوچ رہا تھا وقت کے ساتھ ساتھ امی رشتے کو دل سے قبول کرلیں گی۔ آخر کو ان کے اکلوتے بیٹے کی خوشی تھی۔ ابھی تو صرف ان کا اقرار چاہیے تھا جو جذباتی دباؤ ڈال کر کروالیا گیا تھا۔ فراز نے پکا کام کیا تھا۔ ضوفشاں کے ساتھ تابندہ کا نکاح بھی رکھ لیا گیا تھا اور یہ خبر کمرے سے باہر افراد کے لیے متوقع ہوتے ہوئے بھی ایک بم تھی جو اس نے فی الحال اس کمرے کی حد تک محدود کروالیا تھا۔ وہ اپنے طور پر تابندہ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا ہزار لڑائیوں کے باوجود وہ انکار نہیں کرے گی اور اس گھر کے سب بڑے پرانی روایات واقدار کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ مگر بیٹے کی خوشی کے لیے وہ اس اہم خبر کو راز رکھنے پر رضا مند ہو گئے تھے۔ ویسے بھی ماں کی طرح فراز کو بھی قائل کرنے کا فن آتا تھا۔

رات جب وہ اس کمرے سے باہر نکلے تو مٹھائی کے انتظار میں اکثریت سو چکی تھی۔ وہ بھی زمین پر دراز صوفے پر ٹانگیں رکھے سو رہی تھی۔ شعلہ بار نظروں سے تکتے سب کے اصرار کے باوجود تائی جان اپنے گھر چلی گئیں۔ وہ ساری رات انہوں نے کانٹوں پر گزاری تھی۔ ان کی آخری امید فراز... ان کا سہارا سب ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ بیٹے کی خوشی سے زیادہ شکست کے احساس نے انہیں غضبناک کیا ہوا تھا اور وہ ان کی بے وجہ دشمنی سے بے خبر پرسکون نیند سو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اللہ میرے اللہ کہاں پھنس گئی میں۔" دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز اٹھائے نقاب سنبھالتی وہ پسینے میں شرابور ہوئی تھی۔

"شاپنگ آپی کی اور بے حال مجھے کیا ہوا ہے۔ بھلا آپی کو ساتھ لے کر آنا تھا ناں۔" وہ واقعی بے حال ہوئی تھی۔ روزے میں شاپنگ تو اس نے کبھی اپنی بھی نہیں کی تھی۔ امی لاکھ کہتیں لیکن اسے تو چاند رات کو ہی سب کچھ یاد آتا تھا۔ کبھی فراز کے ترلے کرتی تو کبھی سفیان کے پیچھے لگتی۔

"ہاں اسے لے آتی ناکہ شام کو افطاری میں صرف کھجوروں اور پانی پر گزارہ کرتے۔ ابھی تو گھر جاکر ابا جی کے اعتکاف کے لیے بھی تیاری کرنی ہے۔" امی کی بات پر اس کا دل مزید سمٹ گیا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا، بس میں نے کہہ دیا ہے آج مجھے ٹیوشن بھی نہیں جانا اور مجھے گھر جاکر کوئی کام بھی نہ کہے۔" اسے یقین تھا تائی جان کی طرف سے جوابی گولہ باری ہو کر رہے گی لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں بلکہ عام سے انداز میں مختلف چیزیں دیکھ رہی تھیں البتہ چاچی جان بول اٹھی تھیں۔

"اگر پڑھائی اتنی بار لگتی ہے تو ایف اے کافی تھا۔ ابھی رزلٹ آیا نہیں تو داخلہ بھی لے لیا، عجیب بات ہے۔" ان کے لہجے کا کھڑ پن وہ تو ازلی لاپروائی کی وجہ سے محسوس نہیں کر سکی لیکن امی نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ دیورانی کی عادت وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ خالص زنانہ عادتیں ٹوہ لینا۔ طنز کرنا باتیں بگھارنا یہ تو انہیں آتا ہی نہیں تھا تو پھر یہ طنز کا تیر کس ترکش سے نکلا تھا اور کیوں؟ ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑ گئی تھیں پھر جلد ہی شاپنگ میں مگن ہو کر بھول گئیں۔

واپسی تک تابندہ نڈھال ہو چکی تھی۔ روزے نہ ہوتے تو وہ ضد کر کے باہر سے کچھ کھالیتی لیکن روزہ چھوڑنے یا توڑنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

سارے شاپنگ بیگز صحن میں ڈھیر کر کے وہ بیٹھک میں گھس گئی۔ کولر کی ٹھنڈی نم ہوا گویا اس کے بدن کی مٹی سیراب کرنے لگی تھی۔ صبح ٹھیک سے سوئی بھی نہیں تھی پھر بازار کی خواری۔ وہ لمحوں میں سو گئی

تھی۔ ظہر کی نماز بھی اس کی نیند کی نذر ہو گئی تھی۔ جتنا وہ تھک گئی تھی وہ تو مغرب تک بھی سو سکتی تھی مگر بھلا ہو ضوفی کا جس نے اسے ٹیوشن کے لیے اٹھا دیا تھا۔ ضوفی کو تو وہ ٹال دیتی لیکن جب امی آگئیں تو اسے اٹھنا ہی پڑا۔ گھر میں اکیڈمی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے میٹرک تک وہ دادا جان کے پاس پڑھتی رہی تھی اور صرف وہ ہی نہیں گھر کے تمام بچے میٹرک تک ان کے پاس پڑھے تھے۔ آخر وہ گورنمنٹ ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔

میٹرک کے بعد ایف اے کے لیے اسے ایک گھریلو استانی کے پاس بٹھا دیا گیا تھا جن سے وہ بے حد مطمئن ہوئی تھی۔ رزلٹ آئے بنا وہ اچھی امیدیں لیے نہ صرف بی اے کی کتابیں لے آئی تھی بلکہ اس نے پڑھنے بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ باجی اس کی عادتوں سے اتنا ہی واقف تھیں جتنا خود اس کی سگی ماں۔ کتابیں منہ پر دھرے دیواروں کے سہارے انہوں نے اسے اونگھتے دیکھا تو وقت سے پہلے ہی گھر بھیج دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ خود سے چھٹی نہیں مانگے گی اور اگر اس وقت اسے پڑھایا تو۔ اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑے گا۔

سورج ڈھل رہا تھا۔ تھکا ماندہ دن جیسے شام کی ردا منہ پر اوڑھنے کو تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ گھر پہنچ گئی۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گزرتے گزرتے اس نے اندر جھانکا۔ اندر کوئی ذی روح نہ پا کر وہ کھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔ بیگ صوفے پر اچھالا اور منہ سے نقاب نوچ کر اتارنے کے بعد وہ کونے کے عین سامنے والے صوفے پر گر سی گئی۔

"اللہ کسی کو اتنا نازک بھی نہ بنائے اور اگر بنائے تو پوری آسائشوں کے ساتھ زمین پر اتارے۔"

آنکھیں بند کیے وہ بہ آواز بلند بڑبڑائی۔ اچانک نظروں کی تپش کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ دیوار گیر الماری کے ریکس میں سے کتاب ہاتھ میں لیے جانے وہ کون تھا جو اتنی دلچسپی سے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے جو نا ہاتھ میں پکڑا۔ بیگ اٹھایا اور دروازے کے پاس جوتا نیچے پھینک کر پاؤں میں پہنا اور جلدی سے نقاب چڑھا کر باہر نکل گئی۔ بولتی آنکھوں کی اصطلاح اسے آج سمجھ میں آئی تھی۔ اب یہ اس کی بد قسمتی ہی کہی جا سکتی تھی کہ اس بد حواسی کے عالم میں اسے بیٹھک سے نکلتے تائی جان نے دیکھ لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"کہیں نہیں گھر جا رہی ہوں بس۔" جواب دے کر اس نے تیزی سے گزر جانا چاہا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئیں تو اسے وضاحت کرنا پڑی۔

"غلطی سے اندر چلی گئی تھی۔ اندر مہمان ہیں شاید۔"

"تو اندر سے ہی چلی جاتیں" وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ بوکھلا کر موڑ مڑتے وہ تیزی سے گھر کے دروازے کی طرف لپکی۔ وہ کسی پر اپنی بیوقوفی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چاچو کے غصے سے تو وہ یوں بھی بہت ڈرتی تھی اور اب تو تائی جان جانے کیا کہیں گی، کسے کہیں گی اور کیسے کہیں گی۔ سوچ سوچ کر ہی اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ تب ہی یادداشت کے پردے پر چمکتی دو آنکھیں طلوع ہوئیں تو گھبرا کر دھیان ہٹانے کی غرض سے وہ کچن کی طرف لپکی جہاں افطاری کی تیاری اختتامی مراحل میں تھی۔

☼ ☼ ☼

"سنو۔" وہ نہا کر باہر نکلی تو شرمین نے آواز دے لی۔ لان کا دھلا سوٹ الگنی پر ڈال کر وہ شرمین کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"جی باجی۔"

"یہ بتاؤ نکاح کے سوٹ کا رنگ کون سا ہونا چاہیے؟"

شرمین کی بات پر وہ حیران ہوئی۔ ابھی وہ اور ضوفشاں خود ہی تو ناپ دینے گئی تھیں نکاح کا جوڑا لے کر۔

"سی گرین۔ نہیں میرا خیال ہے پستئی رنگ ہے میکسی کا۔" رنگ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں ضوفی کا نہیں تمہارا پوچھ رہی ہوں۔"

"میرا؟" وہ جی بھر کر حیران ہوئی تھی۔

"ہاں تمہارا۔ فراز نے دادا جان سے بات کر کے سفیان کے ساتھ اپنا نکاح بھی رکھوا لیا تھا۔ سب کا ارادہ تو تمہیں سرپرائز دینے کا تھا لیکن اب ظاہر سی بات ہے تمہارا نکاح ہے تو کپڑے وغیرہ تمہاری مرضی کے تو ہونے چاہئیں۔ اسی لیے فراز نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں بتائے بغیر تم سے تمہاری پسند اگلواؤں لیکن یہ ڈرامے بازی میرے بس کی بات نہیں۔"

شرمین نے عام سے لہجے میں بات کرتے اس کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا ورنہ وہ اسے بت بنے دیکھ کر ٹوکتی ضرور۔

فراز نے خود بات کی تھی مطلب۔۔۔ مطلب وہ اسے اپنی مرضی سے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ تو کیا وہ اسے پسند کرتا ہے؟ وہ بھی اس حد تک؟ اس کی سوچیں اس کا دل گدگدا رہی تھیں۔

"بولو بھی۔" شرمین کی آواز سن کر وہ اپنے حواسوں میں لوٹ آئی۔ "جو مرضی رنگ دیکھ لیں آپ خود۔"

"ہوں اور کسی پر ظاہر مت کرنا کہ تمہیں پتا ہے۔ میں اپنی مرضی کا کوئی رنگ بتا دوں گی۔" جواب سنے بغیر وہ سیڑھیاں اتر گئی۔

تابندہ دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔ تائی جان کا رویہ' ان کی ناپسندیدگی سب کچھ ذہن سے نکل گیا تھا۔ یاد رہا تو صرف اتنا کہ وہ کسی کو اتنی پسند ہے کہ وہ اسے زندگی بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ بڑی خوب صورت سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

سامنے گھر کے چھجے پر لگے زرد بلب کی مدھم روشنی میں اس کا وجود سونے میں ڈھلا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں اتنا کھوئی ہوئی تھی کہ اسے فراز کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ اچانک چہرے پر نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ نئے رشتے میں بندھنے کے خیال سے شرما کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خوش ہو ناں؟" اس نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

"میں سمجھتا تھا تم معصوم ہو۔ تمہیں دنیا اور دنیاداری کا کچھ نہیں پتا۔ تم ایک کوری سلیٹ لگتی تھیں مجھے جس پر میں اپنا لمس' اپنا نام لکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے نہیں پتا تھا تمہاری ناسمجھی اور معصومیت بناوٹی تھی۔ تم وہ عبارت ہو جس میں ایک نقطے کی بھی گنجائش نہیں۔" وہ حیرت سے کھڑی فراز کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔

"میں نے تمہارا پھوہڑپن' تمہاری کام چوری' زبان درازی ہر چیز سے صرف نظر کر کے امی سے تمہارے لیے جھگڑا مول لیا تھا۔ ان کی نظر جو دیکھتی تھی مجھے وہ سب غلط لگتا تھا اور آج۔۔۔ آج مجھے احساس ہوا کہ غلط تو میں تھا۔ شکر ہے کسی بڑے نقصان کے بغیر تمہاری اصلیت کھل گئی۔ تم تو اس قابل تھیں ہی نہیں کہ میں تمہیں سوچتا بھی۔" اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ میں افسوس' دکھ' غصہ' طنز' حقارت پتا نہیں کیا کیا کچھ تھا۔ وہ سن ہو کر وہیں کھڑی رہ گئی۔ فراز جا چکا تھا لیکن اس کے لفظوں کی بازگشت اس کی سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ کیا کہہ گیا تھا؟ کیوں کہہ گیا تھا؟ وہ یکسر انجان تھی۔ گرم سیال اس کے گالوں پر بہہ نکلا۔ جانے کب تک اس بارش نے اس کا تن من بھگونا تھا۔

"آپی! نیچے بلا رہے ہیں۔" ثمو کی آواز پر من من بھاری قدم لیے آنکھیں صاف کرتی وہ نیچے اتر آئی۔

شاید یہی حشر کا دن تھا وہ حشر جس میں اس سے ناکردہ گناہوں کا حساب لیا جا رہا تھا۔ چاچو' چاچی' تائی جان' تایا ابو' امی' ابو اور سب۔۔۔ سب موجود تھے۔ تائی جان فاتحانہ تاثرات کے ساتھ کھڑی تھیں۔

"جھوٹ بولوں تو اندھی ہو جاؤں کہ ان گناہ گار آنکھوں سے اسے' بیٹھک میں اس جوان جہان اکیلے

مرد سے مل کر باہر نکلتے دیکھا ہے۔ ماں باپ پر چشم پوشی واجب ہے لیکن میں چپ نہیں رہوں گی۔ غضب خدا کا ایک لمحے کو عزت کا خیال نہیں آیا۔ پتا نہیں کب سے اندر تھی۔ ٹیوشن گئی بھی تھی یا۔۔۔"

"بھابھی! اللہ کا واسطہ اس سے کچھ پوچھ تو لینے دیں۔" امی نے بات کاٹی۔

"ارے تم پوچھو' اس کے جھوٹ سچ سنو۔ میں تو آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں کر سکتی۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ بھری دوپہر آنکھوں میں دھول جھونک کر فون چھت پر لیے جا رہی تھی جانے فون کر کے۔۔۔"

"بھابھی! اندر بیٹھیں' بات کرتے ہیں۔" اب ابو نے انہیں ٹوک دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اندر سما جائے۔

"بھائی معاف رکھو مجھے تو۔ جو سنتا ہے اسے سناؤ باتیں۔ فراز اب بھی آنکھوں دیکھی مکھی نگلنا چاہے تو شوق سے لیکن پھر اس گھر میں فراز رہے گا یا میں۔"

"تابندہ! بتاؤ کیا ہوا تھا شام کو جب تم۔۔۔" تایا جان نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔ اس کے تو حلق میں جیسے ببول اگ آئے تھے۔ پپڑی زدہ ہونٹوں پر اس نے خشک زبان پھیری۔

"میں۔۔۔ ٹیوشن سے میں جلدی آ گئی تھی۔" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

"جلدی کیوں آئی تھیں؟"

"تایا ابو! میں نے خود چھٹی نہیں مانگی تھی۔ وہ تو باجی نے خود مجھے بھیج دیا تھا۔"

"کیوں بھیجا تھا؟"

"میں۔۔۔ ادھر سو رہی تھی۔" کھڑے ہونے اور بولنے میں اتنی دقت ہو رہی تھی کہ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بستر میں جا پڑتی۔

"گھر آ کر۔۔۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔"

"اللہ توبہ۔۔۔ کتنا جھوٹ۔ اندر ابا جان کے شاگرد کا بیٹا نہیں تھا؟ ساری سہ پہر وہ اس بیٹھک میں رہا تھا۔" تائی جان پھر بول اٹھیں۔ اسے اپنی قوت گویائی سلب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تھا۔۔۔ لیکن میں نے نہیں دیکھا تھا۔"

"شاباش بھئی شاباش۔۔۔ اتنا کڑیل جوان مرد اسے نظر نہیں آیا۔ جھوٹ کے واقعی پیر نہیں ہوتے' اس کا تو سر بھی کوئی نہیں۔ آپ لوگ سنیں اس کے جھوٹ کے پلندے۔ میں جھوٹی ہوں تو یہ سچی۔۔۔ چل شرمین" وہ شرمین کی طرف مڑیں۔

"چل کر سحری کی تیاری کر۔" ان کی بات کا مطلب سب نے سمجھ لیا تھا۔ ان کے جاتے ہی تایا ابو بھی ان کے پیچھے نکل گئے تھے۔ چاچی بتول' چاچو' سفیان' فیضان اور نمرہ بھی چلے گئے۔ امی ابو اندر کمرے کی طرف چل دیے۔

"مجھے ہمیشہ لگتا تھا میری تابندہ بڑی بخت آور ہے لیکن آج جو سیاہی تیری وجہ سے مقدر بنی ہے وہ تجھ سمیت ہم سب کو بد بخت کر گئی ہے۔" ابو کی بات پر اس کا دل پھٹنے کو ہو گیا تھا۔

"اللہ میں مر کیوں نہیں گئی اس سب سے پہلے۔" اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔

امی اس کے پاس آئی تھیں۔ لکنت زدہ زبان اور آنسوؤں کی روانی میں اس نے الف سے یے تک ساری کہانی سنا دی تھی۔ واقعی کہانی کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ یہ تو تائی جان کی سوچ تھی جس نے اس بت کو اپنی مرضی سے تراش کر سب کے سامنے رکھا تھا۔ وجہ وہ نہیں جانتی تھی لیکن امی شاید اس کی وجہ جانتی تھیں۔ انہوں نے اس کی بات کا یقین کیا یا نہیں وہ نہیں جانتی تھی۔ جانتی تھی تو بس یہ کہ اس وقت کی اذیت شاید ہی وہ کبھی بھول پائے۔ اٹھارہ سالہ زندگی کے معمولات میں پہلی دفعہ یہ تبدیلی آئی تھی کہ سحری میں تائی جان کے گھر کا کوئی فرد نہیں تھا۔ ساری رات جاگ کر گزری تھی تہجد تو کیا پڑھتی۔ کچن میں جا کر کسی کا بھی سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اس میں گومگو کی کیفیت میں چارپائی پر بیٹھی سوچتی رہی۔ سحری کا وقت

ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ تھے جب ضوفی اسے بلانے آگئی۔
"مجھے تو لگا تم اٹھیں ہی نہیں۔" وہ کہہ نہیں سکی کہ میں تو سوئی ہی نہیں۔ سوجی آنکھوں والے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر وہ سحری کے لیے باہر چلی گئی۔ بچپن سے ہی گھر کے تمام بچوں کو صبح کے سلام کی عادت پکی کروادی گئی تھی اور آج تو اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ فضا میں تحلیل ہو جائے۔ اس کی غائب دماغی محسوس کر کے ضوفشاں نے جلدی سے سحری اس کے سامنے رکھی۔ چھوٹے چھوٹے نوالے وہ حلق سے ثابت ہی اتار رہی تھی جب بے دھیانی میں نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ پانی کہیں پاس نہیں تھا۔
"چ... چاچی... پانی۔" بتول چاچی کے پاس پانی کا جگ پڑا دیکھ کر اس نے مشکل سے انہیں پکارا۔ بجائے پانی دینے کے وہ اس کا چہرہ تکنے لگیں۔
"کیا ہوا؟" ضوفشاں نے پوچھا۔
"کچھ نہیں، دیکھ رہی ہوں ابھی رات اتنا تماشہ ہوا ہے اور یہ کس حوصلے سے مجھ سے مخاطب ہے۔" پانی دیے بنا انہوں نے جواب دیا۔ تذلیل کے احساس سے اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔
"بنا ثبوت کسی پر الزام دھرنا تہمت ہوتی ہے بتول! اور بہتان تراشی کی سزا تو تم بھی جانتی ہی ہو۔" پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھتے امی نے کہا تو چاچی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کچھ کہے بغیر وہ اٹھیں اور دروازہ کھول کر اپنے گھر چلی گئیں۔ یہ امی کی بات کا ہی ردعمل تھا کہ اس شام افطاری پر صرف وہ گھر والے ہی تھے۔ چاچی بتول کے گھر سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد آنے والے تمام روزے ایسے ہی تھے۔ سب رونق ختم ہو گئی تھی۔
اس دفعہ چاند رات بھی ویران سی تھی۔ تینوں گھروں میں سے کوئی بھی چھت پر چاند دیکھنے نہیں چڑھا تھا۔ ٹی وی پر چاند نظر آجانے کی اطلاع پر دادا جان کو اعتکاف سے اٹھانے کے لیے گھر کے مرد اپنے طور پر پھولوں کے ہار لے کر گئے تھے۔ دادا جان کو کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ انہیں کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنی آل اولاد کے لیے خوشیوں، رحمتوں کی دعائیں کر کے خوش خوش لوٹے تھے۔ تایا جان اور چاچو نے اتنے دن بعد اس گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ دادا جان کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا اور اس وقت بیٹھک میں خوب رونق لگی تھی۔ ایک آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ انہیں ابھی تک گھر کے اندر جا کر خواتین سے ملنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ رات کے گیارہ بجے جب سب ملنے جلنے والے ایک ایک کر کے نکل گئے تو بیٹھک میں ان کے بیٹوں کے ساتھ صرف قیوم انصاری رہ گئے تھے۔
"ماشاء اللہ خوشی کا موقع ہے، اللہ خوشیوں میں اضافہ کرے، آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔" کافی دیر تنہائی کا انتظار کرتے رہنے کے بعد قیوم انصاری گویا ہوئے۔
"سب کچھ میرے بچوں کا ہی تو ہے اور شاگرد بھی بچے ہی ہوتے ہیں۔" دادا جان نے خوش دلی سے جواب دیا۔
"اصل میں، میں اپنے بیٹے کے لیے آپ کے گھر سے تابندہ کو بیٹی بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔" ناپ تول کر بولتے انہوں نے دادا جان کا چہرہ بغور دیکھا مبادا ناگوار گزرے۔
"برخوردار! دیر کر دی آپ نے۔ تابندہ کا تو کل نکاح ہے اور اسی مہینے میں رخصتی ورنہ مجھے بھی خوشی ہوتی آپ سے رشتہ جوڑ کر۔" دادا جان کی بات پر ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔
"ویسے میری ساری بچیاں نیک ہیں۔ پیاری ہیں۔ آپ کسی اور کی بات کرتے تو میں آپ کو خالی نہ لوٹاتا۔ دل مانے تو ابھی بھی سوچ لیں۔"
"نن نہیں... بچیاں تو ماشاء اللہ سب ہی پیاری ہوتی ہیں۔ اصل میں میرے بیٹے نے شاید تابندہ کو

دیکھا ہے جو میں نے خواہش ظاہر کی تو اس نے۔۔۔ خیر اللہ پاک بچیوں کے مقدر اچھے کرے۔" ان کی بات پر دادا جان کے علاوہ تینوں کے چہرے تن گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد جب وہ اندر گئے تو ایک قیامت ان کی منتظر تھی۔ ہم سفر سے دائمی جدائی کے بعد بھی انہوں نے اولاد کو جس طرح سنبھالا تھا' ساتھ رکھا تھا' بلاشبہ قابل تحسین تھا لیکن پتا نہیں اس خوب صورت نشیمن کی کون سی بنیاد غلط پڑ گئی تھی کہ چند گنتی کے دنوں میں ان کی محبت کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ عمر کے اس حصے میں انہیں مات ہو گئی تھی۔ جن اصولوں پر انہوں نے اپنی زندگی بسر کی' اپنی اولادوں کی زندگیوں کی بنیاد رکھی وہ سب اصول غلط ثابت ہو گئے تھے۔ لیکن قیامت ابھی تمام کہاں ہوئی تھی۔ ان کا چھوٹا بیٹا گھر والی کی ایما پر ضوفشاں کے لیے بھی انکار کر گیا تھا۔

لوگ خوشیوں میں مگن آنے والے دن کی تیاری کر رہے تھے اور اس گھر میں نئے سرے سے صف ماتم بچھ گئی تھی۔ ابھی تو عزت پر ہوئے وار کی بھرائی نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا زخم بھی لگ گیا۔

امی جو تابندہ کے دکھ پر خاموش ہو گئی تھیں اب ٹوٹ ٹوٹ کر روئی تھیں۔ دادا جان تو جیسے اندر سے ہی ٹوٹ گئے تھے۔ چہرے پر شکستگی کے آثار واضح تھے اس کے باوجود کھوکھلے لہجے کو مضبوط کرتے انہوں نے دونوں بیٹوں سے کہہ دیا تھا۔

"میرا صرف اس گھر اور اس گھر میں رہنے والوں سے تعلق ہے۔ جو ان سے ملے گا وہی مجھ سے امید رکھے۔" انہیں یقین تھا تابندہ جیسی کچے ذہن کی لڑکی ایسی خار دار راہوں کی مسافر ہو ہی نہیں سکتی جہاں عفت کے آنچل تار تار ہوں۔ جانے کس کی نظر لگ گئی ان کی خوشیوں کو۔

ضوفشاں کسی کے سامنے نہیں روئی مگر ساری رات اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔ اسے تو اپنا قصور بھی نہیں پتا تھا۔ قصور تو تابندہ کا بھی کوئی نہیں تھا پھر بھی اس کے کردار پر الزام کی کیچڑ تھی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ امی ابو نے بھی وجہ پوچھنی ضروری نہیں سمجھی۔ وہ سفیان سے بات کرنا اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن کیسے؟ نہ اس کے پاس فون تھا کہ اسے کال کر لیتی نہ ہی وہ خود ادھر جا سکتی تھی۔ وہ بھی تو نہیں آیا تھا۔ تابندہ خود کو دہرا مجرم سمجھ رہی تھی۔ پہلے ماں باپ کی عزت پر حرف آیا اور پھر بہن کا گھر بسنے سے پہلے اس کی سب امنگیں اجڑ گئیں۔

عید کی صبح ہمیشہ سے مختلف تھی۔ جیسے ہواؤں کو بھی خبر ہو گئی ہو۔ چڑیاں ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرتیں یہاں سے بسائے دل اور بسنے والے گھر برباد ہو گئے ہیں۔ اداسیوں کا سورج طلوع ہوا اور ناکام و نامراد ڈوب گیا۔ دونوں گھروں میں سے کسی نے میٹھا نہیں بھیجا۔ کوئی عید مبارک نہیں کھنکی' کسی ہتھیلی پر مہندی نے رنگ نہیں جمایا' کسی سانس کو حنا نے نہیں مہکایا۔ کسی کمرے سے کپڑوں اور میچنگ چیزوں کی پکار نہیں پڑی۔ قبرستان سا سناٹا طاری تھا۔ دیواریں بھی کسی سوگ میں ڈوبی سر جھکائے سوچ میں گم تھیں۔

آنے والے دن اس سے مختلف نہیں تھے۔ وہ سب مشینی انداز میں مقررہ وقت پر اٹھتے سوتے' کھاتے پیتے اور کام نمٹاتے۔ زندگی سے جیسے زندگی نکل ہی گئی تھی۔ امی سارا دن چارپائی پر لیٹی روتی رہتیں۔ مہینہ ہو چلا تھا لیکن کسی کا بھی سوگ کم ہونے کو نہیں آرہا تھا۔ آج بھی ضوفی آدھی آدھی رات تک چپکے چپکے روتی رہی تھی۔ جانے کس دیوار' کس سوراخ میں الو بیٹھا نحوست کے منتر پڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

"امی! چاچو آئے ہیں۔" دروازہ کھول کر شمو بھاگتی ہوئی امی کے پاس پہنچی تھی۔ دوپٹے پر لیس لگاتی ضوفشاں کا ہاتھ لرزا اور سوئی انگلی میں گھس گئی۔ خون ایک نقطے کی طرح نمودار ہوا اور قطروں کی صورت

اس کے دامن پر گرنے لگا لیکن اسے احساس کہاں تھا۔ چاچو! سفیان نے نہ بھیجا ہو۔ اس کا دل خوش فہمیوں کی تتلیوں میں گھر گیا۔

چاچو دادا جان کے کمرے میں تھے۔ معافی تلافی کی دبی دبی آوازیں اور دادا جان کی نحیف لیکن پاٹ دار آواز کمرے میں گونجتی کمرے سے نکل کر ان کی سماعتوں میں من چاہے گیت گھول رہی تھی۔ امی منتظر ہی رہیں لیکن انہیں بلایا نہیں گیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ خود اٹھ کر دادا جان کے کمرے میں گئیں۔

"ابا جان! خیریت تو ہے؟" سن تابندہ بھی رہی تھی لیکن ضوفشاں کا تو رواں رواں کان بنا ہوا تھا۔

"نمرہ کی شادی ہے اگلے ہفتے۔ کارڈ دینے آیا تھا۔ میں تو حیران ہوں کس منہ سے آگیا ادھر۔" ان کی بات پر امی کی بھی امید ٹوٹی تھی اور ضوفشاں کی خوش فہمیاں بھی دم توڑ گئی تھیں۔ اگر نکاح ہو جاتا تو اب اس کی بھی رخصتی ہوتی۔ ایک ہوک سی اس کے دل میں اٹھی۔

اسے یقین تھا سفیان چاچی کو منالے گا لیکن... لیکن اس نے تو رابطہ بھی نہیں کیا۔ اس کا بہت دل دکھا تھا۔ نئے سرے سے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

"میں نے تو صاف جواب دے دیا۔ منتیں کر رہا تھا۔ پیر پکڑ رہا تھا کہ اس کی بیٹی کو دعاؤں کے سنگ رخصت کروں۔ کیوں؟ کیا اس کی بیٹی مجھے زیادہ پیاری ہے؟ ارے میری ضوفی 'تابی کے برابر کوئی نہیں ہے۔ لکھ کر رکھ چھوڑیں۔ ساری زندگی ان کے گھروں میں قدم نہیں رکھوں گا۔ نہ دل میں ان کے لیے کوئی دعا آنے دوں گا۔" بولتے بولتے ہانپنے لگے تو چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"سارے حق ماں کے ہی نہیں ہوتے۔ باپ ہوں۔ اپنی کمائی 'اپنے خون کا ایک قطرہ نہیں بخشوں گا۔ باپ تو جنت کا دروازہ ہوتا ہے۔ اللہ نے معاف کر بھی دیا تو میں راستہ روک رکھوں گا۔" دبتے دبتے آواز بڑبڑاہٹ رہ گئی تھی۔ امی خاموشی سے بستر پر جالیٹیں۔

شام کو ابو دکان سے آئے تو انہوں نے بھی ابا جان کے پاس پڑا کارڈ دیکھا۔ اپنے دل کی حالت صرف وہی سمجھ سکتے تھے۔ دل تو ان کا بھی خون کے آنسو رویا تھا لیکن اپنے بھائیوں میں وہ ذرا مختلف مزاج کے تھے۔ اب بھی اپنا دکھ سائیڈ پر رکھ کر وہ غیر جانبداری سے سوچ رہے تھے۔

"ابا جان آپ کو جانا چاہیے شادی میں۔"

انہوں نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔ ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا جب اس کی عزت پر بھائی نے کیچڑ اچھالی اور دوسرے بھائی نے سہارا دینے کی بجائے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور آج وہ انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ ان کی خوشیوں میں شریک ہوں۔

"ابا جان! بچیاں تو سانجھی ہوتی ہیں ناں۔ کوئی بات نہیں اگر وہ نہیں سمجھتے لیکن یہی حقیقت ہے۔ اگر میری بچیوں کا قصور نہیں تو قصور ان بچیوں کا بھی نہیں۔ آپ کی دعاؤں' آپ کی محبتوں پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے۔"

بیٹے کی اعلیٰ ظرفی پر ان کی آنکھیں بے اختیار چھلک اٹھیں۔ دل راضی ہوا یا نہیں لیکن دماغ راضی ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے' چلا جاؤں گا دعا دینے۔"

"دادا جان ہم کیوں نہیں جا سکتے؟ کارڈ پر ابو کا نام لکھا تو ہے۔" تابندہ کی بات پر دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ چائے رکھ کر وہ مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

"میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا تائی جان چاچی کو..." وہ ہچکچائی۔

"کیا؟" دادا جان نے پوچھا۔

"تائی جان' چاچی کو آپی کے بارے میں الٹا سیدھا بول رہی تھیں۔ آپ کے اعتکاف پر بیٹھنے سے پہلے۔" وہ کہہ نہیں سکی کہ الزام لگنے سے پہلے۔

"چاچی نے ان کی باتوں کے زیر اثر ہی... مجھے لگتا ہے ہمیں جانا چاہیے۔ شاید... شاید ان کے انکار کا سبب پتا چلے اور اگر اللہ کی ذات کرم نوازی کردے تو ہو سکتا ہے بگڑی سنور جائے اور رشتے ٹوٹنے سے بچ جائیں۔"

ابو کے سامنے اپنی رائے کا اظہار گو کہ بہت بہادری سے کیا تھا اس نے 'لیکن رد عمل دیکھنے کی ہمت اس

میں نہیں تھی اس لیے فوراً" اٹھ کر باہر نکل گئی۔ پیچھے ان دونوں کے چہروں پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔



گلی میں لگے شامیانے میں اس وقت روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ سبز، سرخ اور پیلے رنگوں کے امتزاج سے بنے گوٹے کناری والے ملبوسات پہنے لڑکیاں ادھر سے ادھر چوڑیاں کھنکاتی ہنستی مسکراتی اڑتی پھر رہی تھیں۔ آج نمرہ کی مہندی تھی۔ پیلے جوڑے میں ملبوس، سر پر تیل ملے، ملگجے حلیے میں بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر ان کو سامنے دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی۔ پھر اٹھ کر گرمجوشی سے ضوفی کے گلے لگی۔ آنکھیں بے اختیار بہنے لگی تھیں۔ تابندہ نے بھی گلے لگ کر اسے مبارک دی۔ اس کے اصرار پر بھی وہ اس کے پاس نہیں بیٹھیں۔ نسبتاً" پرسکون گوشہ دیکھ کر وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئیں۔ امی نے آنے کا سن کر خوب شور مچایا تھا لیکن ابو نے انہیں منا ہی لیا تھا۔ اب بھی وہ بیزار سی بیٹھی تھیں۔ ضوفشاں کی متلاشی نظریں سفیان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہ پہلی بار تھا جو اتنے دن سے انہوں نے ایک دوسرے کا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہ لڑکی ہے ناں جس کا عین نکاح کے دن رشتہ ٹوٹ گیا تھا؟" ان کے عقب سے آواز ابھری۔ ان سے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا گیا۔

"ہاں یہی ہے۔ اتنی خوب صورت ہے، جانے کیا بات ہوئی جو سگے چاچا نے رشتہ چھوڑ دیا۔"

"کیا بات ہو گی؟ کچھ نہ کچھ دیکھ کر ہی چھوڑا ہو گا بھلا۔ رشتے داروں سے بہتر کون جانتا ہو گا۔ خالی شکل سے تو گزارہ نہیں ہوتا ناں۔ کردار بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

ضوفشاں کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ امی سے بھی بیٹھنا دوبھر ہوا تھا۔

"میں نے تو سنا ہے ان کی چھوٹی لڑکی کا بھی چکر تھا کسی لڑکے سے۔ تب ہی تو نفیسہ نے رشتہ نہیں لیا اور تو اور لڑکے نے رشتہ بھی ڈالا تھا۔ چھوٹی کے یہ گن ہیں تو بڑی کے سوچ لو۔"

باتیں تھیں یا زہر جو ان کی سماعتیں مردہ کرتا جا رہا تھا۔ تابندہ سن ہو کر بیٹھی تھی۔ ضوفشاں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے آنکھوں میں آنسو قید کرتی تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف بھاگی۔ اسی جلدی میں وہ سامنے آتے دشمن جاں سے ٹکرا گئی۔ بڑھی شیو اور بکھرے بالوں کے ساتھ مسلے لباس میں وہ سفیان ہی تھا۔ اسے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ آئی ہے۔ زرد لباس میں خود بھی وہ زرد کلی ہی لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کوئی حق نہیں آپ کو یہ پوچھنے کا۔" آنسو پیتے ہوئے وہ ضبط سے بولی۔

"حق..... میرا ہی ہو گا ان شاء اللہ۔ بس تم ثابت قدم رہنا۔ یہ نہ ہو میں ساری لڑائی جیت کر آؤں تو تم انتظار سے تھک کر نئی منزلوں کی مسافر ہو جاؤ۔"

مخصوص دھیمے لہجے میں کہتے وہ اس کے پاس سے گزر کر چلا گیا۔ اس کے سوختہ من پر ٹھنڈی نرم پھوار برسنے لگی تھی۔ اس کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ سفیان ساتھ چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اپنے حالات کے ساتھ نبرد آزما ابھی بھی وہ دل میں اس کی خواہش لیے بیٹھا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس نے آنے والے وقت کے خوش کن تصورات میں پرسکون رات گزاری تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" نمرہ مکلاوے کے بعد رہنے آئی ہوئی تھی۔ دال چنتی ماں کے پاس بیٹھ کر اس نے تمہید باندھی۔

"ہاں کہو۔"

"وہ... میری ساس ہیں ناں!" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے کرے۔

"ہاں کیا ہوا؟" اس کے جھجکنے پر انہیں اندازہ ہوا تھا کہ بات کچھ خاص اور توجہ طلب ہے سو پوری طرح

متوجہ ہو کر بیٹھ گئیں۔
"انہوں نے عثمان کے لیے ضوفی کے رشتے کا کہا ہے۔" اس نے اپنے دیور کا نام لیا تو بتول کے ہاتھ سے دال والی ٹرے پھسل گئی۔ بھلا نمرہ کے سسرال میں ضوفی کا رشتہ کیسے ہو سکتا تھا۔
"انہوں نے شادی میں کہیں دیکھا تھا پھر تصویروں میں دیکھ کر پوچھا تو میں نے بتا دیا تایا کی بیٹی ہے' پوچھا شادی شدہ تو نہیں۔ میں نے کہا نہیں تو پھر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
"تم نے کہہ دینا تھا ناں کہ ہمارے خاندان میں ایک گھر میں دو لڑکیاں نہیں دیتے۔"
"میں نے کہا تھا لیکن وہ کہنے لگیں میرے دو ہی تو بیٹے ہیں۔ دونوں بہنیں گھر سنبھال لو گی اور ساری زندگی دونوں بھائی بھی تم دونوں کی نسبت سے بندھے رہیں گے۔"
وہ تو سچ مچ چکرا گئی تھیں۔ ابھی تو بیٹے کی گلو خلاصی کروائی تھی اور اب بیٹی پر بات آ گئی تھی۔ یا اللہ کیا کروں ان لوگوں نے تو میرا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔ بھلا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اب بھابی کہیں اور رشتہ دیکھ کر چلتا کریں۔ پر نہ جی ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ وہ کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔
"تم کہہ دینا کہ اس کا رشتہ ہو گیا ہے۔"
"امی ابھی میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ کوئی غلط بیانی میرے گلے پڑ گئی تو ساری زندگی جان نہیں چھوٹے گی۔" نمرہ کی بات پر وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ انہوں نے آج تک کبھی ایسے معاملے دیکھے ہی نہیں تھے۔ جب ضرورت ہوتی بھائی بھابی آگے ہو جاتے اور ان کی جان چھوٹ جاتی۔ یہاں تک کہ نمرہ کا رشتہ کروانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ سوچ سوچ کر کچھ سمجھ نہیں آیا تو خیال آیا بڑی جٹھانی سے مشورہ کیا جائے۔ سو چادر سر پر ڈالے وہ ان کی طرف جا پہنچیں۔
"بھابی! بتائیں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" ساری بات بتا کر انہوں نے مشورہ مانگا۔

نفیسہ خود سوچ میں تھیں۔ یکایک ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
"میرے پاس ایک آسان سا حل ہے۔"
"وہ کیا...؟"
"بہنوں کا گھر بسانے کے لیے بھائی قربانی دیتے آئے ہیں اگر نمرہ کی خاطر سفیان سے جڑے ارمان قربان کر سکو تو۔" وہ دبے دبے جوش سے بے ربط بول رہی تھیں جو بتول کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔
"میں سمجھی نہیں بھابی۔"
"دیکھو تم خود بھی جانتی ہو۔ ضوفشاں میں کوئی برائی نہیں۔ تم کو گھر دار اور خوب صورت بھی ہے۔ تم اسے سفیان کے لیے لے آؤ تو ساری زندگی بیٹا بھی احسان مند رہے گا اور بہو بھی اور جب ضوفشاں ہو گی تمہاری بہو تو نمرہ کی ساس خود ہی چپ کر جائے گی۔" بتول نے ساری بات حیرت سے سنی تھی۔ ان سے تو کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
"سوچتی ہوں بھابی۔" بڑی مشکل سے یہ تین الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔
"ارے اس میں کیا سوچنا۔ گھر کی بچی ہے۔ دیکھی بھالی ہے بچپن سے تو نظروں کے سامنے ہے۔" وہ تو جیسے انہیں قائل کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور بتول کی سمجھ میں یہ ہی بات نہیں آ رہی تھی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تو کلن بھر بھر کے انہوں نے اس رشتے سے بددل کیا تھا اور آج خود ہی اس رشتے کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں۔ ویسے بھی یہ کون سا گڈے گڈی کا کھیل تھا جو آج رشتہ کیا۔ کل توڑ دیا' پرسوں پھر جوڑ لیا۔ بجائے مسئلے کا حل نکلنے کے وہ اور الجھ گئی تھیں۔
"شرمین بھی تمہاری ہی بیٹی ہے۔ نمرہ کی ساس سے اس کی بات کر کے دیکھنا۔ اللہ کرے بات بن جائے۔ دونوں بہنیں ساتھ خوش رہیں گی۔" وہ اٹھ کر آنے لگیں تو نفیسہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔
شاید یہ پہلی بار تھا جب انہوں نے وہی سنا جو بات تھی۔ انہوں نے اپنی سماعتیں' بصارتیں انگڑائی لے کر جاگتی محسوس کیں۔ رسمی طور پر بھی وہ انہیں تسلی

نہ دے سکیں۔



"سامنے والی آنٹی بتا رہی تھیں کہ تائی جان نے فراز کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔" ثمرہ ابھی سامنے والے گھر میں قربانی کا گوشت دے کر آئی تھی اور اب تازہ ترین خبر سنا رہی تھی۔

"اچھی بات ہے۔ اللہ نیک نصیب کرے۔" امی نے دکھتے دل سے دعا دی تھی۔ تابندہ نے ان سنی کرتے ہوئے مزید چند گوشت کے بھرے شاپر ڈش میں رکھ کر ثمرہ کو تھما دیے تھے۔

ضوفشاں حیرت سے سوچتی ہی رہ گئی۔ اب اگرچہ کوئی آس نہیں تھی پھر بھی اسے عجیب ہی لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تابندہ کو وہ کب سے پسند کرنے لگا تھا۔ تو کیا وہ صرف پسند ہی تھی؟ حیرت تو اسے تائی جان اور تایا ابو پر بھی تھی۔ کیسے دل تھے ان کے۔ ایک عرصہ ساتھ گزارنے کے بعد آج وہ بالکل اجنبی بن گئے تھے۔ اتنے اجنبی کہ محلے کے لوگ ان کے معاملات سے واقف تھے۔ ان کا تو دادا جان سے ملنے کو بھی دل نہیں چاہا تھا۔ اسے پچھلے سال کی اور اس سے بھی پچھلے سالوں کی عیدیں یاد آ رہی تھیں جب تینوں گھروں میں باری باری ترتیب سے قربانی ہوتی تھی۔ پہلے تایا جان کے گھر قربانی ہوتی اور سب وہیں ہوتے۔ کھانا پکتا اور ختم دلایا جاتا۔ سب وہیں کھانے کھاتے تب تک ان کے گھر بھی قربانی ہو چکی ہوتی۔ یوں شام تک چاچو کے گھر بھی قربانی ہو جاتی اور اگلے دو دن وہ صرف قربانی کے گوشت کی مختلف ڈشز انجوائے کرتے۔

"السلام علیکم۔" کی آواز نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑا۔ ٹیوشن والی باجی کے گھر سے بچی آئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" گوشت پکڑ کر اس نے پلیٹ دھو کر اس کی طرف بڑھائی۔ تب تک تابندہ اس کے لیے بوتل نکال چکی تھی۔ شرماتے ہوئے وہ بچی وہیں پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"باجی پوچھ رہی ہیں تابندہ کیوں نہیں پڑھنے آئی اب؟ ٹھیک تو ہے؟ اور رزلٹ کا بھی پوچھ رہی تھیں۔" گلاس پلیٹ میں رکھ کر اس نے ایک ہی سانس میں پیغام سنایا۔

"باجی سے کہہ دینا پڑھائی چھوڑ دی ہے میں نے اور رزلٹ ٹھیک آیا ہے۔" تابندہ کی بات پر ضوفشاں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ بچی اٹھ کر چلی گئی تو اس نے کہا۔

"پڑھائی کیوں چھوڑ رہی ہو؟ امی یا ابو نے تو تمہیں منع نہیں کیا۔"

"جانتی ہوں، جو حالات بن گئے ہیں اس کے باوجود انہوں نے بے اعتباری نہیں دکھائی لیکن میں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ یہ نہیں کہ مجھ میں حوصلہ نہیں، بس دل نہیں چاہتا۔ یوں بھی ان کتابوں کی پندرہ سالوں کی پڑھائی نے وہ کچھ نہیں سکھایا جو میں ان چند مہینوں میں سیکھ گئی ہوں۔" ضوفشاں خاموش رہ گئی۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ وہ اس مختصر سے عرصے میں اس کے مزاج کی پختگی اس کے رویے اس کی باتوں سے بھی جھلکنے لگی تھی۔ جیسے ایک دم سے وہ اتنی بڑی ہو گئی ہو۔

امی سے چھپا کر اس نے تائی جان کے گھر بھی گوشت بھیجا تھا اور چاچو کی طرف بھی۔ تائی جان نے یہ کہہ کر گوشت واپس بھیج دیا کہ ہم نے تو خود قربانی کی ہے ان کی طرف بھیجیں جنہوں نے قربانی نہیں کی۔ جبکہ چاچی نے گوشت رکھ لیا تھا۔ اس کا بہت دل دکھا تھا، تائی جان کے رویے سے۔ وہ تو جیسے رشتے ختم کرنے کے لیے بہانے کے انتظار میں تھیں۔

سہ پہر میں جب گوشت بانٹ کر فارغ ہوئے تو تابندہ کو زبردستی سونے کے لیے بھیج کر وہ فرش دھونے لگ گئی۔ امی بھی دوائی کھا کر سو رہی تھیں جبکہ دادا جان اور ابو دور رہنے والے رشتہ داروں کی طرف گوشت دینے گئے ہوئے تھے۔ دہلیز سے پانی باہر نکالتے اس نے فراز کو باہر دیکھا۔ بے اختیار اس نے آواز دی۔

"فراز، بات سنو۔"

فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی ہو لیکن اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ عزت نفس کو تھپکی دے کر سلاتے اس نے پھر آواز دی۔

"فراز ایک منٹ صرف۔"

وہ واپس آیا اور دروازے سے چند قدم ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ "بولو۔"

"مجھے نہیں پتا تھا تم اتنی جلدی ہمت ہار جاؤ گے۔"

"ہمت کسی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ پانی پر محل تعمیر نہیں ہوتے۔"

"تم نے اتنی جلدی اس بات پر یقین کرلیا۔ تم نے تو عین اس وقت ساتھ چھوڑا ہے جب اسے سب سے زیادہ کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"امید تو سفیان سے بھی نہیں ہوگی، پھر بھی وہ بھی چھوڑ گیا ناں!" اس کے استہزائیہ لہجے پر ضوفشاں چند سیکنڈز تک بول ہی نہیں سکی۔

"لازمی نہیں جو نظر آئے وہی سچ ہو۔" آہستگی سے کہہ کر اس نے دروازہ بند کرلیا۔

جو یکطرفہ بات سن کر فیصلہ دے دے اور پھر راستہ ہی بدل لے اور مزید کچھ سننے پر بھی تیار نہ ہو۔ ایسے شخص سے مزید کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس کے نام نہاد سچے جذبوں نے تابی کے دل تک رسائی نہیں پائی تھی ورنہ جو اذیت اس نے سفیان کی چپ سے جھیلی تھی اس سے کہیں زیادہ تابی کے حصے میں آتی۔ اللہ میری بہنوں کے نصیب اچھے فرمائے۔" دعا کرتے ہوئے وہ بھی کام نمٹانے چل دی۔



تائی جان نے فراز کی شادی کردی تھی اور فراز اپنی شادی سے کتنا خوش تھا یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ تعلیم سے لے کر شکل و صورت تک راشدہ ہر لحاظ سے فراز سے کم تھی۔ تائی جان نے دبا کر رکھنے کی غرض سے ہی ایسی بہو ڈھونڈی تھی۔ وہ مسکین صورت پہلے دن سے ہی شوہر کی ناپسندیدہ ٹھہری تھی۔

کچھ اسے ناز و انداز اور دل لبھانے والی ادائیں بھی نہیں آتی تھیں۔ پچھلے دو مہینوں میں انہوں نے ایک بار بھی فراز کے ہونٹوں پر ہنسی تو کیا مسکراہٹ بھی نہیں دیکھی تھی۔ حالانکہ نئی نئی شادی تھی۔ یہی تو چاؤ چونچلوں کے دن ہوتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

ان کا بیٹا ان کے ہاتھ میں رہے، انہوں نے تو بس یہی چاہا تھا لیکن وہ اپنے آپ میں بند ہو کر سب کچھ فراموش کردے، یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ فراز کی شادی کرکے ان کے لیے صرف ایک فکر تھی شرمین۔۔۔ میٹرک پاس، عام سے نین نقش والی شرمین اتنی گئی گزری بھی نہیں تھی پھر بھی جانے اللہ کی طرف سے کیوں دیر ہو رہی تھی۔

رشتے کے لیے لوگ آتے تھے۔ دیکھتے تھے، پسند کرتے تھے۔ بعض اوقات تو آس کی ڈور بھی تھما جاتے تھے لیکن پھر جانے کیوں لوٹ کر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے بتول سے بھی کتنی بار پوچھا تھا کہ نمرہ کے سسرال میں بات کی یا نہیں لیکن وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتیں۔

"بھابھی! انہوں نے اس کے بعد کوئی بات ہی نہیں کی، میں خود بات کرتی اچھی لگوں گی بھلا؟" وہ چپ کر جاتیں۔ اب شرمین کی فکر تو تھی ہی فراز کی طرف سے بھی دل پریشان سا رہتا تھا۔ نمرہ کو اللہ نے چاند سی بیٹی عطا کی تھی۔ چلّہ کرنے کے لیے وہ گھر ہی آئی ہوئی تھی بلکہ اب تو اس کا چلّہ پورا ہوگیا تھا۔ آج اس کی ساس اور شوہر اسے لینے آرہے تھے۔ بتول نے خاص طور سے کھانا بنوایا تھا۔ محلے میں بھی نیاز بانٹی تھی۔ بیٹی ہوئی تھی تو کیا؟ پہلی خوشی تھی اور یوں بھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نمرہ کے دل میں بچی کو لے کر کوئی بات آئے۔

دوپہر کو مہمانوں کی آمد ہوئی۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد نمرہ کی ساس نے ایک بار پھر وہی بات شروع کی جو وہ پہلے نمرہ کی زبانی کہلوا چکی تھیں۔

"بھئی ہمیں تو آپ کے گھر سے ایک اور بیٹی

چاہیے۔"
بتول بات تو سمجھ گئی تھیں پھر بھی پوچھا۔ "میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔"
"شادی پر میں نے ایک بچی دیکھی تھی۔ ماشاء اللہ نمرہ کی طرح ہی پیاری اور پیارے اطوار والی تھی۔ بس میں نے تب ہی اسے اپنے دوسرے بیٹے کے لیے پسند کرلیا تھا۔ آج یہی سوچ کر آئی تھی کہ آپ ہمیں ان کے گھر لے چلیں تاکہ ہم براہ راست بات کرسکیں۔"
بچی کو گود میں سلاتے نمرہ نے غور سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ جانے کیا جواب دیں گی۔ اب انہوں نے ایک لمحے کو سوچا پھر گہرا سانس بھر کران کی طرف دیکھا۔
"آپ کسی اور بچی کی بات کرتیں تو شاید بات بن بھی جاتی۔" ان کی بات پر نمرہ اور اس کی ساس دونوں نے ان کی طرف دیکھا۔
"بات اصل میں یہ ہے کہ ضوفی تو خیر سے میرے بیٹے سفیان کی منگیتر ہے۔ منگنی تو نہیں البتہ زبانی کلامی بات چیت کافی عرصے سے طے ہے۔" نمرہ نے حیرت سے اپنی سماعت کو ٹٹولا۔ کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔
"لیکن نمرہ نے تو نہیں بتایا۔"
"کیسے بتاتی؟ بچے اس معاملے سے یکسر لاعلم ہیں۔ آج ہم جارہے ہیں شادی کا دن طے کرنے۔ میں تو آپ سے یہ بات کرنے ہی والی تھی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" وہ بڑی خوشی سے انہیں ساتھ چلنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ نمرہ ناسمجھی کے عالم میں بیٹھی تھی۔
"نہیں۔ مناسب نہیں لگتا۔ اگر پہلے بتادیتیں تو ہم آج نمرہ کو بھی نہ لینے آتے۔" انہوں نے ذرا بھی برا منائے بغیر کہا تھا۔
"بہت شکریہ بہن جی کہ آپ نے برا نہیں مانا۔ اصل میں ہوسکتا ہے آج رمضان کا چاند نظر آجائے تو بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ نمرہ کو میں خود کل چھوڑ جاؤں گی آپ کی طرف۔"
"چلیں کوئی بات نہیں' اللہ مقدر اچھے کرے۔"
"آمین۔" انہوں نے دل سے کہا تھا۔

شام تک انہوں نے سفیان کی تیار کی بری میں سے ایک اچھا سا جوڑا نکالا اور کچھ ضروری چیزیں اور مٹھائی وغیرہ خرید کر سفیان کے رشتے کے لیے جیٹھ کے گھر جا پہنچیں۔
اپنی بیوقوفی میں انہوں نے بہت کچھ غلط کردیا تھا۔ بھابھی کی باتوں میں آکر انہوں نے سفیان اور ضوفشاں کے رشتے سے متعلق دل میں بہت سی بے وجہ بدگمانیاں پال لی تھیں۔ سفیان ان کا بڑا بیٹا تھا۔ ان کی ساری امیدیں اس سے ہی جڑی تھیں۔ فیضان تو ابھی چھوٹا تھا۔ سفیان ہی سہارا بن سکتا تھا اور اگر ضوفشاں کی خاطر وہ ان کے ساتھ وہی سلوک کرتا جو ان کے بھائیوں نے ان کی ماں کے ساتھ کیا تھا تو وہ برداشت نہیں کرسکیں گی۔ یہی سوچ کر انہوں نے رشتے سے انکار کیا تھا۔ سب وجہ پوچھتے رہے لیکن انہوں نے کسی کو اپنا خوف نہیں بتایا۔ کسی پر اپنا ڈر ظاہر نہیں کیا۔ وہ یہی کہتی رہیں کہ جب بھائی بھابھی چھوٹی کی غلطی پر اس کی طرف داری کررہے ہیں تو کل ضوفشاں کی غلطی کب مانیں گے جبکہ تابندہ کی شوخ طبیعت گستاخانہ بھی ہوہی جاتی تھی اور ضوفشاں کی خوبیوں کی تو وہ خود بھی معترف تھیں۔
ان کی وجہ کسی نے مانی یا نہیں سفیان نے اکیلے میں ان کا یہ بہانہ رد کردیا تھا۔ وہ تو ابھی تک ان سے وجہ ہی پوچھ رہا تھا۔ مگر انہوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔
سفیان کو انہوں نے اپنی قسم دی تھی کہ وہ کبھی اس گھر میں ان کے بغیر قدم نہیں رکھے گا اور آج انہیں فخر تھا کہ ان کے بیٹے نے ان کا مان برقرار رکھا تھا' چاہے اس کے لیے اس کے کتنے خواب اور امیدیں ٹوٹی تھیں۔ بھابھی کے پیچھے انہوں نے یہ فیصلہ تو کرلیا تھا لیکن جب نمرہ کے دیور کے لیے انہیں شرمین کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا اور اسی پر بس نہیں ضوفشاں اور سفیان کے رشتے کے ثمرات گنوانا شروع کیے تو انہیں یہ سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی کہ بھابھی ان کے ذہن کے ساتھ کھیل چکی تھیں۔ انہوں نے اس دن اپنی ذاتی سمجھ اور سماعت سے ان کی باتیں سنی اور

سمجھی تھیں۔
انہوں نے اسی دن خود سے اپنے فیصلے کے غلط ہونے کا اعتراف کر لیا تھا یہ اور بات کہ اظہار میں انہیں وقت لگ گیا۔ کیونکہ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ فراز کی بے رنگ زندگی وہ دیکھ چکی تھیں۔ بہو کو دبا کر رکھنے کی خاطر بھابھی نے ہر طرح سے کمتر لڑکی چنی تھی لیکن اپنی اس سوچ کی وجہ سے وہ اپنے ہاتھوں اپنے بیٹے کے ساتھ زیادتی کر گئی تھیں۔ تابندہ کوئی حور نہیں تھی لیکن خوش شکل تھی۔ انہیں کم از کم اس جیسی لڑکی تو لانی چاہیے تھی ناکہ اگر فراز نہ چاہے تب بھی بیوی کی طرف متوجہ کرنے والی کوئی چیز تو ہو۔ فراز کی زندگی کی ویرانی سے انہوں نے سبق سیکھ لیا تھا کہ بھابھی کے اصول مکمل طور پر ناکام ہیں۔ وہ تصور میں بھی فراز کی جگہ سفیان کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ جب نمرہ کی ساس نے براہ راست ان سے ضوفشاں کے لیے بات کی تو وہ خود نہیں جانتیں کہ انہوں نے کیسے یہ سب کہہ دیا۔ اس کہے ہوئے پر ان کے گھر میں خوشی کی جو لہر دوڑی تھی وہ ایسی تھی جیسے خزاں رسیدہ چمن میں بہار کا کوئی جھونکا غلطی سے گھس جائے۔ تب ہی انہوں نے اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔
حسب توقع انہیں دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے۔ دادا جان نے تو انہیں یوں لدے پھندے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ نمرہ بیٹی تھی اور سفیان بیٹا۔ اب وہ کیوں خوشی مناتے ان کی۔
"ابا جان' میں آپ سے معافی اور ضوفشاں مانگنے آئی ہوں۔" ان کی بات پر ان کے ساتھ آنے والوں کے علاوہ سب کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔
"میں مانتی ہوں میں غلط تھی اور معافی مانگ کر میں اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتی ہوں نہ کہ اپنی غلطی پہ قائم رہ کر بچوں کی خوشیاں تباہ کرنا چاہوں گی۔"
دادا جان نے سوالیہ نظروں سے بیٹے اور بہو کی طرف دیکھا۔ اصل اذیت تو انہوں نے کاٹی تھی تو پھر فیصلے کا حق بھی ان کا ہی بنتا تھا۔ دادا جان کی نظریں وہ بخوبی سمجھ گئی تھیں۔
"ابا جان! آپ ایک بار معاف کر دیں پھر چاہے مجھے بھابھی اور بھائی کے پیر پکڑ کر ساری رات کیوں نہ بیٹھنا پڑے میں انہیں منا کر ہی اٹھوں گی۔" ان کے الفاظ ان کی آنکھوں سے جھلکتی سچائی۔ جیٹھ نے بڑھ کر سر پر پیار دیا تو بھابھی نے بھی گلے لگا لیا۔ دادا جان نے باری باری سب کو گلے لگا لیا۔
"تائی مٹھائی نکال کر لاؤ۔" نمرہ نے آواز لگائی۔
ندامت کے بہنے والے آنسوؤں نے رشتوں کے دھندلے آئینے شفاف کر ڈالے تھے۔ ایک بار پھر اس گھر میں خوشیوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔
"ہم چھت پر چاند دیکھنے جا رہے ہیں۔" فیضان نے آواز لگائی۔ تابندہ مٹھائی پلیٹ میں نکال کر دے گئی تھی۔ وہ بھی چاند دیکھنے اوپر چلی گئی تھی۔
"تم نے ناحق زحمت کی' تمہیں چاند دکھائی تو دینا نہیں۔" برخلاف عادت سفیان نے شوخی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔ سفیان نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ کتنا بدل گئی تھی وہ ایک سال میں شوخ سی لڑکی نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔
"نہ نظر آئے جب آپ لوگ چاند دیکھتے ہیں تو میں آپ سب کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہوں۔"
ضوفشاں نے چور نظروں سے ساتھ والی چھت پر پھیلی تاریک خاموشی کو دیکھا اور سر جھٹک کر ان سب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تابندہ ان دونوں کو چھوڑ کر نمرہ' ثمرہ اور فیضان کی طرف چلی گئی۔
"یہ سب کیسے ہوا؟" ضوفشاں نے پوچھا۔
"میں خود نہیں جانتا۔ شاید اللہ کی ذات کو ہمارا امتحان مقصود تھا۔ جو بھی تھا' جو بھی ہے سجدۂ شکر واجب ہے۔" گہری سانس بھر کر سفیان نے اسے دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح پاکیزہ اور خوب صورت لگ رہی تھی۔
"بے شک۔" اس نے کہا۔ "وہ نظر آگیا چاند۔" اس کی اچانک ہی نظر پڑی تو بول اٹھی۔ وہ سب بھی اسی طرف چلے آئے۔
"آپی مجھے کیوں نہیں نظر آتا چاند؟" حسب

موں دعا اور سورہ پڑھنے کے بعد اس نے سرگوشی میں ضوفشاں سے پوچھا۔

"دل کی آنکھ سے دیکھا کرو' آجائے گا۔" سفیان نے کہا پھر ایک دم خود ہی چپ ہوگیا۔ باری باری وہ سارے نیچے چلے گئے۔

اچھی خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ چاچی کا اصرار تھا کہ نکاح رمضان میں کرلیا جائے اور عید کے پہلے ہفتے میں شادی جبکہ دادا جان چاہتے تھے کہ نکاح بارات کے روز ہی ہو۔ بالآخر چاچی جیت گئیں اور چھبیسویں روزے کی مبارک شام کو نکاح رکھ لیا گیا۔ ان کے بیٹے نے فرمانبرداری کی حد کردی تھی تو کیا وہ اس کی خوشیوں کے لیے اب تھوڑی سی ضد نہیں کرسکتی تھیں۔ نکاح شادی کے معاملات کے دوران ہی لڑکیوں کو سحری کی تیاری کے لیے کچن میں بھیج دیا گیا جبکہ سفیان فیضان کی بازار کی دوڑیں لگ گئی تھیں۔ رمضان کی برکت اور رحمت سے وہ سب ایک بار پھر ساتھ تھے۔ خوشبو کے جھونکے کی طرح خوشیاں گم درزوں میں سے نکل کر چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔

"تابی تم بھی کچھ بنانا سیکھو یا یونہی رہنا ہے ساری زندگی؟" ضوفشاں کو تیزی سے سالن کے لیے پیاز کاٹتا دیکھ کر نمرہ نے تابندہ سے کہا۔ وہ شیلف کے پاس کھڑی بے دلی سے برتن اٹھا کر ادھر ادھر رکھتی جارہی تھی۔

"جلدی سیکھ لوں گی۔" پچھلے سال چاند رات کا واقعہ یاد کرکے اس کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ ضوفشاں کو اس کے بدلے ہوئے مزاج سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی پھر بھی اس کا دل دکھا تھا۔

"اللہ میری بہن کا نصیب سب سے اچھا کرے۔" اس نے سچے دل سے دعا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

دونوں بھائیوں کے تعلقات کی بحالی اور ضوفشاں کا سفیان سے رشتہ پکا ہونا اتنی ڈھکی چھپی باتیں نہیں تھیں کہ تائی جان کو خبر نہ ہوتی۔ وہ تو بیٹے کے صدقے میں آگئی تھیں۔ "فوراً" سے پہلے بتول کی طرف جا پہنچیں۔ اور وہ بھی شاید تیار ہی بیٹھی تھیں۔

"تم نے ضوفشاں اور سفیان کی بات طے کردی اور بتایا بھی نہیں۔" سلام دعا کے بعد انہوں نے وہ بات چھیڑی جس کے لیے وہ آئی تھیں۔

"بتانے کی کیا بات ہے بھابھی۔ آپ نے خود تو مشورہ دیا تھا۔ یاد نہیں جب نمرہ کی ساس نے رشتے کا کہا تھا۔" وہ ایک دم بھولی بن گئی تھیں۔

"یاد ہے لیکن رشتے کی بات تو ختم نہیں ہوگئی۔ تم نے خود تو بتایا تھا کہ اس کی ساس نے پھر کوئی بات نہیں کی۔"

"ہاں نہیں کی تھی۔ کل نمرہ کو لینے آئی تھیں تو انہوں نے تو زور ڈالنا شروع کردیا کہ میں انہیں لے کر بھابھی کی طرف چلوں۔ میں نے تو جھٹ آپ کی نصیحت پر عمل کر ڈالا۔" بتول کی بات پر وہ چپ رہ گئی تھیں۔ "اور جب بات ہوگئی تو پھر آج کیا کل کیا۔ سوچا اس کام کو بھی لگے ہاتھ سمیٹ دوں۔"

"ہوں۔ تم نے شرمین کی بات کی تھی؟" انہیں اچانک ہی یاد آگیا۔

"جی جی کی تھی۔ شرمین کی تصویر بھی دکھائی تھی شادی والی لیکن وہ کہنے لگیں' شکل و صورت تو اللہ کی دین ہے۔ لڑکی بس ذرا بے باک سی ہے۔ نمرہ کی شادی پہ بار بار مردانے کے چکر لگا رہی تھی۔" جھوٹ موٹ کی بات کہہ کر انہوں نے بغور بھابھی کا چہرہ دیکھا جہاں ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ انہوں نے خود ہی تو اسے ایسا کہا تھا کہ شاید۔

"تم جانتی تو ہو میری بچی ایسی تو نہیں۔" اپنی آواز انہیں خود نہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"بھابھی جانے کا چھوڑیں۔ آپ یہ بتائیں بھلا تابندہ ایسی لگتی تھی؟"

یہ بات مرچوں والی سلائی کی طرح ان کی آنکھیں جلا گئی تھی۔ بنا کچھ کہے منہ موڑ کر آنسو چھپاتی وہ ان کے گھر سے نکل آئیں۔

اپنی بیٹی پر بات آئی تو کیسے تپ کر چلی گئیں۔ یہی تو وہ چاہتی تھیں کہ انہیں اندازہ ہو انہوں نے کیا کر دیا ہے۔ بچے سانجھے پلے تھے۔ تینوں اپنے بچوں کی طرح دوسرے بچوں سے بھی واقف تھیں۔ وہ خود بھی جانتی تھیں کہ تابندہ بے قصور ہے۔ جانے غلط فہمی ہو کیسے گئی؟ سوچتے سوچتے وہ اٹھ کر افطاری کی تیاری کے لیے ساتھ والے گھر میں چلی گئیں۔



امی اور صوفی چاچی کے ساتھ بازار گئی تھیں۔ بے رنگ عید کے تصور سے انہوں نے تیاری ہی کچھ نہیں کی تھی اور اب جب دھنک رنگوں سے عید سجنے والی تھی تو انہیں بھی شاپنگ کا خیال آیا۔ روزے کی وجہ سے وہ نہیں گئی۔ ثمو اسکول سے آکر سو رہی تھی اور دادا جان کمرے میں تھے۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ جب دادا جان کی آواز آئی۔

"تابی۔ دروازہ بند کرلو۔ میں ذرا ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"کیا ہوا ہے دادا جان؟" وہ اٹھ کر ان کے پاس آئی۔

"کچھ نہیں، بس ذرا سر چکرا رہا ہے صبح سے۔ سوچا تھا سو کر اٹھوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ خیر میں ادھر بازار والے ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ جلدی آجاؤں گا' سو مت جانا۔"

"جی دادا جان۔" دروازہ بند کرکے وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ ابھی پانچ سات منٹ ہی گزرے ہوں گے جب دروازہ بج اٹھا۔ اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس فرنچ داڑھی والے اس عمر رسیدہ شخص کو دیکھ کر وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔

"ماسٹر صاحب ہیں گھر پر؟"

"جی نہیں۔ دوائی لینے گئے ہیں ابھی۔"

"اچھا آآآ۔ چلیں میں فون کرتا ہوں۔" ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے انہوں نے نمبر ملایا اور چند سیکنڈز بات کرنے کے بعد دو قدم آگے ہو کر فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ "بات کرلیں" دروازے کی اوٹ سے اس نے ہاتھ بڑھا کر فون کان سے لگالیا۔

"تابی بیٹا! یہ قیوم انصاری ہیں میرے شاگرد۔ میرے آنے تک اندر بٹھاؤ۔ میں بس ابھی آیا۔"

"جی دادا جان۔" اس نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"گھبرانا نہیں۔ سفر سے آیا ہے۔ میرا خیال ہے روزہ نہیں ہوگا۔ سو کھانا پانی نہ پوچھ لینا۔ اچھے سے بٹھانا۔ سمجھ گئیں؟" وہ ان کے احکامات پر حیران تھی۔ وہ کون تھا جسے مردوں کی عدم موجودگی میں گھر کے اندر بلانے کا کہا جا رہا تھا۔

"جی۔" کہہ کر حسب ہدایت اس نے فون ان کی طرف بڑھا دیا۔ دروازے کے پٹ وا کر کے وہ اندر ثمو کو اٹھانے چلی گئی۔

"تابندہ سے کہہ دیا ہے میں نے۔ آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں۔ میں بس تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔" ان کی بات پر قیوم انصاری کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ تو یہ تھی تابندہ۔ ان کے بیٹے کی پسند یا پسند سے کچھ بڑھ کر۔ کیا تھا اگر یہ ستارہ ان کے بیٹے کے مقدر کے آسمان پر چمکتا۔ پہلی بار تو ان کے بیٹے نے کوئی خواہش کی تھی ورنہ لڑکیوں کے معاملات سے وہ خود بھی کوسوں دور بھاگتا تھا۔

"آجائیں انکل۔" اس کی پکار سے ان کی سوچوں کا ارتکاز ٹوٹا۔

"شکریہ بیٹا' جیتی رہو۔ خوش آباد رہو۔" اس کی معیت میں وہ بیٹھک میں جا بیٹھے۔

"انکل کھانا کھائیں گے یا پانی لے آؤں؟" اس کا معصوم سوال چغلی کھا رہا تھا کہ اسے ان معاملات کا تجربہ نہیں۔ وہ مسکرا اٹھے۔

"کچھ بھی نہیں 'بیٹا میں روزے سے ہوں۔"

"اوہ سوری۔" دادا جان کے اندازے نے اسے شرمندہ کروا دیا تھا۔

"گھر میں سب ٹھیک ہیں؟ رہنے آئی ہوئی ہو؟" وہ

جو دروازے سے مڑنے لگی تھی ان کی بات پر حیران ہو گئی تھی۔
"جی ٹھیک ہیں۔ میں یہیں رہتی ہوں۔ ماسٹر صاحب میرے دادا جان ہیں۔" اس نے چھوٹی سی وضاحت کی۔
"جانتا ہوں لیکن آپ کے سسرال کا پوچھ رہا ہوں۔"
"سسرال؟ وہ کہاں ہے؟" تیزی سے جواب دے کر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
"آپ کا نکاح تھا ناں پچھلی عید پر؟"
گہری سانس بھر کر اس نے ان کے الجھن زدہ چہرے پر نظر ڈالی۔ ایک اجنبی کو یہ سب بتانا چاہیے یا نہیں اسی شش و پنج میں صوفے کے کونے پر ٹک کر انگلیاں مروڑتے انہیں سب کچھ بتانے کا قصد کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہو گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ دادا جان آئے تھے۔ وہ کمرے میں چلی گئی اور دادا جان دروازہ بند کر کے بیٹھک میں چلے گئے جہاں قیوم انصاری سراپا انتظار بنے بیٹھے تھے۔
"ایبٹ آباد سے آیا ہوں، سوچا ملتا چلوں۔" بغلگیر ہوتے ہوئے انہوں نے فون پر ہوئی بات دہرائی۔ کھانا پانی پوچھ کر دادا جان صوفے پر بیٹھ گئے۔ دماغ میں کلبلاتے سوال کو وہ مزید دبا نہیں پائے سو پوچھ لیا۔
"یہ بچی تابندہ تھی جس نے دروازہ کھولا تھا؟" دادا جان نے اثبات میں سر ہلایا۔
"جی جی، یہی تابندہ ہے۔"
"ماسٹر جی! ایک بات ہے اگر برا نہ مانیں۔" ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے ان کے جھوٹ پر بات کریں۔ وہ جھوٹ جو انہوں نے پچھلے سال بولا تھا۔
"بولیں بولیں۔ بے فکر رہیں بچوں کی باتوں کا برا نہیں منایا جاتا۔" انہوں نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔
"آپ نے تو کہا تھا تابندہ کی شادی۔۔۔ مطلب اگر آپ کو منظور نہیں تھا تو۔۔۔ صاف کہہ دیا ہوتا۔"
سر جھکائے اٹک اٹک کر انہوں نے بات مکمل کی۔
"جب میری آپ سے بات ہوئی تب تک ایسا ہی تھا۔۔۔" اس کے بعد وہ سب کچھ بتاتے چلے گئے۔ اتنا پریشان وقت گزر رہا تھا کہ انہیں قیوم انصاری کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ وہ اتنے سالوں سے انہیں جانتے تھے۔ ان کی شرافت و نجابت کے گواہ، پھر ان کے بیٹے سے بھی مل چکے تھے۔ آج جب ان کا فون آیا تو دادا جان نے جان بوجھ کر تابندہ کا نام لیا تھا۔ بیٹی تھی اس لیے وہ خود سے بات شروع نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ دل میں اچانک ہی شدید ترین خواہش ابھری تھی کہ اگر ابھی بھی قیوم انصاری اس رشتے پر راضی ہوں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے اور جب قیوم نے بات شروع کی تو وہ بتاتے چلے گئے۔
چند لمحوں کے لیے وہ قدرت کے اس کھیل پر حیران رہ گئے تھے۔ اگر قدرت کو یہ رشتہ منظور تھا تو اسی وقت کیوں نہیں ہو گیا تھا۔ لیکن اللہ نے ہر کام کا وقت مقرر کر رکھا ہے تو یہی وقت مقرر تھا۔ ان کے بیٹے نے پھر کسی لڑکی کا نام نہیں لیا تھا بلکہ ان کی بتائی لڑکیوں پر بھی خاموش ہو جاتا تھا۔ انہوں نے فوراً" دامن پھیلا دیا تھا۔ "میں اس کے ماں باپ کو جانتا ہوں میرا بیٹا مجھ سے کبھی اختلاف نہیں کرے گا۔ نہ ہی میری بہو اعتراض کرے گی۔ پھر بھی ایک بار ان سے پوچھنا چاہتا ہوں۔" ان کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ آنکھیں چیخ چیخ کر "ہاں ہے" کا اعلان کر رہی تھیں۔
شام کو قیوم انصاری نے افطاری بھی ان کی طرف ہی کی تھی اور پھر وہ ہاں کروا کر ہی ان کے گھر سے گئے تھے۔ ان کا بیٹا ان کا دوست تھا اور دوست کو خوشی دینے میں دیر کیوں کرتے سو وہ منہ میٹھا کر کے اٹھے تھے۔ دو آنکھیں تابندہ کو بے قرار کر گئیں۔ امی نے فوراً" دوگانہ شکرانہ کے ادا کیے تھے۔ دادا جان عضوفی ابو ثمرہ سب خوش تھے۔ چاچی نے مٹھائی منگوا کر سب کے گھروں میں بھیجی تھی خاص طور پر نانی جان کے گھر۔
تکلیفوں بھرے اس ایک سال میں کسی کے منہ سے ناشکری اور اعتراض کا کلمہ نہیں نکلا تھا۔ شاید اسی لیے اللہ نے امتحان مختصر کر دیا تھا اور انعام میں زندگی بھر کی خوشیاں لکھ دی تھیں۔ آگے پیچھے دونوں بہنوں

کے نکاح رکھ دیے گئے تھے تاکہ چاند رات کو سب مل کر خوشیاں منا سکیں۔ بازار' خریداری' تیاری میں پورا مہینہ گزر گیا تھا۔ سفیان اور ضوفشاں کا نکاح پہلے اور پھر تابندہ اور جہاں زیب کا نکاح ہوا تھا۔

اس بار تیس روزے پورے ہوئے تھے۔ تیسویں افطاری پر جہانزیب بھی آیا ہوا تھا۔ سفیان نے خاص طور پر اسے بلانے کے لیے مہم چلائی تھی۔

"چاند رات کو ہمارے تایا جان کی چھت پر الگ سے کمیٹی بیٹھتی ہے اور اب آپ اس کمیٹی کے اہم رکن ہیں سو آپ کی آمد و موجودگی ضروری ہے۔"

بڑوں کو بھی اسی نے منایا تھا۔

اور اب وہ سب پھر چھت پر کھڑے چاند تلاش کر رہے تھے۔ شرمیلی مسکراہٹیں' بولتی آنکھیں اور ڈھیروں خوشیاں لیے وہ سب محبتوں میں نہائے ہوئے تھے۔ ساتھ والی چھت البتہ پہلے کی طرح ویران تھی۔

"چاند نظر آگیا۔" اب کی بار بھی چاند ضوفشاں نے ہی دیکھا تھا۔

"تمہاری عید کا چاند تمہارے ــــ پہلو میں کھڑا ہے' اب بھی چاند نظر نہ آئے تو مجھ سے مت پوچھنا' چاند کیوں نظر نہیں آیا۔" ضوفی کی بات پر وہ ہنسی۔ اسے یقین تھا آج اسے چاند نظر آجائے گا لیکن چند لمحوں بعد ہی اس کے یقین کا بلبلہ پھوٹ گیا۔ منہ بنا کر وہ منڈیر سے اتری اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہیں پتا ہے' تمہیں کبھی چاند کیوں دکھائی نہیں دیا؟" جہانزیب کی بات پر اس نے سر اٹھایا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ چاند کو چاند کیسے نظر آئے گا؟" اس کی شرارتی مسکراہٹ پر اس نے شرما کر نظریں جھکالیں۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ اس دن جب تم اچانک سے بے دھیانی میں اندر آگئی تھیں تو مجھے تم سے طوفانی قسم کی محبت ہو گئی تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ دل نے مسکرانے کی خواہش کی تھی' تمہارے ساتھ۔" وہ بڑے جذب سے بول رہا تھا۔ "اور جب مجھے تمہارے رشتے کا پتا چلا تو یوں لگا جیسے زندگی کی تتلی کے سارے رنگ اڑ گئے ہوں۔ بہت بے کیف وقت گزرا تھا اور اب تو میں نے زندگی کو سوچنا بھی چھوڑا ہوا تھا جب میری بن مانگی دعاؤں نے معجزہ دیکھا۔" وہ سر جھکائے مسکرائے چلی جا رہی تھی۔ اچانک کچھ یاد آنے پر سر اٹھا کر اسی کی طرف دیکھا۔

"لیکن میرا نام کیسے پتا چلا آپ کو؟"

"تمہارے بیگ کے ساتھ لٹکتے لکڑی کے دو انچ کے ٹکڑے پر کھدے تمہارے نام والے کی چین سے تمہارے اندر آنے سے واپس جانے تک ایک ایک سیکنڈ میں نے کئی بار جیا ہے۔ میرے حافظے پر روز اول کی طرف محفوظ ہے۔"

"اب چلیں یا ادھر ہی کھڑے رہنا ہے؟ بھئی لڑکیوں نے چوڑیوں اور مہندی کے لیے جانا ہے۔"

سفیان نے شرارت سے ولن کا رول نبھایا۔ ہنستے مسکراتے وہ سب نیچے چلے گئے۔

دیوار کے ساتھ بیٹھے فراز نے ایک ایک لفظ سنا تھا۔ وہ کبھی خود کو معاف نہیں کر سکے گا۔ اس نے سوچا۔ نیچے سے ابھی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ عید تو اس طرف آئی تھی۔

وہ سب ہی ہنس ہنس کر جہانزیب کی گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ بازار جا کر سب ہی ایک دوسرے کو ڈسٹرب کیے بغیر چاند رات کا حسن دیکھنے الگ الگ سمتوں میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ شاپنگ سے فارغ ہو کر وہ آئس کریم کھانے چل دیے۔

"اللہ نے بے پناہ نزاکت دی ہے تو اب آسائش دینے کے لیے مجھے بھیج دیا ہے۔" وہ رش سے بچنے کے لیے گاڑی میں ہی بیٹھی تھی جب اس کے لیے وہ آئس کریم گاڑی میں ہی لے آیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اسے یقین تھا جہانزیب اس کی عید کا چاند تھا یا نہیں۔۔۔ خوشیوں کا چاند ضرور تھا۔

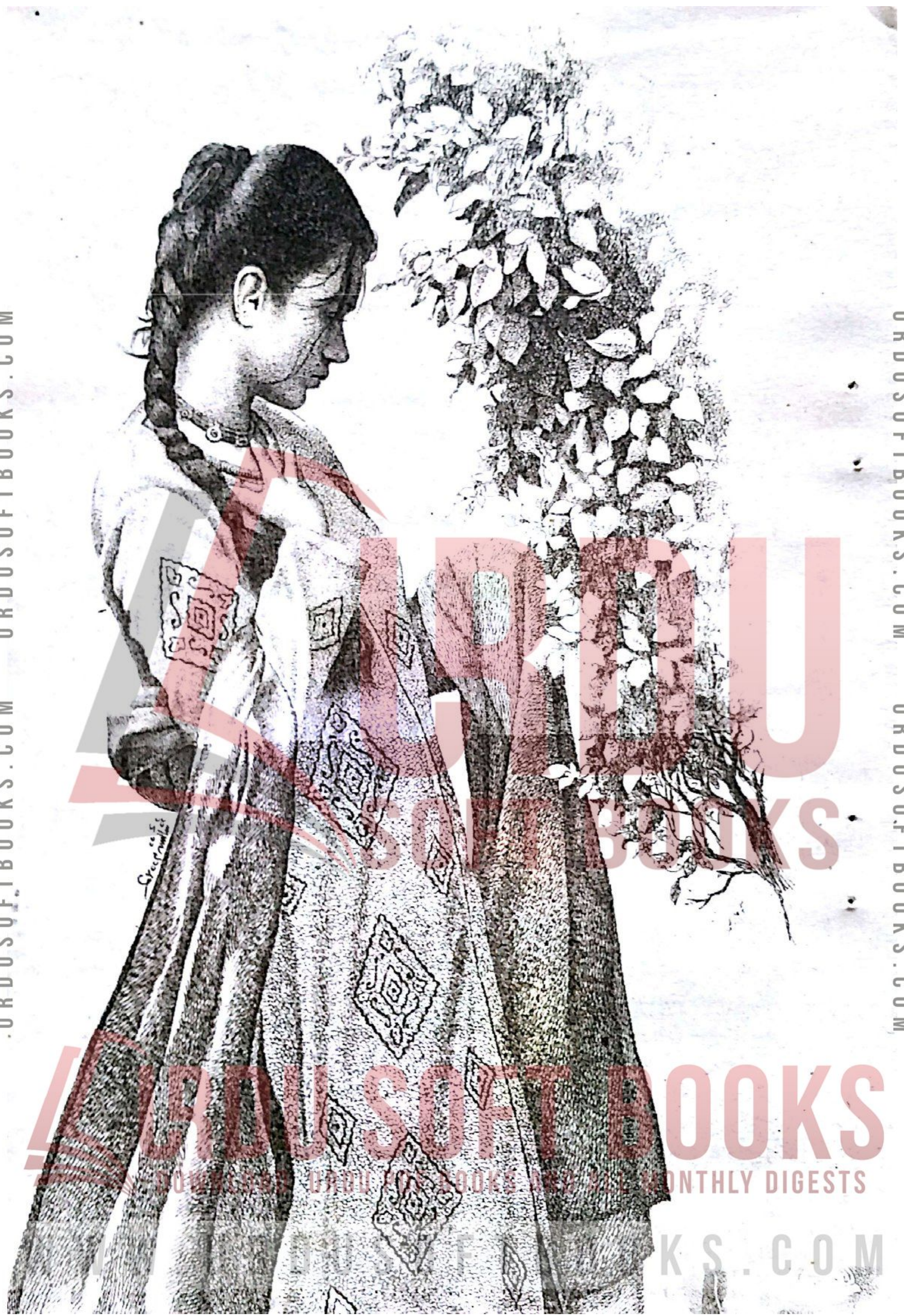


آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہوچکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔





باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال کا ہوچکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہوگئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہوجاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے' مگر وہ انکار کرکے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی' ماموں' معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں' مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کرلیتا ہے۔ کچھ ردوکد کے بعد آئے کت بھی راضی ہوجاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے' مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں' مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر رازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خودکشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے' اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کردیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خودکشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کرکے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کردیتی ہے اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہوجاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کرکے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر بیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے' وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران' خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے' اور فراڈیے شامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران درحقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

شامیر کے دھمکانے پر خوش نصیب گھر میں کسی کو بھی اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں کرتی' فضیلہ چچی صیام کا رشتہ شامیر اور کیف کے لیے منہا کا عندیہ دیتی ہیں۔ کیف گھر آتا ہے۔ جہاں خوش نصیب اسے شامیر کے بارے میں بتانا چاہتی ہے مگر صباحت تائی کے آنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

شامیر کو شیطان کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ جس کی پیشانی پہ تل ہو۔ خوش نصیب اس کے خیالات اور دھمکیاں سن کر بہت پریشان ہوتی ہے اور اس کی حقیقت کیف کو بتاتی ہے' مگر کیف اس بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

شامیر اور صیام کی منگنی ہوتی ہے تو خوش نصیب کیف کی پسند کا بتاتی ہے' یوں صیام کی منگنی شامیر کے بجائے کیف سے ہو جاتی ہے۔ کیف خوب غصہ کرتا ہے' مگر خوش نصیب نے یہ سب صیام کو بچانے کے لیے کیا ہے کیوں کہ اس کی پیشانی پہ بھی تل ہے۔

شامیر خوش نصیب کو نئے سرے سے دھمکاتا ہے۔ اپنے والدین کی شادی کی سالگرہ پر منفرا کی اتفاقی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے وہ اسے سب سے ملواتی ہے۔ سب اس کے حسن اور دولت سے متاثر ہوتے ہیں۔

سترہویں قسط

"خوشی کی بات تو ہے اماں! صیام اور کیف کی جوڑی اچھی بھی بہت لگ رہی ہے.... میں نے تو تعریف کرتے ہوئے بھی جان بوجھ کر بار بار ماشاء اللہ کہا تھا۔ فضیلہ کی عادت تو آپ جانتی ہیں کل کلاں کو بات ہی بنا لیں کہ نظر لگا دی۔"

روشن امی' نانی کو کھانا کھلاتے ہوئے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔ اور خوش نصیب چٹائی پر لگے بستر پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی کھلی کتاب گھٹنوں پر رکھے یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ بُری طرح پڑھائی میں مصروف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کتاب کی اوٹ میں کان پوری طرح روشن امی کی باتوں کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔

"ارے جانے دیں... ایسا پہلے کبھی ہوا ہے کیا؟ آپ بھی کمال باتیں کرتی ہیں اماں!"

روشن امی ذرا سا ہنس کر کہہ رہی تھیں۔ یہ بھی ان کا ہی کمال تھا کہ نانی کی غوں غاں سے ان کی اصل بات کا متن سمجھ کر معنی اخذ کر لیتی تھیں۔ ابھی بھی نانی نے غالباً کوئی مذاق کیا تھا جس پر روشن امی حسب عادت بنا آواز ہولے ہولے ہنس رہی تھیں۔ اگر جو خوش نصیب اپنے ذہنی آزار کا شکار نہ ہوتی تو اس منظر کو خوب انجوائے کرتی۔ کہ روشن امی عرصے بعد ہنس رہی تھیں۔ وہ تو ہر اس بات پر بھی آہستہ سے مسکرا کر پہلو تہی کر لیتی تھیں جس پر قہقہہ فرض ہو جاتا تھا۔

"اچھا یہ لیں... آپ منہ تو میٹھا کریں ایسی اعلا مٹھائی منگوائی ہے فضیلہ نے۔" وہ گلاب جامن اٹھا کر نانی کو کھلانے لگیں تو ماہ نور جو اسی وقت کمرے میں داخل ہو رہی تھی انہیں ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

"نانی کو تو میٹھا مت کھلائیں روشن امی! شوگر نہ ہائی ہو جائے۔"

"بیٹا! ذرا سا ہی تو کھلا رہی ہوں' خوشی کا موقع ہے اماں کو بھی منہ میٹھا کرنے دو۔"

"چلیں بس... جو آپ مناسب سمجھیں۔" وہ اپنی چادر تہہ کر کے الماری میں رکھنے لگی۔

"ویسے آنا" فانا" ہی سب کچھ ہو گیا... میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کیف' صیام کو پسند کرتا ہو گا۔"

اس نے کن انکھیوں سے خوش نصیب کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ نہ جانے کیوں لیکن وہ اسے اداس اداس اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خاموش محسوس ہو رہی تھی۔ گو کہ اس کیف اور صیام کی محبت (اگر واقعی محبت تھی تو) کو منگنی جیسے مضبوط رشتے میں ڈھالنے میں اسی فیصد اسی کا ہاتھ تھا اور جیسا وہ چاہتی تھی ویسا ہو بھی گیا تھا تو پھر اس اداسی کا سبب کیا تھا۔

ماہ نور نے اپنے دل میں کلبلاتے اس سوال کو کسی اور وقت کے لیے سنبھال کر رکھ دیا اور اپنے لمبے بال کھول کر ان میں بہتا پسینہ سکھانے کے لیے پنکھے کے عین نیچے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں واقعی سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔" روشن امی بولیں۔

"نہ ہی کبھی مجھے ایسا لگا کہ کیف، صیام کو پسند کر سکتا ہے۔۔۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" پر سوچ انداز۔ اب خوش نصیب چپ نہ رہ سکی اور فوراً بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے روشن امی! مجھے کیف نے خود بتایا تھا کہ وہ صیام کو پسند کرتا ہے۔"

"لیکن تم نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا اس بات کا۔" ماہ نور الجھن آمیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

خوش نصیب سٹپٹا گئی۔

"کیسے ذکر کرتی۔۔۔ کیف نے منع جو کر رکھا تھا۔"

"اچھا چلو جو بھی ہوا وہ بہتر ہوا۔۔۔ بس اب اللہ کیف اور صیام کو خوش رکھے۔" روشن امی نے روٹی کی قندوری کے ساتھ ساتھ بات بھی سمیٹنا چاہی۔

"سچ تو یہ ہے کہ شامیر بھی برا لڑکا نہیں ہے۔ سلجھا ہوا، تمیزدار، باادب بچہ ہے۔ بات کرتے ہوئے لگتا ہی نہیں کہ اتنا عرصہ ملک سے باہر گزار کر آیا ہے لیکن کیف کے آگے اسے تو اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی۔"

وہ بولتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں تو خوش نصیب وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ کتاب کو اس نے یونہی ایک طرف رکھ دیا تھا۔

ماہ نور نے کن انکھیوں سے اس کی کیفیت دیکھی پھر جھجک آمیز لہجے میں بولی۔

"سنو۔۔۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ کیف اور صیام کی منگنی سے تم کچھ خاص خوش نہیں ہو۔"

"تمہارا دماغی فتور ہے ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ میں تو اتنی خوش ہوں کہ میرے بس میں ہوتا تو پورے محلے میں مٹھائی بٹواتی۔" چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے حسب عادت ترنت کہا تھا لیکن ہزار ہا کوشش کرنے کے باوجود اپنے لہجے کا پھیکا پن چھپا نہیں پائی تھی۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو خوش نصیب! اور ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔" ماہ نور نے زبردستی اس کا رخ اپنی طرف موڑا تو خوش نصیب جھلا ہی گئی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی۔"

"میں تو نہیں ہوئی لیکن مجھے لگ رہا ہے تم ضرور ہو گئی ہو۔۔۔ میں فہمیدہ منہاجی کیا تم خود بھی جانتی تھیں کہ کیف تمہیں پسند کرتا ہے۔۔۔ پھر ایک دم سے یہ صیام کو پسند کرنے کا شوشا کیوں چھوڑ دیا تم نے؟"

"کیف مجھے پسند کرتا ہے یہ مجھ سمیت تم سب کا اندازہ تھا۔۔۔ اس نے کبھی اپنے منہ سے تو نہیں کہا ناں اور ویسے بھی جنہیں پسند کیا جاتا ہے یا محبت کی جاتی ہے کیا ان سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسا کیف میرے ساتھ کرتا تھا۔"

وہ نظریں چرا کر بولی تھی۔

"میں نے بھی نہیں دیکھا کہ کیف نے کچھ برا کیا ہو۔"
"میں نے پہلے ہی کہا تھا تمہارے دماغ میں فتور ہے.... پتا نہیں بات کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہی ہو۔" وہ دانستہ چڑ کر بولی تھی۔
"ہٹو.... مجھے سونے دو۔"
"نہیں تم پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔" وہ بضد ہوئی۔
"اوفو.... کون سے جواب چاہئیں تمہیں؟ میں نے کہا ناں کیف صیام کو پسند کرتا تھا مجھے نہیں.... تم خود سوچو.... وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تھوڑا ہی ہے کہ میں نے اس کا اور صیام کا نام لیا اور اس نے چپ چاپ منگنی کروالی۔"
وہ بڑے مدلل لہجے میں کہہ رہی تھی اور فضل منزل کی دوسری منزل پر عرفات ماموں کے کمرے میں کیف منہ پھلائے کھڑا تھا۔

✡ ✡ ✡

"آنکھیں خوابوں کے الزام اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہیں۔
قدم ہجرتوں کے بوجھ سے لڑکھڑانے لگے ہیں۔
منزلیں رفتہ رفتہ مسافتوں میں ڈھلنے لگی ہیں۔
آہ' یہ شب و روز کی گردشیں اور میں۔
شامیں تاریکی کا لباس اوڑھنے سے اکتا کیوں نہیں جاتیں۔

دن روشنی میں نہانے سے بیزاری کا اعلان کیوں نہیں کرتے۔
بادل دھوپ کیوں نہیں لاتے۔
کیوں.... سمندر صحرا نہیں بن جاتے۔
میرا دماغ فرسودہ نظام حیات کو جینے سے انکار کرتا ہے۔
میں اوپر بلندیوں میں اڑنا چاہتا ہوں سورج کی روشنیاں جہاں تک سفر کرتی ہیں۔
میں آواز اور روشنی کی رفتار چاہتا ہوں۔
میں خیال اور تخیل کی چھلانگ مانگتا ہوں۔
میں زماں و مکاں کی قید سے بہت دور ایک بستی بسانا چاہتا ہوں۔
سوختہ جاں روح کو اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہتا ہوں۔
میں نہ ختم ہونے والا وصال چاہتا ہوں۔
پر یہ سب مجھے اذیت میں مبتلا کرتا ہے۔
میری سوچ میرا ہی مذاق اڑاتی نظر آتی ہے۔
میرے تصور میں میرا ہی وجود چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔
میں یہ سب کیسے پا سکتا ہوں؟؟؟
یہ سوال دماغ پر دستک دیتا ہے۔
اور میں....
میں اوپر نیلے آسمان کو دیکھنے لگتا ہوں۔

اس کے کناروں تک میری نظر سفر کرتی ہے۔
وہاں سے آگے میری روح قدم رکھتی ہے۔
تب میں خود کو گہری تاریکی میں پاتا ہوں۔
ایک ایسی تاریکی میں جس پر کبھی کبھی روشنی کا گمان ہوتا ہے۔
پھر ہر احساس خاموشی کی گہری جھیل میں تحلیل ہو جاتا ہے۔
میں گہری وسعتوں میں کھو جاتا ہوں۔
جہاں بدن جسم نہیں رہتا پر خیال ٹھوس ہو جاتے ہیں۔
میں اپنے غیر مرئی جسم کے ساتھ ان خیالات کو چھوتا ہوں۔
ان کو ٹٹول کر ان سے اپنا وجود نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔
لیکن ہمیشہ ناکام ہو جاتا ہوں۔"

(دشت تخیل از ابن عبداللہ)

جس روز آئے کت فلک بوس سے لاپتا ہوئی ٹھیک اسی روز فلک بوس کی روشنیاں ہمیشہ کے لیے گل کر دی گئی تھیں۔ وہ عمارت ایسی سنسان اور رونق سے عاری ہوئی کہ دوبارہ بشام والوں نے فلک بوس میں کسی زندہ انسان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

اسی رات جب فلک بوس کی روشنیاں غم کے بوجھ سے گل کی جا رہی تھیں۔ آسمان کھل کر رو رہا تھا اور بشام کے بھیگتے جنگل کی سفاکی میں ایک انجان لڑکی بہیمانہ طریقے سے قتل کر دی گئی تھی۔ ایک تیز دھار خنجر اس کے سینے میں دل کے مقام پر تین انچ تک گڑا ہوا تھا اور شہ رگ کے پاس گہرا گھاؤ تھا۔ صرف یہی نہیں اس کا چہرہ بے دردی سے خنجر کے پے در پے وار کر کے بری طرح مسخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی پہچان مشکل ہوتی اگر اس کے تن پر وہ عروسی لباس نہ ہوتا جو معاویہ نے آئے کت کے ساتھ جا کر بطور خاص اس دن کے لیے منتخب کیا تھا۔

پہلے ماں، پھر وسامہ اور اب آئے کت بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ معاویہ جذباتی طور پر ریت کی بے بنیاد دیوار کی طرح ڈھے چکا تھا لیکن ہمت ہارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے آئے کت کو تلاش کرنے کی ٹھانی۔

لیکن آئے کت کی اس پراسرار گمشدگی نے کئی مفروضوں کو جنم دیا تھا۔ بشام کے ناخواندہ اور ضعیف العقیدہ لوگ ایک ہی بات پر بضد تھے کہ آئے کت کو فلک بوس کا آسیب لے اڑا ہے۔ لیکن جنگل سے ملنے والے شواہد آئے کت کی موت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ایک عام قیاس یہ تھا کہ آئے کت کو اس آسیب نے اپنے اثر میں کر کے فلک بوس سے نکالا ہو گا اور جنگل کے ہولناک سناٹے میں موت کے گھاٹ اتار دیا ہو گا۔

وادی کے کچھ بچے اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے ڈھلتی ہوئی شام کے ملگجے اجالے میں ایک ہیولے کو ایک بڑی چادر میں لپٹے اور ایک گٹھڑی نما چیز دبوچے تیزی سے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو وادی کی پگڈنڈیوں پر اس وجود کے قدموں کا کھوج بھی لگایا جا سکتا تھا لیکن افسوس۔ صد افسوس۔ بارش نے ہر نشان مٹا دیا تھا۔

معاویہ ان میں سے کسی بھی مفروضے پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اس کا دل اور دماغ کہتے تھے آئے کت نہ صرف زندہ ہے بلکہ کسی بڑی مشکل کا شکار بھی ہے۔ یہ اسی آسیب کی کارستانی تھی جس نے وسامہ کی جان لی تھی۔ اب محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اسے تلاش کرے اور اس مشکل سے چھٹکارا بھی دلوائے۔

لیکن اردشیر ازی نے سنا تو بھڑک اٹھے۔

"اچھا تو اب تم کیا کرو گے؟ اس آسیب کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی تانترک کو بلاؤ گے یا خود کسی غار میں سنیاس لے کر بیٹھ جاؤ گے اور تب تک بیٹھے رہو گے جب تک وہ آسیب آئے کت کو آزاد نہیں کر دیتا؟"
انہوں نے بڑے گہرے طنز اور کٹیلے لہجے میں پوچھا تھا۔
"مجھے نہیں پتا میں کیا کروں گا۔۔۔ مجھے بس اسے تلاش کرنا ہے۔" اس نے نظریں جھکا کر لیکن دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔
"اور اسے تلاش کرنے کے لیے مجھے جس بھی حد تک جانا ہوا میں جاؤں گا۔"
"تمہیں یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آرہی کہ وہ لڑکی تمہیں بیوقوف بنا کر اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔"
"آپ اتنے وثوق سے کیسے یہ بات کہہ سکتے ہیں؟" وہ تڑخ کر بولا تھا۔
"کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے جو آئے کت کو بد کردار ثابت کر دے۔"
"میرے پاس ایک نہیں کئی ثبوت ہیں اور وہ ثبوت میں نے تمہیں اس وقت بھی دکھانے کی کوشش کی تھی جب تم آئے کت سے شادی کا بیوقوفانہ فیصلہ کر رہے تھے۔۔۔ لیکن تمہیں میری کسی بات کا یقین ہی نہیں تھا۔ تم نے نہ صرف اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا بلکہ میری مرضی کے بغیر اپنے اکاؤنٹس کا سارا بیلنس بھی اس کے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کرتے چلے گئے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں ترکی اور پاکستان کے ہر بینک میں موجود آئے کت کے اکاؤنٹس اب تک نہ صرف کلوز کیے جا چکے ہوں گے بلکہ ان میں موجود رقم بھی نکلوائی گئی ہوگی۔"
معاویہ نے پتا کروایا۔ اردشیر ازی کی بات درست ثابت ہوئی۔
معاویہ کا دماغ ماؤف ہو گیا۔
"اب بھی کہہ دو کہ تمہیں میری باتیں بے بنیاد لگ رہی ہیں۔۔۔ میں پہلے دن سے کہہ رہا ہوں۔ آئے کت ٹھیک لڑکی نہیں تھی۔۔۔ نہ وسامہ کے لیے نہ تمہارے لیے۔۔۔ اس جیسی شاطر عورت نے تم دونوں بھائیوں کو صرف دولت کے حصول کے لیے ٹریپ کیا تھا۔۔۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو وہ یہاں سے نکل بھاگی۔"
"میں۔۔۔ میں آپ کی باتیں نہیں مان سکتا اگر اکاؤنٹس فریز ہوئے ہیں یا رقم نکلوائی گئی ہے تو ضرور اس کے پیچھے کوئی ریزن ہوگا۔۔۔ مجھے اس کیس کی پیروی کرنے دیں بابا۔۔۔ مجھے آئے کت کے مجرم کا کھوج لگانا ہے۔"
اس نے بڑی منت سے کہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا اردشیر ازی کی دولت اور سیاسی پہنچ کے بغیر وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔ وہ اردشیر ازی کا بیٹا تھا اور کسی بھی سسٹم میں اپنی بات منوانے کے لیے اسے اردشیر ازی کے نام کا حوالہ درکار تھا۔ یہاں تک وہ محنت کر کے اس مقام تک نہ پہنچ جاتا جہاں آج اس کا باپ کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنے بیٹے کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا ہو۔
"اس کا مطلب تم میری بات نہیں مانو گے۔۔۔ اب بھی نہیں مانو گے جب اتنا کچھ ہو چکا ہے۔ وہ لڑکی بھری محفل میں تمہارے منہ پر کالک مل کر جا چکی ہے۔۔۔ میری سوسائٹی میں ایک ساکھ ہے۔ ایک پہچان ہے معاویہ! اور وہ ساکھ تمہاری اس آئے کت کی وجہ سے خراب ہوئی ہے۔۔۔ کوئی یہ نہیں کہے گا ایک لڑکی لاپتا ہو گئی۔ سب یہی کہیں گے اردشیر ازی کے اکلوتے بیٹے کی ہونے والی بیوی۔۔۔ عین نکاح کے وقت کہیں غائب ہو گئی۔۔۔ یہ بھوت آسیب کے قصے کئی صدیوں پہلے تو بیچ مانے جا سکتے تھے لیکن آج کل کے دور میں تم کسی کو یقین نہیں دلا سکو گے کہ آئے کت کو کسی نام نہاد آسیب نے غائب کیا ہے۔
ٹھیک ہے پھر تمہاری مرضی۔۔۔ اس نام نہاد آسیب سے نمٹنے کے لیے کسی پیر فقیر یا تانترک کے پاس جاؤ۔

مزاروں اور جعلی پیروں کے آستانوں پر حاضریاں دو یا جنگل میں ملنے والی اس لاش کا ڈی این اے کرواتے پھرو۔۔۔ لیکن مجھ سے کسی تعاون کی امید مت رکھنا معاویہ! میں اپنا پیسہ اور وقت اس لڑکی پر برباد نہیں کر سکتا جس کی دھوکہ دہی صاف ظاہر ہے۔۔۔ اور نہ ہی میں تمہیں اپنا پیسہ ضائع کرنے دوں گا۔

دوسری بات فلک بوس میں آج کے بعد کوئی انکوائری نہیں ہو گی۔ یہاں پولیس کے جتھے یا پرائیویٹ انویسٹیگیٹرز نہیں آئیں گے۔۔۔ جلد یا بدیر میں اس عمارت کو فائیو اسٹار ہوٹل کی شکل دینا چاہتا ہوں اور تمہاری وجہ سے فلک بوس کا نام مارکیٹ میں خراب ہو یہ مجھے ہرگز منظور نہیں ہے۔"

انہوں نے انتہائی لاتعلقی اختیار کر لی۔ اور معاویہ کے پاس کوئی چارہ نہ بچا کہ خاموشی اختیار کر لے۔ لیکن اسی دن اسے ایسا لگا وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔

جسم میں روح تھی لیکن زندہ رہنے کی رمق نہیں۔

سینے میں دل تھا لیکن دھڑکنے کی جستجو سے عاری۔

موت سے زیادہ سفاک چیز زندگی ہے۔ موت تو اپنا شکار دبوچ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ زندگی ایسا وار کرتی ہے کہ پھر انسان زندوں میں رہتا ہے نہ مردوں میں۔



"اگر میں اپنے حق میں کچھ بھی کہتا تو خوش نصیب کی بات غلط ثابت ہو جاتی۔ پہلے ہی سب لوگ اس کے خلاف رہتے ہیں اس بات کے بعد اور ہو جاتے۔"

وہ بچوں کی طرح ہی منہ پھلا کر کہہ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود عرفات ماموں اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں سکے۔

"اس سے ناراض بھی ہو اور اس کے امپریشن کی فکر بھی ہے۔۔۔ خوب۔"

"کیا کروں؟ اس سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں سکتا ناں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"پھر اب کیا سوچا ہے تم نے؟ صیام سے شادی کر لو گے؟"

"مر جانا اس سے کہیں زیادہ بہتر رہے گا۔" اس نے ترنت ناراضی سے کہا تھا۔

"لیکن پھر یہ صیام کے ساتھ بھی زیادتی ہو گی۔"

"میں کیا کروں عرفات ماموں! ہر ایک کی بھلائی سوچنا میری ذمہ داری ہی تو نہیں ہے ناں۔"

"پہلے تو تم ریلیکس ہو جاؤ۔۔۔ اس طرح ہائپر ہونے سے کچھ نہیں ہو گا۔"

"خوش نصیب نے بہت زیادتی کی ہے۔۔۔ اسے میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دینا تھا تو مت دیتی لیکن کم سے کم بیر تو نہ کرتی۔ منگنی توڑتا ہوں تو صیام ہرٹ ہو جائے گی۔ خاندان بھر کی باتیں سننا پڑیں گی الگ۔۔۔ اور اگر اس رشتے کو نبھاتا ہوں۔۔۔ تو اپنے دل کے ساتھ ظلم کرنے والی بات ہو گی۔"

وہ دکھ بھرے انداز میں کسی قدر بیزاری کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"تم کہو تو میں خوش نصیب سے بات کروں؟"

عرفات نے ہمدردی سے پوچھا تھا کیف آج بہت بدلا ہوا سا لگ رہا تھا اداس بیزار۔ اور اس کا یہ انداز عرفات کو ہرگز پسند نہیں آیا تھا۔

ان کا سوال سن کر اپنی دھن میں مگن اندر داخل ہوتی خوش نصیب کے پیر دہلیز نے جکڑ لیے تھے۔

اندر وہ کہہ رہا تھا۔

"کیا فائدہ ہو گا؟ وہ محترمہ تو اپنی نام نہاد عقل مندی میں میرا کباڑا کر ہی چکی ہیں۔۔۔ ویسے عرفات ماموں! مجھے

احساس ہو رہا ہے اپنے دل کے ہاتھوں میں مجبور ہو گیا تھا ورنہ خوش نصیب جیسی لڑکی سے محبت کرتے ہوئے تو دوبار سوچنا چاہیے تھا... اس سے تو اچھا تھا میں نے صیام سے ہی محبت کرلی ہوتی۔ اچھی شکل کے ساتھ ساتھ کہیں تو اپنی عقل بھی استعمال کرتی ہے۔"

وہ بڑا اداس اداس بول رہا تھا۔ خوش نصیب سے اور برداشت نہ ہوا تو اندر چلی آئی۔

کیف اسے دیکھ کر چونکا پھر خفگی سے منہ موڑ لیا۔

"میں چلتا ہوں ماموں! پھر آؤں گا۔"

وہ عرفات ماموں سے مخاطب خوش نصیب کے قریب سے گزر کر جانے لگا تو خوش نصیب بولی۔

"میری وجہ سے جا رہے ہو؟"

کیف نے اسے اتنی خفگی سے گھورا کہ خوش نصیب نظریں ہی چرا گئی۔

"تمہارے لیے جو میں کر رہا ہوں ناں... اسے ہی بہت سمجھو... اور مزید کسی فیور کی تو امید بھی مت رکھنا۔"

اس نے دانت کچکچا کر کہا اور باہر نکل گیا۔

خوش نصیب جو پہلے ہی جذباتی قسم کے ذہنی بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اس بات پر مزید اس کا سر جھک گیا۔

"اب منہ لٹکانے کا کیا فائدہ؟ پہلے ہی سوچ سمجھ کر بول لیا ہوتا تو یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔" عرفات ماموں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"آپ بھی مجھے ہی غلط سمجھتے ہیں؟" اس قدر اداسی تھی اور تنہا رہ جانے کا پچھتاوا تھا اس کے لہجے میں کہ کچھ دیر کے لیے عرفات احمد بھی خاموش ہی رہ گئے۔ لیکن کب تک خاموش رہا جا سکتا تھا۔

"نہیں..." عرفات احمد گہری سانس بھر کر بولے۔

"کیونکہ تم نے غلطی نہیں کی... یہ تو سراسر بے وقوفی تھی خوش نصیب؟ اپنے پیر پر کلہاڑی مار لی سو مار لی... کیف کا مستقبل بھی خراب کر دیا۔"

"اس میں کیف کا مستقبل خراب ہونے کی کیا بات ہے... یہ تو طے ہے کہ مجھے اس کے ساتھ کسی حال میں شادی نہیں کرنی تھی۔"

"ہاں تو مت کرتیں لیکن تمہیں یہ حق کس نے دیا تھا کہ صیام کو اس کے ساتھ نتھی کرتیں۔ کیف نے تو ہر برے بھلے وقت میں تمہارا ساتھ دیا ہے خوش نصیب! اس کے ساتھ کون سی دشمنی نکالی ہے تم نے۔"

وہ الجھے الجھے سے بول رہے تھے۔

"ایسے مت کہیں... میں کیوں دشمنی نکالوں گی اور... اور صیام میں آخر برائی ہی کیا ہے، جو کیف ایسے ری ایکٹ کر رہا ہے۔"

"جہاں دل راضی نہ ہو... وہاں ہزار خوبیاں ہوں تب بھی انسان خوش نہیں رہ سکتا۔"

"میں نے جو کیا اسی میں صیام کی بھلائی ہے۔" وہ زور دے کر بولی تھی۔

"صیام کی بھلائی کے لیے کیف کی بھلائی کو نظر انداز کر دیا۔" عرفات احمد الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"اور پھر صیام کی کیسی بھلائی؟ اس کے لیے تو شامیر بھی بہتر ہی تھا۔"

"آپ کو کچھ نہیں پتا۔" اپنی بات منوانے کی کوشش میں نڈھال سی ہو کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"لیکن کیف کو تو میرا اعتبار کرنا چاہیے تھا... وہ تو ساری حقیقت جانتا تھا۔" خود کلامی۔

"کیا مطلب؟ کیسی حقیقت؟" وہ الجھن آمیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔
خوش نصیب نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ اب بس یہی ایک راستہ بچا تھا کہ وہ عرفات ماموں کو شامیر کی حقیقت بتا کر انہیں اپنا ہم نوا بنالیتی۔
"کیا آپ میرا اعتبار کریں گے؟" اس نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔
عرفات احمد نے آج سے پہلے اسے کبھی اتنا بے بس نہیں دیکھا تھا۔ وہ لڑتی تھی جھگڑتی تھی اور اپنی بات منوانے کے لیے جی جان کی بازی لگا دینے کی قائل تھی۔ آخر اب ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ اتنی بے بس نظر آ رہی تھی۔
"کیوں اعتبار نہیں کروں گا؟ آخر اس سے پہلے بھی تو تمہاری ہر بات مانتا رہا ہوں۔" انہوں نے بڑی حوصلہ افزا انداز میں کہا تھا۔
خوش نصیب کا دل حوصلہ مندی سے بھر گیا۔



اور یوں معاویہ زندوں میں رہا نہ مردوں میں۔
اردشیرازی کے خلاف جانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ سو آئے کت کی تلاش کو اس نے ترک کر دیا۔ مردہ دل کے ساتھ دنیا والوں کے ساتھ گزارا کرنا مشکل تھا۔ سو وہ تنہا سے تنہا ہوتا چلا گیا۔ بظاہر ایک کامیاب لیکن تنہا انسان بنتا چلا گیا۔
مزاروں، پیروں فقیروں کے آستانوں پر حاضریاں دیتے وہ تھکتا نہ تھا۔ ہر وہ جگہ جہاں اسے امید ہوتی کہ اس ہندو عورت کی روح سے بات کرنے کا موقع مل سکتا ہے معاویہ اردشیرازی پہنچ جاتا تھا اور ہر بار ناکام ہو کر لوٹتا تھا۔
سات آٹھ سال کی اس مدت میں وہ ایک جذباتی نوجوان سے بھرپور مرد بن چکا تھا۔ اتنا ہی اس کا عقیدہ روحوں اور اس دوسری دنیا کی مخلوق کے متعلق مضبوط بھی ہوا تھا۔ اردشیرازی اس کے باپ ضرور تھے لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر کبھی بھی اس کے قریب نہ ہو سکے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اب بھی اسے زندگی کی طرف آتا دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ وہ آئے کت کا دیا ہوا زخم بھول رہا ہے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔
آئے کت کو تلاش کرنے کی جستجو میں وہ نہ صرف خود تنہا ہوتا چلا گیا تھا بلکہ اس کی نیند چین بھی مکمل طور پر اس سے روٹھ چکے تھے۔ وہ سو رہا ہوتا تو وسامہ کی بے بسی اسے جگا دیتی۔ جاگ رہا ہوتا تو آئے کت کی یادیں اسے بے چین کیے رکھتیں۔
وہ کم گو اور چڑچڑے مزاج ہوتا چلا گیا۔ آدم بے زاری اس کی پیشانی پر بلوں کی طرح نمودار ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے بارے میں تجسس محسوس کرتے لیکن اس کے قریب آنے سے ڈرتے تھے۔
کبھی وہ لوگوں سے رابطہ بڑھالیتا پھر کہیں سے ماضی کی یاد کا ایک کنکر آ کر اس کے ذہن سے ٹکراتا اور وہ بے بسی سے ان یادوں کو چن چن کر اپنے ارد گرد جمع کر لیتا جس سے بس اسے تلخی ہی مل سکتی تھی۔
اسے پروا نہیں تھی کہ کوئی اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ ارد گرد والوں نے اس کے متعلق کتنی کہانیاں اخذ کر لی ہیں۔ اسے تو بس ایک جستجو تھی۔ ایک لگن تھی جو اس کی رگ جاں کو کاٹتی تھی۔ اسے کسی پل سکون نہ لینے دیتی تھی۔
اس کے اندر ایک آگ تھی جو بجھتی نہ تھی اور اس آگ کو مونٹوک کے ساحل کے شفاف پانی کی گہرائی نے بجھا دیا تھا۔

وہ پانی کی نرمی کو کاٹ کر نیچے اترتا رہا' نیچے' بہت نیچے۔۔۔ یہاں تک کہ بس اس کے ارد گرد صرف پانی رہ گیا۔
تب اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ پیر چلانا چھوڑ دیے اور خود کو پانی کے بہاؤ کے حوالے کر دیا۔
اس کا وجود ہر غم سے آزاد ہو کر پانی کے ساتھ ایک تنکا بن کر بہنے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
اتنا تنہا اتنا لاچار تھا وہ کہ اب شاید دنیا میں کوئی بھی اس کا اپنا نہیں تھا۔ اور اس تنہائی نے اسے بے بس کر دیا تھا۔
لانگ آئی لینڈ کے ساحل کے کنارے اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اپنی زندگی کے کئی سال سوچتا چلا گیا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام کی تیز ہوا بدلتے موسم کی پیشن گوئی کر رہی تھی لیکن یہاں کھڑا معاویہ جیسے ہر چیز سے لاپرواہ ہو چکا تھا۔ آج وہ اتنا پرسکون تھا کہ اسے کسی بھی چیز سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔
گہرے پانیوں میں اترنے کے بعد نہ اسے وسامہ کی ڈائری یاد رہی تھی نہ آئے کت کی ہنسی کی کھنک۔ اس نے ہر تلخی کو پانی کے حوالے کرنے کی کوشش کی تھی اور شاید کامیاب بھی رہا تھا۔ ساحل کے کنارے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تنہا کھڑا وہ بے وجہ ہی مسکرا رہا تھا۔ اور ایسے مسکراتا ہوا وہ چھوٹا سا بچہ لگ رہا تھا۔
پرسکون۔ بے ریا۔
ساحل سمندر سے کچھ دور مسٹر جمال کے اپارٹمنٹ کی بتیاں جلا دی گئی تھیں۔



یہ ایک سر چکرا دینے والی داستان تھی، جو خوش نصیب نے عرفات احمد کو سنائی۔ نتیجتاً" وہ سر پکڑے ہی بیٹھے تھے۔
"تم کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"
"شروع شروع میں مجھے بھی یہ ساری باتیں عجیب سی لگی تھیں۔۔۔ اتنی ہی ناقابل فہم جتنی اس وقت آپ کو لگ رہی ہیں۔۔۔ کاش کاش۔۔۔ میں اپنا دماغ کھول کر دکھا سکوں۔۔۔ ایک ہی وقت میں کہیں پر موجود رہتے ہوئے میں کسی اور دنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ جہاں میرے ساتھ عجیب عجیب واقعات ہوتے ہیں۔۔۔ کبھی مجھے لگتا ہے میں پانی کی تہہ میں سانس لے رہی ہوں۔۔۔ اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ریت کا طوفان مجھے اپنے ساتھ اڑائے پھر رہا ہے۔"
خوش نصیب بڑی بے چارگی کے ساتھ بولتی چلی جا رہی تھی۔
"کیف میرا یقین نہیں کرتا نہ کرے' لیکن آپ کو تو میرا اعتبار کرنا ہو گا عرفات ماموں! آپ جانتے ہیں میں جتنا مرضی کسی سے لڑوں، جھگڑوں۔۔۔ لیکن میں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔"
"میں صیام کو شامیر کے چنگل سے بچانا چاہتی تھی اور اس کے سوا مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا کہ شامیر کے بجائے کیف سے اس کا رشتہ طے کر دیا جائے۔ میرا یقین کریں اگر میں ایسا نہ کرتی تو شامیر صیام کا بہت برا حال کرتا۔"
اسی وقت جب خوش نصیب بڑا جذباتی ہو کر بول رہی تھی کیف واپس آیا اس نے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اس کی ساری بات سن لی تھی اور بگڑا ہوا موڈ کچھ اور بگاڑ لیا تھا۔
"اس کی الف لیلیٰ سن لی ہو تو ذرا آ کر ابو کی بات بھی سن لیں۔۔۔ انہوں نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔"
وہ ناراض ناراض سا گویا ہوا اور کہہ کر چلا گیا۔ جانے سے پہلے کڑکتی نظریں خوش نصیب پر ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

خوش نصیب نے آس بھری نظروں سے عرفات ماموں کو دیکھا تو وہ الجھن زدہ سے بیٹھے نظر آئے۔

"ماموں!!"

"اس بارے میں پھر بات کرتے ہیں.... میں ذرا بھائی صاحب کی بات سن لوں۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور خوش نصیب کے چہرے کی جوت بجھ گئی اس پر ایک بار پھر مایوسی کا بادل چھا گیا تھا۔



منفرا نے مسز جمال کے ساتھ مل کر کھانا میز پر چن دیا اور وہیں کچن کی کھڑکی سے دور ساحل پر جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسا کر کھڑے معاویہ کو دیکھا اور مسکرائی۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ اس قدر اجنبی دکھائی دینے والا شخص کسی روز اس کے گھر میں بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہوگا۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے مسز جمال کو بتایا اور اپنی کیپ شال کو اچھی طرح کندھوں کے گرد پھیلاتی باہر نکل آئی۔ لیکن چند قدم چل کر اسے احساس ہوا اسے کیپ شال کے علاوہ بھی کوئی گرم کپڑا اوڑھ لینا چاہیے تھا۔ ساحل کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں اچھی خاصی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔

جانے نہیں اتنی دیر سے معاویہ اتنے سکون کے ساتھ وہاں کیسے کھڑا ہوا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے منفرا اس کے قریب پہنچ گئی اور چند قدم کے فاصلے پر جا کر رک گئی۔

"تم اندر کیوں نہیں آجاتے.... میرے خدا! یہاں سردی بہت بڑھ گئی ہے۔"

اس کی آواز پر معاویہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ساحل کی ہوا جیسی دلکش لڑکی پنک کلر کی کیپ شال اوڑھے سردی سے باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی ناک سردی سے لال ہو چکی تھی اور اس وقت بڑی مزاحیہ لگ رہی تھی۔ معاویہ نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے غیر محسوس انداز میں چہرے کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔ اور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا... لیکن مجھے تو کوئی خاص سردی نہیں لگ رہی۔"

"اوہ ہاں...." منفرا بے ساختہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "میں کیسے بھول گئی کہ تم اس معاملے میں تھوڑے بے حس ہو.... پارک میں بھی تم ہر روز ایک باریک سا اپر پہن کر آجاتے تھے اور تمہیں دیکھ کر میں اور فی بی ٹھنڈ سے کپکپایا کرتے تھے۔"

"ہاں موسم کی شدت کا مجھے کبھی ایسے احساس نہیں ہوتا جیسے عام لوگوں کو ہوتا ہے۔" جھینپے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

منفرا ہنس دی۔

"میرا خیال تھا تم نہیں مانو گے۔"

"اچھا... وہ کیوں؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"arrogant persons (مغرور لوگ) اتنے آرام سے اپنی خامیوں کا اعتراف نہیں کرتے۔" معاویہ اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسا تھا۔

"ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا... تم نے اور تمہاری سہیلی نے بہت ریسرچ کی ہے مجھ پر۔"

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولی اور اس کی مسکراہٹ میں ایسا عنصر تھا۔ جیسے انسان

کسی بات کا لطف بھی لے رہا ہوتا ہے اور اسے رد بھی کر رہا ہوتا ہے۔
"تم پارک میں آتے جاتے ہوئے نظر آجاتے تھے تو نوٹس کر لیتے تھے ہم۔ ورنہ ہم نے کبھی لڑکوں پر دھیان نہیں دیا۔"
"اوہ رئیلی۔" وہ بھی شرارت سے گویا ہوا اور ایسے کہا جیسے کہہ رہا ہو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔
"اور.... وہ اس روز ٹیوب (زیر زمین ٹرین) میں کیا ہوا تھا.... جب تمہاری سہیلی میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے بلاوجہ میرے ساتھ ضد کرنے لگی تھیں۔" وہ مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں میں دبائے مزے سے پوچھ رہا تھا اور اس کی بات سن کر منفرا ہکا بکا ہی رہ گئی تھی۔ وہ اتنا لا تعلق دکھائی دینے والا شخص اس وقت بھی اسے اور اس کی سہیلیوں کو نوٹس کر چکا تھا۔ یہ ایک حیران کن انکشاف تھا۔ اور اس نے کتنی مہارت سے اگلی کئی ملاقاتوں میں اپنے تاثرات چھپائے رکھے تھے۔
منفرا بے ساختہ اس بات کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔ جس پر معاویہ ہنس دیا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اپنے تاثرات چھپائے، بس آپ ہر وقت ایک طرح ری ایکٹ نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد جب بھی تم میرے سامنے آئیں میں کسی اور موڈ میں ہوں.... اور میں نے تمہیں پہچاننا ضروری نہ سمجھا ہو....."
"تم موڈی لگتے تو نہیں ہو۔"
"چھوڑو.... تم نہیں سمجھو گی۔ معاویہ نے سر جھٹک کر کہا تھا۔ "چلو کھانا کھاتے ہیں۔ مسز جمال نے ضرور آج بھی کوئی مزے دار چیز بنائی ہو گی۔"
منفرا جو اس کی بات سے الجھ سی گئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ چل دی۔



عرفات احمد، خوش نصیب کے پاس سے اٹھے تو بڑے بہنوئی کے کمرے میں چلے آئے۔ انہیں آبائی دکانوں اور زمینوں کے حساب کتاب سے متعلق کچھ معلومات درکار تھیں۔ جو عرفات احمد نے انہیں فراہم کر دیں۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے وہ ان کے پاس بیٹھے رہے، چائے پی۔ باتیں کیں لیکن سچ تو بس یہی ہے کہ ایک منٹ کے لیے بھی خوش نصیب کی کہی ہوئی باتیں ان کے دماغ سے نہیں نکل سکی تھیں۔
وہ دراصل ان لوگوں میں سے تھے جو کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے ہونے کی بنا پر بہت سی ایسی مافوق الفطرت چیزوں کے وجود پر بھی یقین رکھتے ہیں جن کا یقین عام انسان کے فہم سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ پیروں فقیروں کے آستانوں پر بھی جاتے تھے۔ ان کی قبروں پر فاتحہ خوانی بھی کرتے تھے چادر بھی چڑھاتے تھے لیکن عقیدت میں جہالت کے مرتبے تک وہ کبھی نہیں پہنچے تھے۔
وہ ہر بات، ہر نظریے، ہر عقیدے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے پر یقین رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جادو ٹونا، ناری مخلوق کے وجود سے وہ کبھی بھی انکاری نہیں ہوئے تھے۔
خوش نصیب کی باتوں نے انہیں مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ نہ وہ پوری طرح اس کی بات کی سچائی کو رد کر پا رہے تھے نہ ہی قبول کرنے کی پوزیشن میں تھے۔
جس وقت وہ اشفاق صاحب کے کمرے سے نکلے شامیر سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ تابع دار لڑکا تھا انہیں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا اور حال احوال دریافت کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں عرفات احمد نے اسے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ جسے شامیر نے ہنس کر قبول کر لیا تھا۔

جب کیف کو پتا چلا تو وہ چڑ گیا تھا۔
"یعنی آپ کو خوش نصیب کی داستان پر یقین آہی گیا۔۔۔ کم آن ماموں!" وہ خوش نصیب کے ہاتھوں تازہ تازہ نقصان کا شکار ہوا تھا' سو بیزاری سے بولا۔
"یقین آیا ہے یا نہیں۔۔۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔"
"چلیں۔۔۔ اس بار آپ کا یہ مان تو ٹوٹا۔"
"تمہیں کیوں لگتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے؟"
"تاکہ مجھ سے پیچھا چھڑا سکے۔" وہ بیزاری سے بولا۔
"یہ سچ نہیں ہے کیف!" انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔
"آپ تو اس کا ساتھ ہی دیں گے۔" بچوں کی طرح ناراض ہی ہو گیا تھا وہ تو۔۔۔
"خوش نصیب سچ کہہ رہی ہے یا نہیں۔۔۔ اسی بات کا فیصلہ کرنے کے لیے تو شامیر کو بلایا ہے اور میں چاہتا ہوں تم بھی اس وقت میرے ساتھ موجود رہو۔" عرفات ماموں نرمی سے بولے۔
"چھوڑیں بھی۔۔۔ اس کا تو فائدہ ہی ہو گیا۔۔۔ صیام جیسی مصیبت کو ساری زندگی بھگتنے سے بچ جو گیا ہے۔"
"یعنی میں یہ سمجھوں کہ تم نہیں آؤ گے؟"
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" ان کی ناراضی کے ڈر سے کیف نے فوراً" ہتھیار ڈال دیے تھے۔
"چلو ٹھیک ہے پھر۔۔۔ رات کے کھانے پر ملاقات ہوتی ہے۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر چلے گئے تھے۔



کھانا کھانے کے بعد مسز جمال اور منفرا کچن کا بکھراوا سمیٹنے لگیں جبکہ مسٹر جمال' آدم عرف ایڈم اور معاویہ سٹنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بلکہ مسٹر جمال اور آدم ہی زیادہ تر بولتے رہے' معاویہ نے بہت کم باتیں کی اور زیادہ کام اپنی مسکراہٹ سے چلایا۔
کافی بنانے کے لیے دودھ کو ساس پین میں منتقل کرتے ہوئے منفرا نے دیکھا۔ معاویہ چپ چاپ مسکراتا ہوا بڑی دلچسپی سے مسٹر جمال کی جدوجہد کی کہانی سن رہا تھا۔
وہ پتا نہیں کیوں۔۔۔ مسکرا دی۔
"پاکستان سے آتے ہوئے میں بھی بہت سے خواب اپنی آنکھوں میں سجا کر آیا تھا لیکن جتنی مشقت بھری زندگی میں نے گزاری ہے' اس کی توقع ہر گز نہیں تھی مجھے۔۔۔ وہاں رہتے ہوئے تو ایسا لگتا تھا' امریکا خوابوں کی سرزمین ہے۔ مجھے اب تک اپنی ماں کی وہ منتیں یاد آتی ہیں جو انہوں نے مجھے یہاں آنے سے روکنے کے لیے کی تھیں۔۔۔ وہ کہتی تھیں۔ جمال احمد! ایک بار چلا گیا تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔ میں جانتی ہوں میں دوبارہ تیری شکل نہیں دیکھ سکوں گی۔۔۔ اب سوچتا ہوں۔ ماؤں کو الہام ہوتے ہیں اس لیے ان کی باتیں مان لینی چاہئیں۔۔۔ میں نے اپنے خواب تو پورے کر لیے لیکن ماں کی آنکھوں میں انتظار چھوڑ آیا۔"
اپنی نظر کی عینک اتار کر انہوں نے آنکھوں کے کنارے پونچھے تو معاویہ کا دل بوجھل سا ہو گیا۔ آدم جلدی سے جا کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور بازو ان کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔
"جہاں اتنا کچھ بتا رہے ہیں وہاں معاویہ کو یہ بھی تو بتائیں کہ امریکا آ کر آپ کو سب سے بڑا فائدہ کیا حاصل ہوا ہے؟" مسٹر جمال کا موڈ بحال کرنے کے لیے وہ کچھ زیادہ ہی ڈرامائی انداز میں کہہ رہا تھا۔
"اچھا آپ نہیں بتائیں گے تو میں بتا دیتا ہوں امریکا آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ڈیڈی کی ملاقات میری اولڈ

بیوٹی فل (ہمیشہ خوب صورت) مام سے ہو گئی۔۔۔ دونوں میں زبردست افیئر چلا اور کئی مراحل طے کرنے کے بعد نانا نے انہیں مام سے شادی کی اجازت دی۔ تھینک اوور اٹ ڈیڈ! اگر آپ امریکانہ آتے تو مام سے نہ ملتے اور مام سے نہ ملتے تو اللہ آپ کو اتنا خوب صورت بیٹا کیسے دیتا۔"

اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا تھا کہ مسٹر جمال اور معاویہ ہی نہیں امریکن اسٹائل کچن میں کھڑی منفرا اور مسز جمال بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

"تم پریشان مت ہونا معاویہ! میرے بیٹے کو بات بے بات اپنی تعریف کرنے کی عادت ہے۔" مسز جمال نے خوش دلی سے کہا تھا۔

"اب کوئی تعریف نہ کرے تو کیا میں خود بھی نہ کروں۔" وہ ڈھٹائی سے ہنس کر بولا تھا۔

"آدم کی بات کسی حد تک صحیح ہے۔۔۔ میں جتنا مرضی دکھی ہولوں لیکن ایک بات کا دل سے قائل ہو چکا ہوں اور وہ یہ کہ ہر ہجرت انسان کو کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور دیتی ہے۔۔۔ پھر وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کی ہجرت ہو۔ یا ایک انسان سے دوسرے انسان تک کی۔۔۔ ہاں دل سے، پچھتاووں کو ہم نہیں نکال سکتے۔"

معاویہ نے اس بات پر چونک کر مسٹر جمال کو دیکھا تھا۔ وہ تو بس بات برائے بات بول رہے تھے لیکن اس کے دل و دماغ میں جیسے کوئی پن اٹک سی گئی تھی۔

اسی پل منفرا نے کچن کے پارٹیشن سے ان سب کو مخاطب کیا۔

"کافی کون کون پیئے گا؟"

"بھئی۔ میں تو اب سوؤں گا۔۔۔ تم بچے انجوائے کرو۔" مسٹر جمال نے کہا تو معاویہ بھی معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"میں بھی چلوں گا اب۔"

"کم آن۔۔۔ ہم تمہاری پہلی ڈائیو (dive) کو سیلیبریٹ کر رہے ہیں۔۔۔ کچھ دیر تو اور رکو۔۔۔ منفی! کافی ٹیرس پر لے آنا۔" آدم نے اتنے مان اور خلوص سے کہا تھا کہ معاویہ انکار نہیں کر سکا۔



گیلری کی دوہرے کواڑ والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جہاں سے آسمان دکھائی دے رہا تھا اور آسمان کے سینے پر ڈھلتے ہوئے چاند کی مانند بڑتی چاندنی میں رات چپکے چپکے بہہ رہی تھی۔

نیند اس کی آنکھوں سے اتنا ہی دور تھی۔ جتنا وہ چاند

جب اس کی آنکھیں آسمان کو دیکھتے تھک چکیں تو اس نے کروٹ بدل کر ماہ نور کا کندھا ہولے سے ہلا دیا۔

"ماہ نور! ماہ نور۔۔۔"

ماہ نور نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے خوش نصیب؟"

"اٹھو ناں۔ مجھ سے باتیں کرو۔۔۔ مجھے نیند نہیں آ رہی اور پتا نہیں کیوں عجیب سی وحشت ہو رہی ہے۔" اس نے الجھے ہوئے سے لہجے میں بے بسی سے کہا تھا۔

ماہ نور نے پوری آنکھیں کھول کر ذرا حیرانی سے اسے دیکھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟"

خوش نصیب نے کروٹ بدلی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

"طبیعت ٹھیک ہے... قسمت ٹھیک نہیں ہے۔"
"ہوا کیا ہے تمہیں؟"
"پتا نہیں۔"
"محبت وحبت تو نہیں ہو گئی۔" ماہ نور نے ذرا سیدھے ہو کر ایک ہاتھ کا سہارا سر کو دیا اور شرارت سے پوچھنے لگی۔
"کاش محبت ہی ہو گئی ہوتی... کم سے کم اپنی محبت کی خود غرضی میں مجھے یہ تو نظر نہ آتا کہ میں کیف کے ساتھ زیادتی کر گئی ہوں۔" اس نے دل میں سوچا اور انگلی کی پور سے آنکھ کے کنارے جمع ہو کر بہہ نکلنے کے لیے بے تاب سی نمی کو پونچھ ڈالا تھا۔ اور ماہ نور سے بولی۔
"نہیں محبت نہیں ہوئی... اگر کبھی ہوئی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گی۔"
"پتا ہے ہم سب کو لگتا تھا کیف اور تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔"
"پتا نہیں یہ غلط فہمی کیوں تھی سب کو... ہم تو ایک دوسرے سے اتنا جھگڑتے رہے ہیں۔"
"اسی لیے تو لگتا تھا۔" ماہ نور آواز دبا کر لیکن کھلکھلا کر ہنسی تو خوش نصیب نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
"یہ کیا بات ہوئی؟"
"بھئی، جہاں محبت ہوتی ہے، جھگڑے بھی تو وہیں زیادہ ہوتے ہیں ناں۔"
"بڑی بونگی لاجک ہے۔" اس نے گردن موڑی اور واپس چھت کو دیکھنے لگی۔
"ہاں... ہے تو۔" ماہ نور نے کروٹ بدلی اور بالکل خوش نصیب کے انداز میں لیٹ کر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ معنی خیز خاموشی ان دونوں کے درمیان چپکے چپکے بہتی تھی۔
"خوش نصیب!"
"ہوں؟"
"ایک بات بتاؤں؟"
"بتاؤ؟"
"ڈانٹو گی تو نہیں؟"
"تمہیں کب سے میری ڈانٹ کی فکر ہونے لگی؟" خوش نصیب نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔ جواباً "ماہ نور ہنسنے لگی اس کی سریلی ہنسی کا ترنم ہی جدا تھا۔
"پتا ہے خوش نصیب...! مجھے ہمیشہ سے لگتا تھا۔ اللہ نے میری قسمت بہت خاص بنائی ہے۔" ماہ نور اٹھ کر بیٹھی اور تکیہ جھولی میں دبوچ کر کہنے لگی۔ خوش نصیب نے تعجب سے اسے دیکھا۔
"آفرین ہے بھئی تم پہ... جو فضل منزل میں رہتے ہوئے اور خاندان بھر کی زیادتیاں سہنے کے باوجود اتنا مثبت سوچتی رہی ہو۔"
"اوہو! پوری بات تو سنو ناں۔" وہ جھلا کر بولی پھر مسکرائی اور خواب سے لہجے میں بولی۔
"تو مجھے ہمیشہ لگتا تھا اللہ نے میری قسمت بہت خاص بنائی ہے اور جیسے اس نے میری قسمت خاص بنائی ہے ایسے ہی میری لیے کہیں ایک شہزادہ بھی بنایا ہو گا۔"
خوش نصیب بے ساختہ ہنس دی۔
"اور تمہیں یہ بھی لگتا ہو گا کہ کسی دن وہ شہزادہ تمہیں سفید گھوڑے پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔" انداز

صاف مذاق اڑانے والا تھا۔
"ہاں۔۔۔ میں ہمیشہ سے یہی خواب دیکھتی رہی ہوں۔" ماہ نور نے خوش نصیب کی ہنسی کا برا مانے بغیر بتایا تو خوش نصیب ایک منٹ کے لیے حیران ہی رہ گئی پھر ہنسنے لگی تو ہنستی ہی چلی گئی۔
"او میری بھولی بہن! کس دنیا میں زندہ رہ رہی ہو۔"
ماہ نور برا ہی مان گئی۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ خواب نہیں سننا تو مت سنو۔ میں کسی اور کو سنالوں گی۔" وہ خفگی سے کہتی ہوئی لیٹنے لگی تو خوش نصیب نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر اسے زبردستی بٹھائے رکھا۔
"اچھا اچھا۔ تم سناؤ۔ میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔" چہرے پر ابھی بھی دبی دبی سی ہنسی تھی۔ لیکن ماہ نور نے توجہ نہ دی اسے فی الوقت ایک سامع درکار تھا جس سے پچھلے کئی دنوں سے سینے میں دبا راز شیئر کر سکے۔
"اب تم ہنسیں تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گی۔" اس نے سلسلہ کلام جوڑنے سے پہلے انگلی اٹھا کر دھمکی دی تو خوش نصیب نے کانوں کو ہاتھ لگا کر وعدہ کر لیا۔
"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔" ماہ نور نے بڑے جوش و خروش سے وہیں سے سلسلہ جوڑا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔
"میں کئی سالوں سے یہ خواب دیکھ رہی ہوں خوش نصیب! کہ ایک شہزادہ ہے، جو سچ مچ سفید گھوڑے پر بیٹھ کر آتا ہے اور مجھے اپنے ساتھ کسی دور دیس میں لے جاتا ہے۔"
وہ بولتی جا رہی تھی اور خود پر اپنی سوچ پر ہنستی بھی جا رہی تھی ایسے جیسے جانتی ہو' سالہا سال سے دیکھا جانے والا یہ خواب دیومالائی داستانوں کے صفحات پر تو سچ ہو سکتا ہے حقیقی زندگی میں ہرگز نہیں۔
اور خوش نصیب۔۔۔ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے آدھی لیٹی آدھی بیٹھی دلچسپی سے ماہ نور کا خواب سن رہی تھی۔
"وہاں کوئی غم نہیں ہوتا۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔۔۔ وہ مجھے اتنی محبت دیتا ہے اتنی عزت دیتا ہے کہ فضل منزل سے ملے ہوئے تمام غم میں بھول جاتی ہوں اور پھر۔۔۔ اور پھر میں تمہیں اور روشن امی کو اور۔۔۔ اور نانی کو اپنے ساتھ اسی دیس میں لے جاتی ہوں۔" وہ بولتی چلی گئی' یہاں تک کہ پورے دھیان سے اس کا خواب سنتی خوش نصیب نے ٹوک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اس خواب کو دیکھتے ہوئے تمہاری آنکھ کہاں کھلتی ہے۔ وہ بتاؤ۔"
ماہ نور نے ایک ٹرانس کی کیفیت میں بولتے ہوئے خوش نصیب کو دیکھا جس کے سوال میں سنجیدگی ایسی تھی جیسے کوئی اپنے قہقہے کا گلا بڑی مشکل سے گھونٹ رہا ہو۔
"مجھے محبت ہو گئی ہے۔" ماہ نور نے ناراضی ظاہر کرنے کے بجائے بالآخر بلی تھیلے سے نکال ہی دی تھی اور ایسے نکالی تھی کہ لہجے میں شرمیلے پن کا تاثر نمایاں ہو رہا تھا۔
خوش نصیب نے ہنس کر کہا۔
"وہ تو میں تمہارے پہلے جملے سے ہی سمجھ گئی تھی۔۔۔ اب صرف یہ بتاؤ کہ۔۔۔ تم اتنی جی دار کب سے ہو گئیں کہ محبت جیسی بہادری دکھا سکو؟" اب اس نے ماہ نور کی طرف کروٹ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔
"پاگل! محبت کے لیے جی داری کی نہیں بلکہ صرف دل کی ضرورت ہوتی ہے۔"
"اور دل بھی وہ جس میں عقل نام کی کوئی چیز نہ ہو۔" خوش نصیب نے اتنی بے ساختگی سے کہا تھا کہ دونوں

بہنیں ہی ہنس پڑیں۔

"یہ تم نہیں کھوئی تو کون کہے گا؟ کیف بیچارہ کیسے اپنا دل ہاتھوں میں لیے تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا رہا ہے لیکن تم نے اس کی قدر ہی نہیں کی۔"

"وہ مذاق کرتا تھا یار!" جانے کیوں وہ دکھی سی ہو گئی تھی یہ الگ بات ہے کہ اپنا دکھ ماہ نور سے چھپا گئی۔

"بڑا عجیب مذاق تھا پھر تو۔۔۔ جو وہ اتنی سنجیدگی سے کرتا تھا۔"

"کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔" خوش نصیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم چپکے چپکے محبت کا آزار پال کر بیٹھ گئی ہو۔۔۔ ذرا نام تو بتاؤ اس پھنے خان کا۔ جو میری پیاری سی ماہ نور کا دل لے اڑا ہے۔" اس نے دانستہ لہجے میں خوشگواریت بھرتے ہوئے کہا تھا۔

ماہ نور مسکرائی تھوڑا الجائی اور بولی۔

"شامیر۔۔۔ شامیر ہے وہ۔"

اور خوش نصیب کو ایسا لگا جیسے گیلری کی مخدوش چھت آسمان سمیت اس کے سر پر آن گری ہو۔

"کیا؟" شامیر کا نام سن کر بے ساختہ خوش نصیب نے کہا۔

ماہ نور نئی نئی محبت کے زیر اثر تھی اس نے غور بھی نہیں کیا کہ اپنے ایک اعتراف سے خوش نصیب کو کیسی سلگتی ہوئی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے شامیر سے محبت ہو گئی ہے۔ میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ آنکھیں کھولتی ہوں تو۔۔۔ تو میری آنکھیں صرف اسے ہی دیکھنا چاہتی ہیں۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ وہ لوگ جو محبت کرتے ہیں' وہ سب ایسا سوچتے ہیں یا نہیں۔۔۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے خوش نصیب! وہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہے۔"

وہ اپنی جھونک میں بولتی جا رہی تھی' یہ دیکھے بنا کہ خوش نصیب کا منہ اور آنکھیں کچھ حیرانی اور کچھ صدمے سے کھلی ہی رہ گئی ہیں۔

"اور پتا ہے خوش نصیب! میں ہمیشہ یہ خواب دیکھا کرتی تھی۔۔۔ لیکن کبھی بھی اپنے خوابوں میں آنے والے اس لڑکے کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی لیکن جس روز میں نے پہلی بار شامیر کو دیکھا' مجھے لگا۔۔۔ مجھے لگا میں ہمیشہ سے اسے جانتی ہوں۔۔۔ وہ جو سفید گھوڑے پر سوار ہو کر میری طرف بڑھتا چلا آتا ہے۔۔۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ' بلکہ شامیر ہی تھا۔۔۔ مجھے اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ کیف کی منگنی صیام سے ہو گئی۔۔۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے لگتا ہے کیف اسے پسند نہیں کرتا۔۔۔ لیکن اگر اس نے تمہیں کہا ہے تو سچ ہی ہو گا۔۔۔ البتہ صیام کی منگنی شامیر سے نہیں ہوئی۔ اس بات کی بہت خوشی ہے مجھے۔"

شرمیلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

"اس خواب کو جتنی جلدی تم بھول جاؤ' اتنا اچھا ہو گا۔۔۔ سنا تم نے۔"

خوش نصیب کو نہ جانے کیا ہوا' اس نے ایک دم سے ماہ نور کو کندھے سے دبوچ لیا اور اسے جھنجھوڑ کر بولی۔ اس کا لہجہ سخت اور گرفت اس سے بھی زیادہ سختی لیے ہوئے تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو خوش نصیب؟" ماہ نور ہکا بکا ہی رہ گئی۔

"شامیر کا نام تم نے آج لیا ہے۔۔۔ دوبارہ مت لینا۔"

ماہ نور نے اپنا کندھا اس کی گرفت سے آزاد کروایا اور خوش نصیب کو عجیب سی نظروں سے دیکھتی عجیب مخمصے

کی کیفیت میں کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ خوش نصیب تیز تنفس اور ماتھے پر پڑے ہوئے بلوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی پھر خود بھی لیٹ گئی۔ گیلری میں پُراسرار سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹنگا چاند پہلے سے بھی مخدوش دکھائی دینے لگا تھا۔



"میرے نانا مچھلیوں کے بہت بڑے بیوپاری تھے 1923ء میں انہوں نے الویک نام کی دنیا کی سب سے بڑی اور نایاب مچھلی پکڑ کر ورلڈ ریکارڈ بھی قائم کیا تھا۔۔۔ مونٹوک کی ہسٹری کی کتابوں میں ان کا ذکر بھی موجود ہے اور لانگ آئی لینڈ کا وہ حصہ جہاں نانا نے مچھلی شکار کی تھی کئی سالوں تک ان کے نام سے جانا جاتا رہا ہے۔۔۔"

ٹیرس پر بیٹھے آدم نے بڑے فخر سے بتایا تھا۔

منفرا کافی لے کر آچکی تھی اور اب ٹیرس کی گرل سے ٹیک لگا کر کھڑی سینے پر بازو باندھے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنی کیپ شال اتار کر اس نے ایک موٹی اوون کا کارڈیگن پہن لیا تھا جو اتنا کھلا اور بڑا تھا کہ منفرا پر کمبل کی طرح پھیلا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ اس کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ سر پر گرم ٹوپی تھی اور ناک ٹھنڈ سے مزید کچھ لال ہو چکی تھی۔

"رکو۔۔۔ میں تمہیں ان کی تصویر دکھاتا ہوں۔" آدم نے جوش و جذبے کے ساتھ کہا اور سرعت سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

"ایڈم! رکو۔۔۔ معاویہ سے پوچھو تو سہی اسے تصویریں دیکھنے میں دلچسپی ہے بھی یا نہیں۔"

منفرا آوازیں دیتی رہ گئی لیکن آدم تب تک جا چکا تھا۔ منفرا نے جھینپ کر معاویہ کو دیکھا اور وضاحتی لہجے میں بولی۔

"ایڈم کا قد جتنا لمبا ہے' عقل اتنی ہی چھوٹی ہے۔۔۔ معمولی باتوں پر اوور ایکسائیٹڈ ہو جاتا ہے۔" معاویہ ہنس دیا۔

"زندگی میں خوش رہنے کے لیے چھوٹی عقل ضروری ہے۔۔۔ جتنی بڑی عقل ہو' زندگی اتنی ہی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"اوہو۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا تم فلسفی بھی ہو۔" وہ خوشگواریت اور شرارت سے بولی۔

"ابھی تو تمہیں اور بھی بہت کچھ نہیں پتا۔"

"اچھا۔۔۔ مثلاً"؟" وہ دلچسپی سے گویا ہوئی تو معاویہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی ایک ننھی چنگاری کی طرح دہکتی ناک کو زور سے دبانے کی خواہش کو دل میں دبایا اور سنجیدگی سے بات پلٹ دی۔

"مونٹوک میں کچھ ٹورنسٹ اٹریکشنز بھی ہیں یا نہیں؟"

"مائی گاڈ۔۔۔ تم نے ابھی تک مونٹوک نہیں دیکھا؟ اگر مونٹوک نہیں دیکھا تو سمجھو' زندگی میں کچھ نہیں دیکھا۔"

اسے اچنبھا ہوا تھا۔ اور اس کے بعد وہ جوش و خروش سے اسے مونٹوک کی ہسٹری اور سارے مشہور و معروف مقامات کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ اس کا سارا زور صرف اسی بات پر تھا کہ مونٹوک کو جنت کا صدر مقام تسلیم کر لیا جائے۔

معاویہ کو اس کی اس بات پر تو یقین آیا یا نہیں۔ لیکن منفرا کی سرخ ناک کو دیکھتا وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا

چلا گیا تھا۔



شام پہلے رات میں ڈھلی اور پھر رات کی چادر سے دن کا اجالا پھیل نکلا۔

نیند خوش نصیب کی آنکھوں سے ویسے ہی دور تھی جیسا کہ رات کے اس پہر جب ماہ نور نے اس پر اپنے دل کی حکایت بیان کر کے اس کی زندگی کا سکون (جو مٹھی بھر ہی باقی بچا تھا) برباد کر ڈالا تھا۔

لیکن اس صبح دو نئی باتیں اس کی منتظر تھیں۔ ایک تو عرفات ماموں کو اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ وہ اچھے خاصے بڑے چچا سے بات کرتے کرتے ایک طرف کو بے جان سے ہو کر لڑھک گئے تھے۔ وجہ سب ہی کی سمجھ سے بالاتر تھی نہ وہ بیمار لگ رہے تھے نہ انہوں نے اپنی طبیعت خرابی کا کسی سے ذکر کیا تھا۔ ہاں شیرو نے بتایا وہ رات بھر بہت بے چین رہے تھے۔ ایک منٹ کے لیے بھی سکون سے سو نہیں پائے تھے۔ یہ ٹھیک اس کے بعد کی بات ہے، جب کیف اور شامیر بھائی رات کا کھانا کھا کر رخصت ہوئے۔

خوش نصیب کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑا اس نے بے ساختہ شامیر کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی فکر مند نظر آرہا تھا اور اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا جس سے خوش نصیب اس کے دل کے چور کا پتا لگا پاتی۔

کیف اسپتال گیا ہوا تھا اور پیچھے صباحت تائی جان نے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ ساری خواتین ان کے اردگرد جمع انہیں تسلی دے رہی تھیں کہ اکلوتا چھوٹا بھائی ان شاءاللہ جلد صحت یاب ہو کر گھر واپس آجائے گا۔

اسی اثنا میں شامیر کی والدہ کی آمد کی خبر ملی۔

ان کی آمد خوش نصیب کے لیے حیران کن تھی یا شاید وہی ان کی آمد سے لاعلم تھی۔ باقی تو سب جانتے تھے کہ وہ آرہی ہیں۔ بہرحال اپنی لاعلمی کی بنا پر وہ حیران ہو کر ہی ان سے ملی۔ کیا جادوئی شخصیت تھی ان کی۔ بولتی تھیں تو لگتا تھا مسحور کرتی ہیں۔ خوب صورت اور طرح دار اتنی کہ بس انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ ٹھیک ہے، بھئی شامیر کی والدہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

ہر بندہ ان سے متاثر نظر آرہا تھا لیکن خوش نصیب دامن بچا کر نکل آئی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس مسحور کن شخصیت کے پیچھے ویسا ہی کوئی پھندا تھا جو شامیر کی ذات سے بھی جڑا ہوا تھا۔

وہ موقع دیکھ کر ماہ نور کو سمجھانے کھڑی ہو گئی۔

"کچھ خواب صرف بند آنکھوں سے دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ آنکھیں کھلتے ہی انہیں بھول جانا چاہیے۔ تم سمجھو شامیر تمہارا ایسا ہی کوئی خواب ہے، جو حقیقت بنا تو تعبیر اس سے بالکل برعکس ہو گی، جو تم سوتے ہوئے دیکھتی رہی ہو۔"

"دعا نہیں دے سکتی ہو تو بددعا بھی مت دو؟" ماہ نور نے ناگواری سے کہا۔ "میں نے تمہیں اپنے خواب کے بارے میں اس لیے نہیں بتایا تھا کہ تم فوراً "مجھے اس خواب سے دست بردار ہونے کا سبق پڑھانا شروع کر دو۔"

چاپنگ بورڈ پر وہ سبزیاں کاٹ رہی تھی۔ اس جملے کے ساتھ ایسے کھٹا کھٹ چھری چلائی جیسے سامنے سبزی نہیں خوش نصیب کی گردن پڑی ہو۔

"زندگی میں پہلی بار میں نے اچھے دنوں کا انتظار شروع کیا ہے۔ زندگی میں پہلی ہی بار میں نے اپنے کسی خواب کی تعبیر کے سچ ہونے کی دعا کی ہے اور تم بھی سے میری اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں ہو رہی۔"

خوش نصیب اس الزام پر تڑپ ہی گئی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ میں تمہیں صرف اتنا سا سچ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں، جو آج تک روشن امی، ہم

دونوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی ہیں.... اور وہ سچ یہ ہے کہ اپنی بساط کے مطابق خواب بننے چاہئیں.... تم خوب صورت ہو' لاکھوں میں ایک ہو۔ لیکن شامیر وہ انسان نہیں ہے جسے اللہ نے تمہارے لیے بنایا ہے۔"
وہ متحمل انداز میں اب اس کی برین واشنگ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"اور تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟؟؟ ولی اللہ ہو گئی ہو یا وحی نازل ہونے لگی ہے تم پر.... جو اتنے وثوق سے اس بات کا اظہار کر رہی ہو۔" ماہ نور نے سلگ کر کہا تھا۔ "میری ایک بات کان کھول کر سن لو خوش نصیب! زندگی میں پہلی بار میں نے کوئی خواہش کی ہے اور وہ خواہش شامیر کو حاصل کرنے کی ہے.... تم یا کوئی بھی اور میرے راستے میں آیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" اس کا لہجہ اتنا کڑا تھا کہ خوش نصیب دم بخود سی ہو کر رہ گئی۔
"مجھے لگا تھا اگر کوئی میرا ساتھ دے گا تو وہ تم ہو گی۔ لیکن شامیر بالکل ٹھیک کہتا تھا' مجھے تمہیں اس کے بارے میں بتانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ تم سے کبھی کسی کی کوئی خوشی برداشت نہیں ہوتی.... تم کینہ پرور اور حسد کرنے والی انسان ہو.... تم ساری زندگی نہ خود کوئی بہتری حاصل کر سکو گی نہ کسی دوسرے کو حاصل کرنے دو گی۔ اب ہٹو میرے راستے سے۔ مجھے کھانا بھی بنانا ہے۔" اس نے نفرت سے کہا اور ایک طرف سے نکل کر چلی گئی۔
خوش نصیب ایسے کھڑی تھی جیسے جسم میں جان ہی نہ ہو۔

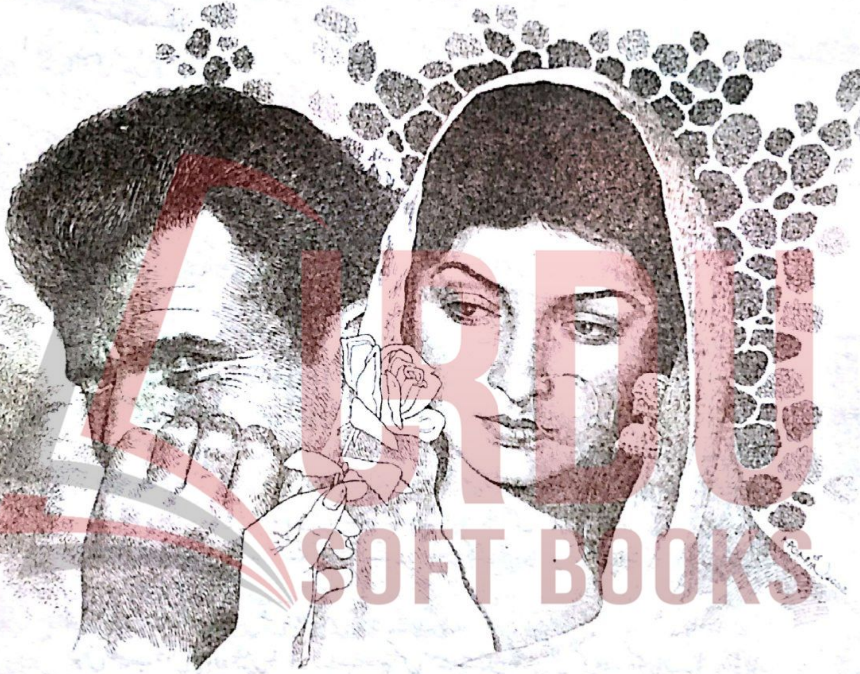


پھر دوسرے سے بھی پہلے اسپتال سے اطلاع آگئی۔ عرفات ماموں کے جسم کے دائیں حصے پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ یہ خبر قیامت سے کم نہ تھی۔ اچھے بھلے صحت مند و تندرست عرفات احمد کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا تھا۔ سب ہی کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ سوائے ایک شخص کے۔ جس نے موقع ملتے ہی خوش نصیب کے کان میں سرگوشی کی تھی۔
"مجھے افسوس ہے تمہارا واحد حمایتی بھی ختم ہو گیا۔ تمہارا ووٹ بینک تو مضبوط ہونے سے پہلے ہی کمزور پڑتا جا رہا ہے خوش نصیب!" خوش نصیب نے بدک کر اسے دیکھا۔ اس کی سرگوشی سانپ کی پھنکار جیسی تھی اور اس کی آنکھیں شاطر الو جیسی چمک دار تھیں۔
"عرفات ماموں کو تو میں نے راستے سے ہٹا دیا۔ اگلا کون ہو گا' اس کا فیصلہ تم خود کرو گی؟ ان کی جان بخشی دی ہے باقی کسی کے لیے وعدہ نہیں کر سکتا۔ بس ایک بات ذہن میں بٹھا لو میں تمہیں ایسے ہی اکیلا کرتا جاؤں گا۔ تمہارے سارے اپنے ایک ایک کر کے تم سے اتنے دور کر دوں گا کہ تم بے بس ہو کر رہ جاؤ گی.... خوش رہو.... خوش نصیب!"
وہ مسکرا کر کہتا ہوا اس کے دل میں اپنا ہراس پھیلائے چلا گیا۔
خوش نصیب کا دل چاہا وہ چیخیں مار مار کر روئے۔ یہ کس مصیبت میں پھنس گئی تھی وہ۔ پہلی بار.... ہاں پہلی بار اسے احساس ہوا اب سے قبل گزاری ہوئی زندگی تو ایک نعمت تھی۔ جس کی ابتری کا وہ واویلا مچائے رکھتی تھی۔ اصل امتحان تو اب شروع ہوا تھا۔
آخر کار اس ناشکری کو شکر گزاری کا خیال آ ہی گیا تھا لیکن اس وقت جب قسمت کی طرف سے ملی ہوئی آسانیاں اس سے چھننے لگی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سائرہ رضا

حسن المآب اور....



صحرا کا آگ اگلتا سورج 'شدید پیاس 'پھوڑے 'پھنسیوں سے بھرا جسم وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ نام 'عہدہ 'شخصیت 'رشتے 'محبت 'نفرت.... اس لمحے اسے اپنے گناہ یاد آرہے تھے وہ اللہ کو پکار رہا تھا۔

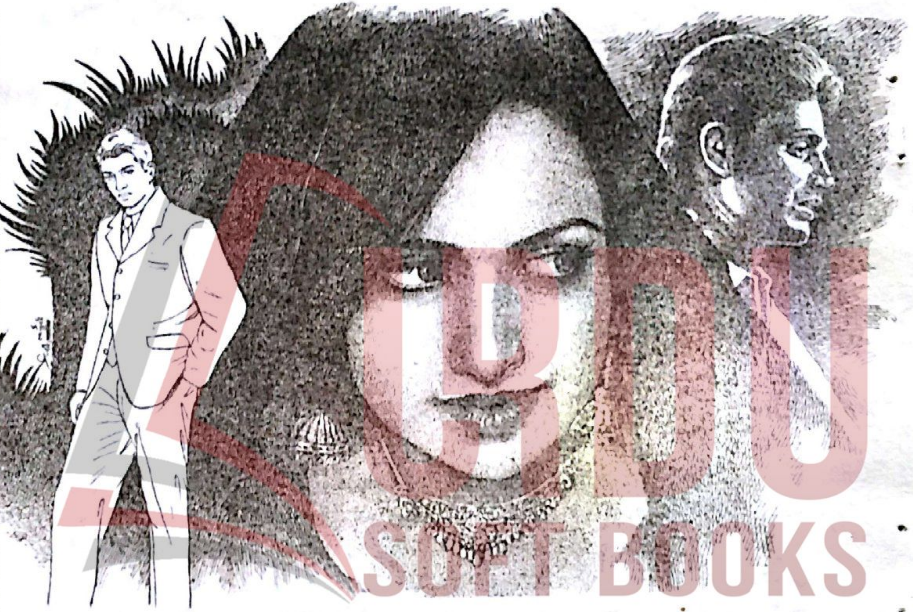
ماہ رو 'اریبہ 'حلیمہ اور حسن المآب کالج میں دوست تھیں۔ ماہ رو کا آزاد خیال اور ماڈرن گھرانے سے تعلق ہے۔ اریبہ ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے اور بڑی بہنوں کے رشتے نہ ہونے سے پریشان رہتی ہے۔ حلیمہ کا تعلق ایک بہت مذہبی گھرانے سے ہے۔ حسن المآب غیر معمولی حسین ہے۔ اس نے سن شعور سے اپنے گھر میں شریعت کے احکام سے اور مذہب کی سختی سے پابندی دیکھی ہے۔ مفتی عبید الرحمن اس کے نانا تھے۔

حسنل کا خاندان تبلیغ دین کے لیے مشہور تھا۔ جبکہ حلیمہ کے گھر والوں کی حیثیت ان کے مریدین جیسی تھی۔ حلیمہ کے والد کی انتہا پسندی کی وجہ سے حلیمہ کی بڑی بہن اور دو بھائیوں کے رشتے نہ ہو سکے تھے۔

حلیمہ اپنے والد کا پرتو تھی 'جبکہ حسنل اپنے مذہبی ماحول سے شدید بے زار تھی۔

مکمل ناول

میری اپنی خالہ زاد کی شادی میں شرکت کرنے چرچ جاتی ہے۔ وہاں دولہا یوحنا اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔
یوحنا نے پہلے اس کے لیے رشتہ دیا تھا۔ ماما کو بھی شدید رنج ہے کہ میری نے یوحنا کے رشتے سے انکار کیوں کیا۔
حسنل کے لیے عبدالمبین اور عبدالمتین کا نام لیا جاتا ہے۔ جن سے حسنل شدید نفرت کرتی ہے۔
حسنل ماہ رو اور اریبہ کے شدید اصرار پر ایک میوزک کنسرٹ میں جاتی ہے۔ وہاں موسیٰ بی کو دیکھتی ہے۔ اسے لگتا



ہے کہ جس شخص کو وہ اپنے تصورات میں دیکھتی رہی ہے۔ وہ موسیٰ بی ہے۔ اس کا خیال پیکر مجسم ہو کر سامنے آگیا تھا۔
عقیلہ بیگم اس کے آنے سے بہت خوش تھیں۔ ان کا پوتا ساری زندگی ان سے دور رہا تھا۔ ان کا پوتا ماورائی حسن کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے حد نازک مزاج بھی تھا۔ خصوصا" کھانے کے معاملے میں اس کے ہزار نخرے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے خاص طور پر شیف رکھا تھا۔
حسنل کی تصورات کی دنیا موسیٰ بی سے آباد تھی۔ موسیٰ انڈین میوزک ڈائریکٹر کی چال بازیوں سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان اپنا کیریئر بنانے آگیا۔ جہاں چالاک اور نسبتا" بڑی عمر کی اداکارہ شہرزاد عیسائی نے اسے گھیر لیا اور دونوں ہی اپنے مفادات کی خاطر دوستی کے رشتے میں بندھ گئے۔
سعد حسن نے دوراندیشی سے کام لے کر محی الدین سہگل کو اپنا داماد بنالیا۔ جو کہ مفتی عبیدالرحمٰن کا کلاس فیلو تھا۔ محی الدین سہگل نے ذہانت کے بل بوتے پر خوب ترقی کی اور اسی دوران وہ ایک بیٹے بدرالدین کا باپ بن گیا۔ بدرالدین کی آمد سہگل اور عقیلہ کے لیے ڈراؤنا خواب تھی۔ وہ صرف کیریئر بنانا چاہتے تھے۔

وہ اپنے دوستوں ایڈورڈ اور کیلاش کے ساتھ تفریح کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر ایڈونچر کے شوق میں راستہ بھٹک گیا۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت ڈھونڈا' مگر وہ صحرا میں کہیں کھو گیا تھا۔

خدیجہ بانو نوعمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے بل بوتے پر پالا۔ خدیجہ بانو کے اپنے بھائی اور اس کی فیملی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ خدیجہ بانو کا بیٹا ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماریہ عیسائی ہے۔ دونوں کے خاندان اس رشتے کے لیے تیار نہیں۔ مگر ماریہ اور منا دونوں ہی کسی معجزے کے منتظر ہیں۔

اپنے اپنے تحفظات کے ساتھ ماریہ اور منے کی فیملی مان جاتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ماریہ کے والدین اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ خدیجہ اور ماریہ کے درمیان روایتی ساس بہو والی چپقلش نہیں۔ ماریہ عملی مسلمان بننے کی کوشش کرتی ہے' مگر خدیجہ بانو اس کے عقائد کے بارے میں شک میں پڑ جاتی ہیں۔

حسنل کو اس کی سہیلیاں سمجھاتی ہیں کہ موسیٰ کا حصول ایک خواب ہے' مگر حسنل اسے اپنی دعاؤں کا حصہ بنا لیتی ہے اور اسے پانے کے لیے نیک بن جاتی ہے۔ اس کی یہ کوشش اس کے نانا سے مخفی نہیں' مگر وہ افضل بات نہیں جانتے۔ موسیٰ نئی نئی ماڈلز کے ساتھ کام کرتا ہے' جس پر شہرزاد چراغ پا ہو جاتی ہے' مگر حقیقت کا ادراک کر کے موسیٰ سے دوبارہ دوستی کر لیتی ہے۔

محی الدین سہگل نے بدر کی تربیت کے لیے فلپ اینڈرسن کو رکھا تھا۔ وہ ایک ہوس ناک مرد تھا جس نے بدر کو لوٹ لیا۔ بدر لندن تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے' فلپ اس کے ساتھ ہے' مگر ایک حادثے میں فلپ ہلاک ہو جاتا ہے۔ فلپ کی موت بدر الدین کو توڑ دیتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ سے برگشتہ ہو کر اسکارلٹ کی دوستی میں پناہ تلاش کرتا ہے جو بلا کی مے نوش ہے۔

کیلاش اسے تلاش کرنے میں اور وہ صحرا میں راستہ تلاش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اب اس کی تلاش ملکی سطح پر ہو رہی ہے کیوں کہ وہ برطانوی شہریت رکھتا ہے۔

جیک کی دوست اس کی محبت میں گرفتار ہے اور خود بھی اس کی تلاش کا عزم رکھتی ہے۔ محی الدین سہگل اپنے پوتے سمیع الدین کے ساتھ کچھ بے باک لڑکیوں کو دیکھ کر خدشات کا اظہار کرتے ہیں' مگر سمیع ان کی تسلی کرا کے اپنی شادی کے سارے اختیارات انہیں سونپ دیتا ہے۔

ماریہ اور خدیجہ بانو کے درمیان تناؤ آ جاتا ہے۔ ماریہ چار بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ منے کا ایک روز ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے تو ماریہ کا بھائی ڈیوڈ اسے خون دیتا ہے۔ اسی اسپتال میں ماریہ کے والد بھی داخل ہوتے ہیں۔ ماریہ محبت سے مجبور ہو کر دوبارہ اپنے گھر والوں سے تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ خدیجہ بانو سخت برا مانتی ہیں۔ ان کی پوتی میری اپنی دادی اور ماں کی چپقلش سے متاثر ہوتی ہے۔ شہرزاد ہر موقع پر موسیٰ بی کی پسند ناپسند کا خیال رکھ کے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ صحرا میں بے بسی سے کسی مدد کا منتظر ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ عالمی میڈیا اس کی جانب متوجہ ہو چکا ہے اور اس کی تلاش کے لیے ہیلی کاپٹر سے مدد لی جا رہی ہے۔

خاندانی شرافت پر یقین رکھنے والی لڑکی کی تلاش میں محی الدین سہگل اپنے حلقے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ مفتی عبید الرحمٰن ان کی توجہ ان کوتاہیوں کی طرف دلاتے ہیں جو بدر الدین کی پرورش کے سلسلے میں ان سے ہوئی تھیں۔

حسنل چھپ چھپ کے ریڈیو پر موسیٰ بی کے گانے سنتی ہے۔ صبغہ اسے ٹوکتی ہے اور اس کے پاس موسیٰ کی جیکٹ بھی نکلتی ہے' مگر حسنل اپنی زبان درازی کے آگے اس کی ایک نہیں چلنے دیتی۔

موسیٰ بی اور شہرزاد کو پرستار گھیر لیتے ہیں۔ وہیں قریب ماہ رو بھی ہوتی ہے' وہ بھی موسیٰ کی شخصیت سے متاثر ہو جاتی ہے۔ موسیٰ کی رفاقت نے شہرزاد کو خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ خدیجہ بانو نے میگی کا نکاح اس کی پسند کو دیکھتے ہوئے ذیشان سے کروا دیا۔ میری کے لیے سمیع الدین کا رشتہ آتا ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں مگر میری کسی ایسے شخص سے شادی کے لیے تیار نہیں' جس کی ماں کا مذہب دوسرا ہو۔ اور اس حوالے سے وہ اپنی دادی کو مورد الزام ٹھہراتی ہے۔

اسے صحرا میں بھٹکے تین دن و رات گزر جاتے ہیں' اس کی تلاش کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اس کی حالت خراب ہونے لگتی ہے جیک کی دوست اس کے حوالے سے بے حد پریشان ہوتی ہے۔

ساتویں قسط

اور ہاں... "ایمانے" ... اللہ پلیز... میں بہت مشکل میں ہوں۔

"تم...!" اسے کسی کا چہرہ یاد آنے لگا مگر بہت زور دینے پر بھی نام یاد نہ آیا۔

"تم... تمہاری دعائیں تو اللہ سنتا تھا تو کیا تم نے میرے لیے دعا نہیں مانگی۔" اسے ابھی ابھی خیال آیا۔

"اچھا اب میرے لیے دعا مانگنا بھی مت... بس سب دعائیں ایمانے کے لیے۔" اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا تھا۔

آگ برساتا سورج ایک روشن چمکدار دوپہر اس کی یادداشت پر ربر پھیرتی جا رہی تھی۔ سب مٹنے لگا تھا۔

بس چند منٹ اور گزرتے... اور وہ سب تکلیفوں سے نجات پا جاتا۔

اسے بس اللہ یاد تھا (اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں کہ آخری سانسوں میں یہ نام یاد ہو)

اسے "ایمانے" یاد تھی۔ اس کا حسین و معصوم چہرہ' اس کی موہنی آواز اس کی ہنسی... اس کی ستاروں جیسی آنکھیں۔

اور پھر جب اسے لگا کہ یہ جو ہچکی بھری ہے وہ آخری ہے اور اب جو پلکیں ملی ہیں تو کبھی جدا نہ ہوں گی۔ تب اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد آ گیا۔ اسے لگا وہ اس کے سرہانے آ بیٹھی ہے۔ "ماں" پکارا بھی تو کب... اس کے ساتھ ہی اسے اپنی ساری زندگی کسی فلم کی طرح یاد آ گئی۔ جس کا عنوان گناہ گار تھا۔ آہ... اس کے پاس اللہ کو دکھانے بتانے کے لیے نیکیاں نہیں تھیں مگر اسے اپنے گناہ یاد آ رہے تھے۔ وہ شرمسار تھا۔ بھلے سے اب ازالے کا وقت نہیں تھا۔ مگر عجز کا یہ انداز بھی اللہ کو پسند ہے۔ یہ اونٹ کے گلے میں بندھی گھنٹی کی آواز تھی۔ اس کے سوار نے ہوا سے پھڑپھڑاتے شاید کو حیرانی سے دیکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قریب آتی آواز کو سن نہ سکا۔

وہ ایک بار پھر اللہ سے "ایمانے" کی حفاظت کی منت کر رہا تھا۔

حواس کھوتے وقت نظروں میں رہ جانے والا چہرہ بھی "ایمانے" کا تھا۔



غم کی زردی اب سیاہی بن کر اس کے چہرے سے چھلکنے لگی تھی۔ وہ دور سے دیکھنے پر بھی کسی لاعلاج مریض کی طرح دکھائی دینے لگی تھی۔ ویران آنکھوں اور ابھری گالوں کی ہڈیاں... لپ گلوس بھی ہونٹوں کو تری دینے میں ناکام ہو چکا تھا۔ وہ بار بار ان پر زبان پھیرتی۔ آفس میں ہوتی تو گھر بھاگ جانے کو دل کرتا گھر سے بھاگتی تو آفس... مگر قرار کہیں نہیں تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اثر اس کے کام پر پڑنے لگا تھا۔ حال دل کسی سے نہ کہنے کے قسم تو سالوں پرانی تھی' کوئی حال پوچھے بھی ناں...

دلاسا تو پھر ممکن ہی نہ تھا۔

ہاں ایک جیک تھا۔ جو اس کا کندھا تھپتھپا دیتا۔ لیکن اب تو وہ نگاہیں چرانے لگا تھا۔ امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔

اس نے سن رکھا تھا میت کا چہرہ نہ دیکھیں تو وہ شخص یادوں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے' تا عمر دکھائی نہ دے مگر کبھی بھی خیال نہیں آتا کہ مر چکا ہے۔

تو پھر یہ اچھا ہو گا کہ اس کے مرجانے کی اطلاع کبھی نہ ملے۔ امید قائم رہے گی۔

پر سیانے یہ بھی تو کہتے ہیں۔ مرجانے کی اطلاع سکون دیتی ہے۔ اپنے ہاتھوں مٹی میں ڈھانپ کر آنا بڑا

تسلی بخش عمل ہوتا ہے۔ کجاکہ کسی کاگم جانا۔ لواحقین نہ زندوں میں ہوتے ہیں اور نہ مردوں میں۔۔۔

اور کھو جانے سے بہتر ہے مرنے کی خبر مل جائے۔

تو وہ کس چیز کی دعا مانگے؟ یہی اصل تکلیف تھی۔

اور اس کا یہ حال تھا۔۔۔ فقط تعلق داری۔۔۔ تو وہ جن سے اس کی رشتے داری تھی اور وہ بھی ایسی اٹوٹ کہ روز ازل لکھی گئی روز ابد تک کے لیے تو وہ سب کن حالوں میں ہوں گے؟ وہ کہنیوں کو میز پر ٹکا کر کمپیوٹر اسکرین کے قریب جھک آئی۔

کتنے ہزار لائکس مل چکے تھے اس پیج کو۔۔۔ اور رشتہ تو ان سب کا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہاں انسانیت کا ہمدردی کا۔۔۔ جو خونی رشتوں سے بھی ارفع کہلاتا ہے۔ وہ دن میں کتنی ہی بار ان کمنٹس کو پڑھتی تھی۔ سب کے جملے کتنے پُر خلوص اور درد مند تھے۔ وہ سب چاہتے تھے وہ مل جائے کچھ کا انداز دعائیہ تھا۔ کچھ کا احتجاجی۔۔۔ کچھ کے جملے ہمت توڑ دیتے تھے۔ تو بیشتر ہمت بندھاتے تھے۔

اس پیج کو چیک کرنے سے جہاں اسے گمشدہ کی ریکوری کے حوالے سے تازہ ترین خبریں ملتی تھیں وہاں کچھ گمشدہ چہرے بھی دکھائی دے جاتے تھے۔

اس نے کمپیوٹر اسکرین پر موجود ایک چھوٹی سی تصویر کو زوم کر کے دیکھنا شروع کر دیا۔

ہر نقش کی تشریح ہونے لگی۔

چہرے کے گرد کسا ہوا سادہ انداز کا اسکارف' ہاں اونچا جوڑا باندھنے کی وجہ سے سر کے اوپر کوہانی ابھار سا بن گیا تھا۔ پردہ اور فیشن دونوں ترجیحات پوری ہو رہی تھیں۔ نقوش کی سادگی میں عمر نے وقار پیدا کر دیا تھا۔

ہاں آنکھوں کی بے ریائی میں ایک حزن اضافی تھا۔ اور نجانے کیوں تھا۔ بامراد تو وہ بھی رہی تھی۔

جو چاہا پالیا۔۔۔ اور کوئی ایسی شدت اور ضد بھی نہیں تھی کہ وہی ملے تو ملے ورنہ زندگی رہے نہ رہے۔ بس اک خواہش تھی۔

یا پھر وہی کہ اللہ مانگنے والوں کو لوٹاتا نہیں' دیتا ہے بس تیقن ہونا چاہیے اور وہ تو تھا۔۔۔ بلاشبہ تو پھر اس آنکھ میں غم کیوں تھا؟ حسرت کیوں تھی؟

اور یہ دوسرا چہرہ۔۔۔

سلونا روپ ذہانت سے بھرپور چمکیلی آنکھیں اور سیدھی ناک۔۔۔ ہاں کچھ فربہی تھی۔ مگر جچ رہی تھی۔

اور وہ تیسری تصویر۔۔۔ بقیہ دو سے تو وہ اس پیج کے ذریعے متعارف ہوئی تھی۔ لیکن یہ جو تیسرا چہرہ تھا۔ اسے اس نے کبھی فراموش کیا ہی نہیں' سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر بھی۔۔۔ سب سے چھپ کر مانو اس نے اسی ایک چہرے کی خبر رکھی تھی۔ یہ پیج تو پانچ چھ روز پرانا تھا۔ پہچان جیسے صدیوں پر محیط تھی۔

شہد رنگ آنکھوں اور بالوں کی ملکہ۔۔۔ مہکتی دمکتی وقت جیسے اس کے لیے جامد ہو گیا تھا۔ ماہ و سال کی گردش اسے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ حسن ایسے نکھرا تھا۔ جیسے گلستان میں صبح۔۔۔ نوخیز کلیوں پر شبنم وہ ایسی ملائم نظر آ رہی تھی جیسے نومولود کی ایڑی۔۔۔ مگر۔

اس نے زوم کیا اور وہ جانتی تھی۔ تصویر بڑی ہو جائے گی تو عیب نظر آئیں گے۔

حسن مصنوعی لگنے لگا۔ اس نے بارہا تشبیہات سوچی تھیں۔ پر کچھ نہ سوجھتا بس یہی ایک لفظ پلاسٹک کی گڑیا۔

مگر گڑیا تھی تو حسین۔۔۔ حسین اور بہت حسین۔۔۔ اس تصویر کے کلک کرنے سے اس کی زندگی کھل کر سامنے آجاتی۔ ہر تصویر ہر عکس' ہر جملہ۔۔۔ خوشی کامرانی سے مزین۔۔۔

لیکن یہ سب تصاویر بھی ہفتہ بھر پرانی تھیں۔ اس کے دل میں ایک بار پھر عود کر یہ خواہش ابھری کہ وہ اسے اس ہفتے کے گزر جانے کے بعد دیکھے وہ کیسی ہو گی۔۔۔ کیا حال ہو گا اس کا۔۔۔

اور بات پھر اک کلک پر آ کر رک جاتی تھی اور یہیں پر اس کے جسم کی حرکت بھی۔ نہیں اسے کسی کلک کی ضرورت نہیں۔ وہ زندگی کے اس جمود کی عادی

ہو چکی تھی۔ اب اسے کوئی ہلچل درکار نہیں تھی۔
لیکن اگر یوں ہی فرینڈز ریکوسٹ بھیج دوں تو.....
تو کیا پہچانی جاؤں گی.... اور یہی تو میں چاہتی نہیں۔
جیتے جی چھپنا آسان نہیں ہوتا۔ نام بدل لیں' جگہ بدل لیں' پہچان بدل لیں' ہاں دل بدل لیں تو بات ہے۔ حالانکہ اس نے دل کو کتنی درشتی سے کہا تھا بدل جا.... بھول جا مگر دل....؟ انٹرنیٹ کے اس دور میں چھپنا آسان نہیں تھا.... مگر وہ کامیاب تھی۔ (ایسی کامیابی جو دھاڑیں مار کے رُلائے)

یکدم اسے اپنے پورے وجود پر تھکن کا غلبہ محسوس ہونے لگا۔ وہ کرسی پر نیچے کو یوں سرکی جیسے کسی نے پیروں سے پکڑ کر کھینچا ہو۔ نیم وا نگاہیں بدستور کمپیوٹر اسکرین پر جمی تھیں۔

ماؤس پر چلتے ہاتھ میں مردنی تھی۔ یک بیک اس کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔

آنکھیں پٹ سے کھلیں وہ کرنٹ کھائے انداز سے اچھل کر سیدھی ہوئی۔

کسی سنگ دل نے گمشدہ کی متوقع موت پر ایصال ثواب کی دعا لکھ ڈالی تھی۔

ہاہ.... اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹوں کو ڈھانپ لیا۔ مبادا چیخ نکل جائے۔

پر ایسا اعلان کرنے والے یہ ہوتے کون ہیں۔ شاید کوئی خبر آئی ہو۔ وہ اتنی تیزی سے اپنا موبائل اٹھانے کو اٹھی کہ کتنی ہی چیزیں موبائل سمیت زمین بوس ہو گئیں۔ وہ ایک ہاتھ سے چہرے پر گر جانے والے بالوں کو سنبھالتی دیگر تمام چیزوں کو نظر انداز کرتی موبائل اٹھانے لگی۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ یہ جیک تھا۔

"تم نے سنا....؟" اس کی آواز سے ہیجان عیاں تھا۔ وہ جو کھڑی ہونے لگی تھی ساکت ہو گئی۔

"کہاں ہو تم....؟" جیک کی آواز سے عجلت بھی عیاں تھی۔

"ہے۔"

یا خدا جیک آگے کچھ نہ کہے۔ وہ اسے سامنے نہ پا کر واپس چلا جائے وہ نہیں سن سکے گی کہ بالآخر وہ مل گیا۔ نہیں نہیں وہ نہیں اس کا لاشہ.....

"نہیں...." اسے پتا نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا ہے اس نے موبائل پر اپنی گرفت سخت کر لی۔ ساکت رہنے کی خواہش میں اس کے کندھے کی ٹھوکر سے میز ہل سی گئی۔ جیک چونکا پھر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔

وہ کس سے چھپی بیٹھی تھی۔ ایسا آنسوؤں سے دھلا ہراساں چہرہ۔

"کیا ہوا...." اس کا سر نفی میں ہلنے لگا۔ پھر ہچکیاں بے قابو ہو گئیں۔ "تو یعنی تمہیں پتا چل گیا۔"

اس نے لب بھینچ لیے سختی سے آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلایا۔

"باہر آؤ...." جیک میز کے اس طرف آ گیا اور کرسی سرکاتے ہوئے اسے شانوں سے تھام کر کھڑا کرنے کی کوشش کے دوران اس کی نگاہ کمپیوٹر اسکرین پر پڑ گئی۔

"تو میں ٹھیک کہتا ہوں تم پاکستانی بہت جذباتی قوم ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"اور تم انگریز کسی کے مرنے پر بھی رونے کو نان پریکٹیکل ہونا کہہ دیتے ہو۔" اور کوئی وقت ہوتا تو وہ کہہ دیتی۔ مگر اس وقت اس کے رونے میں شدت آ گئی۔ وہ باقاعدہ ہچکیاں بھرنے لگی۔ اور اس کا جسم جھٹکے کھانے لگا۔

"اب کیوں رو رہی ہو.... اب تو وہ مل گیا ناں۔" (ہاں اس کا لاشہ....) اس کے انداز میں.... تحیر آمیز شوخی تھی۔ "وہ بھی زندہ سلامت۔"

وہ کسی قسم کے جذباتی تعلق نہ ہونے کے باوجود بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ دوست دوست کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں ناں۔

"مل گیا...." اس نے زیر لب دہرایا۔ "زندہ سلامت.... کک.... کس نے کہا؟" اسے چکر آیا تھا اس نے سہارے کو میز تھامی۔

"بیٹھو ادھر...." جیک نے مصنوعی خفگی و مصنوعی

جبر سے اسے بٹھایا۔
"وہ مل گیا۔" وہ دوبارہ سے تصدیق چاہتی تھی۔
"ہاں بابا ہاں!" جیک نے اپنا موبائل کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔
وہ دیکھتی جاتی تھی پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی' ساتھ ہی ہنستی بھی۔ دھوپ چھاؤں کا منظر... جیک نے سر پکڑ لیا۔
"اف تم پاکستانی... بالکل فضول' جذباتی قوم... اب کیوں روتی ہو۔"
اور وہ کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ اس کی ہچکیاں بلند سے بلند تر ہوتی جاتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں زندگی میں جب جب کسی مشکل سے دوچار ہوا اور مجھے کوئی حل نہ سوجھا تب یہاں آ کر دعا کرنے سے میرا مسئلہ حل ہوا اور قلبی سکون بھی ملا۔ میں نے منت مانی تھی کہ سمیع الدین کی اچھی جگہ شادی ہو۔ اسے اچھی لڑکی ملے تب یہاں چادر چڑھاؤں گا اور منت کی دیگیں بھی دوں گا۔"
محی الدین سہگل کا لہجہ عقیدت و یقین سے پُر تھا۔ عقیلہ سہگل کا چہرہ بھی شوہر کے بیان کی تائید کر رہا تھا۔
اس نے بے ساختہ سمیع الدین کی صورت دیکھی وہ متوجہ نہیں تھا۔ سر اٹھا کر مزار کی چھت پر لٹکے فانوس کو دیکھ رہا تھا۔ محی الدین کے پکارنے پر چونک کر متوجہ ہوا۔ وہ اسے حسنیٰ کے ہمراہ چادر پکڑ کر ڈالنے کی ہدایت کر رہے تھے۔ اس نے تابعداری سے ان کی ہدایت پر عمل کیا جیسے وہ اس سے پیشتر کر رہا تھا صدقے کے بکروں کو ہاتھ لگا دیا چھری کو چھو لیا۔ اپنے ہاتھ سے غریبوں میں خیرات تقسیم کر دی۔ پرندوں کو دانا ڈال دیا۔ محی الدین جو جو کہتے تھے' وہ کرتا جا تا تھا۔
یہی حال حسنیٰ کا تھا۔ اس کے اناڑی پن اور استعجاب پر عقیلہ سہگل چونکی تھیں۔ جس طرح وہ ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔
"نہیں..." اس نے قطعیت سے کہا۔ "میں پہلے کبھی ایسی کسی جگہ پر نہیں آئی۔ نانا جان کہتے ہیں اللہ اور بندے کے بیچ کسی تیسرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"
محی الدین سہگل اور عقیلہ سہگل بری طرح چونکے۔
انہیں توقع نہیں تھی۔ بہت معصوم' کم عمر' کم گو دکھائی دینے والی دو دن کی دلہن اتنی صاف گوئی سے رائے کا اظہار کر دے گی۔ "منع فرمایا گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا آپ لوگ مجھے یہاں لا رہے ہیں ورنہ میں آتی ہی نہیں۔"
عقیلہ سہگل نے تڑپ کر محی الدین سہگل کی صورت دیکھی۔ ان کا انداز سخت شکایتی تھا۔ مگر یہ کیا؟ محی الدین پر تو جیسے شادیٔ مرگ طاری ہو گئی تھی۔ اس نے ان کی سوچ کی نفی کر دی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خوش تھے۔
ہاں وہ واقعی خوشی سے بے حال ہونے لگے تھے۔ فرط مسرت میں گھر کر انہوں نے عقیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاں مفتی عبیدالرحمٰن کی نواسی ایسا ہی مدلل جواب دے سکتی تھی۔ تو یعنی وہ مکمل مذہبی معلومات رکھتی ہے۔ اس کی عملی زندگی کتنی شاندار اور دین کی تصویر ہو گی۔
وہ کتنے شاندار خطوط پر اپنی زندگی استوار کرے گی۔ وہ واقعی ان کی نسل کو سنوار دے گی۔
تو یعنی وہ ایک اچھی عورت ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
اور کسی شخص نے یہ بات کہی ہوتی تو وہ بحث پر اتر آتے۔ عقیلہ سہگل نے بدقت اپنے تاثرات بدلے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے محی الدین کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئیں جو دونوں ہاتھ اٹھائے اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ انہیں گوہر مقصود مل گیا اور ان تینوں کو بغور سنتا سمیع الدین...
وہ یقیناً "مسلمان تھا۔ بدرالدین جب جب ہوش میں ہوتا اسے یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کرتا۔

سو اس وقت ان تینوں کے بیچ ہونے والی بات کی حقیقت کیا تھی۔ سمیع الدین سمجھ نہیں سکا۔ عقیلہ کے انداز کی ناگواری آمیز حیرت بدستور تھی۔ وہیں محی الدین سہگل کی بات رد ہوئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی بے پناہ خوش نظر آتے تھے۔ خود وہ... وہی سب کرتا گیا تھا۔ جس کی گھر سے نکلنے سے یہاں آنے تک محی الدین سہگل نے ہدایت دی۔ ایسے ایسے اور ویسے...

وہ دادا کے حکم کی تعمیل میں یہاں آیا تھا۔ مذہبی حوالے سے اس مقام کے تقدس کا پورا پورا خیال بھی تھا۔ مگر چھتیس گھنٹوں سے بھی کم وقت پرانی دلہن جو حسن و جمال میں یکتا تھی۔ اور جو خوفزدہ تھی... اور حیران... یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں کا ہراس سمیع الدین کے بے حد دوستانہ پُرمحبت رویے کے باوجود کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔

وہ سمیع الدین کی جانب یوں دیکھتی تھی جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

بعض اوقات تو اسے یہ شک ہونے لگتا کہ اس نے اپنے ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ اس لیے جما رکھے ہیں کہ وہ اپنی چیخوں کو دبانا چاہتی ہے۔

اس نے سن رکھا تھا مشرقی لڑکیاں شادی پر خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوتی ہیں۔ لیکن بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ یا خوف سے پسینہ پسینہ ہو جاتی ہیں' یہ نہیں سنا تھا۔ اور چلو اگر ایسا ہو بھی جایا کرتا تھا۔ تو اس کے بے پناہ محبت بھرے رویے سے اس کی کیفیت کو زائل ہو جانا چاہیے تھا۔

خود سمیع الدین کی اپنی کیفیت بہت عجیب سی تھی۔ مگر یہ طے تھا کہ وہ بہت خوش گوار اور مطمئن تھا۔ عقیلہ سہگل دلہن کے حسن کے قصیدوں سے نہیں تھکتی تھیں' تو محی الدین کے پاس دوسری بہت سی وجوہات تھیں۔ تو سمیع الدین نے خود کو طمانیت سے "سب ٹھیک ہو گیا ہے" کا یقین دلا دیا تھا۔ مگر دلہن کا ردعمل... اول تو استعجاب آمیز خوف ہی نہ جاتا تھا۔ اور زیادہ اصرار پر رونے لگتی۔ بے آواز' بے حساب آنسو...

تو یہ سب اس لیے تو نہیں تھا کہ وہ اس سب کے لیے راضی ہی نہ ہو۔ سمیع الدین کو اپنے پورے جسم میں کانٹے چبھنے کا احساس ہوا۔

اس نے بہت دوستانہ رویہ اپناتے ہوئے اپنے بارے میں سب کچھ بتانے کی کوشش کی۔ اور حسنل جو ابھی تک صدمے سے نکلی نہیں تھی' یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ عبدالمبین جیسے نیک کو ٹھکرانے کے بعد اسے جو ملا' وہ اپنے شرابی ہونے کا اعلان کر رہا تھا اور یہ کہ وہ زانی نہیں ہے' ہاں اس کی بہت سی دوستیں ہیں۔ مگر وہ اس کے ساتھ رشتہ ایمان داری سے شروع کر رہا ہے اور نبھا ہے گا۔

بس وہ بھی اسے اپنے بارے میں سچ سچ بتا دے وہ کیوں رو رہی ہے۔

کیا اس پر ماں باپ کی جدائی کا غم بہت گہرا ہے۔

کیا وہ اس طرح کی اچانک شادی پر راضی نہیں تھی۔

یا اس کی زندگی میں کوئی اور شخص تھا۔

اس کے چہرے کو بغور تکتے سمیع الدین کا رنگ اڑ گیا تو یعنی... اس سے آگے وہ سوچ نہ سکا۔

اس نے اس کا ہاتھ تھاما تھا' اس کے انداز سے پتا چلتا تھا۔ اس کی زندگی' جواب پر ٹکی ہے۔

پھر یہ بھی پتا لگ گیا کہ وہ انکار سننا چاہتا ہے۔

اس کے لیے فیصلہ مشکل ہو گیا۔ وہ غصے سے پوچھے' دہاڑ کر گریبان پکڑ کر یا پیار سے... پچکار کر۔

"میں... میں بتا دوں گی۔" اب بولے بنا چارہ نہ تھا۔

"وہ تو وجہ تھی۔" اس پر اوس گر گئی۔

"کب...؟" اس نے خود کو کچھ بھی سننے کے لیے تیار کر لیا۔ بعض دفعہ صرف شکل ہی باپ پر نہیں جاتی نصیب بھی چلا جاتا ہے۔ اس نے سوچا۔

دوسری طرف اس نے جواب نہیں دیا۔ کپکپاتے لبوں کو دانتوں تلے کچل دیا تو اس رات کی ڈری سہمی

لڑکی۔۔۔ اور آج ناگواری و بے خوفی سے عقیلہ سہگل کو ٹوکتی لڑکی۔۔۔ دونوں میں بہت فرق تھا۔

بظاہر پُرسکون دکھائی دیتے سمیع الدین کے اندر تلاطم برپا تھا۔

وہ غیر محسوس طریقے سے اس کے نزدیک جا پہنچا۔

"تم بہت صاف گو ہو۔۔۔ ہے نا؟" وہ بری طرح بدکی۔

اس کا اشارہ عقیلہ سہگل کو ٹوک دینے پر تھا۔ وہ تقریباً" اس کے شانے پر ٹھوڑی رکھے بظاہر کسی اور جانب دیکھتے ہوئے بات کر رہا تھا۔

"میرے سوال کا جواب کب دو گی؟؟"

وہ بے ساختہ اس کے سامنے سیدھی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور قطعیت تھی۔ سمیع الدین نے بری طرح محسوس کیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی جبکہ پہلے تو چوروں کی طرح نظریں چراتی تھی۔ یا چور نظروں سے دیکھتی تھی۔

"میں اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کا گھر ہے، جھوٹ مت بولنا۔" حسنل چونکی۔۔۔ وہ چلتے چلتے مزار سے ملحق مسجد کے صحن میں آگئے تھے۔

"اوہ۔۔۔!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں یہاں نہ ہوتی تب بھی سچ بولتی۔" وہ زیر لب مسکرائی تھی۔ سمیع الدین حیران رہ گیا۔

"اور صرف سچ نہیں۔۔۔ ثبوت بھی دوں گی۔"

"ثبوت۔۔۔!" وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ اسے حسین لگی تھی۔ کمزور، بے بس مظلوم۔۔۔ اور یوں اچانک اتنی بہادر۔۔۔ اور ایسی پُرسکون۔ اسے لگا وہ کوئی اور تھی اور یہ کوئی اور۔۔۔

اور یہ ثبوت بھلا کس چیز کا۔۔۔

"اوہ پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟" اس نے زندگی کے بہت سے پہلو دیکھے تھے اور جھیلے تھے مگر بس وہ اسی ایک مقام پر شکست نہیں کھانا چاہتا تھا۔

اور حسن المآب جھوٹی نہیں تھی۔ ڈرپوک بھی نہیں اور وعدہ خلاف تو بالکل نہیں۔۔۔ سمیع الدین کو یقین آگیا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے سچ کہنے کا وعدہ اپنا کر دیا تھا وہ بھی بمعہ ثبوت۔۔۔

مسلسل بولتے ہوئے اس کی آواز صاف تھی۔ لہجہ متوازن تھا اور وہ دم بخود اس کی شکل دیکھ رہا تھا اور شکل پر بھی سچائی درج تھی۔ جو کچھ وہ بتا رہی تھی، وہ یقین کرنے کا تھا کیا؟ نہیں قطعی نہیں۔

اور اس پر مستزاد وہ کتنی بے خوف تھی۔ وہ اپنے شوہر کو اپنے عشق کا قصہ سنا رہی تھی۔ وہ عشق جو تصوّر سے شروع ہو کر حقیقت میں ڈھل گیا تھا اور پھر اس نے اسے پانے کی چاہ کی اور دعا کی اور دعا بھی ایسی کہ جسے ضد کہیں۔

اور کوئی اور وقت ہوتا یا وہ کسی قصہ گو کی محفل میں بیٹھا ہوتا تو تنفر و استہزاء سے ہاتھ جھٹک کر اٹھ جاتا۔

یہ کیا بکواس تھی۔ کہانی میں اتنی زیادہ کہانی بھی نہیں ہونی چاہیے کچھ تو حقیقت سے واسطہ ضروری ہے۔

یہ کہاں کا قصہ تھا کہ ایک لڑکی نے اپنے تصوّر میں من پسند شبیہ گھڑی اور پھر اسے وہ مجسم نظر آگئی اور اس نے اسے دعا بنا لیا۔ ایسا تو بچوں کی کہانیوں میں بھی نہیں ہوتا۔

اور سمیع الدین نے اپنے لیے ایک نکھری ستھری سچی عورت کا خواب دیکھا تھا وہ جس کا جسم ان چھوا ہو۔

اسے اس چیز کا ادراک نہیں تھا کہ سوچوں کا ان چھوا ہونا بھی کس قدر ضروری ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ عمل سوچ کی پیداوار ہوتا ہے۔ سوچ بیج ہو تو عمل بصورت درخت بصورت ثمر۔

سمیع الدین نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ اس نے ماں کی عملی آوارگی دیکھی تھی۔۔۔ آہ۔۔۔ (اور اس جملے کو کہنا بھی بڑا جوکھم کا کام ہے)

ماں کی آوارگی۔۔۔ آہ۔۔۔

اس نے سر یوں جھٹکا جیسے بے خیالی میں آگ کو چھو لیا ہو۔

اور صرف وہ ہی کیوں۔۔۔ بدر الدین بھی تو۔۔۔ اس

نے بھی زندگی بھر اسے صرف دیکھا تھا۔
سمیع الدین بیٹا ہونے کی وجہ سے بے بس تھا تو کیا بدر الدین بھی... وہ تو شوہر تھا۔
بیوی کا قبلہ درست کروا سکتا تھا مگر اس نے کیا خاک کرواتا تھا۔ جس کا اپنا قبلہ درست نہ ہو وہ کسی اور کو کیا تعلیم کرے گا۔
اور بدر الدین دیکھا کرتا تھا اور سمیع الدین سن رہا تھا۔
اس کی سوچیں ٹھٹھر سی گئی تھیں۔ وہ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔
جو کسی ٹھہری ندی کے سے سکون سے بولتی تھی۔ ہاں اس کے بیان میں جذبات نہیں تھے۔ کبھی سر جھکا لیتی۔ کبھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی۔ کبھی کمرے میں موجود کسی بھی شے پر نظریں جما لیتی مگر اس کی روانی میں فرق نہیں آتا تھا۔
کون بیوی ہوگی جو اس فصاحت و بلاغت سے ماضی کہتی ہوگی مگر وہ حسن المآب تھی عام لڑکی نہیں تھی۔
نہ جانے اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ وہ کیا ٹھان چکی تھی۔ اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی تھی کیا۔
پرانے زمانوں میں سیانی۔ عمر کھائی عورتیں دلہن کے گھونگٹ میں گھس کر کان سے منہ جوڑ کر سرگوشیاں کرتی تھیں۔ کنواریوں کے دل میں کھد بد ہوتی جانے کیا کہتی ہوں گی۔
بے وقوف نہ ہوں تو کیا کہتی ہوں گی کہ مرد کا اعتبار کبھی نہ کرنا کبھی دل کا بھید نہ دینا بس۔
پچھلا سب بھلا کر ایمان داری سے آغاز کرنا اگرچہ کہ کچھ بھی ہو۔ مرد اپنے بچ سینہ تان کر بتاتا ہے۔ جب کہ عورت کی محض شک پر ہی گردن مار دی جاتی ہے تو حسن المآب نے کیا کہا سب کچھ کہہ دیا اور سمیع الدین...؟
اس نے مشرق کی عورتوں کی کہانیاں سنی تھیں۔
مشرق کی عورت۔ جو والدین کے فیصلے پر سر

جھکانے کی عادی ہوتی ہے اسے کسی غیر شخص نے دیکھا نہیں ہوتا اور اس نے بھی نظر نہیں اٹھائی ہوتی۔

اور یہ چیز۔۔۔ یہی چیز سمیع الدین کے لیے باعث کشش تھی۔ ڈھکی چھپی مسلمان لڑکی کے دوستوں کی فہرست میں مرد نہیں ہوتے۔ وہ غیر مردوں سے بات کرتے وقت آواز سخت کرلیتی ہے اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر بات کرتی ہے۔ عورت کا مرد کے دوستوں سے سلام کا تعلق بھی بہت کم ہوتا ہے۔ ہاں تو بس وہ کسی ایسی ہی مشرقی مسلم لڑکی سے شادی کرے گا۔

اور ان خیالات کو راسخ کرنے والے ایک فرد محی الدین سہگل بھی تھے۔

اس نے پھر ایسی ہی لڑکی سے شادی کی، جسے وہ جانتا تک نہ تھا۔ اور وہی لڑکی ابھی اپنے بارے میں سب کچھ بتارہی تھی۔

لڑکی یعنی حسن المآب

وہ اپنے نام کی طرح خوب صورت اور انوکھی تھی۔ شادی کی رات یوں لگتا تھا وہ کسی تنویمی عمل کے زیر اثر ہے۔ اور پھر وہ بے ہوش ہوگئی تھی اور ہوش میں آنے پر خوف زدہ۔ بے حد و بے حساب۔

اور ہراساں، جو آہٹ پر دم دے دے۔

وہ سمیع الدین کو یوں دیکھتی تھی جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔ تب سمیع الدین کو پیش قدمی روکنی پڑی اور بات سوال پر آکر رک گئی۔ جیسے اب جواب ملنے پر رکی ہوئی تھی۔

سمیع الدین نے اس کی سمت دیکھا جو خاموش ہوچکی تھی اس کے لیے حسن نئی چیز نہیں تھا ہاں مگر حسن المآب بھی۔

اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا تھا اور بال جو کسی باربی گڑیا کی طرح سیدھے کمر پر پڑے تھے ہاں اس کے بال اور آنکھوں کا رنگ ایک سا تھا۔

مگر یہ کون سا رنگ۔۔۔؟ ہاں، ہنی شہد اسی رنگ کا ہوتا ہے۔

حسن المآب سمیع الدین کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی جستجو میں تھی واضح تو کچھ نہیں ہو رہا تھا مگر اور ایسی حیرت صبغہ کے چہرے پر بھی تو آئی تھی نا (جب) تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ سامنے عقیلہ بیگم کا مسکراتا چہرہ تھا۔ ان کے ہاتھ میں ہینگر میں ٹنگا لباس تھا۔

"تم لوگوں کے ناشتے کے لیے کہہ کر آئی ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔" وہ ہینگر اسے تھماتے ہوئے بولیں۔

" ہم نیچے آتے ہیں۔" سمیع الدین نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ تمہارے دادا کہہ رہے تھے اکٹھے ناشتے کے لیے، میں نے کہا اب آپ کے ناشتے کے لیے میں انہیں جگا نہیں سکتی۔ ٹھیک کہا نا۔۔۔ انہیں ولیمہ کا پروگرام ڈسکس کرنے کی فکر ہے۔"

"آپ بلالیتیں۔ میں صبح اذان سے پہلے اٹھنے کی عادی ہوں۔ نماز پڑھنی ہوتی ہے۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

سمیع الدین کا سر تائیدا" ہلا ہاں صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ جائے نماز پر ہی تھی۔

عقیلہ بیگم بہ عجلت کمرے سے نکلیں۔ اتنی خاص بات تو محی الدین کو لازمی بتانی چاہیے، وہ کتنا خوش ہوتے۔ ہے نا۔



اپنے کمرے سے نکل کر باہر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھنے کی خواہش مند میری کامن روم سے گزرتے وقت ٹھٹک کر رک گئی۔ یہ گویا ایک ساکت منظر تھا۔ خدیجہ بانو صوفے پر بیٹھی تھیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ ایک دم بخودسی کیفیت طاری تھی۔ جس میں صدمہ نمایاں تھا۔ ایسی ہی حالت ماریہ اور میگی کی تھی۔

اس کی سوالیہ نظریں میگی کی سمت اٹھیں اور پھر میگی کی نظروں کے تعاقب میں سینٹرل ٹیبل پر۔۔۔ وہاں ایک کارڈ پڑا تھا۔ اوہ تو اس سناٹے کا باعث یہ کارڈ تھا ایسا کیا تھا اس کارڈ میں۔۔۔ اس نے جھک کر کارڈ

اٹھالیا۔
اور اگلے ہی پل۔۔۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس نے بے ساختہ ان تینوں کو دیکھا۔ خدیجہ بانو بے حد دکھی نظر آرہی تھیں اور میگی کی نگاہوں میں صرف اور صرف الزام ہے۔ تم۔۔۔ تمہاری وجہ سے۔۔۔ کیا ہوتا اگر مان جاتیں۔ تو آج سمیع الدین کی تقریب ولیمہ کے کارڈ پر دلہن کی جگہ تمہارا نام ہوتا اور دلہن کا نام۔۔۔ کارڈ پر دلہن کا نام نہیں تھا۔
یہ دعوت محی الدین سہگل اور عقیلہ سہگل کی طرف سے تھی۔ ان کے چہیتے پوتے کی دعوت ولیمہ کی تقریب سعید میں شرکت باعث۔۔۔
"اوہ۔۔۔" میری نے پیروں کا وزن بدلا۔ اسے "حیرت" ہوئی تھی یا صدمہ۔۔۔ یوں اچانک اور وہ بھی ولیمہ۔۔۔ یعنی شادی ہوچکی اور ان تینوں کی نظریں کہتی تھیں "دیکھا میری بہتنا نقصان کرلیا تم نے اپنا۔۔۔ کتنا شاندار تھا سمیع الدین۔۔۔ اس سے اچھا۔۔۔ یا اس جیسا ہی اب کہاں ملے گا۔" میری نے قصداً" نظریں پھیریں اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔
"پھر کیا ارادہ ہے؟ شرکت کرنی ہے؟"
"شرکت۔۔۔ تمہیں لگتا ہے ہمیں شرکت کرنی چاہیے۔" اسے اس احمقانہ آئیڈیا پر عود کر غصہ آیا۔
"ہاں کیوں نہیں۔۔۔ کتنے دنوں بعد کسی شادی کا دعوت نامہ ملا ہے۔ اور کارڈ دیکھ کر ہی پتا لگتا ہے مینیو بھی شاندار ہوگا کتنے دن ہوئے دیگی بریانی کھائے۔۔۔ ہے نا میگی؟" اس نے باری باری سب کو دیکھا۔
"جانا تو پڑے گا۔" خدیجہ بانو کی آواز مدھم مگر قطعیت سے بھرپور تھی۔
"ہاں دادی۔۔۔ میں بھی جاؤں گی۔" وہ کارڈ پر درج تاریخ پڑھ رہی تھی۔
"تم۔۔۔ تمہارا وہاں کیا کام۔۔۔؟"
"کیوں۔۔۔ میں کیوں نہیں؟"
"تم وہ لڑکی ہو جس نے سمیع الدین کو انکار کردیا میری!" میگی نے ایک ایک لفظ پہ زور دیا۔
"ہاں یہی بات۔ انکار میں نے کیا ہے۔ انہوں نے نہیں۔ سو میں تو جاؤں گی اور سر اٹھا کر جاؤں گی۔ دادی! آپ مجھے شاپنگ کروا لائیں۔" خدیجہ بانو نے سر ہلا دیا۔
ماریہ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ جب دادی پوتی اکٹھی ہوجاتیں پھر اس کی رائے کیا۔ اور کارڈ کے مندرجات کو پڑھتی میری سرسری نظر آتی تھی مگر بعض زلزلے سمندر کے اندر بھی برپا ہوتے ہیں۔ دل بڑی گہری چیز ہے۔



ولیمہ کی تقریب بہت شاندار تھی۔ نکاح ور خصتی کے اندر جتنی سادگی و خاموشی تھی ولیمہ اس کا صریحاً" الٹ تھا۔ وہ ایکس بیورو کریٹس کے پوتے کی دعوت ولیمہ میں کیا کیا نہ ہوسکتا تھا۔ ملکی و غیر ملکی مہمانان گرامی۔۔۔ سفارت کار' سیاست دان' شاعرو مفکر۔۔۔ اخبارات کے مالکان اور کیمرہ مینز' شوبز کے ستارے۔۔۔ کون کون سا شعبہ تھا جس کے لوگ یہاں اکٹھے ہوگئے تھے۔
بہت روایتی مغلیہ انداز کی سجاوٹ تھی۔ سب سے اہم بات مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ انتظام تھا جو ان کے حلقۂ احباب کے لیے عجیب تھا کہ وہاں تو ماڈرن ازم کے نام پر بہت کچھ ہونے لگا تھا۔
سب نے اسے ایک نیا اسٹائل کہہ کر سراہا' مگر محی الدین نے یہ اہتمام بالخصوص مفتی عبدالرحمٰن کے حوالے سے کیا تھا۔ تقریب میں مذہبی حلقوں کے بیشتر اہم نام بھی موجود تھے اور مفتی عبدالرحمٰن۔۔۔ انہوں نے تو حسنل کو یوں خود سے جدا کیا تھا جیسے زہر کھائی ٹانگ کو کاٹ دیتے ہیں۔ جیسے پلک کے بال کو جھاڑتے ہیں جیسے منہ پھیر لیتے ہیں۔ پلٹ کر نہ دیکھنے کی قسم کھاتے ہیں۔
مگر پھر وہ ہوا جو ان کے سان و گمان سے پرے کی چیز تھا۔ جو سب کے لیے ایک حیران کن واقعہ تھا۔
اور وہ دیکھنے چلے آئے کہ کیا واقعی۔۔۔؟
اور اب سانس روک کیفیت میں سمیع الدین پہ نظر

جمائے بیٹھے تھے ان کی خاموشی کو ناسازیٔ طبع کہہ دیا گیا۔ محی الدین سہگل کا بس نہ چلتا تھا۔ وہ مفتی عبید الرحمٰن کے پیر دھو دھو پینا شروع کر دیں۔

کیسا کرم کیا تھا انہوں نے ان پر۔۔۔

وہ ہر روز انہیں فون کرتے تھے منت سماجت لجاجت کے ساتھ ایک روز رو تک پڑے مگر مفتی صاحب کا انکار اقرار میں نہ بدلا۔

لیکن پھر ایک روز

"میں نے استخارہ کیا تھا دراصل۔۔۔" وہ نگاہیں ملائے بغیر بول رہے تھے۔ "اس میں مثبت جواب ملا ہے بس اس لیے۔"

انہیں بڑا زبردست جواب سوجھا۔ انہیں بہت محفوظ جواز مل گیا تھا۔ انکار کا بھی اور پھر اقرار کا بھی۔۔۔ محی الدین جھوم جھوم گئے۔ ہاں واقعی اس طرف تو دھیان ہی نہ گیا کہ وہ بہو (اچھی عورت) ڈھونڈنے پر استخارہ کرتے تو واقعی اللہ کی طرف سے یہ اچھائی مقدر کر دی گئی تھی۔

وہ بار بار یوں ہی جوش میں گھر کے مفتی صاحب کو خود سے لپٹائے جاتے تھے اور مفتی عبید الرحمٰن غم زدہ زیادہ تھے یا صدمہ آمیز بے یقینی کا عنصر غالب تھا۔ وہ خود فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔

یہ سچ تھا حسنل کے منہ پر آئیڈیل مرد کا تذکرہ سن کر وہ دم بخود رہ گئے تھے اور وہ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ایسا مرد۔۔۔ کیونکہ بات عبدالمبین کی نہیں تھی۔ بات تو اس سوچ و خیال کی تھی جو حسنل کے دل و دماغ میں راسخ ہو گیا تھا اور ایسے ہی بے بس لمحے میں انہیں محی الدین سہگل کا خیال آیا جو کسی صورت باز نہیں آتے تھے۔

اور یہ بھی ایک سچ تھا کہ استخارہ میں مثبت جواب ملا تھا۔

اللہ مشورہ دیتا تھا وہ حسن المآب ولد عبدالسنان۔۔۔ نواسی مفتی عبید الرحمٰن کے لیے بہترین شوہر ثابت ہوتا۔

لیکن اب وہ سمیع الدین کو دیکھ رہے تھے سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ اتنا خوب صورت مرد تھا کہ مرد ہونے کے باوجود مفتی صاحب اس کی دلکشی کے آگے نظریں جھکانے لگے۔

اور حسنل خوش ہو گی۔۔۔؟ جب وہ عمرے سے واپسی پر بہت تیزی میں گھر آئی تھی اور کسی سے بھی ملے بغیر واپس چلی گئی تھی اور پھر صبغہ جو کچھ کہہ رہی تھی۔

تو حسنل کو خوش ہونا ہی چاہیے ناں۔۔۔ سمیع الدین بالکل ویسا مرد تھا جیسا اس نے زیر و زبر کے ساتھ بتایا تھا اور صبغہ نے کہا کہ۔۔۔

کچھ لوگ انہیں مبارک باد دینے آئے تھے۔ سوچوں سے وقتی طور پر چھٹکارا ملا اور ان کے حلقے کے لوگ رشک حسد میں مبتلا تھے۔ اتنا بڑا نام اور مفتی عبید الرحمٰن۔۔۔ ہاں وہ بھی بہت معزز معتبر تھے مگر محی الدین سہگل تو۔۔۔ اور ان کی بیگم عقیلہ سہگل اور ان کا یہ پوتا سمیع الدین۔

"ہم کالج کے زمانے کے دوست ہیں بھئی، مگر اب تو رشتے داری ہے ناں؟" محی الدین مفتی عبید کو بغل میں لے کر فخر سے بتاتے۔

ایسی ہی محبت سے عقیلہ بیگم شہر کی کریم خواتین سے اپنی سمدھن کو متعارف کروا رہی تھیں۔ قیمتی مگر سادہ لباس میں خود کو چادروں سے اچھی طرح لپیٹے بہو کی ماں۔۔۔ مامیاں اور بہنیں۔۔۔

ان کے چہرے سادہ تھے عاجزی سے بھرپور وہ پریشان حال بھی لگتی تھیں شاید اس ماحول کے باعث ہاں مگر خوب صورتی میں بہت سوں سے بہت آگے تھیں۔ مفتی عبید الرحمٰن کا خاندان خوب صورتی میں نوازا ہوا تھا۔

مگر وہ جو ہو تھی۔۔۔ وہ تو بے مثال تھی۔

ایک حسن اور دوسرے وہ بناؤ سنگھار، زیور و لباس۔۔۔

نجانے وہ سب عقیلہ بیگم نے کہاں سے خریدا تھا۔ عورتیں کبھی حسن کو دیکھتیں، کبھی آرائش حسن کو۔۔۔

عبیدہ بی بی اور صبغہ اک جھجک میں تھیں ایک تفکر تھا ایک بے یقینی سی، جیسی بھی تھی بیٹی تھی عبیدہ بی بی کا دل الڈا پڑ رہا تھا۔ وہ اسٹیج پر جائیں اور بیٹی کو دیکھیں۔ انہیں اس کے سامنے جانے سے خوف آ رہا تھا۔ (دل چاہ بھی رہا تھا) ایسا نہ ہو وہ سب تہس نہس کر دے۔ اور مفتی عبید بھی حسینل کو دیکھنا چاہتے تھے، مگر۔۔۔ کتنی دنیا اکٹھی کی تھی محی الدین نے۔۔۔ وہ تو بس اپنے کنبے کے ساتھ آئے تھے۔ اور خاص طور پر ناراض ہوئیں۔

پھر عبدالمبین اور عبدالمتین ہاں وہ تایا کی مرضی پر کبھی بھی نقطۂ اعتراض نہیں عائد کرتے تھے آج بھی ساتھ تھے۔



اور اس رش میں دلہن کو دیکھنے کی شائق خدیجہ بانو میگی اور میری تھیں بلکہ میگی کی جانے بلا جو بھی ہو سو۔۔۔ مگر میری اسے دلہن دیکھنی تھی اسے دلہن لازمی دیکھنی تھی۔

خدیجہ بانو بہت خاموش تھیں۔ حالانکہ یہاں ان کی اور عقیلہ بیگم کی مشترکہ رشتے داریاں موجود تھیں مگر وہ کسی سے مخاطب نہیں ہونا چاہتی تھیں قصداً ایک کونا چن کر بیٹھی تھیں۔

"آپ سب سے الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہیں خدیجہ آپا۔" بالآخر عقیلہ بیگم نے انہیں جالیا۔

"ہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ بہت مبارک ہو۔" وہ اٹھ کر گلے ملیں۔

"اور تم کیسی ہو میرو۔۔۔؟" وہ اسے گہری نظر سے دیکھنے لگیں۔

"میں بہت اچھی ہوں آنٹی۔۔۔!" وہ مسکرائی۔

"دلہن سے ملے آپ لوگ۔۔۔؟" عقیلہ بیگم کی پہلی نظر جتاتی ہوئی، مگر جب ان تینوں کو ایسا سرسری دیکھا تو خود کو سمجھالیا۔ ہاں وہ کیوں ظاہر کریں کہ انہوں نے اب تک انکار کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ انہیں میرو سے ہزار درجے اچھی لڑکی مل گئی ناں۔

"جی آنٹی مل لیا۔۔۔ ماشاء اللہ بہت پیاری ہے آپ کی بہو۔" میگی نے بہت تیزی سے کمان سنبھالی۔ اسے کوئی خواہش نہیں تھی دلہن کو دیکھنے کی مگر میری کھڑی ہو گئی۔

"میں نہیں دیکھ سکی آنٹی۔۔۔! یہ میگی ہی گئی تھی۔" اس نے بہن کو بچا بھی لیا۔ "ادھر رش بہت ہے۔"

"ارے تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔ آؤ، میں لیے چلتی ہوں۔ رش تو ختم نہیں ہوگا۔ میں نے سہگل صاحب سے کہا لگتا ہے میرے پوتے کا ولیمہ نہیں ہے پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ سارے سیاست دان اکٹھے ہو گئے۔ کیا حزب اقتدار تو کیا حزب اختلاف۔۔۔"

عقیلہ بیگم نے خوش دلی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ ایک فہمائشی قہقہہ پڑا۔ خدیجہ بانو کو بھی مسکرا کر تائید کرنا پڑی۔ میگی نے البتہ دانت پیسے۔ عقیلہ بیگم منہ سے نہ بھی کہتیں تو سارے دکھائی دے رہے تھے مگر وہ کیا ہے ناں انسان کہے بغیر، جتائے بغیر رہ نہیں سکتا بلا جواز شیخی اور اس میری کی بچی کو نجانے کون سی تکلیف ہے دلہن دیکھنے کی خود نے تو منع کر دیا اب وہ کسی دیوی سے شادی کرے یا پھولن دیوی سے۔"

میگی دانت پیستی پیر پٹختی اپنے اور دادی کے لیے کھانا نکالنے اٹھی۔ نجانے کیا بات تھی دلہن کا لفظ کہتے ہی جیسے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اتنے ماڈرن سمیع الدین نے ولیمہ نہ رکھا دربار اکبری ترتیب دے دیا خود جلوہ افروز ہوا ہی نہ تھا۔

ہاں بس لوگوں کو کچھ الگ کر کے چونکانے کی عادت بھی ہوتی ہے۔ اتنے بہت سے کھانے تھے چناؤ مشکل ہو گیا اس نے ہاتھ جو لگا نکال کے لے آئی۔

"تم۔۔۔ ارمان پورا کر کے آگئیں تو اتنا نہ ہوا کہ کھانے نکالنے میں میری مدد کر دیتیں۔ تف ہے اس قوم پر۔۔۔" کھانا جینٹری میں کھلے یا کسی کے سوئم میں لوگ تہذیب بھول جاتے ہیں۔ چمچ پلیٹیں ٹکرا رہے ہیں دادی جیسے میدان جنگ میں تلوار بازی ہو رہی ہو۔"

وہ تھکے، جلے انداز میں بیٹھ گئی۔ "اب بریانی تم خود نکال لاؤ۔ دیگی بریانی ہنہ۔!" میگی نے واپس آکر اسے دیکھا تو منٹ کے اندر سب کچھ کہہ ڈالا۔

"اے ہیلو۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں جاؤ۔۔۔ رش کم ہوگیا ہے۔" وہ ہنوز گھس بیٹھی تھی میگی نے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

تب میری نے نظریں اٹھائیں اور میگی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، میری کی آنکھیں۔۔۔ جیسے وہ۔۔۔ وہ کوئی بھوت دیکھ آئی تھی۔ میگی نے اس کے ہاتھ کو پکڑا وہ برف کی طرف ٹھنڈا اور موم کی طرح پگھلتا ہوا تھا۔ غور کرنے پر اس کی کپکپاہٹ بھی واضح ہوگئی۔

"کیا ہوا میری۔۔۔" میگی کے لہجے میں تفکر آمیز اپنائیت در آئی۔ میگی نے چونک کر دیکھا اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔۔۔ بے یقینی۔

"میگی۔۔۔!" میری کی آواز میں عجیب سی لرزش تھی اور میگی ہکابکا رہ گئی۔ اس نے میری کی آنکھوں میں نمی دیکھی اور اس کا چہرہ فق تھا، مگر کیوں۔۔۔ میگی نے گھبرا کر دیکھا سب کھانے میں مگن تھے اور خدیجہ بانو بھی پلیٹ پکڑے کرسی گھمائے کسی رشتے دار سے محو گفتگو ہو چکی تھیں اور میری اس نے دفعتاً اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپالیا تھا۔

میگی نے دزدیدہ نظروں سے اطراف میں دیکھا۔

"تم سے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ انکار تم نے خود کیا تھا میری۔۔۔ تو پھر اس طرح سے رونا۔۔۔ ایسا رد عمل۔۔۔ کیوں۔۔۔؟" میگی نے بھنچی آواز میں پوچھا

میری نے اپنی خالی نظریں اس پر جمادیں۔

"میں اسے کھو دینے کے غم میں نہیں رو رہی میگی۔۔۔!" اس نے ٹھٹھرتی آواز میں تیزی سے کہا پھر گردوپیش کا خیال کرکے اس کی سمت جھک آئی۔

"پتا ہے میں اقرار کر بھی لیتی ناں۔۔۔ تو پھر بھی وہ مجھے نہ ملتا میگی۔" اس نے میگی کا بازو دبوچ کر کہا۔ "یہ لایعنی بات نہیں ہے میگی۔" وہ لمبا سانس لے کر بولی۔

"مسئلہ میری ہاں کا نہیں تھا مسئلہ یہ تھا کہ اللہ پہلے ہی حسنل کی دعا قبول کر چکا تھا۔"

"دعا۔۔۔ حسنل۔۔۔!" میگی نے اس کے جملے میں سے اہم لفظ لے کر دہرائے۔ "حسنل۔۔۔ تمہاری۔۔۔؟" اس نے سخت نا سمجھی سے میری کو دیکھا۔

"ہاں حسنل چنڈال چوکڑی چکور کا چوتھا کونا حلیمہ، اریبہ، حسن الملب اور میں میری۔۔۔ میرو۔۔۔ ملہ روفیاض!"

میگی کو اس کا ایک لفظ سمجھ نہ آیا۔۔۔ ہاں یہ کہ وہ میری کی دوستوں کو چنڈال چوکڑی کہتی تھی۔ میگی کا سر کرنٹ کھائے انداز میں اسٹیج کی سمت گھوم گیا تو کیا۔۔۔ اسٹیج پر حسن۔۔۔ حسنل۔۔۔ حسن المآب تھی سمیع الدین کی دلہن۔۔۔

مگر میری کہہ کیا رہی تھی۔ حسنل کی دعا۔۔۔ کون سی دعا۔

"حسنل نے دعا مانگی تھی کہ اس کی شادی سمیع الدین سے ہو جائے۔؟" اس نے سخت بے یقینی سے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"حسنل کیسے جانتی تھی سمیع الدین کو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔!" میری کا سر نفی میں ہلا۔ "سمیع الدین نہیں۔۔۔ موسیٰ۔۔۔ موسیٰ بدر الدین۔۔۔"

اس کے ایک جملے میں ساری داستان سمٹ آئی۔ یہ اور بات تھی۔ میگی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"دعائیں ایسے بھی پوری ہوتی ہیں میگی؟" اس کا سوال یقین و بے یقینی کی ایسی منزل پر آکھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہاں پار لگادے گی اور ناں۔۔۔؟ تو اللہ سن لیتے ہیں اسے حسنل کا یقین یاد آنے لگا اور وہ سب باتیں جو وہ کرتی تھی اور میری بھی اللہ پر یقین رکھتی تھی۔ اللہ وحدہ لاشریک ہوتا ہے، مگر میری دو خداؤں کو جانتی تھی ایک جس کا ذکر خدیجہ بانو کرتی تھیں اور دوسرے وہ جن کا ذکر نانا نانی کے گھر ہوتا تھا۔

اور وہ اللہ کو مانتی تھی ویسے ہی جیسے میں اور آپ۔۔۔

مگر وہ خدا کو بھی مانتی تھی جیسے۔۔۔؟ جیسے ماریہ۔۔۔ تو وہ دونوں ماں بیٹی دنیا کی وہ دو انسان تھیں، جو دونوں مذاہب

کو مانتی تھیں۔ ایک مسلمان کا گزشتہ مذاہب کو ماننا اور احترام کرنا ایمان کا تقاضا ہے مگر "عمل" اسے صرف دین محمدی پر کرنا ہے۔ یہ شرط اولین و شرط آخر ہے۔

مگر... یہاں سے آگے داستان میں ایسا الجھاؤ تھا جسے سمیٹنے میں میری کو لگتا تھا عمر بکھر جائے گی، بکھر رہی تھی یا پھر بکھر چکی تھی۔

ہنستی مسکراتی شوخ و شنگ ماہ رو فیاض۔ ماں کی میری اور دادی کی میرو... وہ ماہ رو، جس پر حلیمہ کو رشک آتا تھا۔ خوش باش سیدھی سادی زندگی گزارنے والی ماہ رو مطمئن و بے فکر اور کسی نے کبھی ماہ رو کو افسردہ نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کسی فکر میں نہیں دیکھا۔ ماہ رو کی سوچیں منجمد ہو گئیں۔ سامنے حسنل کی دعا مجسم چلی آ رہی تھی۔ کب کھانا ختم ہوا۔ کب ہال کی لائٹس آف ہوئیں اور بیم لائٹ سے ریڈ کارپٹ پر روشنی کی لکیر بن گئی اور اس لکیر پر ایک ہاتھ سے اپنے لہنگے کو ذرا سا اٹھائے۔ دوسرا ہاتھ سمیع الدین کے ہاتھ میں دیے وہ سج سج قدم اٹھاتی آ رہی تھی۔

وہ جو آفتاب محشر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے تھے اور ان کی روشنی، آنکھ خیرہ ہوتی تھی۔ لباس کا عکس تھا یا یہ اس کے آتشیں رخ کی جلوہ نمائی تھی۔ اس نے پالیا تھا جو اسے چاہیے تھا۔

تو خواہش ایسے بھی پوری ہوتی ہیں۔ اوں ہوں دعائیں.....

اس نے حسن المآب سے نظریں ہٹا کر سمیع الدین المعروف موسیٰ بی ولد بدر الدین کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی طمانیت کا ایک جہان آباد تھا۔ حسنل کی خوشی کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی۔

جسے اس نے چاہا... اسے اس نے پالیا۔

پر موسیٰ کیوں اتنا خوش تھا۔ اس کا دل چاہا وہ تیزی سے آگے بڑھے اور پوچھے اور یہ بھی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ وہ دونوں مووی میکر کی ہدایت پر بہت چھوٹے قدم اٹھاتے اب ماہ رو سے اتنے نزدیک ہو چکے تھے کہ وہ پکار سکتی تھی۔ چھو بھی سکتی تھی۔

لیکن فضول ہوتی یہ کوشش... وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں مگن تھے جیسے اتنے بڑے پنڈال میں لوگوں کے بیچ نہ چلتے ہوں۔ کسی مرغزار میں چہل قدمی فرما رہے ہوں۔ جہاں انہیں دیکھنے والی کوئی آنکھ نہ ہو۔ ہاں بس پرندوں کی چہچہاتی اور آبشاروں کی آوازیں... اور پھولوں کی خوشبو اور ایک دوسرے کے... قدموں سے الجھتے قدم...

ہجوم میں تنہا ہونے کو دیکھنا ہوتا تو کوئی ماہ رو کو دیکھتا اور ہجوم میں گرد و پیش سے بے گانوں کا پتا لگانا ہوتا تو کوئی حسن المآب اور... اور... موسیٰ کو دیکھ لیتا۔

اور اتنا کم فاصلہ تھا کہ موسیٰ ماہ رو کو دیکھ سکتا تھا۔ اور حسنل بھی... مگر وہی یاں وہ ایک دوسرے میں یوں گم تھے۔ جیسے مور محو رقص ہو تو سب فراموش کر دیتا ہے۔ ماہ رو کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔

یہ بھلا کس لیے....؟ وہ اب حسنل کو نہیں دیکھ رہی تھی اب اس کی نگاہیں موسیٰ کی پشت پر جمی تھیں۔ اور سرشاری اس رخ سے بھی عیاں تھی۔

"راستے سے ہٹ جاؤ میری...! آؤ ادھر۔" میگی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کسی گوشے میں لے آئی۔ جہاں انہیں کوئی نہ دیکھے۔ مگر ایک مسئلہ تھا وہ جہاں بھی کھڑی ہو جاتیں، انہیں اسٹیج پر کھڑے تصاویر بنواتے دولہا دلہن نظر آتے تھے۔ میگی نے شعوراً پشت کر دی۔ مگر وہ خود کو باز نہ رکھ پا رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے میری؟" میگی کے لہجے میں بہن کے لیے محبت و ہمدردی تھی۔

"حسنل کی خوشی تو سمجھ میں آتی ہے میگی... اگر یہ موسیٰ کیوں اتنا خوش ہے۔ کیا اس نے بھی اسے دعاؤں میں مانگا تھا؟"

اس نے ایک ہی سوال جڑ دیا۔ میگی کی گردن گھوم گئی۔ ہاں وہ کبوتروں کی جوڑی کی طرح ایک دوسرے میں محو تھے۔ دونوں اسی سوال پر اٹک گئیں۔

اور اگر موسیٰ کے آگے یہ سوال رکھ دیا جاتا تو....؟

اور اسی حیرت سے محی الدین سہگل کے ہمراہ ان کے بے حد اصرار پر اس جانب آنے والے مفتی عبید

الرحمن بھی ان دونوں کو دیکھتے تھے۔
اور ان کی حیرت سے کہیں زیادہ حیرت عبیدہ بی بی کی تھی اور صبغہ کی اور مامیوں کی۔۔۔ وہ جو ابھی ان کی ٹیبل کے پاس سے ان کی طرف دیکھے بنا گزری تھی۔
اسے ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ ماں بہنوں کو کھوجتی۔
مائیں بیٹیوں کے چہروں پر ایسی ہی طمانیت سوچتی ہیں۔ دعا کرتی ہیں۔ تو کہاں وہ حسن المآب جس کی سرکشی پر ان کی روح کپکپا گئی تھی۔ اور کہاں یہ۔۔۔
انہیں لگا تھا اپنی تعلیم و تربیت و ماحول کا مذاق اڑانے پر اللہ تعالیٰ اسے قطعاً" نہیں بخشیں گے اور خوب سزا دیں گے۔ وہ خوش نہیں رہے گی وہ نشان عبرت رہ جائے گی۔ مگر اب۔ جو حسنل دیکھی۔۔۔
وہ۔۔۔ وہ تو ایسی تھی جیسی ماں کی دعا۔۔۔ جو پوری ہو گئی ہو۔
اور مفتی عبیدالرحمٰن کو صبغہ کی بات کا یقین آگیا۔ شک کی گنجائش تھی ہی نہیں۔
"اسٹیج پر چلیے مولانا۔!" محی الدین نے کہا۔
"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" ان کے سر نفی میں ہلا۔
"وہاں خواتین ہیں۔" جواز بھی دے دیا۔ "اچھا نہیں لگتا۔"
"اوہ۔۔۔ او۔۔۔" محی الدین فوراً" مان گئے وہ ان پر زور نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔
دونوں دور کھڑے ہو کر اسٹیج پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ عقیلہ کے بے حد اصرار پر عبیدہ بی بی و دیگر اسٹیج پر چلی آئی تھیں۔ کیمرہ مینز اور مووی میکر کو ہٹا دیا گیا تھا۔
ان سب کے قدم جھجکے ہوئے تھے۔ وہ کچھ حواس باختہ دکھائی دیتی تھیں۔ غیر محسوس طریقے سے ان سب نے اپنے دوپٹے ماتھے سے کھینچ لیے تھے۔ مقدور بھر چہرے ڈھانپ لیے تھے موسیٰ احتراماً کھڑا ہوا تھا۔ حسنل نے اپنے گھر والوں کو دیکھا۔ ہاں ولیمہ کی تقریب میں تو انہیں آنا ہی چاہیے تھا۔
عبیدہ بی بی کی محتاط ہراساں سی نظر اس پر ٹھہری۔۔۔ اور پل بھر کے ٹکراؤ کے بعد وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں کے گلے لگ گئی۔ اس نے انہیں بھینچ لیا تھا۔
"امی۔۔۔؟" اس کی آواز سے خوشی یوں چھلکتی تھی۔ جیسے سونے کی پرات پر چاندی کے سکے گرنے لگیں۔
اس کی گرفت کی گرم جوشی۔۔۔ اس کے حال کی گواہ تھی۔
وہ کتنی خوش تھی۔ اس روئے زمین میں اس سے بڑھ کر خوش اور کوئی نہیں تھا اس وقت۔
موسیٰ انہیں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ اس کی نظروں و انداز میں بے پناہ عزت و احترام تھا۔ امی کی نظریں حیا سے مزید جھک گئیں۔ انعمتہ و صبغہ قصداً" منہ پھیرے کھڑی تھیں۔ سچ تو یہ تھا یہ خاندان کا پہلا غیر اور اس طرح کا داماد تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کس طرح کے ردعمل کا اظہار کریں۔
ان سب کی سوچوں سے پرے حسنل نے صبغہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔
"تم موسیٰ سے ملیں۔۔۔"
صبغہ کی نگاہیں بے ساختہ اٹھیں اور فوراً" جھک گئیں۔ وہ ذرا سا خمیدہ ہو کر عقیلہ بیگم کی بات سن رہا تھا۔ ذرا سا سر جھکا کر نظریں مخاطب کے چہرے پر جما کر بغور دیکھتے ہوئے بات سننا اس کا انداز تھا۔
اور ایسے میں اس کی آنکھوں میں دیکھنا بلکہ اس کی سمت دیکھنا بھی ایک امتحان تھا۔ صبغہ کا دل پتے کی طرح لرزا۔ اس نے فوراً" نظریں جھکائی تھیں۔ اور سوچا تھا۔ کچھ عجب نہیں تھا اگر اس کی بہن نے اس شخص کے لیے ہر چیز تہس نہس کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مرنے مارنے پر تل گئی۔
محی الدین سہگل مفتی صاحب کو اسٹیج پر لے آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حسنل کی نظریں اور سر جھک گیا۔ شکر اس میں اتنی حیا باقی تھی۔ انعمتہ نے سوچا۔ مفتی صاحب نے اپنا ہاتھ حسنل کے سر پر رکھ دیا۔
(اسی ہاتھ سے انہوں نے حسنل کی کلائی کو پکڑا تھا

جب وہ نکاح پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔ تب اسے پکڑ سے انہوں نے کہا تھا۔ "اب ایک لفظ اور نہیں۔ سائن کرو۔۔۔" اور حسنل کی ساری سرکشی جھاگ ہو گئی تھی۔

بعد میں حسنل نے سوچا شاید نانا جان نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ ورنہ تو وہ کبھی سائن نہ کرتی۔ کجا کہ وہ عقیلہ بیگم کے ساتھ آئی بیوٹیشن کے ہاتھوں تیار ہوئی۔ رخصت ہوئی اور سمیع الدین کے کمرے تک پہنچ گئی یا پھر یہ کہ یہ سب اللہ کی طرف سے خود بخود ہوتا چلا گیا۔ کہ ایسے ہی لکھا گیا تھا۔ ورنہ وہ اور سائن۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔)

مفتی صاحب کو ایک بار پھر سمیع الدین کو گلے لگانا پڑا۔۔۔ حسنل کے خوش ہونے پر اب کوئی شک نہ تھا۔ جو کچھ صبغہ نے کہا تھا۔۔۔ اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر۔۔۔ ہاں وہ یہ چاہتے تھے وہ حسنل سے پوچھیں کیا صبغہ سچ کہتی ہے۔ اور اگر وہ سچ کہتی ہے تو۔۔۔ حسنل تو پھر عام انسان نہ رہی ناں۔۔۔ وہ تو بہت خاص تھی اور کیسی حیرت کہ انہیں اندازہ بھی نہ ہوا۔ تو انہیں اب سمیع الدین کے لیے ہدایت کی دعا مانگنی چاہیے۔

"ہاں مولانا پھر بولو۔۔۔ اصل سے سود سے پیارا ہوتا ہے ناں۔" محی الدین کی محبت پاش نظریں موسیٰ اور حسنل پر جمی تھیں۔ خوشی ان کی آواز سے چھلکی پڑتی تھی۔

"سود نہیں کہتے۔ سو تو حرام ہوتا ہے۔ ہم غلط مثالیں قائم کرتے ہیں اور پھر ان کی ترویج کرتے ہیں۔ اولاد کو اور اس کی اولاد کو ثمر کہنا چاہیے۔ حلال کو حرام کیوں کرتے ہیں۔ اولاد تو بہت پاکیزہ چیز ہوتی ہے۔"

"بے شک بے شک۔۔۔" محی الدین نے فوراً "مان لیا۔

حسنل نے موسیٰ کو دیکھا۔ وہ بغور دیکھ رہا تھا مفتی صاحب کو۔۔۔ اور یہ نانا جان۔۔۔ کوئی موقع جانے نہیں دیتے۔ وہ موسیٰ کے آگے شرمندہ سی ہو گئی۔

اس نے دوبارہ اسے دیکھا۔ اور اسے دیکھنے سے دل میں کیسی خوشی بھرتی تھی۔ اسے یکدم اپنی دوستیں یاد آئیں۔ موسیٰ کی قربت نے اسے سدھ بدھ بھلا دی تھی۔ ورنہ ایک پیغام ان سب کو بھجوا دیتی کہ آؤ دیکھو ذرا۔

دیکھو تو۔۔۔ اسے تاسف نے گھیر لیا۔

لیکن خیر وہ جلد ہی ان سب سے ملنے جائے گی اور انہیں بتائے گی۔ اسٹیج پر شوبز کے متعلق لوگوں کا ایک ریلا چلا آیا۔ عقیلہ، مفتی صاحب و دیگر کو ڈنر کے لیے سجائی جانے والی خصوصی ٹیبل پر لے گئیں۔

وہ سب دولہا دلہن کے ساتھ گروپ فوٹوز بنوانا چاہتے تھے۔ موسیٰ کا سیکریٹری ڈھونڈ ڈھونڈ کر سب کو لے آیا۔ یہ پکچرز میگزینز کو دینی تھیں۔

حسنل کا دل بلیوں اچھلنے لگا اسے صرف موسیٰ نہیں ملا تھا سب کچھ مل گیا تھا۔ ساتھ ہی وہ چونکی اس کی متلاشی نگاہیں بالآخر ناکام ہو گئیں۔ سیکریٹری موسیٰ کو بتا رہا تھا۔ شوبز سے متعلق تمام لوگوں کو وہ اسٹیج پر لے آیا ہے۔

اور ان سب میں وہ نہیں تھی۔ وہ شہرزاد عیسانی۔۔۔ حالانکہ وہ صبح ہی تو ان کے گھر آئی تھی۔ شوبز سے متعلق دوستوں میں وہ پہلی تھی جو حسنل سے ملی تھی اور جسے موسیٰ نے ولیمہ کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی تھی اور پھر حسنل نے بھی بصد اصرار۔۔۔ مگر وہ آئی کیوں نہیں۔۔۔ وہ تو اچھی دوست ہونے کی دعوے دار تھی ناں۔

✲ ✲ ✲

اس طرح سے اوندھے ہو کر تکیے میں منہ دیے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ اس نے اپنے سوجے پپوٹے بدقت کھول کر وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ دونوں سوئیاں بارہ پر چڑھی ہوئی تھیں (ایسے ہی جیسے اس کی زندگی میں بارہ بج گئے تھے۔ بارہ کو لوگ زوال کا ہندسہ کہتے ہیں)۔

دن کے بارہ یا رات کے بارہ۔ وہ بہت سوچنے پر بھی فیصلہ نہ کر سکی۔ کھڑکیوں پر سنہری مدھم تار وائے

میرون پردے تنے تھے۔ کوئی درز نہیں تھی۔ جس سے وہ پہر کا اندازہ لگاتی۔ اس کا سن دماغ اور منجمد نظریں جیسے دھیرے دھیرے ہوش میں آرہی تھیں۔

اس کی یادداشت لوٹنے لگی۔

رات اسے عجب وحشت نے گھیر لیا تھا۔ نجانے کیوں اور اس کا دکھتا سر، سُوجی آنکھیں نائٹ بلب کی سفید روشنی بہت مدہم تھی۔ مگر اسے سامنے آویزاں آئینے میں اپنے بکھرے بال اور سوجی آنکھیں دکھائی دینے لگیں۔ اسے خود کو دیکھنے سے گھبراہٹ ہوئی۔ خوف آیا۔ وہ قبر سے نکلی کوئی لاش لگتی تھی۔

اور آخر اسے ہوا کیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر نیند کی گولیوں کی کھلی شیشی پڑی تھی۔ اور کارپٹ پر گلاس اوندھا پڑا تھا۔ کارپٹ کے میرون رنگ نے اسے چونکایا۔ یہ رنگ اسے وحشت زدہ کررہا تھا۔ حالانکہ یہ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ پر اس وقت دل چاہا یہاں سے بھاگ جائے۔ اسے آخر ہوا کیا تھا۔ وہ اپنی کنپٹی دبانے لگی۔

باہر فون بج رہا تھا۔ جیسی کوئی ری ڈائل کے بٹن پر انگلی رکھ کے بھول گیا۔ اور یہ چنگھاڑتی آواز اعصاب پر بھاری تھی۔ وہ گرتے پڑتے اٹھی۔ اس لاچاری کا عالم تھا کہ چیزوں کا سہارا لیتی دروازے تک پہنچی۔ پھر دیوار کے سہارے ٹوٹے قدم اٹھاتی فون تک پہنچی۔

مگر تب ہی فون بند ہوگیا۔

اس نے ریسیور کان سے لگالیا۔ پھر فون ہاتھ میں پکڑ کے چہرے کے قریب کرکے نمبر پہچاننے کی کوشش کی ۔ مگر اس کے اعصاب کے لیے اتنا سا کام بھی بڑا مشقت طلب تھا۔ دونوں چیزیں زوردار آواز سے زمین بوس ہوگئیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے صوفے کی پشت کو تھاما اور اسی سہارے سے صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہورہی تھی۔ اور کاش کوئی پردے سرکادے اور باہر اجلا دن نکلا تھا۔

اسے ایک بار پھر روشنی کی خواہش ہونے لگی۔ ملازم بچہ موجود نہیں تھا۔ نجانے کہاں تھا۔ پکار فضول تھی۔ وہ گھر میں ہوتا تو ٹی وی چل رہا ہوتا۔ اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور اس بار وہ فریج تک پہنچ گئی۔

اس نے پانی کی بوتل کو منہ سے لگالیا۔ پانی باچھوں سے گرتا گریبان کو بھگو رہا تھا۔ پر اسے پرواہ نہ رہی تھی۔ بوتل منہ سے لگتے ہی اس کی نظریں سینٹرل ٹیبل پر پڑے اخبار پر پڑ گئیں۔

اور اگلے ہی پل جیسے دماغ کی سن کیفیت اڑ گئی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اس کے منجمد احساسات کی برف پگھلنے لگی۔ اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ اسے سب یاد آگیا۔ وہ بوتل کو پھینک کر گرتی پڑتی اخبار تک پہنچی۔

"ہاں۔۔۔!" اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔

"یہ۔۔۔ یہ تو موئی تھا۔۔۔ اور ساتھ عروسی آتشیں و سنہری لباس میں اس کی دلہن۔۔۔ جسے اس نے۔۔۔ ہنی کے نام سے پکارا تھا۔

اسے یہ بھی یاد آگیا۔ کل رات اسے میرون رنگ سے نفرت ہوگئی تھی۔ کل رات۔۔۔ وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھی۔

کل رات تو نہیں۔۔۔ اس نے اخبار پر درج تاریخ دیکھی۔ یہ تو تین دن پہلے کی بات تھی۔ جب وہ۔۔۔ تو وہ دو راتوں سے مدہوش پڑی تھی گویا) اس کی یادداشت پر پڑے پردے سرک گئے۔

اسے سب یاد آنے لگا۔



"بیرون ملک شوٹنگ تھوڑا ریسٹ اور ریلکس تو دیتی ہے مگر ختم کرتے کرتے بندہ گھر کے لیے باقاعدہ پریشان ہوجاتا ہے۔ میں تو ہمیشہ بہت شوق سے جاتی ہوں لیکن جوش ٹھنڈا ہوتے ہی ہوم سک نس پیدا ہوجاتی ہے بس گھر بھاگو۔۔۔"

شہزاد کریم کلر کی پلین جارجٹ ساڑھی میں بے حد فریش اور اپنی عمر سے کافی کم نظر آرہی تھی اس نے یقیناً "ٹریٹمنٹ" کروائے تھے فلرز وغیرہ۔

ہونٹوں کے گرد لائنیں نہیں تھیں اور آنکھیں

بھی خوب روشن کھلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔
بین کالر بلاؤزر کی جگہ آگے پیچھے سے گہرا گول گلا اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ اس نے گردن کی جھریوں کو چھپانے کے لیے انجکشن لگوائے ہیں۔
وہ بہت خوب صورت اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ موسیٰ تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔
"میں یہاں خود آنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اتنے دن سے ملے نہیں تھے۔ میرا دل ــــ تم سے اتنی دوری کو کیسے برداشت کر گیا۔ سوچتی ہوں تو یقین نہیں آتا۔"
"گھر میں کوئی نہیں ہے خصوصی طور پر وہ تمہارے۔۔۔" اس نے لب بھینچ لیے۔
ملازمہ، شیف کی مدد سے بہترین ناشتہ سرو کر رہی تھی۔
"کتنے دن ہو گئے ہمیں ساتھ کھانا کھائے ہوئے ناں۔۔۔ اکیلے کھانا بہت مشکل لگتا ہے۔"
"اسی لیے تم بہت اسمارٹ نظر آ رہی ہو۔۔۔ کھانا نہیں کھایا ہو گا یا پھر ایکسر سائز وغیرہ۔"
"کھانا ہی کم کھایا۔۔۔ ہاں بھاگ دوڑ بہت تھی۔ اسکاٹ لینڈ اتنا خوب صورت ہے۔۔۔ اتنی نیچرل بیوٹی۔ بس پیک اپ ہوتے ہی سب بھاگے۔ اتنا پیدل تو شاید ہی کبھی چلے ہوں صرف میں ہی نہیں، کریو کا ہر بندہ اتنی ہی نئی لک دے رہا ہے۔" شہرزاد مسلسل بولتے ہوئے اب اپنی پلیٹ میں ناشتے کے لوازمات چن رہی تھی۔
"کچھ زیادہ نہیں ڈال لیا۔۔۔ آئی مین تم اتنا نہیں کھاتی ہو۔۔۔" موسیٰ نے اسے چھیڑا۔
"بالکل زیادہ ڈالا ہے ایکچوئلی۔۔۔ میں نے چار کلو وزن کم کیا ہے۔ آدھ کلو اوپر نیچے ہو جائے تو پتا نہیں چلے گا۔ پر تم کیوں نہیں لے رہے اور۔۔۔ مجھے یہاں اوپن لاؤنج میں بیٹھنا عجیب لگ رہا ہے۔ ہم اسٹوڈیو میں بیٹھتے ناں۔۔۔ ابھی کوئی آئے گا تمہاری۔۔۔ گرینڈ مدر۔۔۔ فادر۔۔۔" اس نے ساتھ ہی ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔
"کم آن شہر۔۔۔ وی آر گڈ فرینڈ۔۔۔ ہم سب لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ ریلکس۔" موسیٰ نے گلاس میں جوس انڈیلا۔
"پتا نہیں رات کیسے گزاری۔ تم کال اٹینڈ ہی نہیں کر رہے تھے۔ یہاں گھر کا نمبر ملایا تو پتا لگا صاحب۔۔۔ سو رہے ہیں۔۔۔ تم نے کب سے گیارہ بجے سونا شروع کر دیا۔" "یا اچھی عادتیں اپنا رہے ہو جلدی سونا جلدی جاگنا۔" وہ ہنسی۔
"کچھ روز ہی ہوئے ہیں۔" موسیٰ کی مسکراہٹ جان لیوا تھی۔
"اور یہ انڈا پراٹھا کس کے لیے۔ اتنا سب کچھ۔۔۔ میں تو چکھ بھی نہیں پاؤں گی۔ تم نے کب سے ایسی ڈائٹ لینی شروع کر دی۔" وہ خستہ پراٹھے اور پھولے ہری پیاز والے آملیٹ کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔
"یہ۔" موسیٰ نے پلیٹ کو بغور دیکھا۔ یہ بھی کھانے کے لیے ہے، کوئی نہ کوئی تو کھا ہی لے گا۔" وہ مسکرایا تھا۔
"میرا خیال ہے، ایک لقمہ لے لیتی ہوں زمانے ہوئے۔۔۔ اب تو شاید ذائقہ ہی بھول گیا۔"
"بالکل۔۔۔" موسیٰ نے شانے اچکائے تھے اور پلیٹ سرکا دی۔
"تمہارا ڈرامہ کب آن ایئر جائے گا؟"
"بہت جلد۔۔۔ بہت مزے دار اسٹوری ہے ڈفرنٹ۔۔۔ ڈیفینیٹلی سکسس فل۔۔۔"
"بہت خوش ہو شہر۔۔۔ اور بہت اچھی لگ رہی ہو۔۔۔" وہ گلاس ہونٹوں سے لگا تانیم دراز ہو گیا۔
بلو جینز پر سفید بے حد باریک کرتا۔۔۔ پاؤں میں آرام دہ چپل۔۔۔ شہرزاد کی نگاہیں اس کے وجود پر ٹک گئیں وہ سوچنے لگی۔
وہ تو چھٹیاں گزار کر ایک بے حد پُرفضا مقام پر گھوم پھر کے اتنی ریلیکس نظر آ رہی ہے۔ اس نے ڈائٹ کا خیال رکھا۔ اسکن ٹریٹمنٹ کروائی، خود پر بے حد توجہ دی تو نتیجے میں ہر جگہ سے تعریف ہو رہی ہے۔
موسیٰ نے خود پر کون سا جادوئی ہاتھ پھروایا ہے۔
وہ خوب صورت ہمیشہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر دیکھنا ایک ہمت طلب کام تھا۔ مگر اب یہ جو محسوس کی جانے والی دل پر پڑنے والی جگمگاہٹ ہے یہ کہاں سے ملی۔

اس کا بے حد اطمینان اور ایک محسوس کی جانے والی خوشی کس چیز کی مرہون منت ہے۔ موسیٰ نے اخبار اٹھالیا تھا۔ شہزاد کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ وہ دزدیدہ نگاہوں سے اس بے حد دلکش مرد کو جیسے دل میں اتار رہی تھی۔ اس کا ایک ایک انداز آنکھوں میں بسا رہی تھی۔

موسیٰ نے کسی خبر کا بقیہ پڑھنے کے لیے پورا اخبار چہرے کے سامنے کھول کر پھیلا لیا۔ شہزاد چونک کر سیدھی ہوئی۔

تب ہی اس کی نگاہیں سامنے اٹھیں۔ وہ گمان تھی یا حقیقت۔ شہزاد نے پلکیں زور زور سے جھپکائیں۔

"نہیں۔۔۔ حقیقت دھیمے قدموں سے ریلنگ کو تھامے اتر کر نزدیک ہوتی جارہی ہے۔ اور نزدیکی' وضاحت تھی۔ اس کے ایک ایک نقش کی ہر عضو کی۔ ہر پہلو کی۔۔۔ وہ خوب صورت تھی پری جیسی۔ دیو مالائی داستانوں کے کردار جیسی۔۔۔ اس کے سراپے پر غزل کہی جاسکتی تھی تو کہتے۔ کہنے والے کہتے جو مرضی کہتے۔ مگر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہاں کیوں تھی؟"

سجے سجے قدم اٹھاتی موسیٰ کے صوفے کی پشت پر آرکی ۔ شہزاد کے بدترین خدشات۔۔۔ اس کا دل بے حد تیزی سے دھڑک رہا تھا اس نے بمشکل پیالی تپائی پر رکھی اس کا دوسرا ہاتھ دل پر دھرا تھا۔

"ارے ہنی آؤ۔۔۔ آؤ سامنے۔۔۔" موسیٰ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھامی اور اسے گھما کر اپنے ساتھ بیٹھنے کی جگہ دی۔ وہ سمٹ کر کچھ جھینپ کر یوں ٹکی تھی جیسے ابھی بھاگ اٹھے گی۔

"یہ شہزاد ہے میری بیسٹ فرینڈ۔۔۔ اور یہ ہنی ہے۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ اس لیے بیسٹ خود بخود ہوگئی۔"

دل کا زور سے دھڑکنا تکلیف دہ تھا نا قابل برداشت یا۔۔۔ دل کا بند ہوجانا۔

تیز میرون امبریلا فراک اور دوپٹے پر سنہری نفیس کام بنا ہوا تھا۔ چوڑی دار پاجامہ کے نیچے اس کے کبوتر پیر سنہری دوپٹی میں دمکتے تھے۔

اس کے بال سیدھے لمبے شہد رنگ تھے بالوں کو ڈرائر نہیں کیا گیا تھا گیلے پن کی نمی اور خوشبو ماحول پر حاوی تھی۔ وہ ناشتے کی پکار پر گیلے بال سنوار کر انہیں پشت پر سیدھا چھوڑ بھاگی آئی تھی۔

اس کی دادی ساس نے اس کے لیے لباس اور جیولری کا چناؤ خود کیا تھا۔ بہت تیز میرون لپ اسٹک میں اس کے ہونٹوں کا قاتل کٹاؤ نمایاں تھا۔

بہت وزنی اور خوب صورت پرانے زمانے کے بڑے بڑے کٹوروں والے جھمکے کان جن کے وزن سے لٹکے جارہے تھے۔

آستین کی لمبائی ہاتھ کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس کے ناخن بے حد نفاست سے ترشے ہوئے تھے جھمکوں ہی کے ڈیزائن کے بہت موٹے کڑے آستین کے اوپر ہی چڑھے ہوئے تھے۔

وہ صوفے پر ٹکی تو موسیٰ نے ہاتھ صوفے کی پشت پر لمبا کرلیا۔ اس کے گیلے بالوں کی نمی اسے اپنے پہلو میں محسوس ہوئی تو اخبار دوسری جانب رکھتے ہوئے اس کے تمام بالوں کو دوسری جانب کندھے پر گرادیا۔

اس کے چہرے پر پھیلے حیا کے رنگ' سرخ پڑتے گال اس کے وجود کو آسمانی بنا رہے تھے۔

"میں نے اتنا بلش کرتی لڑکی اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔" وہ ذرا سا جھک کر آگے ہو کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے جی بھر کے انجوائے کررہا تھا۔ اس نے شہزاد کو اس کی خوبی فخر سے بتائی تھی۔

موسیٰ نے آگے بڑھا کر انڈا اور پراٹھا اس کے سامنے رکھ دیا۔

"نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے ہوں گے ۔ کھانے کو تو یہ سونگھتی ہے۔" عقیلہ بیگم بولتی چلی آرہی تھیں۔ وہ شہزاد کو دیکھ کر بہت دل سے مسکرائی تھیں۔

"بہت دنوں بعد نظر آئیں خیریت۔۔۔!" وہ کبھی

زندگی میں اس کا حال نہ پوچھتیں اس بلا سے ہی تو انہوں نے اپنے سمیع الدین کو بچایا تھا اب یہاں کچھ جتانے کے لیے آئی تھیں۔
شہزاد کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس کے جسم سے سارا لہو نچڑ گیا تھا۔ وہ سفید لاش کی مانند دکھائی دیتی تھی۔
”بس سب اچانک ہو گیا ہنی کے نانا اور میرے دادا بیسٹ فرینڈ ہیں۔“ موسیٰ کی نثار ہوتی نگاہیں۔ بیوی کے چہرے پر تھیں۔
”بہت فکر تھی ہمیں بہو کے حوالے سے....“ عقیلہ یوں شامل ہوئی تھیں جیسے برسوں کی دوستی ہو۔
”کنوؤں میں بانس ڈال دیے مگر بس یہ تو اچانک اللہ کا تحفہ بن کر ملی ہمیں۔ انہیں تو تم نے دیکھا ہو گا حسن الماٰب۔ !موسیٰ کے ساتھ کافی کام کیا ہے ان فیکٹ خوب دوستی ہے۔ شہزاد عیسائی۔“
”دبھئی حسنل کے نانا سادگی کے قائل تھے اور سمیع شادی کو بہت پرسنل میٹر کہتا ہے۔ ہم پانچ چھ لوگ ہی تھے ویری کلوز فرینڈز.... ہاں کل ولیمہ میں سب کو انوائٹ کریں گے۔“
وہ بہت میٹھے انداز میں مسلسل شہزاد کے کھلے زخم پر نمک چھڑک رہی تھیں۔ چیخیں روکے تڑپنا نظر نہ آئے.... شہزاد کے چہرے کے تاثرات بے حد ٹھہرے ہوئے تھے تمام سرجری۔ انجکشن فلرز ناکام ہو گئے.... وہ سو سال کی بڑھیا کی مانند دکھائی دیتی تھی۔



سہگل ہاؤس سے گھر تک شہزاد عیسائی کیسے پہنچی یہ الگ کہانی تھی۔ اور گھر سے کمرے تک اسے یہ بھی یاد آیا اسے میرون رنگ سے نفرت ہو گئی تھی۔ موسیٰ کی بیوی.... جیسے اس نے ہنی پکارا تھا.... اور اس کی دادی نے نجانے کیا نام.... حسن.... حسن.... پتا نہیں مگر وہ حسن ہی تھی جو سہگل ہاؤس میں بکھرا ہوا تھا اور ابھی اخبار کے صفحے پر پھیل گیا تھا۔
تو اب کیا وہ سنہری و آتشیں رنگ کو بھی زندگی سے نکال دے۔
مگر ایسے تو خسارہ اسی کے حصے میں آیا ناں.... اصل رنگ آمیزی تو موسیٰ سے تھی۔ جب وہی نکل گیا تو.... یا آتشیں کیا سنہری اور کیا میرون.... اس کی آنکھ سے بے آواز آنسو جھڑنے لگے۔ اسے بار بار آنکھیں رگڑنا پڑتیں“ آنسوؤں کے باعث موسیٰ کی تصویر دھندلی ہو جاتی تھی۔
اور اسے ایسی پلک جھپکنے سے دور ہو جانے والی ریکلوٹ بھی برداشت نہیں تھی۔ کجا کہ وہ اس سے اتنا دور ہو گیا.... اتنا بھی.... اور ہمیشہ کے لیے بھی.... آہ.... اسے دل مٹھی میں آجانے کا مطلب ابھی ابھی سمجھ میں آیا تھا۔
عمر کے اتنے فرق کے باوجود.... اسے بھی پا نہیں سکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی شہزاد عیسائی نے موسیٰ بدر الدین سے محبت کی تھی۔
اس نے بارہا انگلیوں پر اس فرق کو گنا تھا۔ وہ اس سے اتنے سال اتنے دن اتنے گھنٹے چھوٹا تھا۔ اس نے کتنی بار شکوہ کیا تھا۔ اے اللہ اسے اتنی دیر سے کیوں بھیجا۔ یا پھر میں نے اتنی جلدی دنیا میں آکر کون سا تیر مار لیا۔
لیکن عمر کا فرق کوئی ایسے خاص معنی بھی نہیں رکھتا۔ اگر محبت ہو مگر یہاں چھوٹا سا مسئلہ یہ تھا کہ شہزاد کو محبت تھی۔ اتنی جتنی لہروں کو کنارے سے.... (کنارہ جو صرف چھونے کی اجازت دیتا ہے موسیٰ نے کبھی نہ دی) گیت کو لے سے.... تتلی کو پھول سے....
شہزاد سوچتی جتنی محبت اسے موسیٰ سے ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ اسے دیکھنے کو اس کا دل اڑ پڑتا تھا۔ صبح بیدار ہوتی تو اس کے خیال سے اور رات کو اس کا تصور باندھ کر آنکھیں موندتی تھی۔
مگر وہ اس سے کبھی کہہ نہ سکی۔ اس نے سوچا وہ کسی کے ذریعے کہلوا دے۔ پھر خود پر جی بھر کے ہنسی۔ لو جی محبت نہ ہوئی تعزیتی پیغام ہو گیا۔ جیسے پرانے زمانوں میں نائی پیغام رسانی کرتے تھے۔
اور چلو بالفرض بھیج بھی دے تو کیا.... وہ جواباً“ کہلوا

دیتا میں بھی شہرزاد سے بہت محبت کرتا ہوں' مگر اسے کہنے سننے والی محبت نہیں چاہیے تھی ناں اسے تو اصلی والی پوری محبت درکار تھی۔ اسے پورے کا پورا موسیٰ درکار تھا۔ وہ موسیٰ جو کسی اور کو مل گیا۔

تو ایسی مفت میں بٹنے والی چیز تو نہیں تھا اس کا موسیٰ جو... کسی بھی... اسے ہنی پکارتے وقت موسیٰ کے لہجے میں جو شیرینی... اور محبت تھی ایسے اس نے کبھی شہرزاد کو تو نہ پکارا ہاں وہ اسے شہر کہتا تھا۔ اسے یہی محبت کی انتہا لگنے لگا (وہ شہر ویران ہو گئی۔ موسیٰ نے اس شہر کو بسایا نہیں...)

اسے کبھی کسی نے ایسی لگاوٹ و پیار سے نہیں پکارا تھا۔ اس کے دونوں مردود شوہروں نے بھی نہیں۔ وہ شہر کہتا تھا اور اس کے دل میں پھولوں کی بستی آباد ہو جاتی تھی اور ابھی ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے اسے لگ رہا تھا۔

دل دل نہ رہا قبرستان بن گیا۔ جہاں اب قیامت تک سناٹے بولتے۔

نظر' نظر نہ رہی پتھر ہو گئی اور اسے اب اسی پتھر سے سر پھوڑنا تھا۔

زندگی' زندگی نہ ہوئی' موت سے بدتر ہو گئی۔

بربادی دو مونہے سانپ کی سی تھی اسے موسیٰ نہیں مل سکا۔

اس کے ماتھے پر ڈنک لگتا۔

موسیٰ کسی اور کو مل گیا

ڈنک اس کی گدی میں لگتا

تو وہ کس چیز کا غم زیادہ مناتی؟ اس نے اپنی آنکھیں اپنے ہی ہاتھوں سے خشک کریں۔ (اور اپنے آپ کو چپ کروانے سے بڑی تکلیف اور کوئی نہیں ہوتی)

اس کی نظریں دلہن کے سراپے پر جمی تھیں۔

اس نے پہلے احتیاط سے موسیٰ کی تصویر کو الگ کر لیا۔ باقی کا... اخبار اس کے پیروں میں پڑا تھا اور موسیٰ... اس کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگیں۔

اسے پتا چل گیا تھا۔

اسے موسیٰ کے کسی اور کو مل جانے کا زیادہ دکھ ہوا تھا۔ اس کا نہیں تھا تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ یہ اطمینان کافی تھا' مگر اب محض خیال ہی کہ وہ کسی اور کا ہو چکا۔ اور وہ بھی ایسی محبت والہ فتگی آف۔ شہرزاد کو لگنے لگا جیسے کسی نے اسے کانٹے سے گودا ہو اور پھر نمک مرچ چھڑکی ہو۔

اوہ۔ وہ بے ساختہ چونکی یہ تو اسی کے ایک ڈرامے کا مکالمہ تھا اور وہ بھی بالکل ایسا ہی ڈراما... جس میں اس کا محبوب کسی اور کو مل گیا تھا' مگر ڈرامے میں اس نے موقع پاتے ہی اس دوسری عورت کو زہر دے دیا تھا۔

تو کیا جا کر وہ موسیٰ کی دلہن کو زہر دے دے' مگر کیسے... اس کی سوچیں اس نقطے پر رک گئیں۔

ڈرامے میں تو سلو پوائزنگ کی گئی تھی اور کسی کو شک بھی نہیں ہوا تھا۔ تو کیا وہ ایسا کرے' مگر ڈرامے میں تو وہ "دوست" تھی اس لیے "وار" آسان ثابت ہوا۔ (دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا آسان ہوتا ہے۔ دوست پہلو سے جڑ کر جو رہتا ہے) بے فکر ہوتا ہے۔ بے خطر ہوتا ہے۔ دوستی میں شک نہیں کیا جاتا۔ دوست ہی کے دھوکے کا نوحہ پڑھا جاتا ہے بروٹس یو ٹو... دوستی میں آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ دوستی یقین ہوتا ہے۔ دوستی میں محبت ہوتی ہے۔ محبت ہی تو سانپ کو دودھ پلا کر پالنے پر اکساتی ہے اور محبت کا ہی مزاج جدا ہوتا ہے کسی سے بھی... کبھی بھی کہیں بھی ہو جاتی ہے۔ سانپ سے بھی... تو کیا شہرزاد کو۔ موسیٰ کی بیوی سے بھی دوستی کرنی پڑے گی)

اس کے ذہن سے سارا قصہ محو ہو گیا۔ زندگی خواب خواہش۔ مقصد اسی ایک سوال پر آکر سمٹ گیا۔

اس نے آنسو پونچھ لیے... موسیٰ کی تصویر کو سینے سے لگائے جب وہ اٹھی اور کمرے کی جانب بڑھی تب حسن المآب کی تصویروں والا اخبار پیروں کے نیچے تھا۔



اور جو کچھ صبغہ نے کہا تھا اسے دوبارہ اور سہ بارہ

سننے کے بعد بھی مفتی عبید الرحمٰن نے یقین نہیں کیا تھا، مگر رات حسن المآب اور سمیع الدین المعروف موسیٰ بی کے ولیمہ سے واپسی پر جب جب ان کی نگاہ حسنل کے چہرے پر پڑی تب دوسری نظر صبغہ پر اٹھتی تھی اور وہ بھی ان ہی کو دیکھ رہی ہوتی تھی۔ نظریں ملنے پر آنکھیں کہتیں۔

"میں نے جو کچھ آپ کو بتایا... جو کہ دراصل مجھے حسنل نے خود اپنے منہ سے بتایا تھا وہ غلط نہیں تھا نانا جان۔ وہ صدفی صدی سچ تھا۔ ہے۔ مجسم سچائی ہے آپ دیکھ لیجیے۔"

اور اس جواب کے بعد وہ ایک بار پھر ان دونوں کو دیکھنے لگتے جن کے بارے میں ایک عالم کا خیال تھا وہ ایک دوسرے ہی کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

ولیمہ کی تقریب سے رات دیر گئے واپسی ہوئی سب ایک سانپ سانگھی کیفیت کے زیر اثر تھے۔ ہاں حسنل کی امی کا انداز مطمئن و مسرور تھا۔

اصل پہاڑ صبغہ پر ٹوٹا تھا اور دماغ ایسا سُن ہو گیا کہ اس کے منہ سے وہ نکلا جو ہوش میں رہتے وہ کبھی نہ کہتی اور کہا بھی کس سے مفتی عبید الرحمٰن سے...

اور چونکہ حیرت اب تک برقرار تھی سو اس وقت صبح سویرے جب نانا جان نے اسے بلوا بھیجا تو وہ کسی دکھ، گھبراہٹ و خوف کے عنصر کے بغیر ان کے کتب خانے میں ان کے عین سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ اپنی کرسی میز سے نکال کر کنارے کے قریب رکھ کر بیٹھے تھے۔ کہنی میز پر ٹکی تھی اور نگاہیں آج کے اخبار کے ہوا سے ہلتے اوراق پر تھیں۔

ان کی چائے کے کپ پر جمی تہہ بدرنگی تھی۔

"اوہ" اس کے منجمد احساسات پر ضرب لگی۔ اس کے ہاتھ بے ساختہ اخبار کی سمت بڑھے۔ اخبار اٹھانے سے پہلے ہی اس کے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اخبار پر رکھے پیپرویٹ کا وزن پہاڑ جتنا لگنے لگا۔ یہ حسن المآب اور موسیٰ بی کے دعوت ولیمہ کا فوٹو شوٹ تھا۔ اس نے بلا ارادہ نانا جان کا چہرہ دیکھا۔ اور... وہ اسی کو دیکھ رہے تھے اس نے کرنٹ کھائے انداز سے اخبار چھوڑ دیا۔

مفتی عبید الرحمٰن کی سات نسلوں میں یہ انوکھا واقعہ تھا۔ ان کے خاندان کی لڑکی کے حسن کے جلوے اور قصیدے اس طرح سرعام تھے۔

یہ قیامت سی قیامت تھی اور اب نانا جان کیا کہیں گے۔ اس نے قصداً گردن اس حد تک گھمالی کہ اخبار کا گمان بھی نہ ہو۔

"اس روز کیا ہوا تھا صبغہ؟" نانا جان نے بالکل الگ سوال کیا۔

"کس روز نانا جان؟" اس کی آواز سے اچنبھا عیاں تھا۔

اسی روز جب حسن المآب مزار سے واپسی پر گھر آئی تھی۔ اس نے کیا کہا تھا وہ کیا لینے آئی ہے۔" سوال کے شروع میں وہ سامنے دیوار کو دیکھ رہے تھے، سوال مکمل ہونے پر وہ صبغہ کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بیٹھ گئے۔

"اوہ۔ اور آخر نانا جان کتنی بار یہ سوال پوچھیں گے اور کیا اتی صبح صبح اسے اسی لیے بلایا ہے۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا ناں۔" اس نے کچھ ہچکچا کر جیسے انکار کرنا چاہا۔

"میں دوبارہ سننا چاہتا ہوں بالکل شروع سے..." نانا جان اس کے لہجے کی ہچکچاہٹ کو کسی خاطر میں نہ لائے۔

"شروع سے..." صبغہ نے زیر لب دہرایا۔

بالکل شروع سے... یعنی وہاں سے جب حسن المآب شادی کے بعد اس روز ہوا کے جھونکے کی طرح گھر آئی۔ بڑی سی گاڑی اندر نہیں آئی۔ سب سے پہلے صبغہ ہی نے دیکھا وہ فرنٹ سیٹ سے اتری تھی۔ یعنی ڈرائیور نہیں تھا۔ اس کا شوہر ہی ہو گا، مگر وہ اندر کیوں نہیں آیا۔ باہر کیوں رک گیا۔ انجانے خدشات سے لرزتی وہ حسنل کے پیچھے لپکی۔

اسے گیٹ سے اندر کمرے تک کوئی نہیں ٹکرایا تھا۔ دونوں مامیاں انعمتہ کے ہمراہ محلے میں کسی کی تعزیت کے لیے گئی تھیں۔ امی نہا رہی تھیں۔ بھائی اسکول تھا۔ نانا جان کتب خانے میں تھے اور حسنل

نے بھی کسی کا پوچھا نہیں۔۔۔ وہ بہت عجلت میں تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو حسنل؟"

اتنے روز بعد بہن کو دیکھ کر حال پوچھنے، گلے۔ لگ جانے کی خواہش دم توڑ گئی۔ وہ گردو پیش سے بے نیاز اپنی الماری میں منہ دیے ہوئے تھی اور اس نے ایک ہاتھ مار کے مانو ساری الماری الٹ دی تھی۔ ترتیب سے تہہ شدہ کپڑے اس کے پیروں میں پڑے تھے۔

اس کی آواز پر وہ چونک کر مڑی اور پھر اتنا پیارا مسکرائی کہ صبغہ ٹھٹکتی کی دیکھتی رہ گئی۔

شادی کو کیسے مانی۔ یہ سب کے سامنے تھا۔ نانا جان کی قطعیت کے آگے وہ زیر ہوگئی تھی۔ اللہ جانے انہوں نے کمرے میں بلا کر کیا کہا تھا، مگر نکاح کے وقت تو بس اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر دو حرف کہے تھے۔

"حسن المآب بس۔۔" اور حسن المآب بے بس ہوگئی تھی۔

اس کی عجلت کو اگر کوئی اچانک آکر دیکھتا تو لگتا، چور گھسا ہے اور مال کی تلاش میں سب اجاڑ دینا چاہتا ہے۔ پھر پکارنے پر وہ مسکرائی تھی۔

"تم ایسے اکیلی۔۔۔ کس کے ساتھ آئی ہو اور کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" اسے مطلوبہ شے مل گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی و طمانیت پھیل گئی۔ "اوہ شکر!"

"یہ کیا ہے؟" صبغہ کے پلے کچھ نہ پڑا۔

"یہ۔۔" حسنل شاپر کی گرہ کھول رہی تھی پھر اس نے اس میں موجود جیکٹ نکال لی اور شانوں سے پکڑ کر لہراتے ہوئے محبت پاش نگاہوں سے جیکٹ کو اور پھر ہونق کھڑی صبغہ کو دیکھا۔

"موسیٰ کی جیکٹ لینے آئی تھی۔" اس کے لہجے سے فتح مندی جھلک رہی تھی۔ سرشاری و طمانیت۔۔۔

"کون موسیٰ؟" صبغہ بھونچکی رہ گئی۔

"ہاہ۔" حسنل کھلکھلا کر ہنس دی۔ صبغہ کا دل خراب انجن کی طرح بولنے لگا۔ "تم موسیٰ کو نہیں جانتیں۔" اس نے جیکٹ کو بانہوں میں بھینچ کر سینے سے لگالیا۔

"کون ہے یہ موسیٰ اور یہ جیکٹ یہ تو ماہ رو کے بھائی کی تھی ناں جو تم نے۔" صبغہ نے جیکٹ جھپٹنی چاہی، مگر ناکام رہی۔ حسنل کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔

"اونہہ! کون ماہ رو اور کون سا اس کا بھائی۔ یہ تو ہمیشہ سے موسیٰ کی تھی۔"

اور یہ موسیٰ کون ہے اور اس کی جیکٹ تمہارے پاس کیسے آئی؟"

"ادھر بیٹھو۔ موسیٰ۔ تمہارے دولہا بھائی موسیٰ بدرالدین۔ موسیٰ ہی نام تو سنا ہوگا۔" اس کے لہجے کی شوخی میں پرندوں سی چہچہاہٹ تھی۔

"دولہا بھائی۔ پر ان کا نام تو سمیع الدین تھا۔"

"ان کا نام اب بھی سمیع الدین ہے۔ مگر میرے لیے وہ موسیٰ ہیں ہمیشہ سے۔" وہ ہنوز شوخ تھی۔

"تم ٹھیک نہیں ہو حسنل۔ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔ میں۔ میں امی کو بلاتی ہوں اور تم آئی کس کے ساتھ ہو؟" صبغہ یوں بے چین ہوگئی جیسے جسم میں چونٹیاں رینگنے لگی ہوں۔

"چپکی بیٹھی رہو۔ میں موسیٰ کے ساتھ آئی ہوں اور بس یہ جیکٹ لے جانے کے لیے۔ سمجھیں۔ امی سے پھر ملوں گی۔ ابھی تو مجھے موسیٰ کو ثبوت دینا ہے۔"

"کیسا ثبوت؟" صبغہ کو اس کی دماغی حالت کی خرابی کا یقین ہوگیا تھا۔

"یہی کہ لاشعور سے شعور تک میں نے ان ہی کو چاہا۔ ان ہی کو پانے کے لیے دعائیں کیں اور ان ہی کو۔"

"تم نے دعائیں کیں؟"

"ہاں دن رات، صبح شام ہر وقت، ہر پل اور بالآخر میں نے انہیں پالیا۔"

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا حسنل! خدا کے لیے یہ سب بکواس سمیع بھائی کے سامنے نہ کرنا وہ تمہیں گولی ماردیں گے۔ مرد کبھی برداشت نہیں کرتا کہ۔"

"ارے۔" حسنل ہنس پڑی۔ "میں نے ان سے سچ بولنے کی قسم کھائی تھی اور ثبوت دینے کا کہا تھا

میں تو بس وعدہ پورا کرنے آئی ہوں۔"
"تو تم نے یہ جیکٹ۔ یعنی تم نے یہ جو شخص ہے کیا نام لیا۔ موسیٰ اس کے بارے میں انہیں بتا دیا تھا۔"
صبغہ کو اپنی آواز قبر سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔
"ابھی بتایا نہیں ہے گھر جا کر بتاؤں گی۔ اسی لیے تو جیکٹ لینے آئی ہوں۔" وہ پیار سے اس پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ صبغہ کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ اس نے حسنل کی کلائی دبوچ لی۔
"نہیں حسنل! ایسی بے وقوفی مت کرنا۔ تم ایسی پاگل کیسے ہو سکتی ہو۔ کیوں اپنے راستے میں کانٹے بونے لگی ہو۔ یہ اتنی بھی ضروری چیز نہیں ایسی حماقت مت کرنا۔" صبغہ کے لہجے کی رقت پر ہیجان چھا گیا۔
"میں تمہیں ایسا کرنے بھی نہیں دوں گی۔ لاؤ ادھر دو مجھے۔"
اس نے پورے زور سے جیکٹ کھینچنی چاہی۔
اس نے بہت پیار اور نرمی سے صبغہ کی ٹھوڑی چھوئی۔
"تمہاری فکر مندی بہت اچھی لگی صبغہ۔۔۔ تم مجھ سے واقعی محبت کرتی ہو۔ تمہاری تسلی کے لیے۔ تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اس لیے۔ تمہیں بتا رہی ہوں۔" وہ صبغہ کے چہرے کی طرف جھکی۔
"موسیٰ۔ اور!" اس نے قصداً وقفہ دیا اور بھرپور شرارت سے دیکھا۔ "سمیع الدین ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔"
"کیا مطلب؟" بدقت صبغہ کے لب ہلے۔
"مطلب یہ کہ میری پیاری بہن۔ وہ میرے لاشعور میں بسنے والا آئیڈیل تھا اور پھر ایک روز میں نے اسے مجسم دیکھ لیا اور پھر دعاؤں میں مانگ لیا۔ اور دیکھو اللہ نے میری دعائیں قبول کر لیں۔"
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے حسن المآب۔" صبغہ کے لہجے میں بے بسی تھی اور حسنل کو بہت جلدی تھی۔ گاڑی میں موجود موسیٰ سے وہ دو منٹ کا کہہ کر آئی تھی مگر اسے صبغہ پر ترس آگیا۔
اس نے تفصیل آئندہ پر ڈال کر خلاصے کا ارادہ کیا اور یہ خلاصہ بھی صبغہ کے ہوش اڑانے کو کافی تھا۔
اس نے مختصر ترین الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے بھی بات وہاں سے شروع کی جب موسیٰ بی کی جیکٹ ہوا میں اڑتی اس کے سر پر گری اور بالوں میں اٹک گئی۔۔۔
اور۔۔ اور۔۔۔ پھر۔۔۔ حسنل تو جیکٹ لیے چلی گئی صبغہ پتھرائی رہ گئی۔
"چوکیدار نے کہا، حسن المآب آئی تھی!" مفتی عبیدالرحمٰن اس کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ ہارن کی آواز پر وہ چونکے تھے۔ کچھ لکھ رہے تھے اٹھنا مناسب نہ لگا، مگر اپنے گھر کے دروازے کے زور سے کھلنے اور دھاڑ سے بند ہونے کی آواز پر گھبراہٹ میں قلم چھوٹ گیا۔ اٹھ کر کھڑکی سے دیکھا تو ایک گاڑی ریورس ہو رہی تھی۔ کون آیا تھا اور چلا بھی گیا۔ وہ گاڑی کو پہچانتے نہیں تھے تب چوکیدار سے پوچھا اور اب صبغہ سے۔
"ہاں۔ وہ موسیٰ کی جیکٹ لینے آئی تھی۔" صبغہ اسی ٹرانس میں تھی۔
"ہاں ہاں ٹھیک، مگر تم انہیں روکتیں۔ بات سنو موسیٰ کی جیکٹ۔" وہ چونکے۔ "اس کا یہاں کیا کام۔ اس کی جیکٹ یہاں کیسے آگئی؟" صبغہ کا سر جھٹکے سے اٹھا اور پھر نظریں جھک گئیں۔
"میں تم سے پوچھ رہا ہوں صبغہ۔۔۔ تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو موسیٰ کی جیکٹ۔"
"جی نانا جان! وہ کہتی ہے اس نے دعاؤں میں اسے مانگا تھا اور پا لیا۔"
"کیا؟" نانا جان اس کے سامنے بیٹھ کر اسے دیکھنے لگے۔
"میں صحیح کہہ رہی ہوں اس نے یہی کہا ہے۔ تو دعائیں ایسے بھی قبول ہو جاتی ہیں نانا جان؟"
"ہاں دعائیں ایسے بھی قبول ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ ہمیں اس راستے پر ڈال دیتا ہے، جو اس نے پہلے سے طے کر رکھا ہوتا ہے۔ بس ہم انسان اپنی کم فہمی میں اسے اپنا کارنامہ گردانتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں۔ ہم نے دعا کی، کبھی کہتے ہیں کوشش۔۔۔

"تو آپ کہتے ہیں' حسنل کے دل میں موسیٰ کا خیال۔۔۔" وہ خیال کہتے جھجکی۔ "منجانب اللہ تھا۔"

"ہاں۔۔۔ سب کچھ منجانب اللہ ہی ہے۔" ان کا لہجہ دوٹوک اور ایمان سے لبریز تھا۔ جب ہی تو ہر بار استخارے میں جواب "ہاں" آتا تھا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے نانا جان!" اس کے لہجے میں بے بسی آمیز احتجاج تھا۔ "آپ کو عجیب نہیں لگتا کہ اس نے جو چاہا وہ پانے کے لیے کیسی راہ چنی۔ ورنہ کوئی تصور بھی کر سکتا ہے کہ مفتی عبیدالرحمن کی نواسی کی شادی ایک شوبز والے۔۔۔" اس سے جملہ مکمل نہ ہو سکا۔

"میں سمیع الدین کی ہدایت کے لیے دعا کروں گا۔" وہ مدھم سا مسکرائے۔ انہیں صبغہ پر رحم آرہا تھا۔

"اور دعا تو تب ہی قبول ہوگی جب اللہ نے ہدایت لکھ رکھی ہوگی۔ تو وہ تو پھر دعا کے بغیر بھی مل کر رہے گی۔" اس نے انہیں بہت تیزی سے ٹوکا تھا۔

مفتی صاحب نے تحمل سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہدایت دعا کے بغیر بھی مل کر رہے گی۔ مگر مجھ ہی کو تو دعا کا حکم دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوح محفوظ پر درج ہو۔ فلاں شخص کو ہدایت ملے گی۔ اگر مفتی عبیدالرحمن یا کوئی بھی اور شخص دعا کرے گا۔"

"حسنل اتنی بدقسمت تھی کہ اسے ایسا شوہر ملا؟ میری اتنی نمازی' اللہ پر اتنا گہرا یقین رکھنے والی بہن کا ایسا شوہر۔ آپ کو حیرت نہیں ہوتی؟" "تم اتنی گہری باتوں میں ابھی مت الجھو۔۔۔ اس کے لیے بہت چھوٹی عمر ہے' اللہ کے بھید اللہ ہی جانے' ہاں آج نہیں۔۔۔ کچھ عرصے بعد یقیناً" تم خود سے جاننے لگو گی۔

اللہ علم کو گارے سے بھری تگاری (مستری کی پرات) کی طرح یک دم سر پر نہیں رکھتے کہ بندہ لڑکھڑا کر منہ کے بل جا گرے اور لت پت ہو جائے۔ علم ریشم کے الجھے دھاگے کی طرح بہت احتیاط سے دھیرے دھیرے کھلتا ہے۔

قرآن عظیم بھی ایک رات میں نہیں اتارا گیا۔ چوبیس برس لگ گئے تو تم بھی بے صبری کا مظاہرہ مت کرو۔ کچھ جواب وقت دیتا ہے' سو اسے گزرنے دو۔"

"آپ کو حیرت کیوں نہیں ہو رہی نانا جان؟ حسنل نے ایک ناقابل حصول چیز کی خواہش کی اور اسے دعا بنا ڈالا۔" وہ اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی تھی' بے بسی سے آواز رندھ گئی۔

"حیرت کس لیے' اس نے اللہ سے مانگا۔ اللہ کے لیے کیا کوئی مشکل ہے نعوذباللہ۔"

وہ رسانیت سے بولے' مگر صبغہ پرسکون ہونے کے بجائے مزید چمکی۔

"تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آج کے بعد جس کا جو دل چاہے منہ اٹھا کر مانگ لے کہ اللہ دے دیتا ہے۔"

"میں نے ایسا بھی نہیں کہا' دعا کے لوازمات ہوتے ہیں' شرائط ہوتی ہیں اور وہی چیز دی جاتی ہے' جو ہمارے لیے بہتر ہو۔" مفتی صاحب نے نرم مسکراہٹ سے کہا۔

اس قصے کو فی الوقت لپیٹ دینا بہتر تھا۔ ورنہ دعا پر بحث تو صدیوں سے ہو رہی ہے۔ سائنس کہتی ہے' وہ مریض جلدی صحت یاب ہوتے ہیں جنہیں دوا کے ساتھ دعا بھی دی جاتی ہے۔

"اچھا!" اس نے کچھ جارحانہ پن سے پھڑپھڑاتے اخبار کو اٹھایا۔ "آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں وہی چیز ملتی ہے' جو ہمارے حق میں بہتر ہو' تو پھر اسے آپ کیا کہیں گے؟ یہ بے حیائی تو اللہ کو منظور نہیں ہو سکتی۔"

حسن المآب کی تصاویر سے سجا ورق۔۔۔ صبغہ کی آنکھوں میں غضب ناکی تھی۔ تو اس نے مفتی عبیدالرحمٰن کو لاجواب کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے آج کا اخبار دیکھا ماہ رو۔۔۔!" فون پر دوسری طرف اریبہ تھی۔ اس کے لہجے کی بے قراری سانسوں تک سے عیاں ہوتی تھی' مگر ماہ رو کا دھیان نہیں تھا۔ اس نے بالکل الگ بات کی۔

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں اریبہ۔ تم سے اور حلیمہ سے۔ ابھی اور اسی وقت....."

"تم میرے گھر آجاؤ۔" اریبہ نے کہا۔ "پھر ہم حلیمہ کے گھر چلیں گے۔" اور حلیمہ ان دونوں کو اس طرح اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران تھی۔ خاص طور پر ماہ رو کو۔ یہ وہ ماہ رو تو نہیں تھی جسے وہ چار برس سے جانتی تھیں۔

"خیریت..... تم دونوں اس طرح سے ایک ساتھ؟" حلیمہ کے متعجب چہرے پر خیر مقدمی مسکان تھی۔

"اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" حلیمہ نے خود سے ہاتھ بڑھا کر اخبار کھول لیا۔

اس نے موسیٰ کو پہلی نظر میں پہچان لیا۔ مشہور گلوکار موسیٰ بی اپنی دلہن حسن المآب کے ہمراہ نام پر نظر نہ پڑتی۔ تو وہ حسنل کو تصویر سے کبھی نہ پہچانتی۔ یہی کیفیت اریبہ کی بھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی نام دیکھا تھا اور ان سب کا پکا یقین تھا۔ دنیا میں حسن المآب نام کی ایک ہی لڑکی ہے۔ ان کی دوست حسنل۔

"یہ سب کیسے ہوگیا؟" وہ ششدر تھی۔

"ہم تو تم سے پوچھنے آئے ہیں۔ یہ سب کیسے ہوگیا حلیمہ؟" اریبہ بولی۔

"مجھ سے..." حلیمہ نے انگشت شہادت اپنے سینے پر رکھی۔ "مجھ سے کیوں.....؟"

"تم ایک دوسرے کے پڑوسی ہو۔ بہت اچھے گھریلو تعلقات ہیں۔ تمہارے ابو کی تو بہت دوستی ہے حسنل کے نانا سے۔ بلکہ تمہاری امی کی حسنل کی امی سے بھی..... ایسی اچانک شادی پر تو سوال اٹھتے ہیں۔" اریبہ کو حلیمہ کی لاعلمی نے سخت بدمزہ کردیا تھا۔ حلیمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر میں امی کے ساتھ ملتان گئی ہوئی تھی۔"

"تو تم بعد میں چلی جاتیں۔ کچھ تو معلومات ملتیں۔ تم بھی صبر کر کے بیٹھ گئیں۔" اریبہ نے نیا اعتراض جڑ دیا۔

"میں گئی تھی۔ حسنل کی ماموں نے یوں گھور کے دیکھا جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔ اس کی امی سو رہی تھیں۔ صبغہ نے مروت نبھائی۔ مگر وہ یوں چپ بیٹھی تھی جیسے سوئم کی تعزیت کرنے والوں سے ایک لفظ بولنے کو دل نہیں کرتا۔ میں خود ہی اٹھ کر آگئی۔" حلیمہ کے لہجے میں خجالت تھی۔ وہ یک دم خاموش ہوگئی اور اخبار پر نظریں گاڑ دیں۔

"تم کچھ نہیں بول رہیں ماہ رو؟" اریبہ کو اس کی مسلسل خاموشی نے چونکایا۔ وہ یوں اچھلی جیسے چاقو کی نوک چبھوئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی و وحشت کی کیفیت تھی۔ "تم نے دیکھا اخبار۔" حلیمہ نے صفحہ اس کے روبرو کردیا۔ مگر ماہ رو نے نظر نہ ڈالی۔ وہ ان دونوں کی شکلیں باری باری دیکھ رہی تھی۔

"دیکھو حسنل کی شادی موسیٰ سے ہوگئی۔" اس کے لہجے کے تحیر میں رتی بھر کمی نہیں آئی تھی۔

ماہ رو کا سر نفی میں ہلا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے ماہ رو....." اریبہ اب سچ مچ حسنل کو بھول کر ماہ رو کی فکر میں پڑی تھی۔ حلیمہ بھی متوجہ ہوگئی۔ یہ وہ پیاری ماہ رو تو نہیں تھی۔

"میں نے رات حسنل اور موسیٰ کے ولیمے میں شرکت کی تھی۔" اس نے وہ کہا جس نے اسے صبح صبح بھگا دیا تھا۔

"کیا....؟" اریبہ و حلیمہ کی چیخ بے ساختہ تھی۔

ماہ رو نے ولیمے میں شرکت کی۔ یہ ان دونوں کی شادی ہو جانے سے بھی بڑا اچنبھا تھا گویا۔ اس نے بھلا۔ کس طرح... کیا حسنل نے صرف اسے یعنی ماہ رو کو مدعو کیا اور حلیمہ و اریبہ کو نہیں... دونوں کو بڑی ہتک آمیز حیرانی نے گھیر لیا۔ اور یہ ماہ رو نہ جانے کون سا قصہ بتانے لگی تھی۔ انہیں دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے لیے ماہ رو کی حالت بھی حیرانی تھی۔ آندھی، طوفان، خوشی غمی... ماہ رو فیاض تو ایسی نظر نہیں آتی تھی، اسے ہوا کیا تھا۔ مگر پھر کچھ دیر انہیں ماہ رو کے قصے میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ اتنی کہ بیڈ کے بیچ سجے دسترخوان کے لوازمات کو انہوں نے چھوا تک نہیں۔ ہاں بس ماہ رو

تھی جو چند منٹ بعد پانی کا گلاس بھرتی تھی اور آج کا دن کیا انکشافات کا تھا۔ ماہ رو نے جتایا۔ "اس کے لیے موسیٰ جس کا اصل نام سمیع الدین ہے کا رشتہ آیا تھا۔"

"کیا؟" ان دونوں کی چیخوں نے ان کے گلوں میں خراشیں ڈال دیں۔

"اور اس نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں؟" انہیں کسی صورت یقین نہیں کرنا تھا۔

ماہ رو کا قصہ بے ربط تھا۔ وہ جیسے ان دونوں کو سنا نہیں رہی تھی۔ خود کلامی میں تھی۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ رشتہ آگیا تھا کہ ماہ رو کی دادی اور موسیٰ کی دادی آپس میں کزن تھیں لیکن انہیں صرف یہ جاننا تھا کہ ماننے والی سادہ بات تھی۔ ماہ رو نے انکار کر دیا' کیوں۔۔۔ کیا اس لیے کہ وہ جانتی تھی حسنل 'موسیٰ کو چاہتی تھی۔ کیا ماہ رو نے قربانی دی اور اب پچھتا رہی ہے۔

اس کو آج ہوا کیا تھا کہ ایک جملے میں لفظ کم تھے اور ہچکیاں زیادہ۔۔۔

"نہیں۔ انکار تو میں نے خود کیا تھا۔ مجھے انکار کا تو دکھ نہیں۔ انکار پر تو میں آج بھی قائم ہوں ہمیشہ رہوں گی۔ بات اصول کی ہے۔ بات نظریہ کی ہے۔ مجھے کبھی بھی "ہاں" نہیں کرنی تھی۔ تب بھی جب وہ سمیع الدین بن کر آیا۔ تب بھی جب میں نے شاپنگ مال میں جان لیا کہ وہ موسیٰ ہے۔۔۔ مجھے۔۔۔"

اس نے کسی صحرا نورد کی طرح اب جگ کو منہ لگا لیا تھا۔ بے تابی نے تکلفات کو بھلا دیا۔ نہ جانے کیسی پیاس تھی۔

"تو پھر ایسے کیوں روتی ہو میری جان؟" اریبہ کا دل موم ہو گیا۔ "تم اتنا پانی کیوں پی رہی ہو ماہ رو۔۔۔ اور تم نے ناشتا کیا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ لو۔۔۔ تم یہ سینڈوچ کھاؤ۔"

"نہیں۔۔۔ نہ مجھے بھوک ہے' نہ پیاس۔" اس نے سختی سے اریبہ کو دھکیل دیا اور پانی کا گھونٹ بھرا' کچھ بیڈ پر چھلکا' کچھ باچھوں سے گر کر گریبان کو بھگو گیا۔

"چھوڑو' جب تم نے خود انکار کیا تو اب رونا کس بات کا۔۔۔ ہے نا حلیمہ؟"

حلیمہ نے خالی نگاہیں اٹھائیں۔ ان میں ترحم تھا' پھر اثبات میں سر ہل گیا۔

"لب حسنل جانے اور اس کا موسیٰ۔۔۔ ہم یہاں سانس روکے بیٹھے ہیں۔ وہ تو شادیانے بجا رہی ہو گی۔ آخر کو اس کی دعا جو پوری ہو گئی۔ من کی مراد مل گئی اسے تو۔۔۔" حلیمہ نے بولنا شروع کیا' تاکہ اس قصے کو یہیں تمام کیا جائے۔

اسے سب کی سن کر پھر اپنی رائے دینے کی عادت تھی۔ مگر اس کے جملے ادھورے رہ گئے۔ ہانپتی ماہ رو نے جیسے دوبارہ جان پکڑی تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی' وہ کہنا کیا چاہتی ہے' تو حلیمہ کے جملے نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"تو تم یہ کہتی ہو اللہ نے حسنل کی دعا سن لی۔" وہ حلیمہ کے دوبدو ہو گئی۔ "اللہ دعا سنتا ہے ماہ رو!"

حلیمہ نے اس کی وحشت کے جواب میں قصداً رسانیت اختیار کی۔

"تو کیا خدا نہیں سنتا۔ وہ بڑبڑائی تھی۔" "ارے۔۔۔" حلیمہ نے بھنویں سکیڑیں' بولی تو لہجہ مربیانہ تھا۔ "اللہ اور خدا میں کیا فرق بھلا۔۔۔"

اریبہ نے آگے ہو کر ماہ رو کا چہرہ دیکھا۔ اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔

"ہے فرق۔۔۔!" ماہ رو نے جھٹکے سے سر اٹھا کر مدلل انداز میں کہا۔ "اللہ وہ جسے دادی پکارتی ہیں اور خدا وہ ہے جو نانا' نانی کا ہے۔ حسنل نے تو اللہ سے دعا مانگی تھی نا۔ میں زندگی بھر یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے کس سے دعا مانگنی چاہیے۔ اللہ سے یا خدا سے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو ماہ رو۔" حلیمہ کی لہجے سے درشتی ٹپکنے لگی۔ اسے لگا ماہ رو کا دماغ الٹ گیا ہے۔

"پتا ہے کامیاب اور مکمل لوگ وہ ہوتے ہیں جو قائم رہتے ہیں۔ سچ پر یا جھوٹ پر۔۔۔ میں نے تو ساری زندگی جیسے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر گزاری' ڈولتے لڑکھڑاتے۔۔۔ نانا جان' نانی اور فاری خالہ کہتی ہیں' خدا سنتا ہے' ان دونوں نے نانا جان کے لیے مدد (دعا) کی تھی۔ جب ہی تو وہ صحت یاب ہو گئے۔ ورنہ ڈاکٹرز نے

تو انہیں محض چند ماہ دیے تھے اور وہ آج بھی زندہ ہیں اور دادی کہتی ہیں۔ اللہ سنتا ہے۔ ان کے پاس بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ پر میں نے پہلی بار جیسے اللہ کے حضور مانگی جانے والی دعا قبول ہوتے دیکھی ہے۔ طے ہوا اللہ سنتا ہے۔ مسز ثمینہ انجم نے کہا تھا۔ اللہ رب المسلمین نہیں "اللہ رب العالمین ہے تو پھر خدا کون ہے۔ کیوں ہے۔ میں زندگی بھر پنڈولم رہی حلیمہ.....

اور اسی لیے میں نے سمیع الدین کے رشتے سے انکار کردیا۔ میں ایسے کسی انسان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی جو قائم نہ ہو۔ پنڈولم ہوا اور امی نے کہا۔ یہ سب میرے محسوسات ہیں اور دادی نے کہا۔ کچھ نہیں ہوتا' جبکہ دادی اور امی ہی کی وجہ سے ہے تو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے آنسوؤں کو رگڑا۔

"دادی اور امی نے کیا کیا؟" اریبہ کے منہ سے بلا ارادہ نکلا۔

"دادی اور امی ہی نے تو..." اس کے آنسو پھر سے بہنے لگے۔ اریبہ کو کچھ پلے نہیں پڑا تھا' اس نے مدد طلب نظروں سے حلیمہ کو دیکھا اور پھر اس کا رنگ فق ہوگیا۔ یہ حلیمہ کو کیا ہوگیا تھا۔

یہ تو کوئی اور چہرہ تھا۔ جس میں اجنبیت تھی اور حلیمی کا فقدان تھا۔ اس کی آنکھوں میں تاثر تھا' نفرت کا تاثر... پر کیوں...

"تم وہی کہہ رہی ہو نا ماہ رو! جو میں سمجھ رہی ہوں۔" حلیمہ نے انگشت شہادت ماہ رو کی سمت اٹھائی اور یہ سوال نہیں تھا۔ تصدیق کی ضرورت رسمی تھی۔ وہ سب کچھ جان گئی تھی۔

"تم کیا سمجھی ہو حلیمہ؟" ماہ رو کا لہجہ ریزہ ریزہ تھا۔ "جبکہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔"

اسے ماہ رو کے حال کی ذرا برابر پروا نہ رہی۔ "تو بہت عرصہ پہلے تم نے جس پادری کا ذکر کیا تھا۔ وہ تمہارے نانا' نانی کے خدا کا پیروکار تھا۔" اس کا لہجہ بھی زہر آلود تھا۔

"کون پادری؟" بیڈ پر چڑھ کر بیٹھی' اریبہ سراسیمگی کے عالم میں اتر آئی۔ "تم کیا بات کہہ رہی ہو حلیمہ! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ تمہاری سمجھ میں آرہا ہے ماہ رو..." اور ماہ رو اپنی بپتا بھول کر استعجاب سے حلیمہ کو دیکھنے لگی تھی۔ جو ایک سفاک تفتیشی افسر لگتی تھی اور کوئی بھی... کوئی بھی حربہ استعمال کرکے سچ اگلوانے کا عہد کر آئی تھی۔

ماہ رو کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی ابھری۔ "ہاں! تم ٹھیک سمجھی ہو' وہ پادری میرے نانا' نانی کے مذہبی پیشوا ہیں۔ مگر... میں مسلم ہوں۔ میرے پاپا..."

"تم چار سال تک ہم سے جھوٹ بولتی رہیں۔" حلیمہ نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔ اس کا لہجہ روکھا۔ حلیمہ کی نظریں تیزی سے دسترخوان پر گئیں۔ اوندھا جگ اور گلاس..."

"تو اس سے کیا ہوتا ہے حلیمہ...؟" اریبہ کا سوال سادہ اور لہجہ متعجب تھا۔

"تمہیں نہیں پتا لگ رہا' اس سے کیا ہوتا ہے؟" حلیمہ نے سخت حیرت سے الٹا سوال جڑ دیا۔ اسے اریبہ کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا' جبکہ دماغ تو درحقیقت حلیمہ بی بی کا خراب تھا۔ بہت خراب' اس سیم کھائی زمین جیسا جہاں کبھی فصل نہیں اگتی۔ جھاڑ بھی نہیں لگتا۔ ایک جرم ہوتا ہے 'غلط کام کرنا' پر اس سے بڑا جرم ہوتا ہے غلط کا ادراک نہ رکھنا۔ اسے غلط سمجھنا ہی نہیں' اور یہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ آپ غلط کو صحیح کہیں اور ساری دنیا کو تہس نہس کردیں اور پیچھے کچھ نہ بچے۔

جیسے ابھی ماہ رو ختم ہوگئی تھی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ حلیمہ کے بستر سے اٹھ جاتی۔ جو حلیمہ کے خیال میں گندا ہوچکا تھا۔ اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ وہ حلیمہ کو پلکیں جھپکائے بنا دیکھ رہی تھی اور یہ اس لیے کہ پلک جھپکتی تو وہ لبریز آنکھیں چھلک پڑتیں۔

رات حسن المآب اور موسیٰ کو اکٹھا دیکھ کر اسے یقین آگیا تھا۔ اللہ دعائیں سنتا ہے۔ اللہ... ایک اللہ وہ اللہ جنہیں خدیجہ بانو مانتی تھیں اور حلیمہ اور سب لوگ... مانتی تو وہ بھی تھی' مگر وہ اللہ اور خدا کے بیچ

پنڈولم رہی۔ (آپ نے کبھی پنڈولم دیکھا ہے؟) تو وہ حلیمہ کو بتانے آئی تھی کہ اس نے پالیا۔ اس نے جان لیا کہ صرف اللہ ہے جو دعا سنتا ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اسے اللہ کے وحدہ لاشریک ہونے پر کبھی شک نہیں تھا۔ مگر وہ کیا کرتی کہ وہ پنڈولم رہی اور اب جب قائم ہوئی تو... حلیمہ نے پیروں سے زمین کھینچ لی۔ تو اللہ تو سنتا ہے۔ مگر اس کے بندے... وہ نہیں سنتے۔ وہ اس کی پوری بات تو سنتی۔

اور یہی سب زندگی بھر خدیجہ بانو نے کیا تھا ماریہ کے ساتھ... تو اللہ تو اپنا لیتا ہے۔ ایک قدم آنے والے کی طرف، ستر قدم بڑھ کر آتا ہے۔ مگر بندے نہیں اپناتے۔ جیسے اس وقت حلیمہ نے اسے دھتکار دیا تھا۔

اس نے اپنی پوری زندگی دو مذاہب کی تعلیمات کو قولاً "عملاً" دیکھا سنا تھا۔ اور دونوں مذہب انسانیت کی تعلیم دیتے تھے اور انسانیت کہتی ہے۔ انسان دھتکارے جانے والی چیز ہے ہی نہیں۔ حلیمہ مذہبی شدت پسندی کی طرف مائل تھی۔ اس کے حواس کام کرتے ہوتے تو وہ اس سے بس یہی پوچھتی۔ اسلام ایسے تو نہیں پھیلا تھا۔ وہ اسے انصار مدینہ کا واقعہ سناتی۔

حسین المآب نے تین تین اسلامیات اس لیے پڑھی تھیں کہ پراسپکٹس نانا جان نے بھرا تھا۔ ماہ رو فیاض عرف میری عرف میرو نے اس لیے پڑھی تھیں کہ اسے دین جاننا تھا۔ مگر نوے فیصد نمبر لینے کے باوجود اسے دین سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ہاں جب رات حسنل، موتی کو اکٹھے دیکھا تو اسے دین بھی سمجھ میں آگیا اور اللہ بھی... مگر حلیمہ نے کیا کیا۔

ماہ رو یک ٹک حلیمہ کا غضب ناک چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا بیگ پکڑ لیا۔ وہ اٹھی تو اس نے ایسا چکر کھایا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آیا۔ اریبہ خود صدمے سے شل تھی اور حلیمہ نے کیا کیا۔ اس نے انسانیت سے گر کے ماہ رو فیاض سے دونوں کو چھین لیا۔

اللہ کو بھی اور خدا کو بھی... کیوں یہی کیا تھا نا حلیمہ نے اور اریبہ کے پکارنے اور پیچھے آنے تک وہ نکل کر کہاں سے کہاں پہنچی تھی۔ سن 99ء کی اس دوپہر غالب لائبریری کے سامنے چوک پر کھڑی وہ لڑکی ماہ رو فیاض تھی۔ جسے لاکھ ذہن پر زور دینے پر یاد نہیں آرہا تھا کہ اس کے گھر کی طرف کون سی بس جاتی ہے۔

آپ نے تو دیکھی ہوگی۔ اجڑی پجڑی ہراساں... مخبوط الحواس نظر آئی، جسے دیکھ کر بہت سے لوگ چونکے تھے۔ کیا آپ چونکی تھیں۔ وہ ماہ رو فیاض تھی بھئی۔ آپ کو تو رکنا چاہیے تھا۔ وہ ماہ رو جو نیلا لائنو لگاتی تھی اور کہنی تک گول چوکور چوڑیاں پہنتی تھی۔ جو ہنستی تھی اور ہر مشکل کو چٹکیوں سے اڑایا کرتی تھی۔ وہی ماہ رو... آپ کو... اسے دلاسا دینا چاہیے۔ اسے ضرورت تھی۔ سہارا دینا چاہیے۔ اسے ضرورت تھی۔ اسے بتانا تھا۔ یہ تو بس حلیمہ تھی اور اس کی شدت پسندی۔ سب اس جیسے نہیں ہوتے، نہ آپ ہیں، نہ میں ہوں۔ اسلام تو دل کو بڑا کر لینے کا نام ہے۔ اپنا لینے کا نام ہے۔

دین تو وہ ہے جو غیر مسلم ایذا پسند بڑھیا کی عیادت کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ تو آپ کو بتانا تھا پیاری ماہ رو دل برداشتہ مت ہو۔ وہ تو بس ایک ہی حلیمہ تھی یا اس جیسے چند اور ہوں گے، مگر باقی سب ایسے نہیں ہیں۔

اسلام تفریق مٹا دینے کا نام ہے۔ عربی کو عجمی پر... اور عجمی کو عربی پر... اور بنیاد تو بس تقویٰ ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ اور کس کا۔

تو اس وقت ضرورت تھی کہ ماہ رو کو گلے لگا لیا جاتا۔ پیشانی پر بوسا دیا جاتا اور کہا جاتا کہ دل چھوٹا مت کرو۔

یہ تو حلیمہ جیسے لوگ ہیں جو چند ہیں۔ یا خدیجہ بانو جیسے۔ (جو غلط پر کاربند ہوتے ہیں اور ترویج کرتے ہیں۔)

ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو اپنے دستر خوان پر کسی کو مہمان کیے بغیر کھانا تناول ہی نہ

فرماتے تھے۔ اور ایک روز ایک اجنبی نے اللہ کا نام لیے بغیر کھانا شروع کردیا تو آپ نے اسے دسترخوان سے اٹھ جانے کو کہا' تب اللہ نے کہا۔

"اے ابراہیم! اس نے کبھی ہمارا نام نہیں لیا اور ہم زندگی بھر اسے رزق دیتے رہے۔ تم نے ایک دن کی میزبانی میں اٹھ جانے کا کہہ دیا۔" اور ابراہیم علیہ السلام معذرت طلب کرتے بھاگے بھاگے اسے واپس لائے اور شریک طعام کردیا۔

تو حلیمہ نے یہ واقعہ پڑھا نہیں ہوگا' یا پھر سمجھا نہیں ہوگا' جب ہی تو.... دراصل حلیمہ جیسے چند لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اللہ کو جانتے ہیں۔ مگر وہ بس اللہ کے نام سے واقف ہوتے۔ مجذوبوں کی طرح سر ہلا ہلا کر اللہ ہو اللہ ہو کہنے سے اللہ نہیں ملتا۔ نہ آپ اللہ والے ہوجاتے ہیں۔ اللہ والا ہونے کے لیے اس کی مخلوق سے محبت کرنی پڑتی ہے۔ اور یہیں حلیمہ سے چوک ہوگئی' اس نے شاید ابو بن ادھم کی نظم بھی نہیں پڑھی تھی' یا رٹا لگانے کو یاد کی ہوگی۔

تو 1999ء کی اس دوپہر غالب لائبریری کے سامنے کھڑی وہ لڑکی ماہ رو فیاض تھی۔ جسے کوئی نہ ملا۔ اللہ جانے گھر تک کیسے پہنچی ہوگی اور گھر جاکر کون سا سکون ملا۔

وہاں ایک نئی کہانی تھی۔ کیسی کہانی بھلا؟ تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے جیسی۔ وہ زلزلے جیسا دن تھا۔ پہلے بنیادیں ہلیں' شام تک ساری عمارت زمین بوس ہوگئی۔ آفٹر شاکس زلزلے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

انسپکٹر رام ناتھ نے اپنی شرٹ اتار کر کرسی کی پشت سے لٹکا رکھی تھی۔ وہ پوری دل جمعی سے کھانا کھا رہا تھا۔

مذہبی و معاشرتی چلن اور احکامات کے مطابق اسے صرف سبزی کھانی چاہیے تھی۔ گوشت سے دور کا علاقہ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مگر وہ زندگی کے ہر میدان میں اپنی من مانی کا عادی ہوچکا تھا۔ سو تمام منع کی ہوئی باتوں اور احکامات کو ڈنکے کی چوٹ پر کرتا۔

اسی لیے وہ اس وقت دیسی مرغے کی ہڈیاں تک نگل جانا چاہتا تھا۔ اس ویران تھانے میں اس پر آنکھ رکھنے والا کوئی مائی کا لال نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنی ذمے داریاں کانسٹیبل ہری اوم کے حوالے کرکے' من بہلانے نہ جانے کہاں کہاں سفر کرتا۔

زندگی بے حد بے کار' پھیکی' ٹھنڈی اور بے رنگ ہوچکی تھی۔ وہ جرا" پل بھر کی ترنگ پیدا کیا کرتا تھا۔

خبری شنکر (مخبر) جرائم کی بیخ کنی کے لیے کیسے کچھ کھوج لگاتا' جبکہ اسے صرف اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے الرٹ رہ کر انسپکٹر رام ناتھ کے بے کار اداس پلوں کو رنگین بنانے کا سبب ڈھونڈے۔

سو یہ گزشتہ اڑتالیس گھنٹے شنکر ہی کی مختلف و مشقت کے بل پر نامی گرامی بیسوا مالتی کے چرنوں میں گزار کر آیا تھا۔

مالتی میں وہ مزا کب تھا جو ممبئی کی بار ڈانسرز کی گرم جوشی سے ملا کرتا تھا۔

تھوڑے کو بہت جان کر وہ اس پر اکتفا کرتو لیتا تھا' مگر ممبئی کی یاد اسے پاگل کردیتی۔

مگر اس بار اس نے بڑی مچھلی سے بڑا پنگا لیا تھا۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر پالنے والا یا تو جگہ چھوڑ کر بھاگے گا یا مگرمچھ کے لیے تر نوالہ ثابت ہوگا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق۔

سی ایم پرشاد باجپائی نے اس کی جان بخشی کردی تھی۔ اور اس وقت وہ دیا (مہربانی) پر حیران خوشی خوشی اس چھوٹی سزا پر راضی برضا ہوا تھا' مگر اس ویران راجستھانی سرحدی پٹی کے چھوٹے سے گاؤں میں قدم رکھتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ یہ زیادہ بھیانک سزا تھی۔ اور سال ہونے کو آیا تھا اسے سب پتا لگ گیا۔ ایسی زندگی سے موت بھلی ہوتی۔ وہ منہ بھر بھر کے سی ایم پرشاد باجپائی کو گالیاں دیتا۔

وہ ایک سے ایک زبردست پلان بناتا۔

مگر ہوش میں آتے ہی بے پر کے کبوتر کی طرح پھڑپھڑا جاتا۔ اس نے اپنے تمام کانٹیکٹ استعمال کر کے دیکھ لیے، معافی تلافی توبہ سب۔۔۔ مگر سی ایم کا دل موم نہ ہوا۔

سی ایم پرشاد باجپائی اور انسپکٹر رام ناتھ یکساں شوق رکھنے والے دو قطعاً "انجان افراد" تھے۔ پینے اور جینے کے اس شوق نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ بظاہر افسر ماتحت کا رشتہ، سلیوٹ کے ساتھ "یس سر" کہنے کا تھا۔ مگر اندر خانے "نوالہ ہم پیالہ" والا قصہ تھا۔ یہاں مل بانٹ کر کھانے کا رواج تھا۔ مگر رام ناتھ کے حصے میں ہمیشہ ریجیکٹ اور بچا کھچا مال آتا۔ سی ایم کے چمچے اور منظور نظر سب سے اچھے اور بہترین مال کی چھانٹی کرتے۔

تلاش، ترسیل، نگرانی سب رام ناتھ کی محنت۔۔۔ ان بے غیرت کالی بھیڑوں کے درمیان کچھ ایک، دو ایمان دار سب کے لیے ہر حوالے سے خطرہ ہوتے۔ ان کی نظروں سے بچ کر رہنا اور ان کا منہ بند رکھنے کا سارا کشٹ رام ناتھ کا اور۔۔۔

وہ۔۔۔ بس بی فاختہ اور انڈے چیلیں کھائیں۔

نہیں۔۔۔ وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔ مگر۔۔۔ کیا۔۔۔ کیسے۔۔۔ کیوں کر۔

عورتوں کی اسمگلنگ کرنے والی ایک لانچ کو پکڑنا رام ناتھ کا کارنامہ تھا۔ اس نے خوب واہ واہ سمیٹی۔ اب سو فیصد ترقی کے چانس تھے۔۔۔ مگر۔۔۔ ملک کے طول و عرض سے اکٹھی کی جانے والی لڑکیاں اور عورتیں اب بے گھر تھیں، اس لیے انہیں اناتھ آشرم بھیج دیا گیا۔

لیکن وہ تمام بے خبر آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکی تھیں۔

پکڑی اور اناتھ آشرم بھیجی جانے والی لڑکیوں کی تعداد میں فرق تھا۔ ان سب کی گنتی کے دوران ہی انہیں بہت سوں نے چن لیا تھا۔

خبر میڈیا میں گرم تھی۔ سو ٹھنڈا کر کے کھانے کا انتظار کرنا تھا۔ لیکن اناؤ لے ہوئے رام ناتھ نے گندمی رنگت اور تیکھے نقوش ساحر آنکھوں والی سولہ برس کی مینا کے لیے تمام احتیاط بالائے طاق رکھ دی۔

یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔

اپنے گھر پریوار سے چھپ کر بنائے جانے والے فلیٹ میں مینا کو منتقل کر دیا گیا۔ لیکن۔۔۔

رام ناتھ کے سر پر بم پھوٹا۔ سی ایم پرشاد باجپائی، مینا کو دیکھتے ہی پاگل ہو چکا تھا۔ وہ گنجا کالا پچپن برس کا سور نما شخص تھا۔

یوں لگتا اگر دھرتی پر کوئی صحیح معنوں میں عورت اتاری گئی تو وہ ایک مینا ہی ہے۔

ملک میں کرپشن کا ایک کیس موبائل ریکارڈنگ کے ثبوتوں کے ساتھ زبان زد عام تھا۔ سی ایم کی پارٹی کے بڑے نام پھندے میں کسے جا رہے تھے۔ پارٹی ہیڈ کی جانب سے سخت احتیاط کی ہدایت تھی۔

سب لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ ایسے میں پرشاد باجپائی بے حد محتاط تھا۔ اس کے پاس پورا پلان تھا۔

کرپشن کا معاملہ ٹھنڈا ہو گا تو وہ چھٹی لے گا۔ ممبئی سے دور ندی اور ہرے بھرے جنگل کے بیچ اس کا ایک ہٹ ہے، وہ وہاں جائے گا اور مینا اس کے ساتھ ہو گی۔

مینا کا تصور اسے ہوش سے بے گانہ رکھتا۔

اور پریوار کے لوگ شبھ چنتک (خیر خواہ) کرپشن کیس کی ٹینشن سے تعبیر کرتے رہے۔

اس نے مینا کو ہمراہ لے جانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ مگر مینا غائب تھی۔ شیر کے منہ سے نوالہ کس نے چھینا۔ کس کے باپ میں اتنی ہمت۔۔۔ اس۔

وہ ایسی حرکت کرنے والے کو چیر دے گا۔ پھاڑ دے گا۔

سالا اتنی ہمت والا کون پیدا ہو گیا، رام قسم۔۔۔ اسے۔۔۔

اس نے رام کی قسم کھائی اور آگے رام ناتھ تھا۔

سی ایم نے رات کی خاموشی میں فلیٹ پر چھاپہ مارا،

وہاں مینا موجود تھی۔ مگر یہ وہ ان چھوئی کلی جیسی مینا تو نہیں تھی۔ یہ تو ایک مسلی، کچلی عورت تھی۔

سی ایم کے غنڈوں نے رام ناتھ کو لمتا پیا کہ مرنے کا گمان ہونے لگا۔ سی ایم اس کے خلاف سخت عزائم رکھتا تھا۔ مگر آپ کے تمام رازوں کا امین دوست جب دشمن بن جائے تو کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

سانپ کو خواہ دودھ پلایا ہو۔ دم پر پیر رکھو تو وہ پلٹ کر ڈنک مارے گا۔ وہ رام ناتھ کا ایک راز کھولتا۔

تو اس ایک گرہ سے سی ایم کے اپنے رازوں کی پوٹلی کھل جاتی۔ اس نے مینا کو گولی ماری اور انسپکٹر رام ناتھ کا تبادلہ ہر لحاظ سے ایک مختلف علاقے میں کروا دیا۔

رام ناتھ کو اپنی بہت بڑی غلطی کے لیے یہ سزا بہت چھوٹی لگی تھی۔ لیکن... بالکل الگ موسم... ماحول... سرحدی گاؤں... گنتی کے چند گز... اسے ریت پر چلنا نہیں آتا تھا۔ یہاں کے دن کی گرمی... اور رات کی سردی... اور جھگڑا اور پانی کی بے حد کمی اور بجلی کا کم ترین وولٹیج موبائل سگنل نہ ہونا گھر والوں سے دوری...

اور سب سے بڑھ کر تمام عیاشیوں سے کنارہ... یہاں بیخ کنی کے لیے کوئی جرم نہیں تھے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے بل پر ترقی پا کر آگے بڑھتا۔ لڑکیاں گھروں سے نہیں بھاگتی تھی۔ بارہ بارہ برس میں بیاہی جاتیں۔ چوری کے نام پر کوئی جرم نہیں۔ جانور گم جائے تو کھوجی کے ساتھ مل کر مالک شام سے پہلے زندہ یا مردہ خود ہی لے آتا۔

جھگڑے کا فیصلہ پنچایت کرتی۔ سارے مسئلے سرپنچ (پنچایت کے سربراہ) خود ہی حل کرتے۔

سرحدی علاقہ تھا۔ انڈین اور پاکستانی فوج کی چوکیاں تھیں۔ سخت پہرہ۔ کسی بھی قسم کی اسمگلنگ کم از کم اس روٹ سے نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر روز نئے عزم سے جیپ پر گشت کے لیے نکلتا، مگر گز بھر کا گھونگھٹ گرائے ہر عمر کی عورتیں... کم آبادی... وہ کیسے اپنے شوق پورے کرتا۔ اس تبادلے نے اس کی زندگی سے تمام رونقیں چھین لی تھیں۔

سی ایم پرشاد کی حکومت کو ابھی ڈیڑھ سال اور رہنا تھا اور رام ناتھ ڈیڑھ گھنٹے بھی یہاں رہنا موت سمجھتا تھا۔ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن... نہیں... اب...؟

اب تو سی ایم کا باپ بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔ اسے جس اچھے پل کا انتظار تھا جس سنہری موقع کا وہ منتظر تھا، وہ گھڑی آچکی تھی۔

خبری شنکر کی مہربانی سے وہ بیسوا مالتی سے طویل ملاقات کے بعد جب لوٹا تو کانسٹیبل ہری اوم اسے تھانے کی حدود سے باہر پریشانی کے عالم میں ٹہلتا مل گیا۔

"میری پتنی کے بچہ ہونے والا ہے۔ کب سے ہجور کا انتجار کروں ہوں۔ دسیوں باری سندیسہ آیا۔ حکم اجاجت دیویں تو گھر کا چکر لگالوں۔"

وہ لجاجت سے جھکا کہہ رہا تھا۔ رام ناتھ ایک بے حد بد دماغ اور غصہ ور انسپکٹر تھا یہاں پر... لیکن ابھی وہ

طویل عرصے بعد بڑے خوش گوار موڈ میں لوٹا تھا۔ جیپ سے اترنے سے پہلے ہی ہاتھ کے تیز اشارے سے جانے کا کہہ دیا۔ کانسٹیبل ہری اوم اسے اس کی غیر موجودگی کی رپورٹ دینے والا تھا۔ مگر اسی پل اسے اپنا سالا بے حد پریشانی کے عالم میں پکارتا نظر آیا۔ وہ سب کچھ بھول بھال بھاگا۔

"جیون بات سن۔۔۔ صاب کو اس کے بارے میں سب بتا دینا۔" اس نے سختی سے تاکید کی۔ "دھیلے سے رات ہو جائے گی، پر کیلاش مہاراج جرور آویں گے۔"

اس نے جاتے جاتے ہدایت کی، اسے کچھ اور بھی کہنا تھا، پر اس کا سالا جلدی جلدی کی رٹ لگا رہا تھا۔

اور انسپکٹر رام ناتھ کو وہ موقع مل گیا تھا، وہ سنہری موقع جس کی اسے تلاش تھی۔ خوشی اور طمانیت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ کھا رہا تھا اور بے تحاشا پی رہا تھا۔

اس کی نگاہیں اپنے سامنے کھلے پھڑپھڑاتے پاسپورٹ پر تھیں اور سبز رنگ کے آئی ڈی کارڈ پر

اور۔۔۔ اور۔۔۔ کھری چارپائی (ننگی چارپائی) پر ہڈیوں کے ڈھانچے وجود پر۔

مٹی میں لت پت۔۔۔ بے حد لاغر ویران آنکھیں۔۔۔ سینے کا ہلکا زیر و بم زندہ ہونے کی دلیل تھا، ورنہ پہلی نگاہ میں "تھانے میں ایک لاش رکھی ہے" کا خیال آتا تھا۔

اسے بے ہوشی کے حالت میں ایک ساربان پہلے گاؤں لایا اور بعد میں گاؤں والے ایک چارپائی میں ڈال تھانے چھوڑ گئے۔

کانسٹیبل ہری اوم کو صبح ہی ایک شخص کی گمشدگی کی رپورٹ ملی تھی۔ وہ انسپکٹر کے ساتھ گردونواح کے گشت پر جاتا مگر اوم ناتھ غیر حاضر تھا اور "غائب" حاضر ہو چکا تھا۔

اس کی حالت بتاتی تھی وہ کن حالات سے نبرد آزما رہا اور مقام حیرت تھا کہ زندہ تھا۔ ہری اوم نے اسے پکارا، اسے ہلایا۔ پھر فوری خیال کے تحت آب خورے میں پانی بھر لایا اور اس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔

"ہم بھی لوکاں نے ادھر گاؤں میں بھی اس پر پانی ڈالا۔

پر ہلتا نہیں۔ زندہ تو ہے، پر ہوش نہیں آتا۔"

"میں نے جھولا بھیجا ہے وید جی آتے ہوں گے۔"

کوئی پریشان آواز تھی۔

"وید جی آگئے ہیں چاچا!" کسی نے چیخ کر کہا۔

وید جی چارپائی پر ٹک گئے۔ نبض چیک کی۔ پپوٹے اٹھا کر دیکھے۔ اپنا چہرہ سینے سے چپکا دیا۔ دل کی دھڑکن کسی گمان کی طرح تھی۔۔۔ نہیں ہے۔ وہ اپنے پنڈورے سے کچھ نکالنے لگے اور پھائے پر لگا کر نتھنوں سے جوڑ دیا۔ اسے دفعتاً "زور کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر سختی سے میچ لیں۔

کسی دیہاتی نے سرعت سے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنی ران پر رکھ کر اونچا کیا۔ وید جی نے پانی کا برتن لکڑی جیسے ہونٹوں سے جوڑ دیا۔ تری ہونٹ سے ٹکرائی۔ پھر دانت اور مسوڑھے اور پھر زبان سے۔۔۔

وہ منہ نہیں کھول پا رہا تھا۔ پانی باچھوں سے چرتا، گردن اور کالر کو بھگوتا ہوا زیادہ تر گر گیا۔

وہ تھوڑا سا حلق میں بھی گیا۔ جسم سے جان نکل جائے تو لوٹ کر نہیں آتی۔ جسم میں جان موجود ہو تو بھٹک ضرور مارتی ہے۔

اس کے اندر نہ جانے کہاں سے توانائی آئی تھی۔ اس نے کرنٹ کھائے انسان کی طرح اچھل کر آب خورا اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اس کا سارا جسم جھٹکوں کی زد میں تھا۔

پانی کا برتن نعمت نہیں حیرانی تھا۔ وہ غٹاغٹ پی رہا تھا۔ وہ زیادہ پانی اپنے اوپر گرا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



میری دیورانی کا نام ''اوئی اللہ میں مرگئی'' تھا۔ نہیں نہیں یہ تو اس کا تکیہ کلام تھا۔ بھلا کسی کا نام ''اوئی اللہ میں مرگئی'' ہو سکتا ہے گو کہ جتنی بار میری دیورانی کے لبوں سے یہ جملہ ادا ہوتا تھا اس حساب سے تو اس کا نام 'کام' 'عمر' پیشہ سب اوئی اللہ میں مرگئی ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر میری دیورانی کا نام فلک تھا۔

فلک کے ہونٹوں سے نکلے ہر جملے کے ساتھ ''اوئی اللہ میں مرگئی'' بونس کے طور پر موجود ہوتا تھا۔ یعنی ہر جملے کے ساتھ ''اوئی اللہ میں مرگئی'' فری فری فری۔ کبھی کبھی تو حاتم طائی کی سخاوت کو مات دیتے ہوئے ایک جملے کے ساتھ دوبار بھی ''اوئی اللہ میں مرگئی'' مفت دیا جاتا تھا۔ بہرحال فلک کا یہ جملہ محض سیاسی بیان تھا اس کا' کیونکہ وہ صرف کہنا پسند تھی کہ میں مر گئی مگر مرنا ہرگز پسند نہیں کرتی تھی۔

مرنا تو شاید کسی کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا مگر اس طرح کا جھوٹا بیان ایک دن میں اتنی زیادہ بار تو ہمارے سیاست دان نہیں دیتے جتنی دفعہ یہ جملہ میری دیورانی فلک دہراتی تھی۔

میری شادی کے بعد دو سال کا عرصہ تو خاصے سکون و آرام سے گزرا کہ اس گھر کی میں واحد اور چہیتی بہو تھی۔ میرے شوہر کے علاوہ ساس سسر اور دیور بھی تھے۔ سب بہت اچھے تھے۔ میرے سسر جی کو زیادہ تعریفیں کرنے کی عادت تھی۔ بلکہ یہ کہنا مناسب رہے گا کہ میرے سسر جی کو سب کے سامنے میری تعریفیں کرنے اور دعائیں دینے کی عادت تھی۔ سسر جی کی یہ عادت میرے لیے باعث مسرت تھی۔

میری شادی کے دو سال بعد جب فلک میری دیورانی بن کر گھر آئی تو میں بے حد مطمئن تھی۔ وجہ..... وجہ..... نمبر ایک کہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے والی آگئی اور وجہ نمبر دو کہ فلک سے میرے نمبر کچھ زیادہ ہی تھے۔ میں کسی امتحان گاہ میں حل کے لیے پرچے کی بات نہیں کر رہی۔ دراصل زندگی بھی تو امتحان گاہ ہی ہے نا۔ مجھے ہمیشہ پہلی پوزیشن پر رہنا پسند رہا ہے۔ فلک کے آنے کے بعد دل ہی دل میں اپنا اور فلک کا موازنہ

فلک جاناں

مسرت ناز نعیم

کیا اور اپنے آپ کو فلک سے قدرے بہتر پا کر مطمئن ہو گئی۔ الحمدللہ خوب صورتی بہت تھی میرے پاس اور ذہانت بھی..... خوب صورت تو فلک بھی بہت تھی' مگر میری سرخ و سفید رنگت کے سامنے اس کا گندمی رنگ کچھ کچھ سانولا محسوس ہونے لگتا اور اس پر مستزاد فلک کی بے تحاشا اور مسلسل بولنے کی عادت۔ اس کی آواز کان کے پردے پھاڑ دینے کی صلاحیت رکھتی

تھی۔ جب فلک بولنے پر آتی تو شاید چپ ہو جانا بھول جاتی تھی۔ اسے شاید یہ معلوم ہی نہ تھا کہ بولنے کے کچھ دیر بعد خاموش بھی ہو جانا چاہیے۔ جبکہ میں سوچ سمجھ کر اور کم بولنے کی قائل تھی۔

فلک کسی بھی لحاظ سے مجھ سے زیادہ قابل نہ تھی اور میں بے حد مطمئن تھی کہ زندگی کے اس مقام پر بھی میں ہی نمبر ایک ہوں اور میں فلک کی طرف سے کسی قسم کا مقابلہ نہ دیکھتے ہوئے بالکل بے فکر ہو گئی۔ مگر فلک کی شادی کے پانچ سال بعد مجھے احساس ہوا کہ گھر میں ہر کوئی فلک کے گن گاتا پایا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ میرے سسر جی۔۔۔ انہیں تو ویسے ہی سب کے سامنے بہوؤں کی تعریف کرنے کا شوق تھا۔ مگر مجھے اب محسوس ہونا شروع ہوا کہ میری نسبت فلک کی تعریفیں سسر جی زیادہ کرنے لگے ہیں۔ مثلاً "ایک بار میری تعریف تو دو بار فلک کی تعریف۔ میرا دیور رمیز تو تھا ہی بیوی کا دیوانہ۔ اس کے علاوہ میرے میاں اور بچے تک فلک کی تعریفیں کرنے لگے تھے۔ ساسوماں تو خیر سے تعریفوں کے معاملے میں ہمیشہ سے ہی نسبتاً" محتاط رہتی تھیں۔ مگر وہ بھی کبھی کبھار فلک کے گن گاتی پائی جاتی تھیں۔

فلک جانے کب مجھ سے آگے نکل گئی تھی اور اب میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں فلک کو آگے بڑھنے نہیں دوں گی۔

مجھے آج کل ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وزن کچھ بڑھ گیا ہے۔ اپنی اسمارٹ نیس کو لے کر میں بہت حساس تھی۔ جوں ہی محسوس ہوتا کہ میں موٹاپے کی جانب مائل ہوں "فوراً" سے بیشتر اپنی خوراک کم کر دیتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو سوچنے لگی کہ "فلک جانے اسمارٹ رہنے کے لیے کیا کرتی ہے۔ اسے بھی ڈائننگ کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں۔" وہ ہی اپنی دیورانی سے لاشعوری طور پر موازنہ کرنے کی عادت۔

"فلک بیٹا! اب آ بھی جاؤ۔" سسر جی نے فلک کو آواز دی۔

"آئی ابو جان۔ اوئی اللہ میں مر گئی۔ دراصل چائے کا پانی چڑھا رہی تھی میں۔ کھانا کھاتے ہی آپ کو چائے کی طلب ہوتی ہے نا۔" فلک کا کہنا تھا اور سسر جی کا فلک کو ڈھیروں دعاؤں سے نوازنا تھا۔

"کتنا خیال رکھتی ہو میرا۔ جیتی رہو۔ جگ جگ جیو۔"

"ابو جان آپ تو شرمندہ کر دیتے ہیں۔ اوئی اللہ میں مر گئی۔" سسر جی جینے کی دعائیں دیتے نہیں تھکتے اور بھو جی ہر دم مرنے کو تیار او نہہ۔

آج میری توجہ اپنے کھانے سے زیادہ فلک کے کھانے پر تھی۔ میرا فلک کو نظر لگانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ بس دیکھنا چاہتی کہ فلک اپنی اسمارٹنیس برقرار رکھنے کے لیے کتنا کم کھاتی ہے۔

فلک نے پہلا بڑا سا نوالہ توڑا' میں نے بھی اپنے لیے روٹی اٹھائی اور چھوٹا سا نوالہ توڑ کر آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ شروع سے میری عادت ہے کہ بہت آہستگی سے کھانا کھاتی ہوں۔ تیسرے نوالے پر دیکھا تو فلک کی روٹی ختم شد ہو چکی تھی اور اس نے دوسری روٹی اٹھائی تھی۔

اللہ میں حیرت کے کنویں' میرا مطلب ہے کہ میں حیرت کے دریا میں ڈبکیاں کھانے لگی۔ میرے کھانے کی رفتار مزید کم ہو گئی اور فلک کے کھانے کی اسپیڈ باؤلے گھوڑے کی مانند مزید تیز ہو گئی۔ اس نے جھٹ پٹ دوسری روٹی ختم کر کے تیسری روٹی اٹھائی تو میں حیرانی کے سمندر میں مرنے والی ہو گئی۔ تیسری روٹی کے اختتام سے پہلے ملازمہ کی آواز آ گئی۔

"بی بی جی۔۔۔ چائے میں ابال آ گیا ہے۔"

"اوئی اللہ میں مر گئی۔ ابھی آئی۔"

"بیٹا کھانا تو پیٹ بھر کر کھا لو۔" ساسوماں پیار سے بولیں۔

"نہیں امی! بس اب بھوک مر گئی میری۔ اب نہیں کھایا جائے گا۔ چائے نہ گر جائے۔ اوئی اللہ میں مر گئی۔" فلک کہتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"اوہ' بے چاری نے روٹی بھی پوری نہیں کھائی۔" سسر جی افسوس سے بولے۔

ہیں نے فلک کی تیسری روٹی کی بقایاجات پر ایک نظر ڈالی۔ پھر دوسری نظر ڈالی۔ اپنی پہلی روٹی پر جوکہ اب بھی آدھی باقی تھی۔ مگر اب میری بھوک مر چکی تھی۔ کیونکہ مجھے پتا چل گیا تھا کہ فلک بہت کھاتی ہے اور پھر بھی اسمارٹ رہتی ہے۔



فلک پانچ سال میں تین عدد بچوں کی والدہ بن چکی تھی' جبکہ میں شادی کے سات سال بعد بھی وہی شروع کے جڑواں بچوں پر صبر شکر کرکے بیٹھی تھی۔ اپنے جڑواں بچوں کی پیدائش کے بعد مزید بچے پالنے کی ہمت ہم دونوں میاں' بیوی میں نہ تھی۔ دونوں کو دن میں' میں سنبھالتی جبکہ رات کو عاشر سنبھالتے تھے۔

میری نیند میری کمزوری تھی۔ میرے دونوں بچے اب چھ سال کے ہوچکے تھے۔ اس لیے فی الحال اس معاملے میں فلک کی برابری کرہی سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ فلک مزید بچوں کی پیدائش پر غور کرے' بلکہ وہ تو شاید بغیر غور کیے ہی بچوں کی آمد پر یقین رکھتی تھی شاید۔

"جی سنتے ہیں۔" میں نے بہت پیار سے عاشر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پچھلے آٹھ سالوں سے آپ ہی کی تو سن رہے ہیں ایشل جان اور ساری زندگی بخوشی آپ کی سننے کے لیے دل و جان سے راضی ہیں۔" عاشر نے بہت پیار سے جواب دیا میں نے بھی موقع غنیمت جانا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ ایک نیا فرد ہم فیملی میں شامل کرلیں۔"

"بھئی اب تو کوئی اور چھوٹا بھائی ہے نہیں میرا' جس کی شادی کرکے مزید فیملی بڑھائی جاسکے۔"

"اوہو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے دونوں بچے ماشاء اللہ چھ سال سے زیادہ کے ہوچکے ہیں۔ تو کیوں نہ ایک ننھا منا بچہ۔۔۔"

"کیا۔۔۔؟" ابھی میری بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ

پر جاکر بیٹھ گئے جیسے انہیں بیڈ پر فلک بوس کی سرکٹی کھوپڑی نظر آگئی ہو۔

"کیا ہوگیا۔" میں نے اچنبھے سے عاشر کو دیکھا۔

"ایشل۔۔۔ بھئی مجھ میں اب مزید راتوں کو جاگ کر بچے سنبھالنے کی ہمت نہیں ہے۔" عاشر کو شاید گزرا وقت یاد آگیا تھا۔ "تیسرا بچہ ہرگز نہیں۔"

"کیوں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ فلک اور رمیز کو دیکھیے' پانچ سال میں تین بچے ہوگئے ان کے۔ ایک ہم ہیں کہ شادی کے ایک سال بعد بھی دو ہی بچے تھے اور سات سال بعد بھی دو ہی ہیں۔"

"ایشل۔۔۔ ان کے بچے فلک خود سنبھالتی ہے۔ رمیز کو راتوں کو جاگنا نہیں پڑتا۔ وہ فلک ہے۔ رات کو جاگ سکتی ہے اور صبح بھی جلدی اٹھ سکتی ہے۔ اس لیے اگر ان کے تین کے بجائے پانچ بچے بھی ہوں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بچے صرف آپ نے سنبھالے ہیں' میں نے نہیں۔" مجھے افسوس ہوا عاشر کی بات پر۔۔۔

"رات کو تو صرف میں نے سنبھالے ہیں۔" صرف پر زور تھا۔

"اچھا میں اسٹڈی روم میں جارہا ہوں' تھوڑا مطالعہ کروں گا' اس کے بعد وہیں سوجاؤں گا۔ مجھے تنگ نہیں کرنا۔" عاشر کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے

اور میں شرمندگی کی کیفیت میں مبتلا ہوگئی۔

واقعی میری نیند ہی میرا سب سے بڑا مسئلہ ہے شاید۔ رات کو سونے کے بعد آنکھ نہ ہی کھلتی تھی۔ بچوں کے ہونے کے بعد بھی رات کو جب جب بچے اٹھتے' عاشر ہی سنبھالتے۔ کس طرح بچوں کو سنبھالتے' یہ میرا مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر ممکن میری مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں آرام سے اپنی نیند پوری کرتی اور صبح قدرے دیر سے اٹھتی۔

جب تک فلک نہ آئی تھی تب تک ناشتا میری ساس کی ذمہ داری تھی۔ باقی سارے دن گھر کے کام

میں کرتی تھی۔ مگر صبح صبح اٹھنا میرے لیے مسئلہ تھا۔ میرے سسر جی علی الصبح اٹھنے کے عادی تھے۔ صبح صبح اٹھتے ہی ان کو چائے چاہیے ہوتی۔ فلک کی شادی سے پہلے یہ ذمہ اری ساسویاں کی تھی اور بعد میں فلک نے یہ ذمہ داری لے لی تھی۔ جانے وہ رات کو بھی سوتی تھی یا نہیں۔ جیسے ہی سسر جی صبح اٹھ کر لاؤنج میں آتے فلک کی آواز آتی۔

"اوئی اللہ میں مرگئی۔ ابو جی آپ اٹھ گئے، میں چائے لاتی ہوں۔" اور تھوڑی دیر بعد وہ چائے کا کپ لیے حاضر ہوتی اور سسر جی اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے۔ حتیٰ کہ میری ساس اٹھ جاتیں۔ میں بھی اٹھ جاتی۔ بچے بھی اسکول چلے جاتے۔ عاشر اور رمیز آفس چلے جاتے، لیکن سسر جی کا "فلک نامہ" نہ ختم ہوتا۔ سسر جی کے معمول میں شامل تھا کہ گھر کے ہر فرد کے سامنے فلک کے صبح اٹھنے کی اور سسر جی کو چائے پیش کرنے کی داستان روزانہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اور اب پانچ سال بعد مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن جب ہم تمام گھر والے شام کو کھانے کے بعد ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ سسر جی کو جانے کیا سوجھی، کہنے لگے۔ "چلو بھئی آج مشاعرہ ہو جائے۔"

"ارے واہ زبردست آئیڈیا ابو جی۔ ایسی شاعری کروں گی کہ لوگ واہ واہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بڑے بڑے شاعر اپنے دیوان پھاڑ دیں گے اور مشاعرے میں موجود حضرات میری شاعری سن کر اپنے سر پھوڑ لیں گے۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔" فلک نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے سوچا کہ اس کی آواز ہمارے کان کے پردے پھاڑتی ہے اور اب اس کی شاعری ہمارے سر پھاڑے گی۔

"اتنی پر تشدد شاعرہ۔ آپ نے تو سب کچھ برباد کر ڈالنا ہے۔" عاشر مسکرائے۔

"بس جی "آئی" کو کون ٹال سکتا ہے، اوئی اللہ میں مرگئی۔"

"شعر سنائیے، شعر سنانے کی ہمت ہے۔" رمیز شوخی سے بولا۔

"میں تو شعر کہنے کی جرأت رکھتی ہوں، مگر کیا آپ لوگ میری شاعری برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے اپنی شاعری کمزور دل والوں کو سنانے سے پرہیز بتایا ہے۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔" فلک بالکل شاعرہ بنی بیٹھی تھی اس وقت۔

"بھئی میں تو مشاعرے میں انڈے اور ٹماٹر لاؤں گی۔" میں نے بظاہر مذاق کرتے ہوئے درحقیقت جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے چاہے۔

"مشاعرے میں شریک تمام حضرات بغور سن لیجیے کہ اوئی اللہ میں مرگئی۔ مشاعرے کو تخریبی کارروائیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ کیونکہ مابدولت مشاعرے میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"یہ "مابدولت" کون ہیں۔" میں نے دھیرے سے عاشر کے کان میں سوال پوچھا۔ جس کا جواب دینا عاشر نے ضروری نہ سمجھا، وہ ہنستے ہوئے فلک کی تقریر سن رہے تھے جو کہ مسلسل بولے چلے جا رہی تھی۔

"اور اگر ایک بھی سڑا ہوا ٹماٹر میرے شعر کو زور سے لگ گیا تو میرا شعر خراب ہو جائے گا۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔ ہاں انڈے اگر گندے نہ ہوں تو انڈے لانے کی اجازت ہے۔ میں انڈے کیچ کرنے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ انڈے بہت مہنگے ہو چکے ہیں۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔"

"چلو پھر طرحی مشاعرہ کرتے ہیں فلک بیٹا۔" سلیم احمد کا شعر ہے۔

دل کے اندر درد آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیے کہ جزو زندگی بن جائیے

سسر جی نے طرحی مشاعرے کے لیے شعر بتایا۔

"ارے واہ اس لائن پر تو میں فٹافٹ شاعری کر سکتی ہوں اوئی اللہ میں مرگئی۔ عرض کیا ہے۔" فلک اس وقت پکی شاعرہ بنی بیٹھی تھی۔

"واہ۔۔ واہ۔۔ واہ۔۔ واہ" رمیز نے فلک کے

[illegible]
غلام" ہونے کا ثبوت پیش کیا۔

"اسے شاعری تو کرنے دو۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ بعد میں کی جاسکتی ہے یا اشعر سننے کے بعد زبان واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کرنے کے قابل نہ رہے گی۔" میں چڑ ہی تو گئی رمیز کی واہ۔۔۔ واہ سے۔۔۔

"اوہ ہاں سوری۔۔۔" رمیز کھسیانا ہو کر خاموش ہو گیا۔

"عرض کیا ہے۔۔۔"

میٹھے میں شکر، سالن میں دہی بن جائیے
ایسے شوہر بنیے، کچن کی زندگی بن جائیے

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا بات ہے۔ واہ۔۔۔ واہ۔" رمیز نے داد و تحسین کے ٹوکرے برسا دیے، جبکہ باقی سب بھی ہنستے ہوئے واہ۔۔۔ واہ کر رہے تھے۔

"اس میں واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کی کیا بات ہے، وہ شوہر کو کچن میں کام کرنے کی کہہ رہی ہے۔" میں نے رمیز کو شرم دلانی چاہی، جو کہ اسے نہیں آئی۔

"بھابھی جی۔۔۔ گھر کے کام کرنے سے کوئی شوہر چھوٹا نہیں ہو جاتا، میں تو ویسے بھی میاں، بیوی کے رشتے میں برابری کا قائل ہوں۔"

اس ہی بات پر ایک بار پھر واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔ رمیز اس ہی طرح دھمال کے اسٹائل میں سر دھنتے ہوئے بولا۔

"واہ۔۔۔ بہو خوب ماشاء اللہ۔۔۔" ساسو ماں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔

"آگے بھی سنیے، تین شعر اور کہے ہیں۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔"

فلک نے غزل کیا ختم کی کہ رمیز کی واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ سے چھت میٹھنے کے قریب ہو گئی اور میں غصے سے پھٹنے کے قریب ہو گئی۔

سسر جی بھی بہت خوب، بہت خوب کہہ رہے تھے۔ ساسو ماں بھی ہنستے ہوئے شاباش دے رہی تھیں۔ عاشر بھی سراہنے والے انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ اور میں۔۔۔ میرا بس نہ چلتا تھا کہ فلک کی اس

[illegible]
سمیت اٹھا کر باہر پھینک دوں۔

کچن میں اور تو کیا رکھا ہے
چینی پتی کا ڈبا رکھا ہے

میں ہوں سیدھی سادی سی لڑکی
ساس نند نے مجھ کو دبا رکھا ہے

"آداب۔۔۔ آداب۔۔۔ اوئی اللہ۔۔۔ میں مرگئی۔"

فلک نے غزل ختم کی اور سارے گھر والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ رمیز واہ واہ کیے جاتا تھا اور فلک اپنے آپ کو بہت بڑی شاعرہ سمجھ کر "آداب عرض ہے" کہتی تھی اور اگلے ہی لمحے شرما کر کہتی۔

"اوئی اللہ میں مرگئی۔"

"ایشل بھابھی آپ بھی بتائیے نا کیسی لگی آپ کو میری شاعری۔"

"واہ کیا خوب، باورچی خانہ اور خاتون خانہ شاعری ہے۔" میں نے تپ کر کہا تو فلک نے شرما کر "اوئی اللہ میں مرگئی" کہا اور میں سوچنے لگی کہ یہ روزانہ دن میں ہزار بار مرتی ہے، پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے کہتے ہیں مر کر بھی زندہ رہنا۔ یعنی کہ امر ہو جانا۔

"ایشل بیٹا آپ بھی شعر سنائیے نا۔" سسر جی نے لگے ہاتھوں مجھ سے بھی فرمائش کر ڈالی۔

"جی اچھا سناتی ہوں۔"

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جائے گی
تو تو دریا ہے سمندر میں اتر جائے گی

میں نے غصے میں اچھے بھلے شعر کا بیڑہ غرق کر دیا۔ میں نے بظاہر شعر سنایا، مگر اصل میں فلک کو "سنائیں"

مگر فلک پر کون سا اثر ہونا تھا کیونکہ سب گھر والے داد دے رہے تھے، سب سے اونچی آواز میں واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ فلک ہی کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اپنے معمول میں تبدیلی لانی ہوگی۔ اپنی نیند کو شکست دے کر ہی میں گھر میں صبح

حاصل کر سکتی ہوں۔ اب چاہے کچھ بھی ہو میں صبح فلک سے پہلے اٹھوں گی اور سسر جی کو چائے پیش کروں گی۔ میں نے فیصلہ کیا اور موبائل میں الارم لگا کر سو گئی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے الارم بج اٹھا۔ میرا دل تو نہ تھا اٹھنے کا۔ میری نیند مجھے تھپکیاں دے رہی تھی مگر مجھے فلک سے آگے بھی تو نکلنا تھا۔ سو میں نیند کو ناراض کرتی اٹھ بیٹھی۔ مگر نیند بھی چاہنے والے محبوب کی طرح مجھ سے لپٹی لپٹی جاتی تھی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے جو بھی ہو جائے۔ آج صبح کی چائے مجھے ہی سسر جی کو دینی ہے۔ اپنے اس عہد کو دل میں دہراتے ہوئے میں نے مندی مندی آنکھیں کھول کر واش روم کا رخ کیا۔ تاکہ منہ دھو کر اس عاشق (نیند) کو بھگایا جاسکے۔ اپنی نیند کے ساتھ بے رخی برتتے ہوئے ایک عزم کے ساتھ میں نے اپنے اور واش روم کے درمیان موجود تمام دیواریں گرادیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ میرے واش روم پہنچنے تک کمرے کے درمیان رکھی ٹیبل اور ٹیبل پر سجا ہوا گل دان زمین بوس ہو چکے تھے۔

"ایشل کیا ہو گیا۔ نیند میں چل رہی ہو کیا۔" عاشر کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"جی نہیں۔" کہہ کر میں واش روم میں گھس گئی۔

مجھے ہر حال میں آج نیند سے بے وفائی کرنی تھی۔ تاکہ سارا دن سسر جی کی کہانی "فلک نامہ بمعہ صبح کی چائے" سننے سے خود کو بچایا جاسکے اور سسر جی سارا دن "ایشل نامہ بمعہ صبح کی چائے" سناتے رہیں۔

واش روم میں جا کر جانے کیا ہوا۔ میری بے رخی میری نیند کو کچھ خاص پسند نہ آئی تھی۔ نیند نے انتقاماً مجھ پر حملہ کر دیا اور میں نے ایک جمائی لی اور بس ایک لمحے کے لیے میرے آنکھیں شاید نیند سے بند ہوئی تھیں اور بس۔ لو بھلا ایسا کیا گناہ ہو گیا تھا جس کی اتنی بڑی سزا۔ نیند سے بے وفائی کرنے کا بھیانک انجام۔ میں واش روم کے فرش پر اچھلتی ہوئی فرش پر جا گری۔

ویسے تو ہلنا جلنا' پھرنا' اچھلنا' کودنا صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ مگر ایسی بھی کیا اچھل کود کہ بندہ اپنی پاؤں کی ہڈی ہی توڑ لے۔

بس اتنا یاد ہے کہ میں نے زوردار چیخ ماری تھی اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ چارجنگ لائٹوں کی چارجنگ ختم ہو گئی۔ سارے بلب فیوز ہو گئے اور میرے دماغ میں ملک کی طرح بدترین لوڈشیڈنگ ہو گئی۔

پاؤں پر پلاستر چڑھا اور میں تین مہینے کے لیے بیڈ کو پیاری ہو گئی۔ لو جی جان چھوٹی۔ تین مہینے تک نہ تو صبح سویرے اٹھنے کا مسئلہ اور نہ ہی سسر جی سے فلک کی تعریفیں سن کر دل جلے گا۔ اب تو بس کمرہ نشین ہو کر رہنا پڑے گا۔ افففف۔

فلک کی تعریفوں سے بچنے کا یہ حل تو میں نے قطعاً" نہ چاہا تھا۔ یہ حل یقیناً" میری نیند نے مجھ سے قریب رہنے کے لیے نکالا تھا۔ اب چاہوں تو چوبیس گھنٹے نیند کی آغوش میں پڑی رہوں۔ "اوہ میرے خدا" میں نے سر تھام لیا۔



"ایشل بھابھی اب اٹھ بھی جائیں۔ اوئی اللہ میں مر گئی۔ سات بج گئے ہیں۔ بھابھی آئے میں کہہ رہی ہوں۔ میں کب سے منی بس کے ہارن کی طرح بجے جارہی ہوں' پر آپ ہیں کہ اٹھ ہی نہیں رہی ہیں۔ اوئی اللہ میں مر گئی۔" فلک کی سیٹی بجاتی آواز دروازے کے باہر سے سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھ کر کروٹ بدلی۔ غسل خانے میں پھسلنے والے واقعے کو پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ میرا پاؤں بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔

"اس کو کب سے غلط فہمی ہو گئی کہ یہ منی بس کا ہارن ہے۔ جبکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ بس کا ہارن پھر بھی تھوڑی دیر کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ پر اس فلک کا ہارن بجنا شروع ہوتا ہے تو بجتا ہی چلا جاتا ہے۔" میں نے بیڈ پر آنکھیں موندے عاشر سے ہنستے ہوئے کہا۔

جاتی کی وہ بھی فلک کی ہی باتیں کر رہے تھے سب ہیں۔

''لگتا ہے اس کے سسٹم میں خرابی ہے۔ ہارن بند کرنے والا بٹن صحیح کروانا پڑے گا۔'' عاشر نے بند آنکھوں سے جواب دیا۔

''اٹھ گئی ہوں فلک' آ رہی ہوں۔'' میں نے دروازہ کھول کر فلک سے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔ جلدی آجائیں' بچوں کو اسکول سے دیر نہ ہوجائے۔'' جتنی تیزی سے اس کی زبان چل رہی تھی اس سے زیادہ تیزی سے فلک نے قدم باورچی خانے کی طرف بڑھا دیے اور میں ہنستی ہوئی پلٹی۔ واش روم سے باہر آئی تو عاشر بیڈ پر بیٹھے مجھے بغور دیکھنے لگے۔

''کیا بات ہے ایشل' کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اب تم فلک کے بولنے پر غصہ نہیں کرتی ہو اور نہ ہی کسی معاملے میں فلک سے مقابلہ کرتی ہو۔'' عاشر نے مجھے مسلسل مسکراتے دیکھ کر کہا اور میں جو کمرے سے باہر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ باہر جانے کے بجائے بیڈ کے کونے پر آبیٹھی۔

''کیونکہ اب مجھے فلک کی آواز کم سنائی دیتی ہے اور فلک کی اچھائیاں زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔'' میرے کہنے پر عاشر بے حد حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔

''میں نے اپنی بیماری کے ان چند ماہ میں غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ فلک کی تعریفیں سب یونہی نہیں کرتے' بلکہ فلک کی دن رات گھر کے لیے محنت اور تمام گھر والوں سے بے لوث محبت ہی اس کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔ میری معذوری کے دنوں میں اس نے نہ صرف میری خدمت کی' بلکہ بچوں اور آپ کی ضروریات کا بھی خیال رکھا۔ اس نے میرے تمام کام بغیر بوجھ سمجھے اور بنا احسان جتائے اپنے ذمے لے لیے۔

فلک تمام گھر والوں سے محبت کرتی ہے۔ اس ہی لیے سب اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور وہ یہ سب کسی سے تعریفیں وصول کرنے کے لیے نہیں کرتی'

[illegible]

''ارے ایشل! تم تو ابو جی کے ''فلک نامے'' سے بے زار رہتی تھیں' آج خود ہی ''فلک نامہ'' پڑھ رہی ہو۔ آج مقابلہ نہیں ہے فلک سے۔'' عاشر کافی حیران دکھائی دے رہے تھے۔

''فلک سے برابری کرنے کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا۔ بس اس ہی کی طرح سب کی طرف سے دل صاف رکھنا ہے اور سب سے بے غرض محبت کرنی ہے۔ سب کے لیے اچھا سوچنا ہے اور بس۔۔۔'' میں نے مسکراتے ہوئے قدرے اطمینان سے کہا۔

''واہ ایشل! آج تو تمہاری باتوں نے میرا دل ہی جیت لیا۔'' عاشر بہت پیار سے بولے۔ ''سوچ رہا ہوں کہ اگر ہماری فیملی میں تیسرے بچے کا اضافہ ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' عاشر میری طرف قدرے جھکتے ہوئے رومانٹک موڈ میں بولے۔

''جی نہیں' ایسا سوچنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں' اس لیے آپ کو بچے کے لیے راتوں کو جگانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔'' میں ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکلی تو عاشر ٹھنڈی آہ بھر کر دوبارہ بیڈ پر دراز ہوگئے اور میں نے باورچی خانے کی طرف قدم بڑھائے' جہاں کچن سے فلک کی سیٹی بجاتی آواز آرہی تھی۔

''میں کہہ رہی ہوں بھابھی جلدی سے بچوں کو اسکول کے لیے اٹھادو' سات بج گئے ہیں۔ اوئی اللہ میں مرگئی۔ ایشل بھابھی آپ یہ چائے دیکھیے' میں بچوں کو جاکر اٹھاتی ہوں۔ ابو آپ کو چائے اور چاہیے۔'' بچوں کے کمرے کی طرف جاتے جاتے فلک نے لاؤنج میں بیٹھے سسر جی سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! ابھی نہیں چاہیے۔ صبح صبح اٹھ کر سب سے پہلے مجھے چائے دیتی ہو۔ کتنا خیال رکھتی ہو میرا۔'' سسر جی کا ''فلک نامہ'' شروع ہوچکا تھا۔



بقیہ حالم

"تمہارے خیال میں وہ ایسا کیوں کرے گا؟" وہ الجھنوں میں گھر گیا تھا۔
"کیونکہ یہ بہروپیے (con artust) جاسوس یا کرائے کے قاتل ہوتے ہیں جو حلیے بدلتے ہیں اور کسی خاص جگہ یا شخص کو ٹارگٹ کرتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی کو قتل کرنا یا کوئی اہم چیز چرانا ہوتا ہے۔"
"مگر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ وہی ملازم ہے تو وہ بولا کہ نہیں اور اس نے مجھے اتنا برا بھلا بھی کہا۔" اس کو اپنا غم یاد آیا۔
"تو تمہارے خیال میں اس نے مان جانا تھا؟ بلکہ اسے تو ہنگامہ کرکے تمہیں نوکری سے نکلوانا چاہیے تھا تاکہ تم اس کے لیے رکاوٹ نہ بنو۔"
"یعنی وہ..... وہ وہی ہے۔" پہلی دفعہ اسے ہزار فیصد یقین آیا تو وہ دونگ رہ گیا۔
"اگر ہنگامہ کھڑا کیا ہے تو وہ بالکل وہی ہے' کیونکہ چور ہی سب سے زیادہ شور مچاتا ہے۔" وہ سینڈوچ کے لقمے لیتے عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔
"مطلب میں ٹھیک تھا۔ یا اللہ۔ وہ کون ہے؟ چور' جاسوس یا قاتل؟" پھر چونک کے دوست کو دیکھا۔ "اب میں کیا کروں؟"
"یہ اس گھر کا معاملہ ہے جہاں تم نوکری کرتے ہو؟"
ایڈم نے جھٹ سرہلایا۔
"اور کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا؟"
ایڈم نے نفی میں گردن دائیں بائیں ہلائی۔
"جہاں تم نے اس کو ملازم بنے دیکھا تھا' وہاں جاؤ اور ادھر کے مالکوں سے اس کے بارے میں معلومات لو۔ پھر اپنے مالک کے پاس ثبوت سمیت جاؤ۔ ایک منٹ کہاں جارہے ہو' کھانا تو کھالو۔" وہ اسے یوں اٹھتے دیکھ کے حیران ہوا مگر ایڈم نے جلدی سے آگے بڑھ کے اس کا کندھا تھپکا۔ "تھینک یو۔" بولا۔ جیب سے چند نوٹ نکال کے گلاس تلے رکھے اور باہر کو بھاگا۔
اس کی ساری دنیا میں بھونچال آگیا تھا۔ (کرائے کی قاتل؟) جاسوس یا چور کے بجائے یہی خیال پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

☆ ☆ ☆

ابھی دوپہر پوری طرح نہیں ڈھلی تھی مگر اس سڑک پہ بنی مہنگی اور برانڈڈ شاپس کی ساری بتیاں جل اٹھی تھیں۔ ایسے میں وہ اٹھی گردن کے ساتھ کہنی پہ پرس ٹانگے ایک بڑے اسٹور کے سامنے آرکی۔ سبز فراک اور چھوٹا سفید منی کوٹ پہنے' وہ آنکھوں پہ بڑے بڑے سیاہ گلاسز لگائے ہوئے تھی۔ گردن مغرور امیرزادیوں کی طرح اکڑا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں ملک شیک تھا اور دوسرے میں موبائل' جس پہ وہ پیغام دیکھ رہی تھی۔
"جو تم نے کہا تھا' میں نے کردیا' حالم!" مولیا کا پیغام جگمگا رہا تھا۔
"گڈ۔ اب کوشش کرنا کہ مجھے تم بالکل یاد نہ آؤ۔" جواب دے کر فون رکھا تو دوسرا موبائل بجنے لگا۔ اس نے کان سے لگایا۔
"داتن' مولیا نے کام کردیا ہے۔"
"گڈ۔ تم کہاں ہو؟"

"میں مسز حفصہ کے لیے کوئی سی تحفہ لینے آئی ہوں جو میری شان کے عین مطابق ہو۔"
"جیسے میں اس بات پہ یقین کرلوں گی؟" اس نے منہ بنا کے کہا تو تالیہ نے شانے اچکائے اور فون پرس میں ڈال دیا۔ پھر اعتماد سے اندر چلی آئی۔
جیولری ریک پہ آکر اس نے سن گلاسز اوپر کر کے بالوں پہ ٹکائے اور گردن جھکا کے قیمتی زیورات دیکھنے لگی۔ آنکھیں سوچنے والے انداز میں چھوٹی کرلیں۔ ساتھ ہی ملک شیک کے گھونٹ بھی بھرتی رہی۔ پھر دو عدد قیمتی مساک جیولرز کے دو ڈائمنڈ لاکٹ اٹھائے۔ بالکل ایک جیسے۔ ایک کو خالی ہاتھ میں پکڑا' دوسرے کو ملک شیک گلاس والے ہاتھ میں اور کاؤنٹر کی طرف چلی آئی۔
کاؤنٹر پہ ایک چینی نوجوان کھڑا بلنگ کر رہا تھا۔ رش کافی تھا۔ تالیہ کے آگے قطار لگی تھی۔ وہ منتظر سی کھڑی رہی۔ رش بہت تھا۔ قطار سست تھی۔ جیسے ہی سامنے والی عورتیں ہٹیں' وہ آگے آئی اور لاکٹ سامنے دھرا۔ ملک شیک گلاس والا ہاتھ نیچے کرلیا۔ نوجوان نے بل بنا کے دیا تو اس نے پرس سے نوٹوں کی گڈی نکال کے رکھی لڑکے نے پیسے رکھ لیے اور لاکٹ کا سیکیورٹی ٹیگ اتارا۔ (اگر یہ ٹیگ لگا رہے تو دکان سے باہر لے جانے کی صورت الارم بج جاتا ہے۔) ابھی وہ لاکٹ ساتھ والے ملازم کو دینے ہی لگا تھا کہ اسے باکس میں ڈالے کہ وہ بولی۔
"ایک منٹ۔ میں اس کو ٹرائی کرلوں۔" لڑکے نے سمجھنے والے انداز میں لاکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنا سیل اور پرس کاؤنٹر پہ دھرا۔ بقایا رقم بھی نہیں اٹھائی۔ گویا لاپروا امیر لڑکی نے سب ان کے سامنے رکھ دیا۔ پھر ملک شیک سے گھونٹ بھرا اور آئینے تک آئی جو قریب میں لگا تھا۔ اب اس نے دھیرے سے ٹیگ اتارا لاکٹ ملک شیک گلاس میں گرا دیا اور خود ٹیگ والا دوسرا لاکٹ گردن میں پہن کے دیکھنے لگی۔ ہاتھوں کی یہ خفیف سی حرکت سی سی ٹی وی میں نظر نہیں آتی۔
آئینے میں اپنا عکس دیکھ کے اس نے منہ بنایا۔ ماتھے پہ سلوٹیں پڑیں۔ واپس آئی۔ دو تین گاہکوں کے بھگت جانے کا انتظار کیا اور پھر اداسی سے لاکٹ کاؤنٹر پہ رکھا۔
"یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ کیا میں اسے واپس کرسکتی ہوں۔" بل اٹھا کے واپس بڑھایا۔ سیلز مین کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔ مگر اس نے سرہلاتے ہوئے بل تھام لیا۔ "آپ کچھ اور دیکھ لیں۔"
"نہیں' اب میرا موڈ آف ہو گیا ہے۔" وہ اداس نظر آتی تھی۔ لڑکے نے لاکٹ واپس لے لیا اور بل سے میچ کرنے لگا۔ پھر اس کی انگلیاں ٹیگ پہ ٹھہریں۔ تالیہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور اونچا سا بولی۔ "اف باہر کتنی Haze پھیلی ہے۔ اس نے تو کے ایل اور تائی یو این میں کوئی فرق ہی نہیں چھوڑا۔" (ہیز وہ دھند ہوتی ہے جو انڈونیشیا کے جنگلات جلانے سے ملائیشیا تک پھیل جاتی ہے۔)
وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔ "آپ تائی یو این جا چکی ہیں؟" (تائی یو این چائنا کا انتہائی فضائی آلودگی کا شکار ایک شہر ہے۔)
"جا چکی کیا مطلب؟ میں بڑی ہی وہیں ہوئی ہوں۔" وہ مسکرا کے چینی زبان میں بولی تو وہ خوشگوار حیرت سے مسکرایا۔ "میرے والد کا آدھا خاندان وہیں سے ہے۔ ہم بھی وہیں رہتے تھے۔ یہ آپ کے پیسے۔" اس نے لاکٹ واپس کروا دیا اور پیسے اس کے حوالے کر دیے۔
"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" تالیہ نے شکریہ ادا کر کے ملک شیک کا گلاس اٹھایا۔ سن گلاسز آنکھوں پہ گرائے اور اسی اعتماد سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ آرام سے کار تک آئی' اندر بیٹھی' گلاس کا آخری گھونٹ بھرا اور ٹشو سے نیچے بیٹھا لاکٹ نکال کر صاف کیا اور مسکرائی۔ "ہے کوئی حالم جیسا' ہاں؟"

☆ ☆ ☆



تنکو کامل کے گھر پہ شام اترنے لگی تھی جب ایڈم نے بیرونی گیٹ کی گھنٹی بجائی۔ دل دھڑک رہا تھا' بار بار لبوں پہ زبان پھیرتا تھا مگر جنون اس سے بڑا تھا' کھوج لگانی ہی تھی۔
دروازہ کھلا تو ایک ملازم دکھائی دیا۔ "مجھے مسز شیلا سے ملنا ہے۔ میں وان فاتح کا باڈی مین ہوں۔"
ملازم نے فوراً" راستہ چھوڑ دیا اور اسے پورچ تک لے آیا' پھر وہیں رکنے کو کہا۔ ایڈم بے چینی سے آگے پیچھے ٹہلنے لگا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی تو فوراً" سیدھا ہوا۔ مسز شیلا باہر نکلیں تو اس نے فوراً" جھک کے سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کے جواب دیا۔
"کیا آپ کو وان فاتح نے بھیجا ہے؟"
"نہیں میڈم! میں ذاتی کام کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔" وہ ذرا جھجکا مگر انہوں نے مسکرا کے "بتاؤ" کہا تو اس کی ہمت بڑھی۔
"اس روز جب ہم آپ کے گھر آئے تھے تو آپ کی نوکرانی تھی ایک۔۔۔ تا۔۔۔ تالیہ مراد نام کی۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔"
"ہماری تو اس نام کی کوئی ملازمہ نہیں ہے۔" وہ سکون سے بولیں تو ایڈم کا دل دھک سے رہ گیا۔ منہ کھل گیا۔
"نہیں ہے؟ آر یو شیور؟" اس نے جھٹ موبائل نکالا اور ایک تصویر سامنے کی۔ "یہ۔۔۔ یہ آپ کی نوکرانی نہیں ہے؟"
مسز شیلا نے ایک اچٹتی نگاہ سنہرے بالوں والی لڑکی پہ ڈالی۔ "میں تو اس لڑکی کو پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں۔ میں تو اسے نہیں جانتی۔" پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "کچھ اور یا نہیں؟" انداز پر خلوص ہی تھا مگر اس میں عجلت تھی۔ ایڈم کا چہرہ بجھ گیا۔ اپنا آپ انتہائی بے وقوف نظر آنے لگا۔ آہستگی سے اس نے فون جیب میں ڈالا اور نفی میں سر ہلایا۔
"آپ نے اتنا وقت دیا' اس کا شکریہ۔ سوری کہ میں نے یہ وقت ضائع ہی کیا۔" معذرت کر کے وہ لٹکے چہرے کے ساتھ مڑ گیا۔
مسز شیلا اسے جاتے دیکھتی رہیں' پھر واپس اندر آ گئیں۔ لاؤنج میں سامنے تنکو کامل کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر تفکر سے ابرو اکٹھے کیے۔ "تالیہ کا پوچھ رہا تھا؟"
"ہاں۔ میں نے وہی کیا جو آپ نے کہا تھا۔ مگر کامل۔۔۔" وہ الجھیں۔ "ہم تالیہ کے اپنے ہاں کام کرنے کا ہر ریکارڈ کیوں مٹا رہے ہیں۔"
"کیونکہ وہ لڑکا زین العابدین مولیا میرے پاس آیا تھا۔ میرے حریف کی کمپنی سے ہے وہ۔ وہی جس کو تالیہ نے کیپ ٹاپ دیا تھا۔" وہ تلخی سے کہتے ہوئے صوفے پہ جا بیٹھے۔ "وہ مجھے دھمکا رہا تھا کہ وہ جانتا ہے میں نے ان کی پراڈکٹ کا فارمولا چرالیا ہے وہ بھی غیر قانونی ملازمہ کے ہاتھوں۔ جانتی ہو غیر قانونی ملازمہ رکھنا کتنا جرم ہے؟ بہت کریں ہم نے پچتیں۔ وہ کیس کرنے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔ فراڈ' اور چوری میں پکڑا جا سکتا ہوں میں۔ اس لیے ہم گھر سے تالیہ کا سارا ریکارڈ غائب کر دیں گے۔ یہ وان فاتح کا باڈی گارڈ کم اور پولیس کا بندہ زیادہ لگ رہا تھا۔ شاید یہ لوگ میری تفتیش کر رہے ہیں۔" وہ ٹائی ڈھیلی کر رہے تھے گویا سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہو۔
مگر مسز شیلا کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ "تالیہ تصویر میں بڑی فرق لگ رہی تھی۔ بنی سنوری مختلف سی۔"
"اتنے پیسے لے کر گئی ہے' خود کو سنوارنا آ ہی گیا ہو گا۔ بہرحال آئندہ میں تالیہ کا نام نہ سنوں۔" وہ دوٹوک انداز میں کڑوے پن سے بولے تو مسز شیلا نے شانے اچکا دیے۔ (بس سارے مسئلے میرے ملازموں سے ہی ہوتے ہیں ان کو۔ ہونہہ) اور سر جھٹک کے آگے بڑھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

حالم کے گھر پہ بھی دوپہر ڈھل چکی تھی اور شام کی آمد آمد لگتی تھی۔ داتن تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی، جہاں میز پہ چند مشینیں اور آلات رکھے تھے۔ تالیہ زمین پہ بیٹھی تھی اور گود میں ایک ڈبہ اٹھا رکھا تھا جس میں لاکٹ ڈال رہی تھی۔ ڈبہ اسی ڈیزائنر جیولر کا تھا۔ آگے پیچھے چار ایسے ہی ڈبے رکھے تھے گویا ان کو مشکل وقت کے لیے جمع کر رکھا ہو۔

"کیسے چرایا؟" وہ کمر پہ ہاتھ رکھے اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی۔

"ملک شیک اس کام۔" ہنس کر بولی اور ڈھکن احتیاط سے بند کیا۔

"خریدنا تو تمہاری شان کے خلاف ہے۔"

"اب میں اپنی حرام کی کمائی ایک سیاست دان کی بیوی پہ کیوں خرچ کروں بھلا' ہاں!" وہ بے نیازی سے بولی اور ڈبہ لیے اٹھی۔

داتن نے ایک نظر اطراف میں ڈالی۔ کمرے کے چاروں کونوں میں لکڑی کے بند ڈبے رکھے تھے۔ نوادرات اور پینٹنگز جو اتنے سال میں انہوں نے اکٹھی کی تھیں۔ یہ تالیہ کا حصہ تھا۔ داتن اپنا کہاں رکھتی تھی' اس نے کبھی نہیں بتایا۔ ایک سیف بھی بنا تھا جس کے لاک جدید طرز کے تھے اور اس میں تمام ہیرے' جواہرات مقفل رکھے تھے۔ مگر جزیرے' محل خریدنے کے لیے یہ سب کم تھا۔

"میں اب ڈنر کے لیے تیار ہونے جا رہی ہوں۔" وہ ڈبہ اٹھا کے اٹھ گئی تو داتن نے اس کے جانے کا انتظار کیا۔ پھر تیزی سے میز تک آئی۔ آنکھوں پہ چشمہ چڑھایا اور پرس سے ایک پرنٹ آؤٹ نکال کے سامنے کیا۔ تالیہ کی گردن کے پیچھے والا گول نشان۔ احتیاط سے سیڑھیوں کو دیکھا۔ تالیہ اب نہیں آئے گی۔ اس نے گہری سانس لی اور بیگ سے ایک چھوٹی مگر دبیز کتاب نکالی۔ اس کی جلد چمڑے کی تھی اور اس کے بھورے سرورق پہ زرد رنگ سے وہی نشان بنا تھا۔ نیچے قدیم جاوی رسم الخط میں لکھا تھا۔

"ہم شکار باز۔" اس نے کتاب کے بوسیدہ صفحے کھولے۔ پہلے پہ لائبریری کی مہر تھی۔ داتن نے اگلا صفحہ پلٹا اور پڑھنا شروع کیا۔



شیشوں سے ڈھکی تکون عمارت کے اندر شام کے اس پہر بھی مصروف ماحول بنا ہوا تھا۔ پارٹی کارکن کام کر رہے تھے' ٹائپنگ کی آوازیں' فون کی گھنٹیاں... ایسا ہی رش وان فاتح کے آفس میں بھی لگا تھا۔ وہ کنٹرول چیئر پہ پیچھے ہو کر بیٹھا تھا اور مسکرا کے سامنے بیٹھی خاتون کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا جو ہاتھ میں ننھا ریکارڈ مائیک پکڑے اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔ فوٹوگرافر تصاویر اتار رہا تھا۔ انٹرویو اپنے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

"وان فاتح! کیا یہ درست ہے کہ آپ استعفیٰ دے کر امریکہ منتقل ہو رہے ہیں؟" وہ خشک سپاٹ انداز میں نظریں اس پہ جمائے پوچھ رہی تھی۔ وہ اسی سکون سے پیچھے کو ٹیک لگائے مسکراتے ہوئے اسے دیکھے گیا۔ گرے شرٹ پہنے' کف موڑے' بال دائیں طرف کو پیچھے کیے' اس کی چھوٹی چمکتی آنکھوں میں زمانے بھر کی سادگی تھی۔

"مدی! میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا جس کو وجہ بنا کے لوگ اس خبر کو چلائیں۔"

"مگر آپ اس کی تردید بھی نہیں کر رہے۔ ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔"

"میں تو تعلیمی بل کا سوچ رہا ہوں۔"

"آپ کے خیال میں اشعر محمود چیئرمین بننے کے اہل ہیں؟"

"اشعر بہت قابل اور بہت ٹیلنٹڈ نوجوان ہے' میرا خیال ہے وہ زندگی میں بہت ترقی کرے گا' اور میں اس کو

زندگی کے ہر نیک مقصد کے لیے گڈ لک کہتا ہوں۔ اشعر میری فیملی ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے۔" مگر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کے ساتھ کچھ اور بھی تھا جو رپورٹر کو مزید سوالات پہ اکسا رہا تھا۔

"کیا آپ اپنی جگہ اشعر محمود کو چیئرمین کے طور پہ قبول کرلیں گے؟"

فاتح نے گردن موڑ کے سیکرٹری کو دیکھا اور مسکرا کے پوچھا۔ "تم نے مہمانوں کو کافی پیش نہیں کی؟" رپورٹر گہری سانس لے کر تھم گئی اور کیمرے گرانے کا اشارہ کردیا۔ اپنا ریکارڈر بھی بند کردیا۔ سیکرٹری سر ہلا کے فوراً" باہر نکل گیا۔ کچھ لمحوں بعد ٹرے کے ساتھ آمد ہوئی جس پہ چند مگ رکھے تھے۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا' وان فاتح۔" وہ شکوہ کرتے ہوئے ایک مگ اٹھا کے بولی اور گھونٹ بھرا۔

"جو بات ہوئی ہی نہیں ہے' میں اس کے بارے میں رائے کیسے دے سکتا ہوں' ہدی!" وہ اسی طرح ٹیک لگا کے مسکرا رہا تھا۔ سیکرٹری نے اس کا مگ اس کے سامنے رکھا مگر اس نے اسے نہیں چھوا۔ وہ رپورٹر پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"لیکن اب آپ کو اس بات کی وضاحت۔۔۔" کہتے کہتے لڑکی نے مگ سے گھونٹ بھرنے کے لیے اسے چہرے کے قریب کیا تو چونکی۔ بالکل سن۔ شل۔ مگ کو اوپر لا کے دیکھا۔ سرخ رنگ کا مگ جس پہ چند سمبلز بنے تھے۔ اس نے فوراً" دوسرے مگز دیکھے جو سادہ سفید رنگ کے تھے۔ اب کے اس نے عجیب سی نظریں وان فاتح کی جانب اٹھائیں۔

"یہ مگ۔۔۔"

"اشعر نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ چند برس پہلے۔ میں آفس پہ اتنا خرچا کرتا نہیں ہوں' اس لیے نئے مگ ٹوٹ جائیں تو یہ لوگ پرانے نکال لیتے ہیں۔" مسکرا کے کہتے ہوئے اس نے اپنا مگ اٹھایا اور پینے لگا۔ مگر لڑکی یک ٹک اس مگ کو دیکھے جارہی تھی۔

"اور اشعر صاحب کو یہ مگ کسی نے سوونیئر کے طور پہ دیا ہوگا؟"

"ہاں۔ شاید اس کے دوستوں نے۔ مگر خیر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ انسان کے ہر طرح کے دوست ہوتے ہیں۔" مگر رپورٹر نے مگ اسی طرح بھرا ہوا واپس رکھ دیا۔ اس کا دماغ چونکا ہوا لگتا تھا۔ گردن موڑ کے اس نے فوٹو گرافر کو خفیف سا اشارہ کیا۔

(اس مگ کی تصویر لو۔) اور واپس وان فاتح کی طرف متوجہ ہوئی جو اب کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ "ہم اس کو ریپ اپ کرسکتے ہیں اب؟ مجھے ایک ڈنر پہ پہنچنا ہے۔"

"سر! بس دو سوالات مزید۔" وہ بشاشت سے کہتی سلسلہ کلام وہیں سے جوڑنے لگی۔ اس کو خبر مل گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سب تمہارے لیے
جانِ جاں یہ جہاں
یہ زمیں آسماں
یہ مرے رات دن
خاک ہیں تیرے بن
یہ مری زندگی
دوستی، دشمنی
راستے، واسطے
سب تمہارے لیے
تم جو دیکھو تو میرے شب و روز کو
کوئی مطلب ملے
تم جو پوچھو تو میرے ہر اک حرف کو
کوئی رتبہ ملے، کوئی منصب ملے
تم جو چاہو تو میری تگ و تاز کو
کوئی رستہ ملے، کوئی مرکب ملے
تم جو سوچو مرے واسطے کچھ کبھی
میں ستاروں کو مٹھی میں بھر لاؤں گا
تم اگر ایک دن مجھ کو آواز دو
میں جہاں پر بھی ہوں
لوٹ کر آؤں گا
یہ مرے جسم و جاں
میرے شعر و سخن
میری آبادیاں
میری تنہائیاں
میری ہر آرزو
میری مایوسیاں
اب تمہارے لیے
سب تمہارے لیے

امجد اسلام امجد

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں

زمانے کے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
ہم ہی جانتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

غنیمت ہے چشمِ تغافل بھی ان کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

سلامت رہے دل، برا ہے کہ اچھا
ہزاروں میں ہر ایک دم دیکھتے ہیں

رہا کون محفل میں اب آنے والا
وہ چاروں طرف دم بہ دم دیکھتے ہیں

ادھر شرم حائل، ادھر خوف مانع
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

داغ دہلوی



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
(دنیا میں) اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو۔ اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو، اس سے یہ ہو گا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

فوائد و مسائل

نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے کم ہے۔ اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

حسن سلوک

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنی ساس حضرت علیؓ کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد کی حقیقی ماں کی طرح دل و جان سے خدمت کرتی تھیں۔ حضرت فاطمہ بنت اسدؓ کا بیان ہے۔

"جس قدر میری خدمت فاطمہؓ نے کی ہے شاید ہی کسی بہو نے اپنی ساس کی اتنی خدمت کی ہو۔"

مقام مراد

دعا کے بارے میں مجھے کامل یقین ہے کہ خلوص سے نکلی ہوئی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قبولیت انسان کی مرضی کے مطابق ہو یا اللہ کی مرضی کے مطابق۔ جو خوش قسمت لوگ اپنی خواہشات اور مرضی کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع رکھتے ہیں کامیاب ہو جاتے ہیں، ان کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہوتی ہیں۔ اگر ان کی دعا ان کی اپنی خواہش کے مطابق پوری ہو جائے تو وہ اس نعمت پر سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں اور اگر ان کی خواہش کے مطابق نہ پوری ہو تو وہ اسے بھی اللہ کی رضا کے مطابق قبولیت ہی سمجھتے ہیں اور اس کے سامنے بصد خوشی سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

(قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ)

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران ۔ کراچی

کوشش جاری رکھیں

آپ اڑ نہیں سکتے تو دوڑ لگایئے، دوڑ نہیں سکتے تو تیز قدموں سے چلیں۔ قدم اٹھا نہیں سکتے تو گھسٹتے چلے جایئے مگر کبھی رکیں نہیں، ٹھہریں نہیں۔ کہ جیون مسلسل تحریک کا نام ہے جمود کا نہیں۔

(مارٹن لوتھر کنگ)

عنبا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

پاکستانی خواتین کے چند طنز و طعنے

- آپ کے سارے بھائی اتنے چالاک ہیں آپ کیوں اتنے بے وقوف ہیں؟
- سارے پیسے آپ نے توڑ مروڑ کر برباد کر دیے ہیں۔
- آپ کے گھر والوں نے کبھی مجھے بہو تسلیم نہیں کیا۔
- آپ کبھی میری بات نہیں مانتے۔
- میری طبیعت اتنی خراب ہے لیکن آپ کو تو پروا ہی نہیں۔
- بچے میری بات نہیں مانتے اور آپ انہیں کچھ نہیں کہتے۔
- مجھے لگتا ہے میں کوئی فالتو چیز ہوں۔
- میں کبھی آگے سے بولی ہوں۔
- اپنی دفعہ آپ کو بڑا غصہ آتا ہے۔

٭ آپ نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔
٭ آپ کے بھائی ہر بات میں بیویوں سے مشورہ کرتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔

(مشتاق احمد یوسفی)

ہمزہ، اقرا۔ کراچی

سبق

استاد اور کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن سبق وہی یاد رہتا ہے جو وقت سکھاتا ہے۔

بلقیس عبدالحمید خان

نمک پارے

٭ کہتے ہیں کہ آواز کی رفتار روشنی کی رفتار سے کم ہوتی ہے، ٹھیک کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے بزرگ ہمیں جو باتیں بچپن میں بتاتے ہیں وہ ہمیں چالیس برس بعد سنائی دیتی ہیں۔
٭ ایک فلسفی کا آخری وقت تھا۔ اس نے مشورہ دیا۔ "اگر میرے جنازے کو بیٹے پیدل کر کے لے جاؤ تو چار آدمیوں کے بجائے ایک آدمی بھی کافی ہے۔"
٭ ٹیلی وژن کی ایجاد سے پہلے کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ سر درد دیکھنے میں کیسا ہوتا ہے۔

سمیعہ وسیم۔ سکھر

تنقید

جب آپ کسی آدمی پر تنقید کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس میں نقص نکالنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ سارے کا سارا آپ کی سمجھ میں آنے لگتا ہے اور ایکسرے کی طرح اس کے اندر اور باہر کا وجود آپ کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

(اشفاق احمد)

نعمت

جن کے دلوں میں رحم، طبیعت میں سادگی، احساس میں خلوص اور سوچوں میں سچائی ہو، ایسے انسانوں کا وجود اللہ کی طرف سے مخلوق کے لیے نعمت ہے۔

صائمہ عبدالحمید۔ خیرپور میرس

اعتماد

ہمسائے نے شکایت کی۔ "دیکھیے جناب! کل آپ کے بیٹے نے مجھے ایک پتھر مارا۔"
"وہ پتھر آپ کو لگا؟"
"نہیں۔"
"تو پھر وہ میرا بیٹا نہیں کسی اور کا بیٹا ہوگا۔"

راز

مشہور کروڑپتی پال گیٹی سے کسی نے پوچھا۔ "تمہاری دولت مندی کا راز کیا ہے؟"
"بہت سادہ، شادی نہ کرو اگر محبوبہ رکھنی ہو تو امیر لڑکی کا انتخاب کرو تاکہ اسے تمہاری دولت کی ضرورت نہ ہو۔"

ندا طارق۔ فیصل آباد

باتیں اشفاق احمد کی

- جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو وہ ماضی جھوٹا ہے۔
- اپنی دلیل ترک لو۔ بندہ بچالو۔ اسے ذبح نہ ہونے دو کیونکہ وہ زیادہ قیمتی ہے۔
- مومن وہ ہے جو ماضی میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔
- الفاظ گولیوں کی مانند ہوتے ہیں۔ انہیں استعمال کرنے سے پہلے ذہن کو صاف کرلیں ____ جس طرح آپ پستول کو صاف کرتے ہیں۔

عظمیٰ، نادیہ۔ کراچی

باذوق

"کیسے بدذوق لوگ فلم دیکھنے آجاتے ہیں۔ کل میرے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی مسلسل سوتا رہا۔"
"لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"اس کے خراٹوں سے کئی مرتبہ میری اپنی آنکھ کھلی۔"

صدف عمران۔ کے ڈی اے

استانی جی کا اپنے منگیتر کو جوابی خط

مائی ڈیر تاج الدین

سلام محبت!

تمہارا املا کی غلطیوں سے بھرپور مراسلہ ملا۔ جسے تم بدقسمتی سے "محبت نامہ" کہتے ہو، کوئی مسرت نہیں ہوئی۔ یہ خط بھی تمہارا پچھلے خطوط کی طرح بے ترتیب اور بے ڈھنگا تھا۔ اگر خود صحیح طرح نہیں لکھ سکتے تو کسی سے لکھوالیا کرو۔

خط سے آدھی ملاقات ہوتی ہے اور تم سے آدھی ملاقات بھی اتنی دردناک ہوتی ہے کہ بس۔ اور ہاں یہ جو تم نے میری شان میں قصیدہ لکھا ہے یہ دراصل قصیدہ نہیں بلکہ ایک فلمی گانا ہے اور شاید تمہارے علم میں نہیں کہ فلم میں یہ گانا ہیرو نے اپنی ماں کے لیے گایا ہے۔

اور سنو! پان کم کھایا کرو۔ خط میں جگہ جگہ پان کے دھبے صاف نظر آتے ہیں۔ ایک بات تم سے اور کہنی تھی کہ کم از کم اپنا نام تو صحیح لکھا کرو۔ یہ "تاجو" کیا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی قصائی یا دودھ والے کا نام ہو۔ مختصر لکھنا ہی ہے تو صرف "تاج" لکھ دو۔ آخر میں تم نے جو شعر لکھا ہے، وہ تو اب رکشہ والوں نے بھی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔

بس یہی کہنا ہے

فقط

تمہاری بانو

عمل

آسکر وائلڈ نے ایک بار عمل کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"عمل کرنے کی وجہ دراصل تخیل کی کمی ہے۔ وہ جو خواب نہیں دیکھ سکتے، بے چارے آخری حربے کے طور پر اسے استعمال کرتے ہیں۔"

یاد ہے،

دو سکھ شکاریوں نے ایک ہوائی جہاز کرائے پر لیا اور دو گینڈے شکار کرکے اس پر لادنے لگے۔ جہاز کے پائلٹ نے کہا۔

"وزن بہت زیادہ ہے جہاز اتنا وزن نہیں اٹھا سکتا۔"

سکھ شکاریوں نے جواب دیا۔ "پچھلی مرتبہ بھی ہم دو گینڈے جہاز پر لے گئے تھے۔ اس جہاز کے پائلٹ نے تو انکار نہیں کیا تھا۔"

آخر پائلٹ راضی ہوگیا۔ جہاز اڑنے کے تھوڑی دیر بعد نیچے گر گیا۔ کچھ دیر بعد ایک سکھ کو ہوش آیا تو اس نے دوسرے شکاری سے کہا۔

"ہری سنگھ! تمہیں یاد ہے، پچھلی بار بھی ہم یہیں گرے تھے۔"

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

غنیمت،

وقت نے مٹا ڈالے وہ گلاب سے رخسار
اب تو زندہ چہروں کی دلکشی غنیمت ہے
اک گفتگو تو ہے، اک جستجو تو ہے
اس صدی میں پھر یارو! عاشقی غنیمت ہے

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

بات صرف یہ ہے،

بچہ اپنی ماں سے بولا۔ "امی! آپ نے کہا تھا ناکہ انسان کو امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

ماں نے جواب دیا۔ "جی بیٹا! میں نے کہا تھا۔"

بچہ پھر بولا۔ "ماں! آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔"

ماں نے بچے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! آخر بات کیا ہے؟ تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔"

بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بات صرف یہ ہے کہ میں امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔"

کرن رحمٰن۔ گوجرہ



فوزیہ ثمر بٹ کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔
آپ سب بھی پڑھیے۔

شاعر

کیسے کاریگر ہیں یہ
اس کے درختوں سے
لفظ کاٹتے ہیں اور سیڑھیاں بناتے ہیں
کیسے باہنر ہیں یہ
غم کے بیج بوتے ہیں
اور دلوں میں خوشیوں کی کھیتیاں اگاتے ہیں
کیسے چارہ گر ہیں یہ
وقت کے سمندر میں
کشتیاں بناتے ہیں، آپ ڈوب جاتے ہیں

عذرا ناصر/اقصیٰ ناصر کی ڈائری سے

سلیم کوثر کی یہ غزل پتا نہیں کب میری ڈائری کی زینت بنی۔ آج ایک پرانی ڈائری اٹھائی تو نظر پڑی۔ قارئین کے ذوق کی نذر کر رہی ہوں۔

تاروں کی گرد صبح کا ہنگام ہی تو ہے
مل کر گزار لیجیے اک شام ہی تو ہے

پہلے مزاج کے تیور تو دیکھ لیں
پھر دیکھ لیں گے، گردشِ ایام ہی تو ہے

اے حسنِ یار تیرے تغافل کی خیر ہو
بے چینیوں میں بھی ہمیں آرام ہی تو ہے

پھر بھی بہ قدرِ ظرف پہنچتا ہے سب کے پاس
کہنے کو اس کے ہاتھ میں اک جام ہی تو ہے

آغاز کی خبر ہی نہیں ہے ہمیں تو پھر
جس حال میں رواں ہیں، یہ انجام ہی تو ہے

تم نے اسے سنا ہی نہیں غور سے کبھی
یہ خامشی بھی اصل میں کہرام ہی تو ہے

وہ جو کسی کی بات نہیں مانتا سلیم
دیکھیں تو بھیج کر اسے پیغام ہی تو ہے

نوال افضل گھمن کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر نوشی گیلانی کی یہ غزل نادیہ، بشریٰ، مقصود کے نام۔

میری آنکھوں کو سوجھتا ہی نہیں
یا مقدر میں راستہ ہی نہیں

وہ شہر میں کسی سے بھی
میرے بارے میں پوچھتا ہی نہیں

پھر وہی شام ہے وہی ہم ہیں
ہاں مگر دل میں حوصلہ ہی نہیں

ہم چلے اس کی بزم سے اٹھ کر
اور وہ ہے کہ روکتا ہی نہیں

دل جو اک دوست تھا مگر وہ بھی
چپ کا پتھر ہے، بولتا ہی نہیں

میں تو اس کی تلاش میں گم ہوں
وہ کبھی مجھ کو ڈھونڈتا ہی نہیں





باتیں گوہر ممتاز سے

شاہین رشید

1۔ "اصلی نام؟"

"گوہر ممتاز۔"

2۔ "پیار کا نام؟"

"مون۔"

3۔ "تاریخ پیدائش / شہر؟"

"1981ء 27 جولائی / لاہور۔"

4۔ "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"

"چار ہیں، دو بہنیں ہم دو بھائی، میرا نمبر تیسرا ہے۔"

5۔ "تعلیم؟"

"بی ایس سی آنرز کمپیوٹر انجینئر ہوں۔"

6۔ "قد / ستارہ؟"

"6 فٹ / لیو۔"

7۔ "شادی ہوئی؟"

"جی بالکل ہوئی" تقریباً" دو سال ہو گئے ہیں اور ہماری شادی پسند کی ہے۔"

8۔ "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"جب شوٹ ہوتی ہے تو آٹھ بجے اٹھ جاتا ہوں.... ورنہ پھر اپنی مرضی سے اٹھتا ہوں۔"

9۔ "صبح کی آپ کی عادت؟"

"صبح اٹھ کر میری ایک عادت ہے کہ میں پندرہ منٹ کسی سے بات نہیں کرتا.... دنیا میں واپس آنے میں ٹائم لگتا ہے اور میری یہ عادت بچپن سے ہے۔"

10۔ "کس کو دیکھے بنا ناشتہ نہیں کرتا؟"

"ٹی وی کو (قہقہہ)۔"

11۔ "بچپن میں والدین کی کون سی بات بری لگتی تھی؟"

"ہوم ورک کر لو۔ کھیلنے نہ جاؤ تم۔ پڑھ لو۔ بس یہی باتیں۔"

12۔ "ایک پسندیدہ کھانا جو آپ کھا کر کبھی بور نہیں ہوتے؟"

"میں نہاری اور حلیم کھا کر بور نہیں ہوتا۔"

13۔ "جسمانی ساخت میں کیا کمی ہے؟"

"الحمدللہ.... میں بہت خوش ہوں۔ کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔"

14۔ "کیا کھا کر بھوک مٹاتے ہیں وقتی طور پر؟"

"فش برگر۔"

15۔ "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"تبدیلی سے زیادہ تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کی ضرورت ہے.... تعلیم تو ایک پودا ہے جو آج لگائیں گے تو کل اس کا پھل کھائیں گے۔ قانون کو لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔"

16۔ "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"بہت سے لمحات آئے ہیں۔ جن میں نے بیسٹ ایشین بینڈ کا ایوارڈ جیتا.... انڈیا میں جا کر انڈین ایوارڈ جیتنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ بہت سے ایوارڈ جیتے ہیں اور سب پر فخر ہوا۔"

17۔ "تھکن میں بھی چلے جاتے ہیں؟"

"جم۔"

18۔ "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی بھی ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ میں سوچتا زیادہ ہوں۔ کم سوچنا چاہیے۔"

19۔ "ضدی ہیں؟"

"طبیعت میں ضد نہیں ہے۔ مگر کام سے ضد ہے۔"

20۔ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"یہی... جس پر ہم بات کر رہے ہیں۔"

21۔ "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟ اور مہینہ بھی؟"

"اتوار کا دن... بہت اچھا لگتا ہے اور اکتوبر کا مہینہ... کیونکہ گرمیاں جا رہی ہوتی ہیں اور سردیاں آ رہی ہوتی ہیں۔"

22۔ "غصے میں آپ کی کیفیت؟"

"کم آتا ہے، مگر جب آتا ہے تو ڈرامہ سیریل "گھائل" والا۔ کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں پانی پی کر۔"

23۔ "خواتین میں کیا بات دیکھتے ہیں اگر اچانک سامنے آجائیں تو؟"

"میں ان کی آنکھیں اور ہاتھ دیکھتا ہوں۔"

24۔ "خواتین کی کیا بات بری لگتی ہے؟"

"خواتین میں کوئی بات بری نہیں لگتی۔ وہ ہمیشہ تعریف کے قابل ہوتی ہیں۔"

25۔ "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"اپنی ماں کے غصے سے۔"

26۔ "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"چیز تو خیر نہیں، مگر میں میچور وقت سے پہلے ہو گیا تھا۔"

27۔ "آپ بچت کرتے ہیں؟"

"بالکل کرتا ہوں اور پراپرٹی کی شکل میں کرتا ہوں۔"

28۔ "جوائنٹ اکاؤنٹ پسند کرتے ہیں یا؟"

"کوئی مسئلہ نہیں... جو بھی ہو جائے۔ ویسے جوائنٹ میں پتا چلتا رہتا ہے کہ خرچے کس کے زیادہ ہو رہے ہیں اور کیا ہو رہے ہیں۔"

29۔ "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"کسی بھی ملک کی نہیں، میرا وطن پاکستان ہے اور یہی رہے گا میری بیگم البتہ برٹش نیشنل ہیں۔"

30۔ "پیسہ خرچ کرتے وقت سوچتے ہیں؟"

"میں پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں بڑا سمجھ دار انسان ہوں، اس لیے بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہوں۔"

31۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"لاہور اور کراچی کی "دو دریا۔"

32۔ "تحفہ دیتے ہیں یا کیش؟"

"ہمیشہ تحفہ دیتا ہوں۔ اور تحفہ ہی دینا چاہیے۔ اور دوسروں سے بھی یہی امید رکھتا ہوں کہ تحفہ دیں۔"

33۔ "برا وقت کبھی گزارا؟"

"ہاں... جب میرا "بینڈ" ٹوٹا تھا۔"

34۔ "پسندیدہ ایئرلائن؟"

"امارات۔"

35۔ "پسندیدہ کھلاڑی جس کے بغیر کرکٹ کا مزہ نہیں؟"

"پہلے وسیم اکرم تھے۔ آج کل یونس خان اور مصباح الحق ہیں۔"

36۔ "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"

"منحصر ہے کہ اپنے کون ہیں، پرائے کون ہیں۔ اپنوں میں صرف آپ کے بلڈ ریلیشن ہی ہوتے ہیں جو مخلص ہوتے ہیں... باقی کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

37۔ "چھٹیاں کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"

"ابھی استنبول گیا تھا بیگم کے ساتھ پھر اسکردو بھی جا چکا ہوں اور تھائی لینڈ میں بھی مزہ آتا ہے۔"

38۔ "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"سوٹ بہت پسند ہے... اور causal جینز بہت پسند ہے۔"

39۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"دیکھنی کیا... میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے بہت اچھی بیگم ملی۔"

40۔ "آزمائش کے وقت کے لیے کیا کہیں گے؟"

"آزمائش کا وقت آئے، کے لیے یہی کہوں گا کہ اچھے

وقت کے سب ساتھی ہوتے ہیں۔"
41۔ "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"
"دونوں اگر ہو جائیں تو کیا ہی بات ہے۔"
42۔ "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"گھر کے ڈرائنگ روم میں اور گھر میں بنائے گئے اسٹوڈیو میں بہت خاموشی اور سکون ہوتا ہے۔"
43۔ "ایک آرٹسٹ جن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"
"مائرہ خان۔"
44۔ "حسین عورتوں کے ساتھ کام کرنا کیسا لگتا ہے؟"
"جس کے ساتھ اچھی کیمسٹری ڈیولپ ہو جائے اس کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"
45۔ "کس کے SMS کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"
"اپنے والد کے۔"
46۔ "بوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟"
"کوئی نیا گانا بنا کے یا "پی ایس" کھیل کے۔"
47۔ "ایک کردار جو ہٹ ہوا؟"
"جو بہت ہٹ ہوا وہ "گھائل" کا اور "تنہائی" کا۔"
48۔ "کوئی کردار جس کو کرنے سے انکار کیا ہو؟"
"میں بہت سے کردار کرنے سے انکار ہی کرتا ہوں۔ میں نے بہت کام چھوڑا۔۔۔"
49۔ "اگر آپ کے بریف کیس کی تلاشی لی جائے تو؟"
"پاور بنک چارجر نکلے گا۔ تین مختلف گھڑیاں نکلیں گی۔ ایک میڈیکل باکس نکلے گا اور ایک ڈائری اور ایک پین اور ایک جیکٹ۔۔۔ کیونکہ آج کل سردیاں ہیں۔"
50۔ "مہمان بننا اچھا لگتا ہے یا ان کا آنا؟"
"مہمان بننا اچھا لگتا ہے۔"
51۔ "کون سی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"گٹار جمع کرنے کا۔۔۔ اور میرے پاس ہر طرح کے گٹار موجود ہیں۔۔۔ اور اب سوچ رہا ہوں کہ ہر طرح کی گاڑیاں جمع کروں۔"
52۔ "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"بری نہیں لگتی ۔۔۔ اور اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔"
53۔ "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"بہت زیادہ۔۔۔ کہیں جانا ہو، شوٹ ہو، سب سے پہلے میں ہی پہنچتا ہوں۔"
54۔ "اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اسٹوڈیو کا سامان اور گاڑی۔"
55۔ "کھانے کے لیے بہترین جگہ اپنا بیڈ، ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"
"اپنا بیڈ۔۔۔" ہنستے ہوئے۔
56۔ "ہاتھ سے کھاتے ہیں؟"
"زیادہ تر چھری کانٹے کا استعمال کرتا ہوں۔"
57۔ "کردار، اداکار کی شخصیت کے قریب ہوتے ہیں؟"
"بالکل بھی نہیں ہوتے۔ آپ کو ایک مختلف بندہ لے کر آنا پڑتا ہے۔"
58۔ "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"اتنی زیادہ نہیں ہے۔ بیلنس ہے۔"
59۔ "کب اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر محسوس کرتے ہیں؟"
"جب مجھے کوئی یہ کہہ دے کہ آپ نے اس ملک کے لیے بہت contribute کیا ہے۔ آپ نے "عادت" گانے کے بعد میوزک کا ٹرینڈ بدل دیا اور جب میری اداکاری کی تعریف کرتے ہیں تو بس مجھے میری محنت وصول ہو جاتی ہے۔"
60۔ "پسندیدہ کھانے کی کوکنگ کر لیتے ہیں؟"
"بالکل بھی نہیں صرف انڈا ہی بنا لیتا ہوں۔"
61۔ "عشق کے بخار چڑھے؟"
"بہت۔۔۔ جب چھوٹا ہوتا تھا۔۔۔ اور چڑھنا چاہیے اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔"
62۔ "ایک سوال جو ہر صحافی کرتا ہے؟"
"آپ اور عاطف میں کیا ہوا تھا۔"

63۔ ”کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟“

”قہقہہ.... کسی کرپٹ سیاست دان کو اغوا کروں گا اور اس ملک سے جتنا بھی اس نے ناجائز کمایا ہے وہ وصول کر کے گورنمنٹ کے خزانے میں ڈلوا دوں گا۔“

64۔ ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“

”محبت جوا ہوتی ہے.... اور اندھی بھی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے کہ سچی محبت کرنے والا مل جاتا ہے۔“

65۔ ”کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“

”چھپکلی اور لال بیگ۔ ویسے لال بیگ کو عموماً“ مار دیتا ہوں۔“

66۔ ”شادی کی پسندیدہ رسم؟“

”جب مہندی پہ دوست کاندھے پہ اٹھا کر دولہا کو لے جاتے ہیں۔“

67۔ ”ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟“

”ماں کے ہاتھ کا کھانا اور بیگم کے ہاتھ کا ناشتہ۔“

68۔ ”کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟“

”عمران خان سے تو مل چکا ہوں.... ایک خاتون آرٹسٹ ہیں کیتھرین زیٹا جونز ان سے ملنے کی خواہش ہے۔“

69۔ ”اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟“

”میرا فون نمبر گزشتہ 13 سال سے نہیں بدلا۔“

70۔ ”فوبیا ہے؟“

”مجھے پانی کا فوبیا ہے۔“

71۔ ”کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟“

”اپنے سن گلاسز، فون، چارجر وغیرہ۔“

72۔ ”آپ کی زندگی عام لوگوں جیسی ہے؟“

”عام سے بھی عام لوگوں کی طرح....“

73۔ ”اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟“

”فوراً نہیں.... تھوڑی دیر لگاتا ہوں۔“

74۔ ”امی ناراض ہو جائیں تو؟“

”تو ان کو مناتا ہوں۔ ان کے پیر دباتا ہوں۔“

75۔ ”دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟“

"دل کی سنتا ہوں اور دماغ کو استعمال کرتا ہوں اور پھر دل اور دماغ دونوں کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔"
76۔ "بچپن کا کوئی کھلونا جو ابھی بھی ہے آپ کے پاس؟"
"بچپن میں ابو میرے لیے ایک کار لے کر آئے تھے' وہ ابھی تک ہے میرے پاس۔"
77۔ "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہے؟"
"نہیں نہیں.... میں Avoid کرتا ہوں.... اگر میری بیگم اپنے گھر والوں سے بات کر رہی ہوں فون پر یا کہیں بھی .... یا گھر میں دو افراد بات کر رہے ہوں تو پھر میں قریب نہیں جاتا۔"
78۔ "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب آپ پلے لینڈ جائیں اور آپ کا دل چلا رہا ہو بچوں کی کار چلانے کو.... تو خیال آتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ بچہ بنا ہوا ہے۔"
79۔ "نیند جلد آجاتی ہے؟"
"تھوڑی دیر لگتی ہے.... جلدی نہیں آتی۔"
80۔ "سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"
"لیپ ٹاپ.... ہیڈ فون اور دیگر ضروری چیزیں۔"
81۔ "خدا کی حسین تخلیق؟"
"نیچر۔"
82۔ "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"جب کوئی کری ایٹو کام کرنے کو نہ ہو۔"
83۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا ضروری ہے؟"
"سلاد ہونا بہت ضروری ہے۔"
84۔ "ویلن ٹائن ڈے مناتے ہیں؟"
"بالکل مناتا ہوں۔"
85۔ "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"
"محنت سے آپ کام کرتے ہیں 'قسمت ساتھ دیتی ہے۔"
86۔ "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"بہت برا لگتا ہے.... اس کی خیر نہیں ہوتی۔"
87۔ "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"جب کوئی مشکل میں ہو.... مصلحتاً" بولتا ہوں۔"
88۔ "بدلہ لیتے ہیں؟"
"میں بدلہ کام سے لیتا ہوں۔"
89۔ "شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"میں نے چاہا تھا کہ سگریٹ چھوڑ دوں.... سو چھوڑ دی ہے۔"
90۔ "24 گھنٹوں میں آپ کا فریش ٹائم؟"
"پانچ بجے کے بعد.... ویسے زیادہ تر رات کو۔"
91۔ "گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ پہلے اپنے گھر والوں کا چہرہ دیکھوں۔"
92۔ "پسندیدہ چینل؟"
"اسپورٹس چینل اور میوزک چینل۔"
93۔ "موبائل سروس آف ہو تو؟"
"تو میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔"
94۔ "وہم جو پریشان کرتا ہے؟"
"اپنوں سے دور ہونے کا.... میری دعا ہے کہ میرے ماں باپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رہے.... ان کے لیے' اپنے بہن بھائیوں کے لیے سب کے لیے بہت دعا کرتا ہوں خیریت' صحت اور زندگی کی۔"
95۔ "آپ کی کوئی ایکسٹرا کوالٹی؟"
"اپنی کوالٹی خود نہیں بتا سکتا۔ لوگوں سے پوچھیں۔"
96۔ "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟"
"اپنے سے بھی اور دوسروں کے تجربے ڈھونڈتا ہوں کہ ان سے بھی سیکھوں۔"
97۔ "آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کیا سوچتے ہیں؟"
"کہ ایسی کیا بات ہے مجھ میں کہ لڑکیاں پاگل ہو رہی ہیں۔ اتنی فین ہو رہی ہیں۔"
98۔ "لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟"
"گانا سنانے کی۔"
۔ "آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو سمجھوں گا کہ اللہ کی آزمائش ہے۔ پھر میں کوئی اور کام کروں گا۔"



خالد جیلانی



عائشہ نایاب ________ کراچی

میری زندگی کی کتاب کا ہے ورق ورق یوں سجا ہوا
سرِ ابتدا، سرِ انتہا، تیرا نام دل پہ لکھا ہوا

مدیحہ نورین مہک ________ گجرات

بات نیت کی ہے صرف ورنہ فیض
وقت سارے دعا کے ہوتے ہیں

نسیم انجم ________ کنگن پور

کچھ اس ادا سے میرے ساتھ بے وفائی کر
کہ تیرے بعد مجھے کوئی بے وفا نہ لگے

شہر بن اعوان ________ سرگودھا

واقف ہے میرے درد سے مری صبح کا اجالا
لاعلم میرے غم سے میری رات نہیں ہے
جس شخص کی یادوں میں بے حال ہیں محسن
وہ ہنس کے یہ کہتا ہے کوئی بات نہیں ہے

صائمہ عبدالحمید ________ خیرپور میرس

سادگی، بانکپن، اغماض، شرارت، شوخی
تم نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اقصیٰ ناصر ________ کراچی

وہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا
وہی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے
تیرا نام لکھنا کتاب پر
تیرا نام پڑھنا کتاب پر

ثمرہ جاوید ________ بسم اللہ پور

بغیر وجہ کے نہیں ہے رنجی مرے ہم ان کو
ضرور ہم سے وہ رغبت زیادہ رکھتے ہیں

سیدہ نسبت زہرا ________ کھر وڈپکا

لوگ کیوں بن کے ابر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
کس لیے جاں سے گزر جاتے ہیں، کبھی سوچا ہے
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پوشاکوں میں
وہ بھی مٹی میں اتر جاتے ہیں، کبھی سوچا ہے

نمرہ، اقرا ________ کراچی

دل ٹوٹ بھی جائے تو محبت نہیں مٹتی
اس راہ میں لٹ کر بھی خسارہ نہیں ہوتا

دانیہ عقیل ________ کراچی

لوگ پڑھ لیتے ہیں چہروں پہ لکھی تحریریں
کتنا دشوار ہے لوگوں سے چھپا کر رونا

نخبہ اکرم ________ گاؤں کوٹیکی

آگہی کا عذاب باقی ہے
کھل گئی آنکھ خواب باقی ہے
وقت تتلی تھا اڑ گیا کب کا
ڈائری میں گلاب باقی ہے

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

شکستہ دل ہوں مگر مسکرا کے ملتا ہوں
اگر یہ فن ہے تو آیا ہے اک عذاب کے بعد

________ کراچی

تمہیں خبر ہی نہیں تم تو لوٹ جاؤ گے
تمہارے ہجر میں لمحہ بھی سال ہوتا ہے

عائشہ صلاح الدین ________ ملتان

اس انداز سے اس شخص کے
پیار بھرے جیون کو پڑھا
کہ وہ مجھ سے بھی نہ جان پایا
کہ اس کی ہر ادا سے واقف ہو گیا کوئی

حیا رانا ________ کبیر والا

تھا منیرؔ آغاز ہی سے راستہ اپنا غلط
اس کا اندازہ سفر کی رائیگانی سے ہوا

ریحانہ چوہدری ________ مدوکے

نادان دل نے بہت آرزوئیں پیدا کیں
مگر نصیب کا لکھا کہ سب کا خون ہوا

✡

خبریں و بریں

واصفہ سہیل

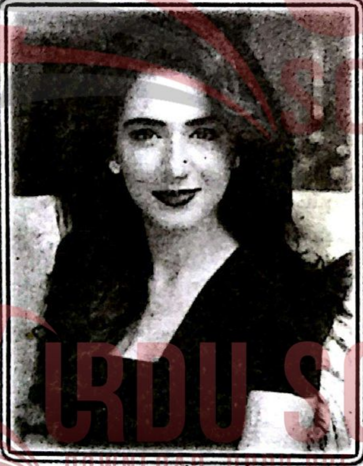


بارہواں کھلاڑی

چیمپنز ٹرافی کا سیزن آیا تو مشہور ماڈل اور اداکار عدنان ملک بھی اپنے بچپن کی کرکٹ یاد کرنے لگے۔ عدنان کہتے ہیں کہ "میں جب بارہ برس کا تھا تو مجھے پاکستان کی نیشنل کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی بننے کا شوق تھا۔ میں گھنٹوں دیوار پر بالنگ کرتا۔ ابو مجھے اپنے اسپتال کی کرکٹ ٹیم کا ہارڈ بال میچ دکھانے کے لیے لے گئے۔ کچھ دن تک تو میں بارہویں کھلاڑی کی حیثیت سے ٹیم کا حصہ بنا (ابو نے بنوایا ہوگا) چوتھے میچ میں ڈاکٹرز نے فیصلہ کیا کہ مجھے بھی ٹیم میں شامل کیا جائے۔ (بارہ برس کی عمر میں.....؟) میں نے ابو کو ایک طرف لے جاکر کہا کہ مجھے نمبر دو پر بیٹنگ کرنی ہے کیوں کہ جاوید میاں داد بھی اسی نمبر پر کھیلتے تھے۔ (نمبر دو پر تو اور بھی لوگ کھیلتے ہیں یعنی بس کھیلتے ہی ہیں..... کرکٹ سے بھی۔) کوئی اوپنر نہیں جانا چاہتا۔ (پتا نہیں کیوں؟) میں نے کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے بال نہ لگ جائے کیوں کہ نیا بال سوئنگ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سب اسی لیے ڈرتے ہیں تم یا تو اوپنر جاؤ یا پھر آٹھویں اور نویں نمبر پر موقع ملے گا۔ بہتر ہے کہ تم اوپنر جاؤ۔ خیر میں نے اپنے سے بڑی عمر کے بالرز کا سامنا کیا (اف یہ عمر ایج کانشس' آج کل لڑکیاں ہی نہیں؟) اور ایک باؤنڈری ماری اور 14 رنز بنائے اگلے میچ میں سنچری کی۔ میرے والد بہت فخر محسوس کررہے تھے۔ (تو پھر کرکٹ میں موقع کیوں نہیں ملا عدنان جو.....؟)

یادیں

خوبرو اداکارہ منشا پاشا اپنے بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ "میں اپنے بچپن کا رمضان بہت زیادہ یاد کرتی ہوں۔ سحری میں اٹھنا ایک خاندانی ایکٹویٹی تھی۔ ٹی وی بند ہوتا تھا۔ (کیوں کہ پی ٹی وی ہی تھا) اور ٹی وی پر کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ہوتا تھا۔ (شیطان قید تھا) بہت سکون اور خاموشی ہوتی تھی۔ یہ سال کا سب سے سادہ مہینہ ہوتا تھا (اور آج.؟) اسکول کی چھٹی





جلدی ہو جاتی تھی (پھر بھی کورس پورا ختم ہو جاتا تھا) ہم گھر آکر سو جاتے تھے اور افطار میں بے دار ہوتے تھے (تو عصر۔۔۔؟) کوئی افراتفری نہیں تھی۔ یہ مہینہ جلدی کا نہیں تھا۔ (تو اب کیوں۔۔۔؟) دنیاوی کاموں کا بھی نہیں تھا۔ (تھا۔۔۔؟) میں اپنی زندگی کے وہ سادہ رمضان بہت یاد کرتی ہوں۔

ارادہ

مومنہ مستحسن نے آفرین آفرین میں اپنی آواز کا جادو جگایا تو اپنے سننے والوں کے دلوں میں گھر کر گئیں۔ تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے کی مومنہ کا کہنا ہے کہ "وہ میوزک کو کیریئر کے طور پر جاری نہیں رکھیں گی۔ وہ مشہور ہونے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تسکین کے لیے گاتی ہیں (اب اتنا اچھا گانے پر تو مشہور ہونا بنتا ہے نا۔۔۔!) مومنہ مزید کہتی ہیں کہ "البم یا گیت مشہور یا ہٹ ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ سنگر بھی اچھا ہے (ہیں۔۔۔! تو۔۔۔ پھر کیا ہے بھئی۔۔۔؟) مومنہ نے نیویارک سے بائیو میڈیکل انجینئرنگ اور اپلائڈ میتھس میں ڈبل میجر کی ڈگری لی ہے (اور میوزک ہے۔۔۔؟)

مومنہ کا ارادہ ہے کہ وہ امریکا آتی جاتی رہیں گی اور میوزک کے ساتھ ساتھ پولیو کے خلاف مہم بھی چلاتی رہیں گی اور دیہاتی بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے سماجی کام بھی کرتی رہیں گی (عزم یا ارادہ۔۔۔؟ کیوں کہ ایسے ارادے تو سب باندھتے ہیں' مگر عمل۔۔۔ ابھی تک تو۔۔۔؟)

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ جملے بازی' فرضی واقعات' من گھڑت قصے' طوطا مینا کی کہانیاں' گمراہ کن مثالیں' لفاظی' حماقت سے لتھڑی ہوئی جذباتیت' دلیل سے خالی مقدمہ' غیر مستند خبروں پر مبنی نام نہاد تجزیے' کھوکھلی پیش گوئیاں' نفرت پر قائم بیانیہ' اپنی عظمت کا خبط' نرگسیت کے پہاڑ پر کھڑے ہو کر عاجزی کا وعظ کرنے کا جنون' جھوٹ اگلتی زبانیں اور تقویٰ کا زعم

حقیقت واقعی خرافات میں کھو گئی ہے۔

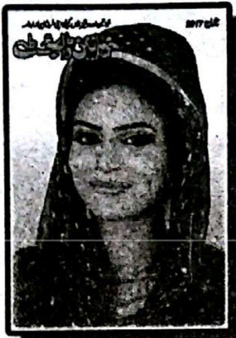
(یاسر پیرزادہ۔۔۔ ذراہٹ کے)

☆ ہیروں کے اس نولکھا ہار (جے آئی ٹی) کے ایک ایک ہیرے نے اب تک کی شان دار کارکردگی کے ذریعے پوری دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ وہ واقعی لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک ہے۔ وہ یقینی طور پر ایک تاریخ لکھ رہے ہیں۔ خود تاریخ ان کے بارے میں کیا لکھے گی۔ یہ دیکھا جائے گا۔

(عطاء الحق قاسمی۔۔۔ روزن دیوار سے)

☆ میرے ذاتی خیال میں جے آئی ٹی اپنے "ہدف" پر پوری طرح فوکس ہے۔ جو یہ ہے کہ دستاویزات اور شہادتوں وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر وزیر اعظم نواز شریف اور ان کے خاندان کو "مجرم" ثابت کیا جائے۔ وہ پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ اس مقصد عظیم کے لیے کوشاں ہے۔

(عطاء الحق قاسمی۔۔۔ روزن دیوار)



نادرگی خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

آسیہ فرید... ملتان

نمرہ جی کی تعریف کے لیے تو الفاظ کم پڑجاتے ہیں۔ معلومات کا ذخیرہ ہے ان کے پاس۔ حالم بے حد انوکھا اور خوب صورت ناول ہے۔ اس کے بعد "عشق مجذوب" مصباح جی آپ کو بہت بہت مبارک ہو اور تو سب بہت پرفیکٹ سالگا بس فارہ کو بہت عبرت ناک سزا ملی۔ خوش نصیب کے ساتھ تو برا ہو رہا ہے۔ شاہ میر بہروپیا برا انسان کیف بے چارے کا دل بھی دکھ گیا اس کی وجہ سے۔ سائرہ جی کا ناول حسن الماب بہت اچھا جارہا ہے۔ حسنل پر غصہ آیا۔ واقعی اسے محبت وہ بھی یک طرفہ نے بہت خودغرض وبدتمیز بنادیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ سمیع ہی موسیٰ لی ہے اور میری ہی ماہ رو ہوگی۔ افراز رسول کا انٹرویو' نفسیاتی الجھنیں پڑھیں اور ہمارے نام کا سلسلہ تو لازمی پڑھتی ہوں' ڈیئر مسرت اتنا غصہ نہ کیا کریں غصے میں ہم کسی اور کا نہیں اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

ج۔ پیاری آسیہ! کیف کا دل دکھنے پر اتنی افسردہ نہ ہوں۔ ابھی اس کی صیام سے شادی ہوئی تو نہیں ہے اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی شادی خوش نصیب سے ہوجاتی تو اس کا دل شاد ہی ہوتا۔

حسنل پر آپ کو غصہ آیا اور مسرت الطاف کو آپ غصہ نہ کرنے کی تلقین کررہی ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں۔

یاسمین کنول... پسرور

ٹائٹل ہنستی مسکراتی ماڈل کے ساتھ اچھا لگا۔ انشا جی کی غزل بہت اچھی لگی۔ لیلیٰ واسطی کا انٹرویو پسند آیا۔ مصباح نوشین کا عشق مجذوب اچھا لگا۔ افسانوں میں "سنگ میل" زیادہ اچھا لگا۔ موسم کے پکوان مزے کے ہیں۔ خبریں وبریں پسند آئیں۔

ج۔ یاسمین! خوشی ہوئی کہ آپ کو سب اچھا لگا۔ آپ کی حمد اس ماہ یعنی جولائی کے شمارے میں شامل ہے۔ غزل بھی منتخب کرلی گئی ہے' ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہوگی۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

روزینہ نعیم' یاسمین ساجد... گوجرانوالہ

ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا' گرمی میں سوٹ کے کلر کو دیکھتے ہی کچھ ہونے لگا۔ سب سے پہلے "حالم" پڑھی۔ باقی قارئین کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ تالیہ کوئی لڑکا ہے' لیکن بعد میں پتا چلا جی کہ ہیروئن صاحبہ ہیرو کا کردار ادا کررہی ہیں۔ نمرہ جی کا کوئی کردار ہو' منفی یا مثبت اور ہم اس کے فین نہ ہوں یہ تو جھوٹ ہے۔ گناہ ہوتا ہے۔ نمرہ جی کی کہانیوں کو پڑھ کر ہم بندیاں تو ویسے ہی احساس کمتری کا شکار ہونا شروع ہوجاتی ہیں کہ ہم کیوں نہیں اتنے لائق فائق اور ذہین۔ ایسے نادر خیالات ہمیں کیوں نہیں آتے جیسے نمرہ کے کرداروں کو آتے ہیں۔ "عشق مجذوب" چلو شکر ختم ہوا۔ مصباح جی کوئی ہلکی پھلکی مزاحیہ سی کہانی لکھیں جس میں ڈھیر سارے کزنز ہوں مزہ آئے گا پڑھ کر۔ دشت جنوں کی تو کیا ہی بات ہے پر آمنہ جی جوڑی کیف اور خوش نصیب کی ہی بنائیے گا۔ دونوں ایک جیسے ہیں اب لگتا ہے منفرا کو۔ آیوشمتی اپنا دیدار کروانے والی ہے۔

ج۔ پیاری روزینہ! نمرہ کی تحریروں کو پڑھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہونا بنتا تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی صرف صورتیں ہی مختلف نہیں بنائیں۔ ان کا مزاج' فطرت ان

کی عقلیں بھی مختلف بنائی ہیں۔ دنیا کا حسن و توازن اسی نیرنگی سے قائم ہے اگر سب ایک جیسے ہوتے تو جینا کتنا دشوار ہوتا۔

شبلی، جوادی ہے تو ہم بھی ملاقات کی خواہش رکھتے ہیں، لیکن کیا کریں ثمرہ جی تو چینلز پر جاکر ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔

صائمہ عبدالحمید۔۔۔ خیرپور میرس

دو اقساط سے ہی اندازہ ہو رہا ہے، یہ ناول بھی نمرہ احمد کے دوسرے کئی ناولز کی طرح ایک عمدہ کاوش ثابت ہوگی۔ "حالم" کے معنی ہم نے کسی دوست کے توسط سے جانے۔ "تالیہ مراد" کا نام "حالم" ہے، مطلب "خواب کی دنیا میں تعبیروں کا سفر ہوگا۔ بہت بہت زبردست ٹاپک اٹھایا ہے نمرہ احمد نے۔ تحریر بھی بہت اثر رکھ رہی ہے۔ سائرہ رضا کی تحریر "حسن المآب" اعلا تحریر ہے۔ کہانی میں بہت کچھ کھل کر سامنے آرہا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ "ماہ رو" ہی "میری" ہے۔ حسنل کی سوچ کے الفاظ بہت پر اثر تھے۔ "توکل خوبی ہے، تقاضہ بندگی ہے، مگر "دعا" شان بندگی ہے۔۔۔ وہ دے دے تو سبحان اللہ اور نہ دے تو الحمد اللہ" حسنل اپنی غرض سے اللہ سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ "ہمارے نام" میں جب بھی پڑھتی ہوں تو مجھے قاری، بہنوں سے اپنائیت کا ایک احساس ہوتا ہے۔

ج۔ پیاری صائمہ! حالم یقیناً" آپ کی توقعات پر پورا اترے گا۔ نمرہ بہت محنت سے لکھ رہی ہیں "حالم" کے معنی ہیں "خواب دیکھنے والا" اب دیکھتے ہیں کہ خواب کون دیکھ رہا ہے اور تعبیر کس کو ملنے والی ہے۔

سدرہ احمد۔۔۔ کوٹ ادو

ہمیشہ کی طرح خواتین ہر رسالے پر سبقت لے گیا۔ ایک تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے انتہائی چھوٹی سی عمر سے یہ رسالہ پسند ہے۔ پہلے دادی اور امی کو پڑھتے دیکھا پھر پھوپھو بھی پیش پیش رہیں۔ میں نے ہوش سنبھالا تو امی کو پڑھا۔ پھر سہیلیوں کی نقل میں شعاع، کرن بھی لینے لگی۔ اب یہ عالم ہے کہ سسرال میں ساس جی، دیورانیاں، جٹھانیاں سب یہ تینوں رسالے ایسے پڑھتے ہیں جیسے اسکول کا کام لازمی کرنا ہو۔ کبھی رسالہ بہت اچھا لگا۔ کبھی بس۔۔۔ کبھی آپس میں گلہ کرلیا۔ کبھی ہنس دیے، کبھی غصے میں پٹخ دیا، بھئی ہم پرانے قاری ہیں۔ اتنا اظہار خیال تو بنتا ہے، کئی بار خطوط بھی لکھے، شائع بھی ہوئے اور کئی بار ناقابل اشاعت ٹھہرے۔ اب بھی آپ سے باتیں کرنے کا موڈ بنا، سو خط کے بہانے بیٹھ گئی۔ اب ایسا بھی نہیں کہ کسی ایک تحریر نے جکڑ ہی لیا اور خط لکھنے پر مجبور کردیا، لیکن باری باری سب پڑھیں اور اچھی ہی لگیں۔ سب سے پہلے حسن المآب پڑھا۔ رشتوں کی بڑی گنجلک ہے اس میں۔ جو سائرہ رضا آہستہ آہستہ کھولنا چاہ رہی ہیں۔ دیکھیں اب حسنل کیا کرتی ہے۔

امت العزیز کا ناول جہاں چہرے پر مسکان بکھیر گیا۔ وہاں ایک رات کا رنگ حنا یاسمین کا ناول بہت ہی اداس کر گیا۔ ہمارے ہاں رشتوں میں کتنا تناؤ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے یا پھر صرف اپنی راجدھانی رکھنے کے لیے کس کس طرح کے حربے استعمال ہوتے ہیں۔

قانتہ رابعہ کا افسانہ سنگ میل بہت ہی پیارا لگا، میں ان کی بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ روزے کا اصل مفہوم جاننا چاہیے۔

مصباح سید کا ہر گام زندگی، چھوٹے سے پیرائے میں بہت بڑی بات کہہ دی۔ حیرت ہے مصباح افسانہ بھی اچھا لکھ لیتی ہیں۔ مگر ان کا مزاج کچھ ناول والا ہے۔

حالم ابھی شروع نہیں کیا۔ سننے میں عجیب و غریب لگ رہا ہے کیا واقعی نمرہ انگلش فلمز کا ترجمہ لکھتی ہیں؟

باقی سلسلے اچھے لگے۔ بطور خاص صلواۃ التسبیح کا طریقہ بہت درست لکھا۔

ج: پیاری سدرہ! نمرہ اگر انگریزی ناولز کا ترجمہ لکھتیں تو پھر "مصحف" اور جنت کے پتے" کس طرح لکھتیں۔ اب انگریزی ناولوں میں تو قرآن ترجمہ کے ساتھ پڑھنے اور پردہ کرنے کی تلقین نہیں کی جاسکتی۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا پورا گھر خواتین، شعاع اور کرن کا مداح ہے اور یہی نہیں بلکہ آپ کی دادی بھی پڑھتی رہی ہیں۔

نادیہ اشرف۔۔۔ رائے ونڈ

خط لکھنا کافی مشکل لگتا ہے لیکن "حالم" (Dreamer) پڑھ کر ہاتھ رکا نہیں۔ بہت مزہ آتا ہے کیونکہ نمرہ کے ہاں کچن، لڑکا لڑکی رومینٹسزم، روایتی جھگڑے، اداسیاں، مایوسی نہیں نظر آتی۔

سائرہ رضا حسن المآب (اچھا عمدہ ٹھکانہ) نیچرل و بے ساختہ ہے۔ کچھ بھی مصنوعی نہیں لگتا ہے۔ کرن کرن روشنی رمضان کے حوالے سے بہت مددگار لگا۔ شکریہ

ج: نادیہ! آپ کی تعریف سائرہ اور نمرہ تک پہنچا رہے ہیں۔

سیدہ فہمی..... منڈی بہاؤالدین

رسالہ ہر بار کی طرح شاندار۔ میں پہلے صفحے سے لے کر آخر تک ہمیشہ پڑھتی ہوں۔ پرانی رائٹرز کے ساتھ ساتھ نئی بھی اچھا لکھ کر رہی ہیں۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ 'فرحت اشتیاق کیا اپنے قارئین سے پکی ناراض ہو گئی ہیں۔

ج۔ فہمی! فرحت اشتیاق قارئین سے ناراض نہیں ٹی وی پر مصروف ہو گئی ہیں۔ اس لیے لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہو گی۔

سُدرہ بتول..... ملتان

ماڈل اچھی تھی پر میک اپ برا تھا اور پھر سیدھا "حالم" پر جا کر رکی اف نمرہ احمد کی ہیروئن کے نام بہت اچھے ہوتے ہیں پہلے "محمل" پھر عائشے گل 'آنے' بہارے گل' زمر' حسین' جواہرات اب تالیہ اور مولیا بھی بہت مزے کا نام ہے پھر ذہانت بھی ان کی ہیروئن پر ختم ہوتی ہے۔ اب تالیہ "گھائل غزال" کو پہچان لے گی کہ یہ کاپی ہے ایم آئی

رائٹ؟ تالیہ داتن بچاری کو اتنے برے ناموں سے کیوں بلاتی ہے؟ میرے فادر اپریل میں کوالالمپور گئے تھے بزنس ٹور پر انہوں نے بتایا کہ وہاں روز چار سے چھ گھنٹے بارش ہوتی ہے اور موسلادھار لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی کہیں نظر نہیں آتا جیسے پاکستان میں ایک دن بارش کے بعد ہفتے تک سڑکوں پہ پانی ختم خشک نہیں ہوتا۔

پھر میں نے حالم کے تبصرے پڑھنے شروع کیے اور یقین کریں میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ آمنہ حسین اور فاطمہ زیدی کا تبصرہ پڑھ کے کہ انہیں نمرہ احمد اور سمیرا حمید کے ناول متاثر نہیں کر سکے اور اچھے نہیں لگے۔ "دشت جنوں" کی روح کہیں "بلی راجپوتاں کی ملکہ" کی طرح آئے گت ہی تو نہیں ہے؟ جیسے لیڈی شیکھر تھی۔ "عشق مجذوب" کا اینڈ تھوڑا اچھا تھوڑا دکھی تھا واجب القتل ہوتے ہیں ٹیپو جیسے لڑکے مقصور صرف ایک فرد کا نہیں ہوتا تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے تو سزا ایک کو کیوں؟۔ افسانے سارے اچھے تھے اور سائرہ رضا تسی گریٹ ہو پر اس قسط میں حسنل کے ساتھ اچھا نہیں کیا آپ نے۔

"اب منزلوں کا یقین" اچھی کہانی تھی بائے داوے "خاتون کی ڈائری" میں بس چند لوگوں کی شاعری ہی شائع کرتے ہیں آپ لوگ (معذرت کے ساتھ) فوزیہ ثمروٹ کا شعر اعلا تھا۔ انجل 'اور نخبہ اکرم کے شعر بھی اچھے تھے۔ "رنگا رنگ پھول" میں "قطعہ" بڑے مزے کا تھا بہت ہنسی آئی پڑھ کر۔

ج۔ پیاری سدرہ! سمیرا اور نمرہ کے لیے اتنی جذباتی نہ ہوں۔ ہر شخص الگ مزاج اور ذوق رکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ کی پسندیدہ رائٹر سب کو پسند ہوں۔ نمرہ اور سمیرا کو بہت سارے قارئین آپ کی طرح دل و جان سے پسند کرتے ہیں۔ حسنل پر ترس نہ کھائیں وہ مجبور ہونے والی نہیں۔ اور دعاؤں کا معاملہ یہ ہے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کیا چیز اس کے حق میں بہتر ہے وہ برائی کو بھی اسی طرح مانگتا ہے جس طرح بھلائی مانگتا ہے' بات صرف اللہ پر یقین کی ہے 'اسے متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔ معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ڈائری میں گنے چنے افراد ہی معیاری کلام بھیجتے ہیں ورنہ ہمارے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہیں شرط صرف معیار ہے۔

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

بھئی! یہ آمنہ ریاض لکھتی جا رہی ہیں اور چھاتی جا رہی ہیں ساحرہ کہیں کی۔ مجھے "دشت جنون" کی ہر قسط بڑی فنٹاسٹک اور مزے دار لگتی ہے۔ ویلڈن آمنہ جی۔

سورۃ الرعد میں حسن مآب لفظ آیا جس کے معنی ہیں اچھی واپسی کی جگہ۔ آپ یہ بتائیں یہ دونوں لفظ ایک ہی ہیں تو حسنل کہاں سے نکالا ہے سائرہ نے۔ کیوں کہ عربی کے الفاظ سے اس طرح الفاظ نکالنے سے معنی بدل سکتے ہیں۔ ضرور بتائیے بلیز ویسے کہانی بڑی سپر ڈوپر ہے۔ صبر کے ساتھ پڑھنے والی۔ اب آتے ہیں محترمہ نمرہ احمد کی طرف "حالم" نام سے زیادہ انٹرسٹنگ نہیں لگا۔ پہلی قسط شروع میں بور سی لگی۔ دلچسپی وہاں سے پیدا ہوئی جب پتا چلا کہ حالم لڑکی ہے۔ واہ بھئی واہ بڑی جگرے والی لڑکی ہے یہ تالیہ مراد۔ کیپ اٹ اپ..... "مئی کے شمارے کی "میں بنت

جمیلہ" سمیرا حمید کی از حد پسند آئی۔ کچھ کچھ تلخ اور کچھ وکھری ٹائپ کی۔

باقی رسالہ ابھی پڑھا نہیں۔ رسالہ 12 جون کو ملا تھا۔ پھر سروے کی جلدی تھی۔ کوئی نہ گیا تو خط ڈالنے اپنے منے سے شہر جاؤں گی۔ دراصل رمضان مبارک کی وجہ سے مصروفیت زیادہ ہوتی ہے۔ نماز، روزہ، قرآن، نفلی عبادات، گھریلو کام، بس وقت نکالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

ج ۔ پیاری ملائکہ! آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔ لفظ حسن المآب سورۃ آل عمران میں بھی آیا ہے۔ اور اس کا مطلب عمدہ ٹھکانہ ہی ہے۔ سائرہ نے اسے نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ گھر میں حسن المآب کو مختصر کرکے حسنل کہا جاتا ہے۔

طہٰ مصطفیٰ..... فاروق آباد

خواتین لینا اور پڑھنا تو چھوڑ نہیں سکتے مگر اب کبھی کبھی بھی اس عالیشان ڈائجسٹ میں لکھنے کی جسارت نہیں کریں گے۔ کیونکہ میرے لفظ شاید اس ڈائجسٹ کے قابل نہیں۔

جون 2017 کا ٹائٹل اف بہت بسورا تھا کیونکہ بہت ڈارک میک اپ تھا۔ اگر لائٹ کیا جاتا اور سلور کی بجائے گولڈن یا میرون شیڈ استعمال کی جاتی اور لپ اسٹک پنک کے بجائے سرخ یا کوئی ہلکی سی (ارے یہ نہ سمجھئے گا اپنا غصہ نکال رہے ہیں) (کہنی سنی) سنی آپ کے لفظوں کا چناؤ حسین تھا اور قابل تحسین بھی (عید سروے) سوچیں گے۔ (ہم اتنے بھی رایگاں نہیں ہیں اچھا!) کرن کرن روشنی کمال کے تھے اور انشاء جی کی نظم زبردست (افراز رسول) پڑھا نہیں ابھی۔ سروے دیکھا بھی نہیں (کیوں دیکھتے بھلا) سب سے پہلے دشت جنوں پڑھا آمنہ ریاض صاحبہ "حالم" پڑھ رہی ہوں ابھی پہلی قسط تو ریکارڈ بریکنگ تھی "نمرہ احمد" صاحبہ (قراقرم کا تاج محل ہی بھجوادیں۔)

"اب منزلوں کا یقین ہے۔" بہت زبردست ناول تھا "شان جیسے لوگ بہت موجود ہیں یہاں اور "جانن" برا سا نام نہیں؟ عشق مجذوب سے 99% میں اچھا لکھ لیتی ہوں۔ ذرا بھی نہیں اچھا تھا۔ (بسورا سا) کیا تھا تہمیم مورل؟ آپ کی بیاض زبردست سلسلہ باقی اچھے تھے۔

پیاری طہٰ! یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ ہمیں آپ کی ناراضی سے فرق نہیں پڑے گا۔ کیا آپ کو اندازہ نہیں کہ ہم اپنی مصنفین اور قارئین سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ شعاع پر تبصرہ بھی آپ نے ساتھ ہی کردیا ہے۔ رقصم آپ کو پسند آیا بہت شکریہ۔ ہیرو پر آپ کو اعتراض ہے کہ وہ یونان سے کیوں تھا۔ تو بھئی بہت سارے پاکستانی یونان میں بھی آباد ہیں۔ اور ہاں یہ بسورا کا کیا مطلب ہے۔ پہلی بار سنا ہے یہ لفظ۔

نبیلہ ساجد..... عارف والا

ہمارا گاؤں شہر سے قریباً" سولہ کلو میٹر دور ہے۔ اور گاؤں بھی کیا ہے بس تھوڑے تھوڑے گھر اپنی زمینوں میں بنائے ہوئے ہیں۔ بجلی کے علاوہ اور کوئی سہولت نہیں۔ ایسے میں ڈائجسٹ ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھنے کی بہت مشکل ہوتی تھی۔ پر اب تو جب میرا چکر لگ گیا شہر کا تو میں لے آتی ہوں۔

خواتین ڈائجسٹ سے محبت کا تو یہ عالم ہے کہ جب ہاتھ میں آتا ہے تو رات کے 2 بجے تک پڑھتی رہتی ہوں اگر لائٹ چلی جائے تو موبائل کی ٹارچ جلا کر پڑھتی ہوں۔ اور نتیجہ یہ سارے کیڑے مکوڑے اور مچھر میرے اوپر جمع ہوتے ہیں۔ ہاں میرا بیٹا اور میرے شوہر کہتے ہیں کہ کیا تم نے اس کا صبح پیپر دینا ہے۔ اب بس بھی کرو اندھی ہو جاؤ گی پڑھ پڑھ کے۔

نمل کے بعد حالم نے بہت اچھا اسٹارٹ لیا ہے۔ حسن المآب کے کیا کہنے حسن الماب کا مطلب اچھا ٹھکانا ہے تو حسن المآب بھی لگتا ہے اچھے ٹھکانے پر پہنچ گئی ہے۔

صائمہ اقبال کا آبسا ہے مجھ میں۔ بہت اچھا ناول تھا۔ اچھا لگا پڑھ کے۔ باقی ناولٹ بھی اچھے تھے۔ آپ سے گزارش ہے کہ حدیث شریف میں اگر کوئی عورتوں کی اپنے والدین کی قبر پر جانے کی کوئی حدیث ہے تو کرن کرن روشنی میں ضرور لکھیں پلیز۔

ج ۔ پیاری نبیلہ! یہ تو بڑی خوش نصیبی ہے کہ کوئی اور سہولت نہ سہی، بجلی کی سہولت میسر ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی فرمائش پر جلد ہی اس موضوع سے متعلق احادیث شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



خواتین سے محبت تو ٹھیک ہے لیکن آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ موبائل کی ٹارچ کی روشنی میں نہ پڑھا کریں۔

اقراء ممتاز۔۔۔۔ بھاگٹانوالہ سرگودھا

اس دفعہ ٹائٹل گرل سو سو لگ رہی تھی۔ افراز رسول سے ملاقات بیسٹ رہی۔ رمضان اور آپ میں سب کے جوابات پڑھتے ہوئے حالم تک پہنچے۔ نمرہ آپی آپ کے بارے میں کیا کہوں۔ جب بھی لکھتی ہیں بہت منفرد لکھتی ہیں۔ مکمل ناول "عشق مجذوب" مصباح نوشین نے بہت اچھا اینڈ کیا ہے۔ ہر کردار کے بہت انصاف کیا ہے۔ فارہ کے ساتھ تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ صرف خوب صورتی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ منزلوں کا یقین "امت العزیز شہزاد" کی اسٹوری کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ "نامے ہمارے نام" میں شکیلہ نور کو پڑھ کر حیرت ہوئی اور خوشی بھی ہوئی۔ 1980ء میں میں تو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکیلہ اتنی خاموش قاری ہیں۔

ج ۔ پیاری اقراء! آپ کے نامے موصول تو ہوئے تھے مگر بے حد تاخیر سے اس لیے جگہ نہ پاسکے۔ ہمیں بھی شکیلہ جیسے اپنے دیرینہ قارئین کے نامے پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے جو پرچے کے اجراء کے ابتدائی سالوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ایسے ہی تو دعوا نہیں کرتے کہ خواتین تین نسلوں کا پسندیدہ پرچا ہے۔

صائمہ مشتاق۔۔۔۔ بھاگٹانوالہ سرگودھا

ہنستی مسکراتی ٹائٹل گرلز بہت پسند آئی "کرن کرن روشنی" میں صلوۃ التسبیح، اعتکاف شب قدر کے بارے میں پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ افراز رسول سے باتیں اچھی لگیں۔ رمضان اور سروے کے جوابات بہت پسند آئے۔ اس کے بعد نمرہ احمد کا مکمل ناول "حالم" نمرہ جی کیا کہوں حالم کے بارے میں۔ آپ جب بھی کوئی اسٹوری لے کر آتی ہے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ مصباح نوشین کا "عشق مجذوب" مصباح جی کیا کمال کا اینڈ کیا۔ مصباح جی اسی طرح کا ناول لے کر جلدی سے آئیں۔ ہم آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ حنا یاسمین کا افسانہ ایک رات کا تاوان اچھی کاوش تھی۔ خواتین کی باقی کہانیاں دل کو نہ چھو سکیں اس دفعہ خواتین ادھورا ادھورا سا لگا۔ لیلیٰ واسطی سے ملاقات اچھی رہی۔

ج ۔ پیاری صائمہ! یہ جان کر بڑا افسوس ہوا کہ آپ کو اس ماہ کا شمارہ پسند نہیں آیا۔ کس چیز کی کمی محسوس ہوئی اس کا بھی اظہار کر دیتیں۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔۔ کراچی

خواتین ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ قابل تعریف تھا۔ ماڈل گرل رمضان کی مناسبت سے پسند آئی۔ "ہمارے نام" میں نظر پڑتے ہی میرے چہرے کی مسکان پھیکی پڑ گئی۔ ڈیئر آپی! میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ آپ کو میرا رمشا شہزادی سے اس انداز میں بات کرنا ناگوار گزرا اسی لیے آپ کا رویہ بھی میرے ساتھ کچھ کچھ خفا خفا سا لگا یقیناً" اور یقیناً" میرا خط پڑھ کر رمشا بھی ڈس ہارٹ ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے میں تہہ دل سے شرمندہ ہوں، پیاری رمشا میری وجہ سے جانے انجانے میں اگر آپ کی دل آزاری ہوئی ہے "آئی ایم رئیلی سوری" دل سے۔۔۔۔! "حالم" کی دوسری قسط انٹرسٹنگ لگی۔ اس پورے ایپی سوڈ میں فاتح ہی ناول پر حاوی رہا تالیہ کے خواب میں وہ لڑکا یقیناً" ایڈم ہی ہے مگر ایڈم کا۔ کردار اسٹرانگ نہیں لگا۔

"دشت جنون" یہ ایپی سوڈ کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ مائی موسٹ فیورٹ کردار منفرا پورے استحقاق سے نظر آئی معاویہ کا کردار کافی پر اسرار اور پر تجسس ہے۔ "حسن المآب" دلچسپی اپنی عروج پر ہے حسنل نے احتجاج کر کے اپنی منزل تو پالی اب یہ دیکھنا ہے کہ آگے اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ "عشق مجذوب" آخری قسط آؤٹ اسٹینڈنگ تھی۔ "منزلوں کا یقین" اسٹارٹ تو بہت ہی پسند آیا تحریر مزاح سے بھرپور تھی شہزادی اور ملکہ کی تو تو میں میں زبردست تھی لاسٹ میں اچھی خاصی گڑبڑ ہوگئی شان کا پوزیٹو کردار یک دم منفی ہونا ہضم نہیں ہوا۔ "آبسا ہے مجھ میں" یہ تحریر بس نارمل ہی لگی۔

افسانوں میں "بوجھل" اے ون تحریر تھی۔ "کچھ دو کچھ لو" زبردست تحریر تھی۔

ج ۔ مسرت! ہمیں آپ کی بات واقعی اچھی نہیں لگی تھی۔ لیکن اب آپ کا خط پڑھ کر ساری ناراضی جاتی رہی۔ آپ واقعی بہت اچھی بچی ہیں۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا یہ اچھی بات ہے۔ آپ نے خط لکھ کر اس کا اظہار بھی کر دیا، یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور عمدہ ہے۔

کنزا ریحان۔۔۔سبڑیال

اس ماہ کا رسالہ ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کسی شمارے میں بہت کمی رہ جاتی ہے لیکن کسی شمارے میں وہ ساری کمیاں پوری ہو جاتی ہیں سو نفع نقصان برابر، نمرہ آپی کا نام دیکھ کر دل کہتا ہے سب سے پہلے ان کی کہانی پڑھی جائے، ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے زندگی مصروف ہو چکی ہے ہمارے پاس دینی سمجھ بوجھ کے لیے وقت نہیں نکلتا، یہ رسالے نکال کر آپ ہمارے لیے درس و تدریس کا کام بھی کر رہی ہیں۔ کہانیوں کی صورت ایسا درس جو طبیعت پر گراں بھی نہ گزرے ورنہ عشق و محبت کی داستانیں تو کبھی بھی رسالے کو منگوا کر پڑھ لو، مجھے ایسی کہانیوں کی تلاش ہوتی ہے جس میں ہمیں اسلامی طرز حیات پتا چلے۔ حسن المآب میری پسندیدہ رائٹر لکھ رہی ہیں سو اس کی تعریف کے لیے الفاظ کا سب ذخیرہ ان کے نام، لیکن اس بار قلم بہت ہی سست چل رہا ہے ذرا اسپیڈ پکڑیں سائرہ آپی، ناولٹ ایک ہی تھا اور وہ کمال کا آبسا ہے مجھ میں واہ واہ واہ صائمہ اقبال صاحبہ سنجیدہ انداز میں اتنی روانی سے لکھا۔ دل کو چھو گیا، واقعی جو مرد بہن اور بیوی کی الگ الگ حیثیت نہ پہچان سکیں وہ بعد میں بہت پچھتاتے ہیں۔

مصباح علی نے اپنے مخصوص برجستہ انداز میں بہت پیارا افسانہ لکھ کر دل موہ لیا، اچھا بھئی "یہ بو جھل" افسانہ میں نیر کاشف نے کیا لکھا۔ پھوپھو چار بجے ہی تہجد کے لیے اٹھ جاتی تھیں ارے نیر آج کل تو چار بجے کراچی میں بھی روزہ بند ہو جاتا ہے کس موسم کا ذکر ہے بھئی، سحری میں لسی اچار اور تہجد ہو چار بجے ہاہاہا، لگتا ہے نیر کو بھی روزہ لگ رہا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ پسند آیا اور خطوں میں سرورق بدلنے کی تجویز پر میرا بھی ووٹ شامل کرلیں ماڈل کی جگہ ایبسٹریکٹ آرٹ واہ پھر تو خواتین سے ہی مختلف ہو جائے گا۔

ج: پیاری کنزا! بہت بے ساختہ اور دلچسپ پوسٹ مارٹم کیا آپ نے شمارے کا۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ شکل پر بارہ بج رہے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ بہت صبح جاگیں یا تہجد کے لیے جاگیں، بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو چار بجے ہی اٹھ گئے تھے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بہت جلدی اٹھ گئے تھے اس سے مراد واقعی 4 بجے ہی نہیں ہوگی۔ اور رہا ایبسٹریکٹ آرٹ تو وہ تو سوائے اپنے خالق کے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسی تجاویز دیں جنہیں ہمارا معدہ ہضم کر سکے۔

ناظمہ زیدی۔۔۔چوک اعظم

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سب ہی رنگ اتار کے شہر کا
کوئی شخص تھا میرے شہر میں کسی دور پار کے شہر کا

مئی کا مہینہ آیا تو لگا جیسے کسی نے اداسی کا رنگ پھیر دیا ہو۔ میرے پیارے چچا مزمل حسین جو کافی عرصے سے علیل تھے وفات پا گئے۔ ہر مشکل میں مجھے ان کا آسرا تھا اللہ کے بعد۔ مگر لوگوں کا یہ کہنا (چند مخصوص) کہ ناظمہ ڈرامے بازی کر رہی تھی دل کو چیر گیا۔ دل زخم زخم ہے۔ کیا کسی کے رونے کا بھی کسی نے تماشا بنایا ہے؟۔ خواتین میں "حالم" اٹھا کر پڑھنا چاہا مگر واپس رکھ دیا کہ کسی پسند کی چیز کو دل نہیں کرتا۔ خواتین کے اڈ میں آپ نے "تجھ سے ناتا جوڑا" دیا ہوا ہے مگر رسالے سے وہ غائب ہے۔ لیلیٰ واسطی کا انٹرویو بھی نہیں ہے مقررہ صفحات پہ۔ ایسا کیوں؟

میں نے ایک افسانہ بھیجا تھا "چھل" مجھے اس سے بہت امید ہے کہ آپ لوگوں کو پسند آئے گا۔ کیونکہ شاہ صاحب نے پسند کیا۔ (خلاف توقع) اس کا بتائیں۔

پیاری ناظمہ! ہم اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں لوگوں کے نہیں۔ اس لیے لوگوں کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔ آپ کے تینوں افسانے مل گئے ہیں۔ مگر ابھی پڑھے نہیں۔ اور اتنا دل گیر ہونے والی کیا بات تھی۔ جو کہانیاں معیاری ہوں گی وہی لگائیں گے نا۔

بعض اوقات بائنڈنگ کرتے وقت غلطی ہو جاتی ہے آپ اپنے بک اسٹال والے سے شمارہ تبدیل کروالیتیں یا ہمارے دفتر بھیج دیتیں۔ ہم دوسرا روانہ کر دیتے۔

عائشہ رباب۔۔۔کراچی

السلام علیکم! کہنی سنی خوب رہی۔ کرن کرن روشنی بہت اچھی لگی۔ انشاء جی کی غزل "اس دل کے جھروکے میں" بہت ہی زبردست۔ افراز رسول سے باتیں اچھی تھیں۔ "رمضان اور آپ" سروے کے جوابات نہایت دلچسپ تھے "اروی کا جواب سے معلوم ہوتا ہے بہت ہی ٹف روٹین ہے آپ کی کیسے مینج کرتی ہیں؟" نظمیں

غزلیں" اس بار تینوں ہی بہترین تھیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظمیں اچھی تھیں۔ ساحرلدھیانوی کی غزل آنکھیں نم کر گئی۔ رنگا رنگ پھول میں عشاق کی باتیں 'لاجواب' تھی۔ "میری بیاض سے" کچھ پسند نہیں آیا۔ "ہمارے نام" شکیلہ تور کا خط بہت ہی دلچسپ تھا۔ شبانہ شمس بلوچ کو بہت بہت مبارک باد میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خبریں وریں بھی اچھی رہیں۔ صفحہ نمبر 279 پر شعاع کی فہرست کے ساتھ خواتین کا سرورق شائع کردیا گیا ہے۔ لیلیٰ واسطی سے ملاقات بہت ہی خوب رہی۔ موسم کے پکوان مزے دار تھے۔ نفسیاتی الجھنیں اور بیوٹی بکس ہمیشہ کی طرح لاجواب تھیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف "حالم" بہت ہی لاجواب ہے۔ حسن المآب خوش اسلوبی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ حسنل کی گستاخیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ "عشق مجذوب" کچھ خاص متاثر نہ کرسکا۔

"منزلوں کا یقین ہے" بہت ہی ہٹ کر کہانی تھی۔ جاسن اور سامعہ کا کردار بہت ہی اچھا لگا۔ شاہ رخ کے گانے 'ملکہ اور شہزادی کی لڑائیاں بڑا لطف آیا۔

"آبسا ہے مجھ میں' صائمہ اقبال نے بہت اچھا لکھا ہے۔

"افسانوں میں 'فہرست میں ایک نام "روزہ نہیں ہے۔" جبکہ کہانی کے اوپر ہر گام زندگی" موجود تھا۔ کہانی اچھی تھی۔ کچھ خاص نہیں لگی۔ "اک رات کا تاوان" کہانی سبق آموز پر روایتی سی تھی۔ لیکن عنوان بالکل بھی کہانی سے میل نہیں کھا رہا تھا "کچھ دو کچھ لو" اچھی لگی۔ "دھوجل اور سنگ میل" دونوں ہی لاجواب کہانیاں تھیں۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اتنے سادہ لفظوں میں اتنے بامعنی سبق دینے کا فن کمال ہوتا ہے۔

ج ۔ پیاری عائشہ! ہمیں افسوس ہے کہ محدود صفحات کے باعث پورا تبصرہ شائع نہ کرسکے۔ اتنے تفصیلی اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ نے ہر کہانی اور ہر سلسلے کو پوری توجہ سے پڑھا اور پھر ہمیں خط لکھا، بہت شکریہ۔

شائستہ اکبر ۔۔۔۔ گڈو کالونی

نمرہ احمد نے "حالم" کی شروعات بہت اچھی کی ہے دو قسطیں پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا آگے بھی بہتر ہی ہوگا۔ (ان شاءاللہ) "دشت جنون" آمنہ ریاض کا اچھا چل رہا ہے پر مجھے معاویہ کا آئے کت کی محبت میں مبتلا ہونا کچھ پسند نہیں آیا۔ اور آئے کت کی عدت بھی مکمل نہیں ہوئی تو شادی کیسے ہوسکتی ہے جبکہ وہ امید سے ہے۔

چند ماہ میں تبصرہ نہیں کرسکتی تھی تب سوچا کہ جب تبصرہ کروں گی تو اس شاندار کہانی پہ ضرور کچھ کہوں گی بات ہو رہی ہے "ادافروش" نعیمہ ناز کی اتنی پراثر اور خوب صورت تحریر لکھ کر نعیمہ ناز نے تو دل جیت لیا میں نے تو باقاعدہ پڑھ کر ہر کسی کو پکڑ پکڑ کر یہ کہانی پڑھائی۔

"عشق مجذوب" مصباح نوشین کے ناول نے بالکل بھی متاثر نہیں کیا پڑھ کر لگا کہ جیسے وقت کا زیاں ہوا' لاحاصل' وہی پرانی کہانی معذرت کے ساتھ۔ سائرہ رضا "حسن المآب" اور میں پرفیکٹ جارہی ہیں۔ یار زندہ صحبت باقی بہت خوب سائرہ رضا!

افسانوں میں "ایک رات کا تاوان" حنا یاسمین کا شاندار رہا۔ سمیرا حمید کی کمی بہت محسوس کی۔ گزارش ہے ایک ناول 'ناولٹ یا ایک عدد افسانہ سمیرا حمید کا ضرور شامل کیا کریں۔

راحت جبیں کہاں ہیں؟ نظر ہی نہیں آتیں کہیں سے پکڑ کر لائیں اور ایک ہنستی مسکراتی بمع دادی کے کہانی لکھوائیں۔

پیاری شائستہ! آپ کی فرمائش پر سمیرا حمید کا ناولٹ شامل ہے۔ وشت جنون میں آئے کت امید سے تھی لیکن معاویہ کے ساتھ گھومنے گئی تو تب حادثہ کا شکار ہوگئی تھی اور اپنا بچہ کھو دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی عدت بھی ختم ہوگئی تھی۔ شریعت کے مطابق حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے۔ نعیمہ ناز کی کہانی ہمیں بھی بے حد اچھی لگی۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے ہیں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دہی مرغ مسالہ

ضروری اشیاء :

چکن	ایک کلو
دہی	آدھا کلو
سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

پیالے میں دہی ' نمک ' کٹی ہوئی سیاہ مرچیں ' ہلدی ' مرچیں ' لہسن ادرک پیسٹ ' کٹا ہوا زیرہ اور تیل ڈال کر مکس کرلیں۔ دہی کا آمیزہ چکن پر لگا کر 3-4 گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

دیگچی میں مسالا لگی چکن مسالے سمیت ڈالیں اور ڈھک کر دھیمی آنچ پر آدھا گھنٹہ پکائیں۔ گوشت گل جائے تو مسالا بھون کر سرونگ ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

کرنچی فرائی چکن

ضروری اشیاء :

چکن بریسٹ	آدھا کلو
لہسن کے جوے	چار عدد (باریک چوپ کرلیں)
انڈا	ایک عدد
کارن فلیکس	آدھا پیکٹ
میدہ	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دار چینی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سیاہ مرچیں	آدھا چائے کا چمچہ (کٹی ہوئی)
ہرا دھنیا	آدھا کپ (باریک چوپ کرلیں)
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

چکن بریسٹ کے پتلے پارچے کاٹ لیں۔ میدہ اور کارن فلور کو مکس کریں اس میں کٹی ہوئی سیاہ مرچیں ' لال مرچ پاؤڈر ' نمک ' دار چینی پاؤڈر ' لہسن ' ہرا دھنیا انڈا ڈالیں اور سب چیزوں کو اچھی طرح سے مکس کریں۔

میدہ کے مکسچر میں گوشت کے سلائسز ڈالیں اچھی طرح مکس کریں۔ کارن فلیکس کو چورا کریں اور گوشت کا ایک ایک ٹکڑا نکال کر اچھی طرح سے اس پر کارن فلیکس لگائیں اور ہلکے گرم تیل میں اس کو فرائی کریں۔ چلی گارلک ساس کے ساتھ پیش کریں۔

چکن رائس ہرا مسالا

ضروری اشیاء :

چکن	آدھا کلو
چاول	آدھا کلو
گھی	آدھا کپ
ہری مرچیں	دس عدد
پودینہ	ایک گٹھی
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
تازہ میتھی	آدھا کپ
ٹماٹر	ایک پاؤ

لہسن پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
ادرک	آدھا انچ کا ٹکڑا
نمک	حسب ذائقہ
ثابت گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (چوپ کرلیں)	ایک عدد

ترکیب :

چاول بھگو دیں۔ ٹماٹر، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، پودینہ، میتھی کے پتے، لہسن، ادرک باریک پیس لیں۔ پین میں گھی گرم کریں اور اس میں پیاز فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں چکن، ثابت گرم مسالا اور زیرہ ڈالیں۔ اب ہرے مسالے کا پیکٹ ڈالیں۔ نمک دہی ڈال کر مسالہ بھون لیں۔ چکن دیکھ لیں۔ گل گئی ہے تو اس کے بعد اس میں چاول کے حساب سے پانی ڈالیں اور چاول میں شامل کریں۔ جب چاول کا پانی خشک ہو جائے تو دم پر لگا دیں اور دہی کے رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

شربت خاص

ضروری اشیاء :

دودھ	آدھا کلو
تخم بالنگا	ایک چائے کا چمچہ
لال شربت	دو کھانے کے چمچے
گلاب جامن (چھوٹے)	دو سے تین عدد
برف	حسب ضرورت

ترکیب :

دودھ جوش کر کے ٹھنڈا کرلیں۔ اس کے بعد گلاس میں سب سے پہلے برف ڈال دیں اور تخم بالنگا دودھ میں شامل کر کے گلاس میں ڈالیں۔ گلاب جامن کے ٹکڑے کر کے گلاس میں ڈالیں اور آخر میں کریم شامل کر کے ٹھنڈا ٹھنڈا شربتِ خاص سرو کریں۔

گلاب جامن

ضروری اشیاء :

کھویا	ڈیڑھ پاؤ
خشک دودھ	آدھا کپ
میدہ	دو کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
شکر	دو کپ
پانی	پانچ سے چھ کھانے کے چمچے
زرد رنگ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کیوڑا	چند قطرے
چھوٹی الائچی (بیج پیس لیں)	چار عدد
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک پتیلی میں شکر، پانی، زرد رنگ، کیوڑا ڈال کر ایک تار کا شیرہ تیار کرلیں۔ پیالے میں کھویا، خشک دودھ، میدہ، بیکنگ پاؤڈر، چھوٹی الائچی ڈال کر گوندھیں۔ بیس منٹ کے لیے گیلے کپڑے سے ڈھک کر رکھ دیں۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے گلاب جامن بنائیں اور گرم گھی میں گولڈن ہونے تک فرائی کریں۔ اس کے بعد شیرے میں ڈال دیں مزےدار گلاب جامن تیار ہیں۔

عفنان

نفسیاتی اور ذہنی الجھنیں

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ پہلا شکر اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسان کی شکل میں پیدا کیا۔ دوسرا شکر اس بات کا کہ ناک، کان، آنکھیں، ہاتھ اور جسم عطا کیا۔ بھائی، بہن، تعلیم اور دوسری نعمتوں سے نوازا۔ سب سے بڑھ کر عقل کی دولت عطا کی۔ اگر کوئی محرومی زندگی میں ہے تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اس محرومی پر صبر کرنا چاہیے۔ زندگی میں ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کسی کو کچھ نہیں ملتا۔

مشہور مفکر ڈاکٹر ماڈرن نے لکھا ہے۔

"جیسا ہم سوچتے ہیں' ویسا ہی بن جاتے ہیں۔ ہماری زندگی ہمارے خیالات سے عبارت ہے۔ اپنی امید سے بڑھ کر آپ کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ اپنی مایوسیوں ہی کے باعث اپنی خداداد صلاحیتوں کو ناکارہ کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے' ہمیشہ اپنی غریبی' دوستوں کی کمی وغیرہ ان گنت مایوسیوں کا تصور کر کے وہ خود اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔"

ایک اور بڑے مفکر نے ان الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

"اپنی امیدوں سے زیادہ آپ نہیں بن سکتے۔"

"اس لیے خوش امید رہیے' رب بڑا مہربان ہے۔ وہ کسی بھی وقت حالات تبدیل کر سکتا ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے' اللہ پر بھروسا رکھیں۔ مایوسی کفر ہے۔"



انگریزی کا ایک محاورہ ہے اور میرے خیال میں اس سے اچھا محاورہ شاید ہی کوئی اور ہو گا۔

An empty mind is devils work shop

(خالی ذہن' شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔)

آپ کی دلچسپیاں کم ہیں تو ان میں اضافہ کریں۔ ڈیل کارنیگی کہتا ہے۔

"پریشانیوں کا بہترین علاج مصروفیت ہے۔"

اگر آپ فارغ رہتی ہیں تو کوئی مشغلہ ڈھونڈیں۔ کتابیں پڑھیں۔ اچھی کتاب سے بہترین ساتھی کوئی نہیں اگر مطالعہ کی عادت ڈال لی جائے تو آپ بہت سی پریشانیوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں' اگر اداس رہتی ہیں تو سوچوں کا رخ بدلنے کی کوشش کریں۔ مثبت طرز فکر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ گھر کے لوگوں کو محبت دیں' ان کے مسائل میں دلچسپی لیں۔ اس کے بعد جو وقت آپ کے پاس بچے۔ اس میں اپنی تعلیم (بڑی بڑی ڈگریاں ضروری نہیں) سے فائدہ اٹھائیں۔ اگر حالات اچھے ہیں تو لوگوں کو مفت تعلیم دیں۔ اپنے آپ کو اتنا مصروف رکھیں کہ آپ کی تمام الجھنیں' پریشانیاں اپنی موت آپ مر جائیں۔ باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ اپنے بندوں پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔

بہن ت۔ب نے خط لکھا ہے۔ یہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے ذہنی پریشانی کا شکار ہیں۔ بھائی کے باہر جانے کے لیے قرض لیا تھا وہ ابھی ادا نہ ہوا تھا کہ بھائی کی اچانک شادی کی وجہ سے قرض لینا پڑا۔ اب بھائی کام چھوڑ کر آگیا ہے۔ چھوٹا بھائی بھی کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا۔ نوبت فاقوں تک آگئی ہے۔ والدین کے درمیان جھگڑوں نے گھر کی فضا خراب کر رکھی ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے بہن ت۔ب شدید ڈپریشن کا شکار ہوگئی ہیں لکھا ہے۔

"دل کرتا ہے خودکشی کرلوں۔ اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میں اپنے بہن بھائیوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔"

ج۔ اچھی بہن! ابھی آپ کی عمر بہت کم ہے۔ اس عمر میں ہمت ہار جانا اور خودکشی کی باتیں کرنا کم ہمتی اور بزدلی ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ کن حالات کی وجہ سے قرض لے کر بھائی کی شادی کی اور پھر چھوٹے بھائی کی بھی منگنی کردی جب کہ وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا۔ بہرحال یہ آپ کے والدین کے فیصلے ہیں اور لازمی طور پر وہ آپ کی نہیں سنیں گے۔ آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اپنے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے بارے میں سوچیں۔ آپ میٹرک کرچکی ہیں' کوشش کریں کہ آپ کو کہیں چھوٹی موٹی جاب مل جائے یا گھر میں چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیں۔ اس سے کم از کم آپ کے تعلیمی اخراجات تو پورے ہوسکیں گے۔ گریجویشن کے بعد آپ کو بہتر جاب بھی مل سکتی ہے۔ خودکشی کے بارے میں سوچنا' غصہ کرنا یا خود کو اذیت دینا کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھیں' ہر مشکل کے ساتھ آسانی ضرور ہوتی ہے اور پریشانی ہمیشہ نہیں رہتی۔ ان شاء اللہ یہ مشکل وقت بھی گزر جائے گا اور آپ کے حالات بہتر ہوجائیں گے۔ شرط یہی ہے کہ آپ ہمت نہ ہاریں۔ اللہ پر بھروسا رکھ کر کوشش کرتی رہیں۔

ساجدہ۔۔۔کراچی

ج۔ اس کالم میں بارہا لکھا جاچکا ہے کہ منہ بولے رشتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی کسی کو بیٹا کہنے اور بیٹا سمجھنے سے وہ آپ کا بیٹا نہیں ہوجاتا۔ کسی مصلحت کی بنا پر ہی ہمارے مذہب نے نامحرم کے لیے کچھ فاصلے رکھے ہیں۔ ان فاصلوں کو قائم رکھنا چاہیے۔ غلطی آپ کی ہے۔ آپ کو اپنے بیٹے کے دوست سے بے تکلفی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہماری ایک بہت اچھی اداکارہ نے تیسری شادی اپنے بیٹے کے دوست سے کی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسی بھی مثالیں ہیں چاہے کوئی آپ کو بہن کہے یا آپ کسی کو بیٹا سمجھیں۔ نامحرم کے ساتھ ایک مناسب اور لیا دیا رویہ رکھنا چاہیے۔ زیادہ بے تکلفی' ہنسی مذاق کسی صورت ٹھیک نہیں ہے۔

یسریٰ نذیر۔۔۔ٹنڈو محمد خان

ایک بچی ستے خط لکھا ہے۔ انہوں نے موبائل پر رانگ نمبر سے گفتگو کی اور دوستی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دوستی کا سلسلہ اس حد تک آگے بڑھا کہ ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی گئیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ لڑکا کہیں اور شادی کررہا ہے' کہتا ہے کہ برادری سے باہر شادی نہیں کرسکتا ورنہ اس کی بہنوں کی شادی نہ ہوسکے گی جب کہ یہ بچی اس صورت حال سے کو قبول نہیں کرپارہی۔

لکھا ہے میں اس کو بھول نہیں سکتی نہ ہی کسی اور سے شادی کرسکتی ہوں۔ آپ بتایئے کیا کروں۔

یسریٰ! آپ کی عمر صرف سولہ سال ہے۔ نویں جماعت کی طالبہ ہیں۔ یہ عمر لکھنے پڑھنے' کچھ بننے کی ہے۔ آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں۔ ابھی میٹرک بھی نہیں کیا اور آپ عشق و محبت کی کہانیوں میں الجھی ہیں۔ جینے مرنے کی باتیں کررہی ہیں' وقت ضائع نہ کریں ورنہ کل وقت آپ کو ضائع کردے گا۔ ابھی آپ کی عقل پختہ نہیں۔ یہ وقتی جذبات ہیں۔ پسند اور محبت میں بہت فرق ہے۔ کل آپ یہ سب باتیں یاد کرکے ہنسیں گی' بہتر ہے کہ ان باتوں کو بھول کر پڑھائی لکھائی میں دل لگائیں' کوئی ہنر سیکھیں۔ ویسے بھی وہ آپ کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے آپ کے جذبات کے ساتھ کھیلا۔ جھوٹے وعدے کیے پھر والدین کا بہانہ کرکے چھوڑ گیا۔ ایسا غیر ذمہ دار اور جھوٹا شخص شادی کے بعد کیسا شوہر ثابت ہوگا۔ آپ اندازہ کرسکتی ہیں۔

